

منتخبات نظام الفتاوی

حضرت مفتی محمد نظام الدین اعظمیؒ
(جلد دوم)

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : منتخب نظام الفتاوی (جلد دوم)

صفحات : ۴۹۶

قیمت : ۴۷۰ روپے

طبع اول : مارچ ۲۰۱۳ء

ناشر

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

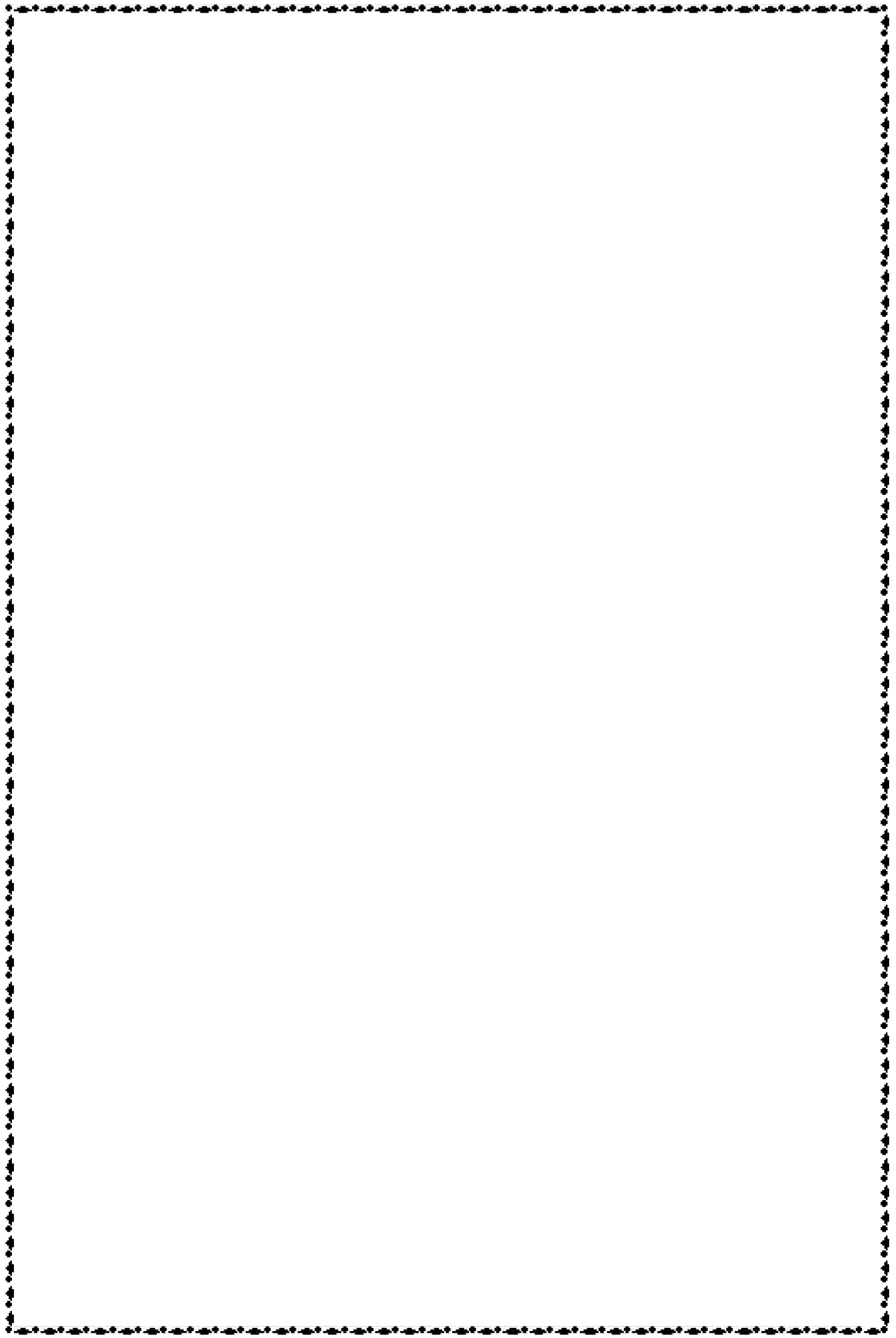
۱۶۱- ایف، بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ای میل: ifapublication@gmail.com

فون: 011 - 26981327

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



اجمالی فہرست

۲۳	کتاب الحج	۱
۵۷	باب الحج عن المیر	۲
۶۵	کتاب النکاح	۳
۱۱۵	باب النکاحات	۴
۱۴۳	باب حرمة المصاهرة	۵
۱۴۷	باب الرضا	۶
۱۴۵	باب المهر والجهاز	۷
۱۳۳	باب الاولیاء	۸
۱۵۹	باب العاشرہ المعروف	۹
۱۶۱	کتاب الطلاق	۱۰
۲۳۷	باب تعلیق الطلاق	۱۱
۲۴۵	باب الخلع	۱۲
۲۴۹	باب اللعان	۱۳
۲۵۱	باب ثبوت النسب والمنقذ	۱۴
۲۶۱	کتاب الوفاق	۱۵
۲۸۷	باب ما علق بأحكام المساجد	۱۶
۳۴۹	باب ما علق بأحكام المدارس	۱۷

٣٤٥	باب ما يتعلق بأحكام التقدير	١٨
٣٩٥	كتاب الإيمان والنذور	١٩
٣٠١	باب الحدود	٣٠
٣٠٥	كتاب المعاملات	٣١

فقہ رسالت

۲۵	کتاب الحج	
۲۵	ہوائی جہاز میں سفر کرنے والا احرام کہاں سے باندھے؟	۱
۲۵	مسند کی جہاز سے حج کے لئے جانے پر احرام کہاں سے باندھے؟	۲
۲۷	اگر کوئی شخص آفاق میں چلتا ہوا جدہ پہنچ جائے تو احرام کہاں سے باندھے؟	۳
۳۲	عورت بغیر حرم حج کرے گی تو حج بکراہت تحریمی ہوگا	۴
۳۵	حقیقی خالہ کو حج میں ساتھ لے جانا	۵
۳۵	سردی کی وجہ سے سر میں کپڑا لپیٹنا	۶
۳۶	حجر اسود اور اس کی اہمیت	۷
۳۷	حجر اسود کے استیلا م کے وقت پیر نہ ہونا	۸
۳۷	عمرہ کرنے سے حج فرض نہیں ہوگا	۹
۳۸	اگر ہوائی جہاز کے ذریعہ بغیر احرام باندھے جدہ پہنچے تو دم دینا ہوگا	۱۰
۳۹	بحالت احرام اگر خود بخود بال ٹوٹ جائے تو کیا حکم ہے؟	۱۱
۳۹	بیماری کی وجہ سے دہی میں نیابت	۱۲
۴۰	کف نہ دیا دم کہاں دینا ضروری ہے؟	۱۳
۴۱	دم چٹائیت کی ادائیگی حدود حرم میں ضروری ہے	۱۴
۴۲	حج کی قربانی کہاں کی جائے؟	۱۵
۴۳	مسنی کی قربانیوں کا گوشت اور ہڈی کاٹل استعمال بنانے کی اسکیم	۱۶
۴۵	بد رچہ مجبوری خواہ تین کے لئے بحالت حیض طواف زیارت کا حکم	۱۷
۴۶	کیا بحالت مجبوری دہی قربانی اور حلق کے درمیان کی ترتیب ساقط ہو جائے گی؟	۱۸
۵۰	عمرہ میں بال قصر کرانے کی مقدار (سر کے ایک طرف کا بال کٹنا درست نہیں)	۱۹
۵۳	اگر کوئی شخص ارکان حج کی ادائیگی کے بعد حلق و قصر نہ کرانا ہو؟	۲۰

۵۴	۲۱	بھارت اہرام بنیان یا سلی ہوئی چادر پہنے کا حکم
۵۴	۲۲	ارکان چھوٹنے یا ترتیب میں تغیر ہونا خیر کا حکم
۵۵	۲۳	بھارت اہرام خون نکلنے سے کیا دموا جب ہوگا؟
۵۵	۲۴	قرآن کے حج کا اہرام باندھنے کے لئے عمرہ کرنا
۵۵	۲۵	عمرہ کے اہرام کی چادر کا کفن میں استعمال

۵۷		باب الحج عن الغیر
۵۵	۱	حج بدل کے لئے آمر کے نفقہ اور اس کے وطن سے جانا ضروری ہے؟
۵۹	۲	حج بدل کرنے والا آمر کی اجازت کے بغیر تمتع کر سکتا ہے یا نہیں؟
۶۱	۳	حج بدل میں کس کی طرف سے حج کی نیت کرے؟
۶۱	۴	حج بدل کرنے والا قارن جنتہ کس طرح ادا کرے؟
۶۲	۵	حج بدل کرنے والا کس حج کا اہرام باندھے؟
۶۲	۶	حج بدل کرنے والا اہرام کہاں سے باندھے؟
۶۳	۷	جس نے حج نہیں کیا اس کا حج بدل کرنا
۶۴	۸	سعودی سے حج بدل کرنا

۶۵		کتاب النکاح
۶۷	۱	آپ ﷺ سے پہلے نکاح کا طریقہ
۶۷	۲	ایجاب و قبول کی ایک خاص صورت
۶۷	۳	صرف بیوی کے بیان پر تفریق کا حکم
۶۸	۴	دوسری مادی سے قانوناً روکنے کا کیا مقصد ہے؟
۷۲	۵	شوہر کے ظلم سے بچنے کی کیا صورت ہے؟
۷۵	۶	نکاح سے قبل لڑکا لڑکی کے لئے ایک دوسرے کو دیکھنا
۷۶	۷	نصرانی اور یہودی لڑکیوں سے نکاح کرنا اور اس کا نکاح پڑھنا
۷۷	۸	انہی کتاب عورتوں سے نکاح
۷۷	۹	دینی معاملات میں بیوی کی تنبیہ کا حکم
۷۷	۱۰	ماہانہ و لاکھ مارنے کا حکم
۷۷	۱۱	متحدہ کا حکم شرعی

۷۷	بہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری سٹا دی کرنے سے دوسری بیوی مستحق وراثت ہوگی یا نہیں؟	۱۲
۸۰	سٹا دی کے موقع پر عورت کا گیت گانا یا لکھ پڑھنا	۱۳
۸۲	قرآن کریم کی تلاوت سے روکنے والے اور اس کی بے حرشی کرنے والے شوہر کے ساتھ بیوی کا سلوک	۱۴
۸۳	مباشرت سے قتل و کیمہ	۱۵
۸۴	سٹا دی و بارات میں شرکت کا شرعی حکم	۱۶
۸۵	لا زمی رجسٹریشن نکاح کا شرعی حکم	۱۷
۸۷	ماتامل مجامعت لڑکی سے نکاح کا حکم	۱۸
۸۸	بلا اجازت نکاح ہو اور لڑکی رخصت ہو کر سرسراں چلی گئی تو کیا نکاح ہو گیا؟	۱۹
۹۰	لڑکا اور لڑکی کے بالغ ہونے کی عمر کیا ہے؟	۲۰
۹۰	بالغہ ہونے کے بعد نکاح کے لئے ولی کی اجازت ضروری نہیں ہے	۲۱
۹۱	لڑکے نے کہا میں نے تم سے نکاح کر لیا لڑکی نے کہا مجھے منظور ہے تو کیا نکاح ہو گیا؟	۲۲
۹۱	نکاح صحیح ہونے کے لئے سرکاری کاغذات میں اندراج ضروری نہیں ہے	۲۳
۹۲	بیوی کا یہ کہنا کہ مسئلہ ملاؤں کا ڈھونگ ہے سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا	۲۴
۹۲	بالغہ کی اجازت کے بغیر نکاح	۲۵
۹۳	زانیہ کو نکاح میں رکھ سکتا ہے یا نہیں؟	۲۶
۹۳	عمر دراز عورت سے نکاح	۲۷
۹۴	خلوت صحیح سے پہلے خلاق دے کر پھر آٹھ روز کے اندر نکاح کر لیا صحیح ہو یا نہیں؟	۲۸
۹۵	کسی کو محض بیٹی کہنے سے ہی عقد وہ بیٹی نہ ہوگی اور نکاح اس سے درست ہوگا	۲۹
۹۶	حاملہ بالما سے نکاح اور اس کے پڑھانے والے کا حکم	۳۰
۹۶	حاملہ بالما سے نکاح اور بچہ کے نسب سے متعلق	۳۱
۹۹	جس لڑکی نے کسی غیر مسلم لڑکے سے سٹا دی کر لی ہو اس سے تعلق رکھنا	۳۲
۱۰۰	بیوہ مرنائی سے نکاح کرنا	۳۳
۱۰۰	مسلم لڑکی نے غیر مسلم لڑکے سے نکاح کیا تو نکاح اور اولاد کا حکم	۳۴
۱۰۱	بیوی کے لڑکے کا نکاح اپنی لڑکی سے	۳۵
۱۰۱	مطلقہ بائہ سے نکاح	۳۶
۱۰۲	مرحوم بھائی کی بیوہ سے نکاح	۳۷
۱۰۲	دو بچے بھائی کا دو بچے بہنوں سے نکاح	۳۸
۱۰۲	مزنہ کی بہن سے نکاح	۳۹

۱۰۳	۳۰	پیسائی مجسٹریٹ کے کرائے ہوئے نکاح کی شرعی حیثیت
۱۰۵	۳۱	بیوی کے مرنے کے فوراً بعد دوسرا نکاح کرنا
۱۰۶	۳۲	مختبرۃ الطہر مطلقہ کے نکاح طائی کے لئے جواز کی ایک صورت
۱۰۷	۳۳	شوہر کے مرتد ہونے سے نکاح نسخ ہو گیا
۱۰۸	۳۴	مطلقہ عورت سے نکاح
۱۱۰	۳۵	منکوحہ بھیر سے نکاح
۱۱۱	۳۶	دوسرے کی بیوی سے نکاح
۱۱۱	۳۷	زوجہ غائب کی عورت کا نکاح دوسری جگہ کب صحیح ہوگا؟
۱۱۲	۳۸	بالغہ کا اپنی مرضی سے کئے ہوئے نکاح نیز غلاق نامہ پر جبراً نشان انگوٹھا لینے کا حکم

۱۱۵		باب المحرمات
۱۱۵	۱	بیوی کے کم بھل ہونے کی وجہ سے سالی سے نکاح جائز ہے یا نہیں
۱۱۶	۲	بیوی اور اس کی ماں کو رکھنا
۱۱۶	۳	بیوی کو غلاق دینے یا اس کے انتقال کر جانے کے بعد اس کی بہن سے نکاح
۱۱۷	۴	دوسرے کی مطلقہ سے بغیر عدت گزارے نکاح
۱۱۸	۵	شوہر کے انتقال کے بعد بیوہ کا تین ماہ کے بعد نکاح کر دینا
۱۱۸	۶	سوتیلی خالہ سے نکاح
۱۱۹	۷	شوہر کو مردہ بتلا کر نکاح کر لینا
۱۲۰	۸	مفقود البتھر کی بیوی سے نکاح
۱۲۱	۹	ساس سے نکاح

۱۲۳		باب حرمة الصاھرۃ
۱۲۳	۱	حرمت مصاہرت کی ایک صورت
۱۲۴	۲	شہوت کے ساتھ دو چادر سال کی بچی کو چھونے سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی
۱۲۵	۳	بہن کا خسر پر زنا کی تہمت لگانے سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟
۱۲۶	۴	مزنہ کی لڑکی سے نکاح

۱۲۷		باب الرضاۃ
-----	--	------------

۱۲۷	رضاعی بہن سے نکاح کرنے سے متعلق حکم شرعی	۱
۱۲۸	ثبوت رضاعت کے لئے تین عورتوں کی شہادت	۲
۱۲۹	عورت کی شہادت پر حرمت رضاعت کا شرعی حکم	۳
۱۳۰	بیوی کا دودھ پینا	۴
۱۳۰	بیوی کا دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی ہے	۵
۱۳۱	دودھ میں دو ملا کر پلانے سے رضاعت کا حکم	۶
۱۳۲	رضاعت سے متعلق	۷

۱۳۳ باب الأولاء والأکفاء

۱۳۳	والد کے ماموں کے لئے مابذلک کا نکاح کرنا	۱
۱۳۴	والد نے مابذلک کا نکاح کر دیا تو بعد یلوغ اس کو خیار یلوغ نہیں ملے گا	۲
۱۳۴	والد کے لئے مابذلک کی کابیرا نکاح کرنا	۳
۱۳۵	مابذلک کی کا نکاح اس کے والد کی اجازت کے بغیر کرنا	۴
۱۳۷	(عدم کفو کی بنیاد پر نسخ نکاح) کفو کی تعریف	۵
۱۳۷	عربی النسل و غیر عربی النسل میں کفو کا مسئلہ	۶
۱۳۹	لڑکی نے غیر کفو میں نکاح کر لیا تو کیا حکم ہے؟	۷
۱۴۳	لڑکی کا ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کرنا	۸
۱۴۴	راجوت، شیخ صدیقی کا کفو نہیں	۹

۱۴۵ باب المهر والجهاز

۱۴۵	ادائیگی مہر میں کس وقت کے سککا اعتبار ہوگا؟	۱
۱۴۷	مہر کی ادائیگی میں کس سککا اعتبار ہوگا؟	۲
۱۴۹	مہر میں اشرقی طے کرنا	۳
۱۵۰	زوجین کے درمیان مہر میں اختلاف ہو تو مہر کتنا واجب ہوگا، نیز مہر شرعی کی تحقیق	۴
۱۵۱	جنابت کا نسل نہ کرنے کی وجہ سے کیا عورت مرد پر حرام ہو جاتی ہے اور اس کا مہر مرد پر واجب ہوتا ہے	۵
۱۵۲	ماشزہ عورت اور اس کے مہر و غیرہ کا حکم	۶
۱۵۳	وسعت سے زائد مہر مقرر کر دینا	۷
۱۵۳	شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کے مہر کا حکم	۸

۱۵۳	مہر سے متعلق مختلف قسم کے سوالات	۹
۱۵۶	چیز کا شرعی حکم	۱۰
۱۵۶	شریعت یا چالٹ میں بیان کردہ احادیث سے استدلال	۱۱
۱۵۶	لڑکی والوں سے سٹادی میں کچھ لینا جائز نہیں	۱۲
۱۵۷	سامان چیز کے ضیاع کے بعد مطالبہ	۱۳
۱۵۹	باب المعاشرة بالمعروف	
۱۵۹	پاک و ناپاک کی کا خیال نہ رکھنے والی بیوی کے ساتھ برتاؤ	۱
۱۶۰	افرمان بیوی کی اصلاح کا طریقہ	۲
۱۶۱	کتاب الطلاق	
۱۶۳	طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہے عورت کو نہیں	۳
۱۶۳	محصن دل میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی	۴
۱۶۳	بیوی کے سامنے طلاق لکھ کر دینے سے طلاق نہیں پڑتی	۵
۱۶۶	طلاق دے دوں کہنے سے طلاق نہیں پڑتی	۶
۱۶۷	ایک مجلس کی تین طلاق کے سلسلہ میں احمدیہ اسلامک ریسرچ سنٹر کی جانب سے منعقد مینار کے فیصلہ پر محاکمہ	۷
۱۸۳	ایک مجلس کی تین طلاق	۸
۱۸۵	کو اہوں کے سامنے تین طلاق دی تو کیا حکم ہے؟	۹
۱۸۶	تین طلاق دینے والے پر مالی جرمانہ اور اس کی تعزیر کا حکم	۱۰
۱۹۱	طلاق دینے پر مالی جرمانہ لینا	۱۱
۱۹۲	طلاق کے بعد دوسری سٹادی	۱۲
۱۹۳	طلاق تکبرہ کا حکم	۱۳
۱۹۳	بیوی سے صرف ایک، دو، تین کہنا	۱۴
۱۹۵	میری طرف سے طلاق ہے اور نا زندگی حرام ہے کتنی طلاق پڑی	۱۵
۱۹۶	شوہر طلاق کا منکر ہو اور کوہ طلاق کی کوہی دیں	۱۶
۱۹۷	سٹادی نا منظور ہے طلاق دے دیا کہنے سے طلاق	۱۷
۱۹۹	مطالبہ طلاق پر دے دی، دے دی، دے دی کہنا	۱۸
۱۹۹	ہنچا ہے کا نسخہ کتاب مستحیر ہے یا نہیں؟	۱۹

۲۰۰	عدالت کی تفریق کا حکم	۲۰
۲۰۱	خلا قہا مہ پر صرف دستخط کرنے سے خلا ق پڑی یا نہیں؟	۲۱
۲۰۲	ان ولفقہ ورجق زوجیت ادا نہ کرنے کی وجہ سے نکاح فسخ کرنا	۲۲
۲۰۳	والد کے اصرار پر خلا قہا مہ پر دستخط کرنے سے خلا ق کا حکم	۲۳
۲۰۴	بیوی کا میکہ میں رہنا خلا ق کی دلیل نہیں	۲۴
۲۰۵	بحالت حمل ثمن خلا ق کا حکم	۲۵
۲۰۶	خلا ق کے بعد عدت واجب ہے	۲۶
۲۰۷	والدین کا خلا ق دینے پر اصرار	۲۷
۲۰۸	بیوی کے لئے شوہر سے خلا ق کا مطالبہ کرنا	۲۸
۲۰۹	زبردستی خلا قہا مہ پر دستخط کرانے سے خلا ق پڑتی ہے یا نہیں؟	۲۹
۲۱۰	کیا حالت حیض میں وٹلی کرنے سے عورت پر خلا ق واقع ہو جاتی ہے؟	۳۰
۲۱۲	بالغ کی خلا ق کا حکم	۳۱
۲۱۳	تم کو خلا ق دیئے، چھوڑ دیئے، چھوڑ دیئے کہنے سے کتنی خلا ق پڑی؟	۳۲
۲۱۴	بذریعہ تحریر وقوع خلا ق کے لئے کیا گواہ کا ہونا ضروری ہے؟	۳۳
۲۱۴	ما جائز تعلق کے شبہ کی وجہ سے خلا ق دینے اور بچہ کے نسب و پرورش سے متعلق	۳۴
۲۱۶	بحالت غصہ خلا ق چند بار کہنے کا حکم	۳۵
۲۱۷	شوہر کا ”تجھ کو خلا ق دیا“ ثمن بار کہنا	۳۶
۲۱۸	دوسرے خلا ق دینے کے بعد منہ بند کر دینے سے کتنی خلا ق پڑی؟	۳۷
۲۱۹	بیوی نے خلا قہا مہ نہیں لیا جب بھی خلا ق پڑ گئی	۳۸
۲۲۰	خلا قہا مہ وصول نہ کرنے یا واپس آ جانے کے باوجود خلا ق پڑ جاتی ہے	۳۹
۲۲۱	شوہر کا خلا ق دے چکا ہوں لکھنا	۴۰
۲۲۱	دوسرے سے خلا ق لکھوانے سے بھی خلا ق پڑ جاتی ہے	۴۱
۲۲۲	خلا قہا مہ پر جبراً انگوٹھا نشان لینے سے خلا ق نہیں پڑتی	۴۲
۲۲۳	ختم کیا چند بار کہنے سے خلا ق پڑی یا نہیں؟	۴۳
۲۲۴	تو آزاد ہے آزاد ہے تجھے خلا ق ہے تجھے خلا ق کہنے کا حکم	۴۴
۲۲۵	شوہر کا کہنا ”قارطی لے جاؤ“ اس سے خلا ق کا حکم	۴۵
۲۲۶	میں تم کو رکھوں تو ماں کو رکھوں یا بیٹی کو رکھوں کہنے سے خلا ق نہیں پڑی	۴۶
۲۲۷	صحیح طلاق کے لئے شوہر کا بیانی کا وٹلی کرنا ضروری ہے	۴۷

۲۲۸	شوہر کا جہاں تنہا رہی مرضی ہو اپنی لڑکی کا نکاح کر دو کہتا	۴۸
۲۲۹	حلالہ کا طریقہ	۴۹
۲۲۹	ایک دو تین کہتے ہیں، جواب دے دیا سے کون سی خلاقی پڑی؟	۵۰
۲۳۰	شوہر کا کہتا ہے آ زاد کروں گا، کہا، گواہان آ زاد کر دیا بیان کرتے ہیں، تو کیا حکم ہے؟	۵۱
۲۳۱	شوہر کا زن و شوہر کے تعلقات نہ رکھنا کہتا	۵۲
۲۳۲	زوجین میں ما اتفاقی کی وجہ سے خلاقی نہیں پڑی	۵۳
۲۳۳	عدالت سے خود بخاری حاصل کرنا	۵۴
۲۳۳	میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے کہنے سے خلاقی	۵۵
۲۳۴	بیوی کو میں نے تم کو چھوڑ دی تو میرے کا مکی نہیں کہتا	۵۶
۲۳۵	کیا جذا مکی وجہ سے حق حضانت ساقط ہونا چاہئے	۵۷

۲۳۷	باب تعلیق الطلاق	
۲۳۷	شوہر کا ایک نہیں تین خلاقی، خلاقی، خلاقی لکھنا	۱
۲۳۸	شوہر کا ایک دو تین خلاقی ہو مجھ پر اگر بیوی میرے گھر آئے، کہتا	۲
۲۳۹	تعلیق خلاقی سے رجوع صحیح نہیں ہے	۳
۲۴۰	مار نے پر خلاقی کو مطلق کرنا	۴
۲۴۱	قرانا مکی خلا ف و رزی سے کون سی خلاقی پڑے گی؟	۵
۲۴۲	زمانہ حال میں لگاتی ہوئی شرط کو ماضی پر محمول کرنے کا حکم	۶
۲۴۲	شوہر کا ”اگر تو میرے اور اللہ کے درمیان حجاب بنتی ہے تو تجھ کو خلاقی“ کہتا	۷
۲۴۳	اگر عیدین میں مصافحہ و مصافحت ہو تو بیوی کو تین خلاقی	۸

۲۴۵	باب الخلع	
۲۴۶	خلع میں زوجین کی رضا مندی ضروری ہے	۱
۲۴۶	بیوی کا خلع ما تحریر کرنا	۲
۲۴۶	خون میں ماردن کی وجہ سے خلع لینا	۳

۲۴۹	باب اللعان	
۲۴۹	لعان کے لئے دارالاسلام شرط ہے	۱

۲۵۱	باب ثبوت السبب و النفقة	
۲۵۱	زنا سے پیدا شدہ بچہ کا نسب	۱
۲۵۱	نفقہ مطلقہ کے بارے میں حکم شرعی	۲
۲۵۵	مطلقہ کو نفقہ کب تک ملے گا؟	۳
۲۵۸	منکوحہ کا بچہ اس کے شوہر کا ہوگا	۴
۲۵۹	جنات کا سلسلہ نسب	۵
۲۶۱	کتاب الوقف	
۲۶۳	موقوفہ جامد اعلیٰ الاولاد کے وقف کو ختم کر کے تقسیم کرنا درست نہیں ہے	۱
۲۶۳	وقف کے شرط کی رعایت ضروری ہے	۲
۲۶۳	وقف علی الاولاد کی کیا نوعیت ہے؟	۳
۲۶۶	بھوپال کے بعض اوقاف کا شرعی حکم	۴
۲۶۸	لوٹک کے ایک وقف کا شرعی حکم	۵
۲۷۰	مال حرام سے خریدی ہوئی اشیاء کا وقف کرنا	۶
۲۷۲	وقف کے لئے تحریر ضروری نہیں، وقف زبانی بھی ہو جاتا ہے	۷
۲۷۲	مشترک جامد ادا کا وقف	۸
۲۷۲	زبانی وقف کے بعد خرچ سے بچنے کے لئے وصیت نامہ لکھنا	۹
۲۷۳	موقوفہ زمین کی خرید و فروخت جائز نہیں	۱۰
۲۷۶	مرض الموت کا وقف وصیت کے حکم میں ہے	۱۱
۲۷۸	موقوفہ زمین بیچ کر اس کی قیمت سے دوسری زمین خریدنا	۱۲
۲۷۸	مشترک زمین سے بلا اجازت شریک زمین وقف کرنا	۱۳
۲۷۹	موقوفہ راضی کو پہرہ کرنا جائز نہیں ہے	۱۴
۲۸۲	شراکاء وقف کے خلاف عمل	۱۵
۲۸۳	خان کی تعریف اور اس کا حکم	۱۶
۲۸۳	شب قدر میں شیرینی کی تقسیم اور اس پر اوقاف کی آمدنی صرف کرنا	۱۷
۲۸۳	مسلم اوقاف بورڈ کی آمدنی عید گاہ پر خرچ کرنا	۱۸
۲۸۵	مغفور کا ستولی رہنا	۱۹

۲۸۷	باب ما یصلیٰ بہ احکام المساجد	
۲۸۷	مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے گم شدہ چیزوں کا اعلان کیسا ہے؟	۱
۲۸۸	امام کو مسجد کی آمدنی سے لام رخصت کی تحواہ دینا کیسا ہے؟	۲
۲۸۸	صدقہ، زکوٰۃ، چھ حلوے چھ افغان وغیرہ کی رقم مسجد میں لگانا اور لگ جانے تو کیا حکم ہے؟	۳
۲۸۹	جگہ کی قلت کی بنا پر خارج از مسجد اقتداء کرنے کا حکم شرعی	۴
۲۹۱	سود لینے، جامدہ کی تصویر بنانے اور بلیک مارکیٹنگ کرنے والے کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگانا کیسا ہے؟	۵
۲۹۲	مسجد کا مکان ایسے قصاب کو کرایہ پر دینا جو خنزیر وغیرہ کاٹے	۶
۲۹۳	اگر مسجد کی زمین پر کسی نے غلطی سے گھر تعمیر کر لیا تو کیا حکم ہے؟	۷
۲۹۴	مسجد میں داخل ہونے وقت سلام کرنا کیسا ہے؟	۸
۲۹۵	کسی کا مکان وغیرہ تو ذکر جبراً مسجد تعمیر کرنا	۹
۲۹۶	غیر مسلم کی رقم مسجد میں لگانا	۱۰
۲۹۶	کافر کا روپیہ مسجد میں لگانا اور اس کو ایصال ثواب کرنا	۱۱
۲۹۷	مسجد کی چھت پر امام کے لئے کمرہ بنولانا جائز نہیں	۱۲
۲۹۸	مسجد یا مدرسہ کی رقم شیئرز میں لگانا از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟	۱۳
۲۹۹	مساجد میں قلعے وغیرہ لگانا شرعی نقطہ نظر سے درست ہے یا نہیں؟	۱۴
۲۹۹	زیادہ مستحکم مسجد بنانے کے لئے مسجد کلاشید کرنا	۱۵
۲۹۹	مسجد کو دھری جگہ منتقل کرنا	۱۶
۳۰۰	شبیہ شدہ مسجد کے بلوں کو فروخت کرنا	۱۷
۳۰۱	احکام المساجد سے متعلق اہم مفصل فتویٰ	۱۸
۳۰۵	مسجد میں پینٹ کا استعمال کرنا شرعاً کیسا ہے؟	۱۹
۳۰۵	محراب سے کیا مراد ہے؟	۲۰
۳۰۶	غیر مسلم کا چندہ مسجد میں لگانے کا حکم	۲۱
۳۰۶	محالت کفر کما یا ہو ایبہ اور اس کا مسجد و مدرسہ میں صرف کرنا کیسا ہے؟	۲۲
۳۰۸	غیر مسلم کا روپیہ مسجد میں لگانا	۲۳
۳۰۸	خادم مسجد کے لئے موقوفہ زمین کی آمدنی امام و معلم پر صرف کرنا	۲۴
۳۰۸	مسجد کی زمین غیر مسلم کے ہاتھ فروخت کرنا	۲۵
۳۱۰	مسجد کی موقوفہ زمین کا تبادلہ	۲۶
۳۱۰	مسجد کے لئے زمین وقف کرنے کی وصیت کی تو کیا اس سے رجوع صحیح ہے	۲۷

۳۱۱	مسجد موقوف ہونی چاہیے مملوک؟	۲۸
۳۱۱	احاطہ مسجد میں امام کے لئے حجرہ بنانا جائز نہیں ہے	۲۹
۳۱۲	مسجد کی پرانی نکزی کو فروخت کرنا	۳۰
۳۱۲	مسجد کا ستولی کون ہوگا؟	۳۱
۳۱۳	مسجد کی آمدنی دوسرے گاہوں کی مسجد پر صرف کرنا	۳۲
۳۱۵	ستولی کا مسجد میں چندہ کرنے سے روکنا	۳۳
۳۱۵	مخمس کی اجازت کے بغیر مسجد میں بجلی کا استعمال	۳۴
۳۱۷	اختلاف کی بنا پر جدید مسجد کی تعمیر	۳۵
۳۱۸	بچے اور بچوں کا مسجد میں داخل ہونا	۳۶
۳۱۹	شرابی کو مسجد سے نکالنا جائز ہے یا نہیں؟	۳۷
۳۱۹	مسجد کے لئے وقف شدہ ذول اور بنی کا حکم	۳۸
۳۲۰	امام کے ساتھ سخت کلائی	۳۹
۳۲۰	لیٹی جگہ جہاں سو سال کے بعد مکانات منہدم کر دیئے جاتے ہوں وہاں مسجد کا حکم	۴۰
۳۲۳	مسجد کی آمدنی سے امام کی آمدورفت کا کرایہ دینا	۴۱
۳۲۳	امام کے ناشتہ وغیرہ کا لکھ مسجد کی آمدنی سے	۴۲
۳۲۳	مسجد کی آمدنی سے انعام دینا	۴۳
۳۲۴	مساجد میں لالچ کا دوسواں حصہ لگانا	۴۴
۳۲۵	عید گاہ کے لئے وقف شدہ زمین کا مصرف	۴۵
۳۲۵	مسجد بنانے کے لئے بینک سے سودی قرض لینا	۴۶
۳۲۶	مسجد کی تعمیر کے لئے سودی قرض لینا کیسا ہے؟	۴۷
۳۲۷	مسجد سے متصل محکمہ کا حکم	۴۸
۳۲۷	مسجد کی آمدنی سے مسجد کے حمام کی نکزی چلانا کیسا ہے؟	۴۹
۳۲۸	مسجد کی آمدنی دوسرے کاسوں پر خرچ کرنا کیسا ہے؟	۵۰
۳۳۰	توسیع کی غرض سے مسجد سے متصل قبرستان اور حجرہ کو مسجد میں شامل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟	۵۱
۳۳۱	مال حرام سے بنی ہوئی مسجد کا حکم	۵۲
۳۳۲	مسجد کی آمدنی کو دوسرے کاسے میں خرچ کرنا درست ہے یا نہیں؟	۵۳
۳۳۳	غصب شدہ زمین میں مسجد بنانے اور نماز پڑھنے کا حکم	۵۴
۳۳۴	مسجد میں نکاح کا سہرا پڑھنا	۵۵

۳۳۴	۵۶	چھوٹے محلہ میں دو مسجد کی بنیاد ڈالی تو کیا حکم ہے؟
۳۳۶	۵۷	محکم مسجد میں وضو خانہ کا حکم
۳۳۶	۵۸	مسجد کا سامان منتقل کرنا کیسا ہے؟
۳۳۷	۵۹	مسجد میں استنجا خانہ بنانا
۳۳۸	۶۰	جہاں استنجا خانہ بنانے سے مسجد کی بے حرمتی ہو، وہیں استنجا خانہ بنانے کا حکم
۳۳۸	۶۱	مسجد کی ایٹھ مدرسہ میں یا مدرسہ کی مسجد میں لگی تو کیا حکم ہے؟
۳۳۹	۶۲	مسجد میں دی ہوئی چیزیں واپس لینا
۳۴۰	۶۳	دوسری مسجد کی تعمیر کے بعد پرانی مسجد کا حکم
۳۴۰	۶۴	مسجد کے محکم کے کچھ حصہ پر مسجد کی آمدنی کی خاطر دوکان کی تعمیر
۳۴۱	۶۵	مسجد کے چندہ سے دوکان و استنجا خانہ کی تعمیر
۳۴۱	۶۶	ایک سنی موقوفہ زمین سے متعلق استفتاء
۳۴۲	۶۷	مسجد کی سابق عمارت گرا کر دوسری جدید تعمیر کا حکم
۳۴۶	۶۸	ماہیہ کو مسجد کا سفیر بنانا
۳۴۶	۶۹	مسجد میں مذہبیں درست نہیں ہے
۳۴۹		باب ما يتعلق بأحكام المدارس
۳۴۹	۱	زکوٰۃ و صدقہ نظر کی رقم بغیر حیلہ تملیک مدرسہ کی تحواہ تعمیر وغیرہ میں صرف کرنا جائز نہیں
۳۵۰	۲	فرائض مالیات کے لئے اجرت کی ایک جدید شکل اور اس کا حکم شرعی
۳۵۱	۳	مدرسہ کے نام موقوفہ زمین پر عید گاہ، مسجد اور مصلیٰ بنانا
۳۵۳	۴	سفیر کے لئے مہتمم کی اجازت کے بغیر وصول شدہ رقم میں تصرف کرنے کا حکم
۳۵۴	۵	فرائض سامان لانے پر نفع لینا
۳۵۵	۶	مکاتب اسلامیہ میں زکوٰۃ، صدقہ الفطر اور چھ مہینہ کی رقم صرف کرنا، نیز حیلہ تملیک کی بہتر شکل
۳۵۶	۷	حیلہ تملیک کا بہتر طریقہ
۳۵۶	۸	الاولیٰ مدرسین کے بارے میں حکم شرعی
۳۵۸	۹	احکام المدارس سے متعلق ایک فتویٰ
۳۵۹	۱۰	مدرسہ یا مسجد کا مکان بینک یا کسی سودی ادارہ کو کرایہ پر دینا
۳۶۰	۱۱	مدرسہ کے مفاد کے پیش نظر مدرسہ کے خزانے سے خواص و عوام پر اوسط درجہ کا خرچ کرنا درست ہے
۳۶۱	۱۲	سینما ہال وغیرہ کی کمائی مدرسہ یا مسجد میں لگانے کا حیلہ شرعی

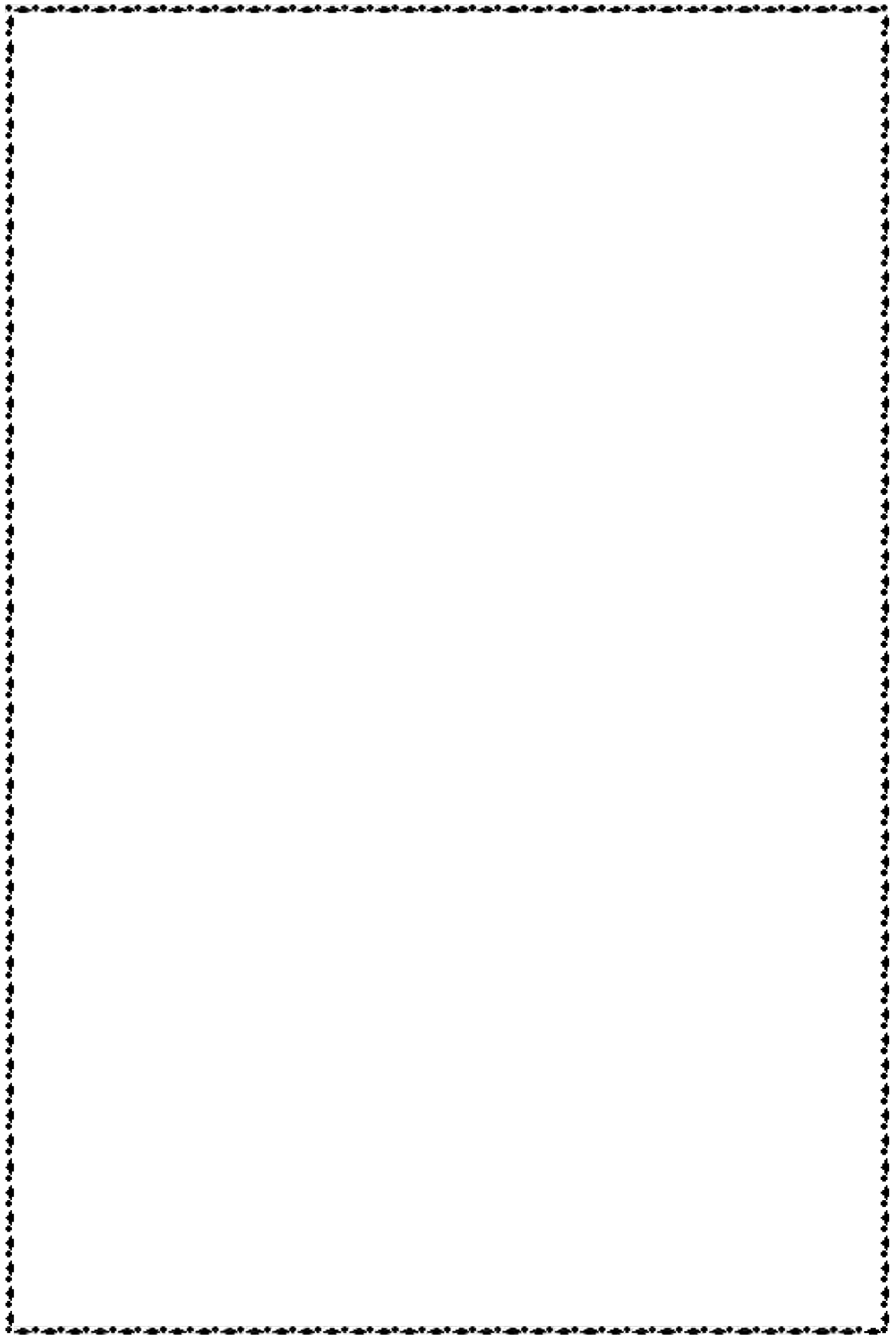
۳۶۲	موقوفہ مدرسہ کا کچھ حصہ یتیم خانہ کو دینے کا حکم	۱۳
۳۶۳	مدرسہ کے لئے وقف زمین پر مسجد و عیدگاہ کی تعمیر	۱۴
۳۶۵	سفرائے مدارس کا حکم	۱۵
۳۶۶	بلا تعدی مدرسہ کی رقم سفراء سے تم ہو جانے تو کیا حکم ہے؟	۱۶
۳۶۸	سفیر سے مدرسہ کی رقم تم ہو جانے کا کیا حکم ہے؟	۱۷
۳۷۰	مدارس و کتابت میں چھ مقررہ فی خرچ کرنے کا حکم	۱۸
۳۷۱	جس مدرسہ میں اسلامی کا منہ ہو اس میں چندہ دینا	۱۹
۳۷۲	جماعت اسلامی کے مدرسہ میں چندہ دینا	۲۰
۳۷۳	مدرسہ کی موقوفہ زمین پر اسکول بنانا	۲۱

۳۷۵	باب ما یصلق باحکام المقابر	
۳۷۵	متر و قبرستان میں مسجد کی توسیع کرنا	۱
۳۷۶	قدیم متر و قبرستان کے نکشائے ختم کر کے مسجد بنانا	۲
۳۷۸	قبرستان کے پڑیا اس کی قیمت کو مسجد میں لگانا	۳
۳۷۸	قبرستان کی زمین پر دوکان کی تعمیر اور اس کی آمدنی کا حکم	۴
۳۷۹	قبرستان یا مسجد کے روپیہ کو تجارت میں لگانا	۵
۳۷۹	قبرستان کو آمدنی کے لئے استعمال کرنا	۶
۳۸۰	میت کی تدفین کے لئے قدیم قبروں کو منہدم کرنا	۷
۳۸۱	پرانی قبروں کے نکشائے مٹ جانے پر کیا حکم ہے؟	۸
۳۸۲	متولی کی اجازت کے بغیر موقوفہ قبرستان میں تدفین	۹
۳۸۲	قبرستان کے ارد گرد کی زمین مدرسہ میں دینا	۱۰
۳۸۳	قبرستان کے درخت کی آمدنی مسجد و مدرسہ میں صرف کرنا	۱۱
۳۸۴	مزار وغیرہ کے موقوف شدہ زمین اور اس کی آمدنی کو مسجد میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟	۱۲
۳۸۵	متر و قبرستان کی زمین میں غرباء کے لئے مکان بنانا	۱۳
۳۸۶	قبرستان کی موقوفہ زمین پر مدرسہ یا امداد جاتی کے لئے مکان کی تعمیر	۱۴
۳۸۷	عورتوں کے قبرستان جانے کا حکم	۱۵
۳۸۸	چھ مقررہ فی کی رقم سے قبرستان کی چھارویواری بنانا کیسا ہے؟	۱۶
۳۸۸	قبرستان میں آبادی بسانا	۱۷

۳۸۹	پرائی قبروں پر دوکان لگانا	۱۸
۳۸۹	قبرستان میں فقیریوں کو چاول دال دینا	۱۹
۳۸۹	مہر جماعت کے لئے دنگہ کمیٹی کی مہری قبول کرنا	۲۰
۳۹۰	قبرستان کی زمین فروخت کرنا	۲۱
۳۹۱	مزار کی آمدنی	۲۲
۳۹۵	کتاب الایمان والذکر	
۳۹۷	شراب نہ پینے کی قسم کھانے کے بعد شراب پی لینے کا حکم	۱
۳۹۷	موت کے روزوں کا حکم شرعی	۲
۳۹۸	مذہب کے روز کو بچا کر کرنے کی صورت	۳
۳۹۹	عہد توڑنے کا کفارہ	۴
۴۰۱	باب الحمدود	
۴۰۱	قصص کی کیا سزا ہے؟	۱
۴۰۲	ننا کی سزا محض مزیہ کے والد سے سوائی مانگنے سے سوائی نہیں ہوگی	۲
۴۰۲	غیر شرعی طریقہ پر اپنی خواہش کی تکمیل	۳
۴۰۵	کتاب المعاملات	
۴۰۷	پرچوں کے معتمے حل کر کے انعام لینا کیسا ہے؟	۱
۴۰۸	شیراز سے متعلق چند اشکالات	۲
۴۱۵	ہندوستان میں عقود فاسدہ کا حکم، نیز ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالامن؟	۳
۴۲۳	دارالاسلام و دارالکفر کی تحقیق	۴
۴۳۱	ترقیاتی منصوبوں میں شرکت کا حکم	۵
۴۳۳	محکمہ اقتصادیات سے مدد لینے کی بعض صورتوں کا شرعی حکم	۶
۴۴۱	محکمہ اقتصادیات سے مدد لینا	۷
۴۴۵	ملکی ترقی کی سرکاری اسکیموں میں مسلمانوں کی شرکت	۸
۴۵۷	انعام کا غلط طریقہ	۹
۴۵۸	حق تصنیف سے متعلق سوال و جواب	۱۰

۳۶۰	شرکت کی مختلف صورتیں اور ان کے احکام	۱۱
۳۶۶	شرکت عیان کے فساد کی وجوہات	۱۲
۳۶۶	بعض شرکا کا ایک شریک کو نکال دینا	۱۳
۳۶۷	مال شرکت میں شرکا کی اجازت کے بغیر تصرف	۱۴
۳۶۹	ایک شریک کو اس کی محنت کے صلہ میں طے شدہ حصہ سے زیادہ دینا	۱۵
۳۷۰	شریک کا مال مشترک سے چندہ دینا و دیگر تصرفات کا حکم	۱۶
۳۷۱	شریک کے انتقال کے بعد اس کے حصہ کا مالک کون ہوگا؟	۱۷
۳۷۱	غیر شریک کا شرکا کے لئے تنخواہ پر کا م کرنا	۱۸
۳۷۱	ہٹل کی ذمہ داری ایسے شریک کو دینا جو نفع زیادہ دے	۱۹
۳۷۱	مال و عمل کے بغیر نفع میں شرکت	۲۰
۳۷۲	کھیت کو پیداوار کے ایک تہائی حصہ کی شرط پر سیراب کرنا	۲۱
۳۷۲	مضاربت کے بعد ادبائے مال مضاربین اور اس مال میں اضافہ کا حکم	۲۲
۳۷۸	شرکا میں سے کسی شریک کا مال شرکت میں سے کچھ اپنے مصرف میں لانا	۲۳
۳۸۰	کمیشن کی شرط پر کمپنی میں شرکت	۲۴
۳۸۱	شرکت کی ایک خاص اسکیم	۲۵
۳۸۲	چوری کے مال سے قرض کی ادائیگی	۲۶
۳۸۳	غیر مسلم کمپنی سے شیئر لینا	۲۷
۳۸۴	مضاربت کی مختلف صورتیں اور ان کے احکام	۲۸
۳۸۷	مقروض کا ادائیگی قرض کے وقت اپنی خوشی سے کچھ رقم زائد دینا	۲۹
۳۸۸	مشترک کا روبا سے متعلق ایک اہم فتویٰ	۳۰
۳۸۹	تقسیم شری مشترک کا ایک خاص فیصلہ	۳۱
۳۹۰	بیٹے کی ملازمت کی رقم کا مالک بیٹا بچا یا پ؟	۳۲
۳۹۱	سودی کا روبا والی ٹیکسٹری کا شیئر ہولڈر دینا	۳۳
۳۹۲	ٹیکسٹری ملازم کی بیوہ کو ٹیکسٹری سے لئے والی رقم کا حکم	۳۴
۳۹۳	سدا بھولی اسکیم میں شرکت	۳۵
۳۹۳	کمپنی کا شیئر ہولڈر بن کر نفع حاصل کرنا	۳۶
۳۹۴	سودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت	۳۷
۳۹۴	ادبائے ہی کی ایک صورت کا شرعی حکم	۳۸

كتاب الحج



کتاب الحج

ہوائی جہاز سے سفر کرنے والا احرام کہاں سے باندھے؟
ایک شخص حج کی غرض سے حرمین شریفین کا ارادہ کرتا ہے ہوائی جہاز سے جانا چاہتا ہے تو احرام کہاں سے باندھے
خلاصہ تحریر فرمادیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

ہندستان کی اصل میقات یلملم ہے محاذات سے آگے بڑھنا بلا احرام کے ناجائز ہے اور اس کے قبل احرام باندھ لینا جائز ہے (۱)، اس لئے بہتر یہ ہے کہ بمبئی ہی سے احرام باندھ لیں ورنہ پھر یلملم یا جو بھی میقات آئے اور اس کے محاذات پر پہنچے تو احرام ضرور باندھ لے اس سے آگے بلا احرام نہ بڑھیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۱۰/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عند

سمندری جہاز سے حج کے لئے جانے پر احرام کہاں سے باندھا جائے؟
اب تک حجاج کرام جو سمندری جہاز سے جاتے ہیں وہ یلملم کے محاذات (جو سمندر کے اندر ہیں اب تک ذی انور کے موافق پڑتا ہے) احرام باندھ لیتے ہیں، لیکن اب چند سال سے اچھے لوگ یعنی علماء کا طبقہ جو سمندر سے احرام ہر دو صورت میں جائز بتلاتے ہیں اور خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں جیسا کہ مشاہدہ ہوا ہے، تو کیا جدہ سے احرام باندھ سکتے

۱۔ ”وحریم داخبر الاحرام عنہا کلہا لمن ای لافالی وقصد دخول مکة یعنی الحرم ولا یحرم التعمیم للإحرام علیہا بل هو الأفضل إن فی أشهر الحج وأمن علی نفسه“ (الدرع الرد ۳/۲۸۳)۔

ہیں، جدہ سے احرام ہر دو صورت یعنی ہڈ ریوہ طیارہ اور ہڈ ریوہ سمندری جہاز جائز ہے یا نہیں؟

ولی اللہ خان (نشان پاڑا روڈ بمبئی)

الجواب وبالله التوفیق:

ابتدائی دور میں جب تک یہ بڑے بڑے جہاز جاری نہ ہوئے تھے اس وقت ہندوستان سے جانے والے عموماً حجاج سورت کی بندرگاہ سے چھوٹے جہازوں یا بادبانی کشتیوں کے ذریعہ سمندر پار کر کے عدن کے آس پاس پہنچ جاتے تھے، پھر وہاں سے سمندر کے کنارے کنارے آگے بڑھتے ہوئے پہنچ جاتے تھے۔

اس درمیان میں بعض جگہ اس خط میقاتی کو عبور کرنا پڑتا تھا یا معلوم اور قرن منازل کے درمیان واقع اسی خط سے جب تجاوز کرنے کا وقت آ جاتا تھا تو جہاز والا اعلان کر دیتا تھا اور لوگ احرام باندھ لیتے تھے اور اب ایسا نہیں ہے، اب یہ بڑے بڑے جہاز میقات سے باہر ہی آفاق میں گزرتے ہوئے جدہ پہنچ جاتے ہیں اور جھہ اور جدہ کے درمیان جو خط میقاتی ہے وہ جدہ سے آدھ میل آگے مقام شمشہ پر سے گزرتا ہے وہاں چونکہ کوئی نشان یا علامت نہیں ہے کہ وہاں پہنچ کر ٹھہرے اور بغیر احرام باندھے آگے نہ بڑھے۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی آفاقی آفاق میں گزرتا ہو بغیر کسی میقات سے آگے گزرتے ہوئے مکہ مکرمہ کے قریب پہنچنے لگے تو جب مکہ مکرمہ صرف دو منزل باقی رہ جائے تو احرام باندھ کر آگے بڑھے، بغیر احرام باندھے آگے نہ بڑھے، یہ مسئلہ عالمگیری اور البحر الرائق وغیرہ میں مصرح ہے (۱)۔

البتہ عوام میں ایک پرانا ڈھڑھرا ہوا ہے کہ اب بھی سمندر کے اندر آفاقی میں بغیر شرعی محاذات کے پیدا ہوئے احرام باندھ لیتے ہیں اور چونکہ میقات سے قبل بلکہ اپنے گھر سے احرام باندھ کر جانا منع یا مکروہ نہیں ہے، اس لیے علماء اس پر نکیر نہیں فرماتے۔

پانی کے جہازوں کے ذریعہ آج کل جانے والوں کے لیے یہی حکم ہے اس کو احقر نے ایک طویل جواب میں جو کہ حج رسالہ جیسا ہو گیا ہے اور وہ موافقت خمسہ کے نام سے ہے، رسالہ دارالعلوم میں شائع ہو چکا ہے اگر وہ مل جائے تو وہ رسالہ

۱۔ ”ثم الآفاقی إذ التھی علی قصد دخول مكة علیه أن يحرم قصد الحج أو العمرة عنداء، أو لم يقصد لقوله صلى الله عليه وسلم: لا يجاوز أحد الميقات إلا محرماً ولو لتجارة، ولأن وجوب الإحرام لعظيم هذه البقعة الشريفة، فیسوی فیہ التاجر والمعتمر وغیرهما“ (فتاویٰ ثنائی، ص ۱۳۹ ج ۲ کتاب الحج) (مرتب)۔

دارالعلوم سے طلب فرما کر ملاحظہ فرمالیجئے!

باقی ہوائی جہاز سے جانے والوں کو یہ شبہ ہو کہ یہ جہاز کسی خطِ میقاتی سے تجاوز کر کے اور خطِ میقاتی کے اوپر سے گزرے گا تو انہیں چاہیے کہ بمبئی ہی سے احرام باندھ کر احتیاطاً سوار ہوں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ۱۳/۱۱/۱۴۰۱ھ

اگر کوئی شخص آفاق میں چلتا ہوا جدہ پہنچ جائے تو احرام کہاں سے باندھے:

مکہ مکرمہ کے مشہور و معروف روزنامہ ”الندوة“ (۲۰ ذی قعدہ ۱۳۹۹ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء) کے آخری صفحہ پر مملکت سعودیہ عربیہ کے بڑے بڑے علماء کرام کی مجلس نے میقات احرام اور رمی جمرات پر ایک فتویٰ صادر کیا ہے اور یہ بات واضح کی ہے کہ ”جوا، بحر، وبرا“ میں داخلہ کے لئے حدود میقات کو تجاوز کر کے جدہ وغیرہ میں احرام باندھنا جائز نہیں ہے اور مجلس نے دوسرا فتویٰ یہ صادر کیا ہے کہ گیارہویں بارہویں، تیرہویں تاریخ کو ایام تشریق میں قبل ازوال رمی جمرات جائز نہیں ہے، صرف دسویں ذی الحج، یعنی یوم النحر کو قبل ازوال رمی جمرہ عقبہ (بڑا شیطان) کی درست ہے، عورتیں اور بوڑھے وضعیف اور عاجزین کے لئے رمی جمرہ عقبہ کی دسویں تاریخ کی آدھی رات کے بعد درست ہے۔

علماء کرام سے استدعاء ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی رائے دے کر حجاج کرام کی رہبری فرمائیں۔

ممتاز احمد جاوید ٹائٹس (بھگل، کراک)

الجواب وباللہ التوفیق:

۲ نومبر ۱۹۷۹ء کے صدق جدید میں علماء سعودیہ کا دو مسلوں پر ایک فتویٰ شائع کر کے علماء کرام سے یہ استدعاء کی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی رائے دے کر حجاج کی رہبری فرمائیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس فتویٰ سے کچھ خلجان یا اشتباہ پیدا ہو گیا ہے، اس لئے ان کے اشتباہ و خلجان کو رفع کرنے کی غرض سے بطور وضاحت و تشریح کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

مسئلہ: یہ جوا، بحر، وبرا حرم میں داخلہ کے لئے حدود میقات کو تجاوز کر کے جدہ وغیرہ میں احرام باندھنا جائز نہیں

ہے۔

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ حرم میں جانے کے لئے حدود میقات سے کسی کو بغیر احرام باندھے ہوئے تجاوز کرنا اور آگے بڑھ جانا جائز نہیں، اس لئے جو لوگ حدود میقات تجاوز کر کے جدہ وغیرہ میں احرام باندھیں گے تو یہ فعل ان کے لئے جائز نہ ہوگا۔

باقی آج کل ہندوستان و پاکستان سے بحری جہاز سے جدہ جانے والے حجاج، بلکہ مشرق کے کسی خطہ سے بحر ہند میں ہوتے ہوئے بحری جہاز سے جدہ جانے والے حجاج، خواہ ملیشیا، وائٹ ویشیا کے ہوں یا کسی اور خطہ کے ہوں وہ حدود میقات کو تجاوز کر کے جدہ نہیں پہنچتے، بلکہ حدود میقات و خطوط میقات سے بالکل باہر باہر حل کبیر و آفاق ہی میں گذرتے ہوئے جدہ پہنچ جاتے ہیں، اور خود جدہ بھی مکہ مکرمہ سے دو منزل سے کچھ زائد فاصلہ (تقریباً ۳۶ میل انگریزی میل سے) پر حل کبیر اور آفاق میں واقع ہے اور حدود میقات و خط میقاتی جدہ سے تقریباً ایک منزل مکہ مکرمہ کی جانب آگے بڑھ کر اس خط مستقیم پر واقع ہے جو یسلم سے چل کر سیدھا رافع و جحفہ کو پہنچتا ہے اور وہی خط مستقیم خط میقاتی ہے اور محاذ اہ میقات اسی خط پر واقع ہوتی ہے۔

کیونکہ اس خط کا مقام اور جگہ معلوم و متعین نہیں ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حدود میقات سے تجاوز کئے بغیر مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ جائے اور میقات و محاذات میقات کا علم و یقین نہ ہو تو کعبۃ اللہ کی تشریف و مکرمہ کے پیش نظر مکہ مکرمہ سے دو منزل کی دوری پر ہی احرام باندھ لے اور بغیر احرام باندھے ہوئے آگے نہ بڑھے۔ مافی الدر المختار علی حاشی الشامی:

”وإن لم یکن بحیث یحاذی فعلی مرحلتین و حرم تأخیر الإحرام عنها“، وھکذا فی الھندیۃ والبحر و غیرھما من الکتب المعتبرۃ للفتاویٰ عند الاحناف“ (۱)۔

اور اسی وجہ سے حجاج کرام کو جو مشرق سے بحری جہاز سے بحر ہند میں سفر کرتے ہوئے آج کل جدہ پہنچتے ہیں تو ان پر جدہ سے احرام باندھنا واجب و ضروری ہو جاتا ہے اور بغیر احرام باندھے ہوئے آگے بڑھنا جائز نہیں رہتا، اور جدہ سے قبل چونکہ کسی میقات سے یا کسی میقات کی محاذات سے تجاوز نہیں ہوتا اور نہ دو منزل سے کم کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے کہیں ہوتا ہے، اس لئے جدہ پہنچنے سے قبل احرام باندھنا واجب و لازم نہیں ہوتا، جدہ سے قبل کی جگہ کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے دو منزل سے کم نہ ہوتا تو ظاہر ہے، اس لئے کہ جدہ سے قبل تقریباً تمام جگہوں کا سمندری کنارہ مکہ مکرمہ سے دو منزل سے بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لئے کم کا کوئی سوا ہی نہیں پیدا ہوتا اور حدود میقات سے کسی جگہ تجاوز نہ ہونا اس لئے صحیح ہے کہ تجاوز کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ

جانے والا کسی میقات سے یا کسی میقات کے محاذ اذ سے، یعنی دو میقاتوں کے درمیان خط میقاتی سے آگے بڑھ کر حل صغیر میں داخل ہو جائے، کما دلت علیہ هذه العبارة من الهندية: ”وإن سلك بين الميقاتين في البحر والبر، اجتهد و أحرم إذا حاذی میقاتا منها (إلى قوله) فإن لم یکن بحيث یحاذی فعلی مرحلتین إلى مكة الخ“ (۱) جہاز کے اس پورے سفر میں آجکل ایسا کہیں نہیں ہوتا۔ حل صغیر کے معنی تو ظاہر ہے کہ حدود حرم سے باہر اور میقات آفاقی کے اندر کا علاقہ حل صغیر کہلاتا ہے اور محاذات میقات کا مفہوم مزید وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عین میقات کل پانچ ہیں: یلملم، جحہ، رابغ، ذو الحلیفہ، ذات عرق بقرن المنازل۔ انہیں کو موافقت خمسہ کہتے ہیں اور ان میقاتوں میں سے ہر ایک میقات سے جو خط مستقیم چل کر سیدھا دوسری میقات تک پہنچتا ہے وہ خط میقاتی کہا جاتا ہے اور انہیں خطوط میقاتی کا مجموعہ حرم شریف کو ہر طرف سے محیط ہے اور گھیرے ہوئے ہے۔ باہر سے کوئی آنے والا جب حدود حرم میں جانا چاہے تو اس کو عین میقات پر سے یا کسی خط میقاتی پر سے گزرنا ضروری ہوتا ہے، بغیر اس کے حدود حرم میں داخل ہونا ممکن نہیں، پس جب اس خط میقاتی پر کوئی جانے والا پہنچ جائے تو کہا جاتا ہے کہ محاذ اذ میقات پر پہنچ گیا اور اسی وجہ سے اس خط میقاتی کو خط محاذاتی بھی کہا جاتا ہے اور اب اگر اس جانے والے کا ارادہ مکہ مکرمہ جانے کا ہے تو بغیر احرام باندھے اس خط میقاتی سے آگے بڑھ گیا اور اس پر جنابت لازم آگئی، پس یلملم سے دائیں جانب یلملم سے جو خط مستقیم چل کر سیدھا دوسری میقات (جحہ و رابغ) تک پہنچتا ہے وہ خط سمندر کے کچھ حصہ سے نہیں گزرتا، تا کہ شبہ بھی کیا جاسکے کہ جدہ جانے والا جہاز اس خط سے متجاوز ہو گیا، بخلاف یلملم کے بائیں جانب جو خط مستقیم یلملم سے چل کر سیدھا قرن منازل تک پہنچتا ہے وہ خط سمندر کے کچھ حصہ پر گزرتا ہے اور اسی وجہ سے قدیم زمانہ میں جب کہ مشرقی ممالک و ہندوستان وغیرہ سے کشتی یا چھوٹے جہاز کے ذریعہ سمندر کو پار کر کے مسقط وغیرہ پر آجاتے تھے پھر سمندر کے کنارے آگے بڑھتے تھے تو خط میقاتی کا وہ حصہ سمندر ہی میں آ جاتا تھا اور بغیر احرام باندھے کوئی حاجی آگے نہیں بڑھتا تھا، اسی مسئلہ ہندیہ (۲۲۱/۱، و بحر) وغیرہ میں، بایں عبارت: ”و من حج فی البحر فوقته إذا حاذی موضعا من البر لا یتجاوز إلا محروما“ (۲) بیان کیا ہے اور اسی مرحلہ پر پہنچ کر جہاز راں محاذ اذ میقات پر پہنچ جانے کا اور احرام بندھوا دینے کا اعلان کر دیتا تھا، مگر اب مشرقی ممالک (ہندوستان وغیرہ) سے آنے والا حاجیوں کا حجاز مسقط و عمان وغیرہ کہیں نہیں جاتا اور نہ سمندر کے اس حصہ سے گزرتا ہے جو

۱- فتاویٰ ہندیہ ۲۲۱/۱۔

۲- حوالہ سابق۔

خط میقاتی کے اندر واقع ہے، بلکہ اس خط سے باہر باہر حل کبیر میں چلتا رہتا ہے۔

قول حل کبیر: حل کبیر و آفاق ایک ہی چیز ہے، موافقت خمسہ سے باہر کا کل علاقہ اقصائے عالم تک سب آفاق اور حل کبیر ہے۔

حل کبیر اور آفاق میں ہی گذرنا ہوا سیدھا جدہ پہنچ جاتا ہے جس کی وجہ سے محاذات میقات کا اور اس کے اعلان وغیرہ کا سولہ ہی نہیں پیدا ہوتا ہے، مگر اب بھی وہی قدیم ڈھرہ چلا آرہا ہے اور اسی قدیم ڈھرہ طریقہ پر اب بھی ایک مقام پر پہنچ کر اگرچہ وہ مقام حل کبیر اور آفاق ہی میں ہو محاذات میقات پر آجانے کا اعلان ہو جاتا ہے، حالانکہ محاذات میقات پر آجانے کا احتمال بھی نہیں رہتا اور چونکہ عوام میں بھی وہی سابقہ حالات و معاملات معروف و مشہور ہیں، اس لئے عوام اس اعلان پر عمل بھی کر لیتے ہیں، اگر بات یہیں تک رہتی تو چونکہ میقات سے قبل بھی احرام باندھ لینا درست ہے، اس لئے انگلیز کر لیا جاتا ہے، مگر اس اعلان پر عمل نہ کرنے والے پر لعن طعن بھی کرنے لگتے ہیں، یہ غلط ہے اور اس کے اصلاح کی ضرورت ہے، اصلاح کی جو بہتر تدبیر ہو اختیار کرنا چاہیے۔

مندرجہ ذیل نظری نقشہ سے میقات و حدود میقات و حل صغیر و حل کبیر و آفاق وغیرہ سب با وضاحت طریقے سے امتلاء ذہن میں آجائیں گے اور حدود میقات سے تجاوز نہ کرنے کا مفہوم بھی واضح ہو جائے گا۔ نیچے دیئے ہوئے نقشے میں دو میقاتوں کے درمیان میں جو خطوط ہیں انہیں خطوط میں سے کسی خط پر پہنچنے سے میقات کی محاذات صادق آتی ہے اور دائیں یا بائیں جو میقات قریب ہوتی ہے اسی میقات کا وہ شخص میقاتی کہا جاتا ہے اور اسی خط سے بغیر احرام کے آگے جانا ممنوع ہے، بلکہ اگر جانا ہے تو احرام باندھ کر آگے جانا جائز ہوتا ہے، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ کوئی جہاز یا قافلہ کسی میقات کے سامنے خواہ حل کبیر ہی میں ہو اس طرح پہنچ جائے کہ اگر بیت اللہ شریف سے کوئی خط مستقیم چل کر اس میقات سے گزرتا ہو اس جہاز یا قافلہ تک پہنچ جائے تو وہ محاذات میقات پر آجائیں گے اور ان کو وہیں سے بغیر احرام باندھے آگے بڑھنا جائز نہ ہوگا، یہ شبہ غلط ہوگا اس پر تفصیلی گفتگو اگلے صفحات پر ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

حدود میقات یا محاذات میقات کا اگر کوئی شخص یہ مفہوم لے کہ بیت اللہ شریف سے کوئی خط مستقیم چل کر کسی میقات پر سے گذرنا ہوا سیدھا آگے بڑھتا ہو حل کبیر و آفاق میں سمندری علاقہ میں گزرتا ہو اچلا جائے تو وہ سب خط میقاتی ہے اور اس خط پر بغیر احرام باندھے آگے بڑھنا اور تجاوز کرنا حدود میقات سے تجاوز کرنا شمار ہوگا تو یہ مفہوم صحیح و جوہ غلط ہے۔

جوابات شبہ:

اول: ایٹک اس تقدیر پر یہ خط اقصائے عالم تک جاسکتا ہے، اور درمیان میں کسی متعین حد پر ختم کر دینا یا ختم مان لینا نہ مخصوص ہے نہ معقول ہے، پس اس مفہوم کی بنیاد پر اقصائے عالم تک حل کبیر و آفاق میں لاکھوں مقامات و مکانات ایسے آجائیں گے جو خط میقاتی پر واقع ہوں گے اور محاذات میقات پر آجائیں گے، اور اس خط کے آگے بغیر احرام باندھے ہوئے آگے جانا جائز نہ ہوگا، ورنہ تجاوز عن حدود المیقات لازم آجائے گا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے لوگوں کا جب ارادہ مکہ مکرمہ جانے کا ہو تو اپنی آبا دی بلکہ اپنے گھر سے ہی اور آفاق میں ہی احرام باندھ کر نکلتا واجب ہو جائے گا اور بغیر احرام باندھے ہوئے آفاق کے اندر بھی اپنے گھر یا آبا دی سے باہر نکلتا جائز نہ ہوگا، حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔

ثانی: اسی طرح اس خط کے اطراف منزل و منزل کے فاصلے سے مکہ مکرمہ کی سمت سے چل کر جب کوئی اس خط پر آجائے تو اس کو بغیر احرام باندھے آگے بڑھنا جائز نہ رہے گا، حالانکہ وہ بھی آفاق ہی میں ہے اور شریعت کا مسئلہ ہے کہ مکہ مکرمہ آنے کے باوجود بغیر احرام کے جہاں تک چاہے جاسکتا ہے اور یہ اس کے خلاف ہے۔ کمانی الہندیہ (۲۲۱/۱)۔

ثالث: اس لئے کہ اس تقدیر پر میقاتی اور آفاقی کا فرق ہی ختم ہو جائے گا، جو منشاء شرع سے متضاد اور خلاف ہی نہیں، بلکہ ایسے احکام شرعیہ کو منہدم کر دینے والا بھی ہے۔

رابعاً: اس لئے کہ شریعت مقدسہ نے حدود حرم کے ہر چہار طرف کچھ فاصلہ پر پانچ سمتوں میں ایک ایک مقام نامزد کر کے میقات حرمت قرار دیا ہے، اس لئے کہ بتقاضائے: ”وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا“ (۱) پورا خطہ و حرم دربار محبوب حقیقی کا محل سرائے شامی ہے اور اس کے ہر طرف ان میقاتوں تک اس محل سرائے شامی کا جلو ہے جو بمنزلہ پائیں باغ اور پورا اجاز بلدہ امین کے لئے بمنزلہ فنائے مصر ہے، اس لئے منشاء شرع یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تم فنائے بلد میں آجاؤ اور محل سرائیں داخلہ کی نیت کرو تو دربار کے آداب شامی بجالا کر داخل ہوا کرو، اپنے محبوب حقیقی کے عشق و محبت کی کیفیت طاری کرو، بلکہ محبت میں فنا کی کیفیت طاری کر کے کفن کے کپڑے (احرام) پہن کر آجاؤ اور جب دربار شامی میں داخل ہو جاؤ آداب سلامی بجالاؤ اور نور عشق و محبت میں سرشار ہو کر محبوب حقیقی کے گھر کا چکر (طواف قدوم) لگاؤ۔

مناسک حج کے تمام ہی احکام دیکھ جائے تقریباً سب ہی اسی عشق و محبت کی سرشاری کے ترجمان و مظہر نظر آتے ہیں، ان سب باتوں کا بھی تقاضا یہ ہے کہ کم از کم محل سرائے شامی کا پائیں باغ (حدود میقات) ہر طرف سے مثل بستان کے

احاطہ بند اور گھرا ہوا ہو، تاکہ کوئی داخل ہونے والا دربار شامی کے آداب کے ادا کئے بغیر محل سرا میں داخل ہی نہ ہو سکے۔
مگر محبوب حقیقی کی شانِ کریمہ و رحیمی ہے کہ دیواروں سے احاطہ بندی کے بجائے محض خطوط بین المواقیت سے احاطہ بندی تر اردے کر حدود میقات کی تعیین و تحدید کردی اور آداب شامی کے بجالانے کے طریقے بھی خود ہی بتلا دیئے حدود میقات کی اور محاذ میقات کی اس ترجمانی اور مفہوم میں جو ایک شبہ اور اس کا ازالہ کے تحت بیان کیا گیا ہے اس میں ان فوائد اور حکم کا کہیں دور و در تک بھی پتہ و نشان نہیں ہے، بلکہ ان مذکورہ شرائط کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں جو اس ترجمانی کی تردید کرتی ہیں، بغرض اختصار ذکر نہیں کیا جاتا۔

غرض حدود میقات و محاذات میقات کی مذکورہ بالا ترجمانی جن کو صاحب اشکال و شبہ نے بیان ہے وہ اصول شرع، اصول فقہ اور ضوابط عقل و نقل سب کے ہی خلاف ہے اور غلط ہے۔

خشبکی و بحر کے راستے سے جانے والے حجاج کے لئے یہ سب تفصیل ہے اگر کوئی ہوائی جہاز سے جانا چاہے تو اس کے لئے مزید تفصیل بھی ہوگی کہ اگر کوئی ہوائی جہاز محض اتنی بلندی پر پرواز کرتا ہے کہ زمین سے بغیر کسی دور بین وغیرہ آلہ کے مدد کے وہ نظر آتا ہے تو وہ زمین کے تابع تر اردیا جائے گا اور اس کے حجاج کو کسی میقات اور خط میقاتی سے بغیر احرام کے آگے بڑھنا اور تہجد و نماز کرنا جائز نہ رہے گا اور اس پر جانے والے حجاج کو اگر یہ ظن غالب ہو کہ صرف تھوڑے ہی وقفہ میں کسی میقات یا کسی خط میقات سے آگے بڑھ جائیں گے تو ان کے لئے ضروری ہے کہ سوار ہونے سے قبل ہی احرام باندھ کر سوار ہوں یا سوار ہوتے ہی فوراً احرام باندھ کر تیار ہو جائیں، مثلاً ہندو پاک سے جانے والا ہوائی جہاز اگر قرن منازل و پلہلم کے درمیان سے گزرتا ہو اچھا یا حدود عرب میں کسی جگہ جاتا ہے تو وہ قرن منازل و پلہلم کے درمیان خط میقاتی سے بھینا گزرے گا، اور اس حال میں اس خط (خط میقاتی بین قرن و پلہلم) سے بغیر احرام باندھے ہوئے اس کے کسی مسافر کو آگے بڑھنا جائز نہ ہوگا، اور جو ہوائی جہاز اتنی بلندی سے پرواز کرتا ہے کہ زمین سے بغیر دور بین وغیرہ آلہ کی مدد کے نظر نہیں آتا ہو، جیسا کہ اکثر دور دراز مقامات (لندن، امریکا، کنیڈا، افریقہ وغیرہ) سے آنے والے ہوائی جہازوں کا عموماً یہ حال ہوتا ہے، تو وہ زمین کے تابع نہیں تر اردینے جائیں گے، بلکہ جس وقت وہ زمین سے قریب آ کر نظر آئے گا تو اس وقت زمین کے تابع تر اردینے جائیں گے، اور صرف اسی وقت سے احرام وغیرہ کے مذکورہ بالا احکامات اس میں آنے والے مسافروں پر لاگو ہوں گے، یا یہ کہ اس مسافر کو اس جہاز کا روٹ (راستہ) معلوم ہو، راستہ کے اور مقامات کا نقشہ بھی معلوم ہو اور جانتا ہو کہ فلاں میقات سے یا اس کی محاذات سے فلاں وقت گزرے گا تو اس وقت کے آنے سے کچھ قبل احرام باندھ لینا ضروری ہو جائے گا۔

ابنہ ان کو ان امور کا مزید لحاظ رکھ کر اپنے احرام وغیرہ کا نظم رکھنا ضروری ہوگا۔ مثلاً چھ گھنٹہ مسلسل پرواز میں رہے گا اور جب اترے گا تو میقات کے اندر اترے گا تو اترنے سے محض گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے احرام باندھ لینا کافی ہوگا، اور اگر یہ معلوم ہے کہ وہ میقات سے باہر ہو جائے گا اور میقات کے باہر اترے گا، جب تو کوئی اس کا اشکال ہی نہیں، اتر کر پھر خشکی کے مسافروں کی طرح احرام باندھنے کا اہتمام و انتظام کرے گا۔

مسلم حنفیہ کے نزدیک بھی ۱۱-۱۲-۱۳ کوری جمرات قبل الزوال جائز نہیں اور ذی الحجہ کو قبل الزوال رمی کرنا محض درست اور مباح ہی نہیں ہے، بلکہ افضل اور بہتر ہے اور بعد الزوال غروب تک مباح ہے، اور غروب آفتاب سے صبح صادق کے طلوع ہونے تک مکروہ ہے اور اس تفصیل کا ثمرہ محض یہ نکلے گا کہ ۱۱ کی صبح صادق سے پہلے اگر کوئی رمی جمرہ کرے گا تو تارک بن کر رہ جائے گا، باقی افضل یہی ہے کہ دسویں تاریخ کو زوال سے قبل قبل کر لے، فقط واللہ اعلم بالصواب

نقشہ نظر کی میقات خمسہ

محمد ورائف

نقطہ میقاتی حل کبیر و آفاق

والحليفة

But

125

خط میقاتی حل کبیر و آفاق

نقطہ میقاتی حل کبیر و آفاق

مجلس

ملفوظات

قرن مہا زل

کراچی بھینٹی..... سمندر راستہ چہاز۔

(خط میقاتی حل کبیر و آفاق ہندوستان و پاکستان) سمندر راستہ چہار.....

.....ستندوز استر چهار

3

کتابخانه محمد زکریا مالدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

عورت بغیر محرم کے حج کرے گی، تو حج بکراہت تحریمی ہوگا:

میں یہاں طائف کے سرکاری دواخانہ میں کام کرتا ہوں، میری بیوی یہاں آئی ہوئی ہے، مکہ کی قربت کی وجہ سے ان پر حج فرض ہو جاتا ہے، لیکن اس مسئلہ میں مشکل یہ ہے کہ حج کے دوران جب کہ تمام ملک میں چھٹی ہے، ڈاکٹروں کو حج کی خصوصی ڈیوٹی پر لگایا جاتا ہے، مجھے یا تو مکہ مکرمہ میں حج کی بولنگ ہوگی یا کسی اور جگہ پر ہوگی۔

اس لیے مسئلہ یہ ہے کہ بیوی کے محرم کے لیے کیا کیا جائے، کیا میری موجودگی حدود حرم کے اندر ہونے کی وجہ سے اور بیوی کے ساتھ محرم شرعی کے نہ ہونے کے باوجود حج فرض ادا ہو جائے گا، یا پھر مجھے احرام باندھ کر ان کے ساتھ حج کے درمیان مستقل رہنا ضروری ہے یا نہیں؟ بغیر محرم شرعی کے میری بیوی کا حج ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

ڈاکٹر سید انور حسین (ہسپتال طائف، سعودی عرب)

الجواب وبالله التوفیق:

بخاری شریف و مسلم شریف میں روایت ہے: ”لَا تَسَافِرُ السَّرَّاءُ ثَلَاثًا إِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ أَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ“ (۱)۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسافرتِ قصر یا اس سے زائد کا سفر عورت کو بغیر محرم کے یا شوہر کے کرنا جائز نہیں ہے، یہ عام اور مطلق ہے، سفر حج میں جانے والی عورت کے لیے بھی ہے، اس لیے آپ طائف سے توجع کرنے کے لیے بغیر اپنے ساتھ لیے ہوئے یا کسی محرم کے ساتھ گئے ہوئے تنہا نہ بھیجیں، البتہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آپ کی ڈیوٹی مکہ مکرمہ یا منی میں یا حدود حرم کسی جگہ میں ہونے والی ہے، آپ مکہ مکرمہ یا منی میں یا حدود حرم میں کہیں بھی اپنی ایک قیام گاہ کرایہ پر یا عاریتہ لے لیجئے اور وہاں ساتھ لاکر اہلیہ کا قیام کرا دیجئے، پھر ۸ رزی الحج کو جو مناسک حج ادا کرنے کے لیے جانا وغیرہ پڑے گا وہ مسافتِ قصر سے بہت کم ہوگا اور مخالفت والا حکم جو اوپر حدیث پاک سے منقول ہے لا کونہ ہوگا، کیونکہ منی کا سفر ہوگا تو وہ صرف چار میل کا ہوگا، پھر منی، عرفات، مزدلفہ کا سفر ہوگا وہ ۸/۹ میل سے زیادہ کا نہ ہوگا، اسی طرح حدود حرم کے ہر مقام سے کہیں سے بھی مسافتِ قصر نہ ہوگی، البتہ چونکہ اس سفر میں راتیں بھی گزریں گی، اس لیے اگر ممکن ہو تو آپ رات کو ان کے پاس خود رہ لیا کریں، یا ایسی معتبر اور حج کو جانے والی عورتوں کے ساتھ ان کو کر دیں جن کے محرم یا شوہر ساتھ ہوں اور وقتاً فوقتاً

آپ بھی نگرانی کرتے رہیں، تو اس طریقہ سے اہلیہ کا حج بھی ادا ہو جائے گا اور کوئی شرعی قباحت یا خرابی بھی لاحق نہ ہوگی، ورنہ اگر عورت مسافت قصر کا سفر یا اس سے بھی زیادہ کا سفر طے کر کے تہاجج ادا کرے تو حج کا فریضہ ادا تو ہو جائے گا مگر اس طرح سفر کا گناہ بھی ہوگا اور حج بکراہت ادا ہوگا، باقی مقبولیت کا مدار اخلاص پر ہے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- حقیقی خالہ کو حج میں ساتھ لے جانا:

حاجی اپنی نگی حقیقی خالہ کو ساتھ لیجا سکتا ہے یا نہیں؟

۲- سردی کی وجہ سے سر میں کپڑا پٹینا:

آجکل موسم حج میں سخت جاڑا ہوتا ہے تو کیا سر میں کوئی کپڑا پٹ سکتا ہے کیونکہ سردی کی وجہ سے بیماری ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، مثلاً اگر بیماری پڑ جائے تو پھر کیا سر میں کپڑا باندھ سکتا ہے اور اگر باندھے تو کیا قربانی واجب ہوگی اور اگر قربان کا احرام ہو تو کیا قربانیاں چرمانہ کی واجب ہوں گی، یا ایک پھر یہ حکم ایک دن باندھنے کا ہے یا پورے ایام بھر باندھنے کا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

۱- لے جا سکتا ہے (۲)۔

۲- اگر ممنوع احرام عذر سے بھی کرے گا تو جزا دینی واجب ہوگی، لیکن قانون یہ ہے کہ ہر ڈھانکنے میں دم تب ہے جبکہ سارا دن ڈھانکے (۳)، اور اس سے کم ڈھانکنا اگرچہ گھنٹہ بھر ہو تو صدقہ دے نصف صاع اور گھنٹہ سے کم میں ایک مشمت

۱- ”ولو حجبت بلا محرم جاز مع الكراهة، قال الشامي قوله مع الكراهة أي التحريمية للنهي في حديث الصححين: لا يسافر امرأة تلتها إلا ومعها محرم“ (فتاویٰ ثانی ۲/۳۰۰ کتاب الحج)۔

۲- اس لئے کہ حقیقی خالہ محرم ہے ”حرمت علیکم امہانکم وبناتکم وایوانکم وعمالکم“ (سورہ نسا ۲۳)۔

۳- ”أو مسر رأسه بمعاد اما بحمل اجالة أو عمل شيء فلا شيء عليه يومًا كاملاً أو ليلة كاملة وفي الأقل صدقة“ (الدر المختار ۳/۵۷۷)۔

گندم دے اور دن سے زیادہ میں بھی ایک ہی دم ہے اگرچہ کئی دن پہنچے رہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پورا ۲۶/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمد جمیل الرحمن، سید احمد علی سعید

حجر اسود اور اس کی اہمیت:

کہتے ہیں کہ حجر اسود کو حضرت آدم علیہ السلام اپنے ساتھ جنت سے لائے تھے، اگر یہ سب درست ہے تو پھر کیا جنت میں مادی اشیاء موجود ہیں، اگر یہ دنیاوی سنگ ہے تو پھر ہمارے رسول اللہ ﷺ نے اتنی اہمیت کیوں دی؟ کوئی مسلمان اگر اس کو ایک معمولی سا پتھر سمجھ کر اس کا بوسہ نہ لے تو اس کا حج درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

ممکن ہے کہ جو ہر مجردہ میں سے رہا ہو اور جب دنیا میں اتارا گیا تو متصف بالمدہ کر دیا ہو، کیونکہ دنیا عالم مادیات سے ہے اور جو ہر مجردہ کا اتصاف بالمدہ ممکن ہے، جیسا کہ روح جو ہر مجردہ سے ہے لیکن اس کا اتصاف باجسام الحیو ان ہوتا ہے حالانکہ اجسام کا مادی ہونا ظاہر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حجر اسود دنیاوی سنگ نہیں ہے کہ اس کو اس پر قیاس کیا جاوے، بلکہ یہ جنت کی ایک محبوب و معظم شے ہے، اسی لیے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایسی اہمیت دی ہے، پھر آپ کو حکم خداوندی اسی طرح کا تھا اور یہ ایک امرِ تعبدی ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں اور جب اس کا شے محترم ہوا عقلاً ممکن ہے اور حضور ﷺ نے معاملہ احترام کا حکم دیا ہے تو اس کی تحقیر کرنا رسول اللہ ﷺ کی اور اصل احکم الحاکمین کے حکم کی مافرمائی ہوگی، جو اپنے اندر شانِ بغاوت رکھے گی، اس لیے یہ حرکت جائز نہ ہوگی، اور اس کا تقاضا بے شک یہ ہے کہ ایسا کرنے سے حج ہی ادا نہ ہوگا۔

لیکن حضور ﷺ کی شانِ رحیمی کا ظہور ہے کہ اس کا بوسہ نہ لینے سے کفارہ جنایت بھی لازم نہ آئے گا (۱)، اور فریضہ

۱- قال: واسلمہ إن استطاع من غیر أن یؤذی مسلماً، لما روی أن السیّد علیہ السلام قبل الحجر الأسود ووضع شفیہ علیہ، وقال لعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: إلیک رجل أیّد تؤذی الضعیف فلا تراحم الدائم علی الحجر، ولكن إن وجدت فرجة فاسلمه وإلا فاسقبله وهلل، وکبر، ولأن الإسلام مدة والنحرز عن أذى المسلم واجب (المعتمد مع فتح القدیر، ص ۳۵۳، کتاب الحج) (مرتب ک)

حج ادا ہو جائے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حجر اسود کے استیلام کے وقت پیر نہ موڑنا:

حجر اسود کے استیلام کے وقت حضرت مفتی سعید احمد صاحب نے معلم الحجاج میں لکھا ہے کہ ہاتھ سے استیلام کے وقت صرف چہرہ اور دونوں ہاتھوں کو حجر اسود کی طرف کرنے پر پیر نہ موڑے کہ یہ بہت برا ہے۔

بعض اچھے علماء کا خیال یہ ہے کہ شاید یہ سہو ہے، اس لیے کہ پیر اس طرف نہ کرنے میں ذرا لاپرواہی معلوم ہوتی ہے تو صحیح کیا ہے؟

حضرت مفتی صاحب نے جو لکھا ہے وہ صحیح ہے، یا بعض علماء کا خیال جو ہے کہ پیر بھی حجر اسود کی طرف کرے یہ صحیح ہے، ذرا اس پر روشنی ڈالیں مہربانی ہوگی!

ولی اللہ خان (نشان پاڑا روڈ، ممبئی)

الجواب وبالله التوفیق:

ضابطہ کی اور اصل بات وہی ہے جس کو حضرت مفتی سعید احمد صاحب نے معلم الحجاج میں لکھا ہے، اس لیے کہ یہ استیلام طواف کرتے ہوئے ضمناً کرنا ہوتا ہے۔

لہذا طواف کرتے ہوئے جو قدم جس طرح رہتا ہے اسی طرح رہنے دیں، اس رخ سے قدم پھیرنے میں انقطاع فی الشوط کا ایہام ہوتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۱۱/۱۴۰۱ھ

عمرہ کرنے سے حج فرض نہیں ہوگا:

کیا عمرہ کرنے سے حج فرض ہو جاتا ہے؟ میں عمرہ کر کے جب واپس ہوا تو ہر شخص کی زبان پر یہ کلمہ تھا کہ تم پر حج فرض ہو گیا، اب تم نے حج نہیں کیا تو دوزخ میں جاؤ گے، پھر میں اس پر پریشان ہوا اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفيق :

محض عمرہ کرنے سے حج فرض نہیں ہوتا، بلکہ حج کی فرضیت لقولہ تعالیٰ: ”من استطاع إلیہ سبیلاً“ (۱) سے ہوتی ہے کہ جو بیت اللہ تک جانے کی استطاعت ہونے سے متحقق ہوتا ہے، لقولہ تعالیٰ: ”الحج أشیہر معلومات فمن فرض فیہن الحج فلا رفق الخ“ (۲) جیسے نمازہ جنگا نہ کی نفس فرضیت عطل وبلوغ کے متحقق سے ہو جاتی ہے اور سبب وجوب صلوٰۃ اوقات صلوٰۃ سے متحقق ہوتا ہے کہ جب وقت صلوٰۃ آگیا، سبب وجوب متحقق ہو گیا کہ اگر بسبب وجوب (اوقات صلوٰۃ) پا کر نماز ادا نہ کرے گا تو گنہگار ہوگا، پس اس طرح چونکہ عمرہ میں طواف سعی ہوتا ہے، پس جب کوئی شخص اشہرج میں سعی و طواف بیت اللہ کرے گا تو وجوب کا سبب اشہرج پائے جانے کی وجہ سے اب حج نہ کرے گا تو گنہگار ہوگا، نہ کہ محض عمرہ کرنے سے، پس اشہرج سے قبل کوئی عمرہ کرے تو سبب وجوب حج متحقق نہ ہونے سے وجوب حج نہیں ہوگا، کیونکہ سبب وجوب کے پائے جانے سے پہلے وجوب نہیں ہوتا، جیسا کہ نماز کے بیان کردہ مسائل سے واضح ہو چکا۔

پس اگر اشہرج میں عمرہ کرے گا تو حج بھی ادا کرنا اسی سال فرض ہو جائے گا اور اگر اشہرج سے قبل عمرہ کرے گا تو وجوب کا سبب (اشہرج) نہ پائے جانے کی وجہ سے اسی سال حج فرض نہ ہوگا، بلکہ اصل فرضیت ”فمن حج البيت من استطاع إلیہ سبیلاً“ (۳) کے حکم کے مطابق جس سال بھی ادا کرے گا حج ادا ہو جائے گا، کیونکہ اگرچہ بعض ائمہ کے نزدیک استطاعت ہوتے ہی پہلے ہی سال ادا کی جائے گی بھی فرض ہو جاتی ہے، مگر مفتی بقول میں پہلے ہی سال ادا کی جائے گی لازم نہیں رہتی، بلکہ بعد میں بھی جس سال ادا کرے گا حج ہو جائے گا، قضا کرنا نہ کہا جائے گا، خلاصہ یہ کہ اشہرج سے قبل محض عمرہ کر لینے سے اسی سال حج کا ادا کرنا فرض نہ ہوگا، پورا مسئلہ ذہن میں نہ آنے سے اس قسم کا خلط پیدا ہو جاتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، ۳۰/۱/۱۴۱۱ھ

۱- اگر ہوائی جہاز کے ذریعہ بغیر احرام باندھے جدہ پہنچے تو دم دینا ہوگا:

ہم لوگ سعودی عرب میں شہر جہاں میں کام کرتے ہیں، ہمارا ارادہ ہوا کہ عمرہ کر کے آئیں، ہمارا ایک عزیز جدہ

۱- سورۃ آل عمران: ۹۷۔

۲- سورۃ بقرہ: ۱۹۷۔

۳- سورۃ آل عمران: ۹۷۔

میں کام کرنا تھا، ہم ظہران سے بذریعہ ہوائی جہاز جدہ بغیر احرام باندھے ہوئے نچے اور جدہ میں ہم اپنے عزیز کے یہاں پہنچے، وہاں قریب ۵/۴ گھنٹہ ٹھہرے اور وہاں سے پھر ہم احرام وغیرہ باندھ کر مکہ معظمہ گئے اور وہاں جا کر ہم لوگوں نے عمرہ کیا، عمرہ کرنے کے بعد جب ہم لوگ جہیل آئے تو ہم نے سنا کہ چونکہ ہوائی جہاز ظہران سے جدہ میقات پر سے گذرتے ہوئے پہونچتا ہے، اس لیے ہم پر دم واجب ہوتا ہے، جب کہ ہمارا ارادہ پہلے اپنے عزیز سے ملنے کا تھا، اس کے بعد ہم لوگوں کا عمرہ کرنے کا ارادہ تھا، اس لیے پہلے تو ہمیں چند لوگوں نے بتایا کہ چونکہ تمہارا ارادہ اپنے عزیز سے ملنے کے بعد عمرہ کرنے کا ہے، اس لیے تم احرام جدہ سے پہلے بھی باندھ سکتے ہو۔

یہ لوگ جنہوں نے ہمیں پہلے اور بعد میں یعنی عمرہ سے پہلے احرام جدہ میں باندھنے کو اور عمرہ کے بعد دم واجب ہونے کو کہا یہ کوئی اچھے یعنی مولوی یا مفتی وغیرہ نہیں تھے، اس لیے اب ذہن نے یہ طے کر لیا کہ اس کا صحیح جواب معتبر علماء سے معلوم کیا جائے، برائے کرم بذریعہ ڈاک جواب دینے کی زحمت کو ارفہمائیں۔

۲۔ بحالت احرام اگر خود بخود بال ٹوٹ جائے تو کیا حکم ہے؟

میں نے حج قرآن کیا، جب میں عرفات کے میدان میں پہنچا تو شام کے قریب ۳ بجے تھے، چونکہ تکان پوری تھی اور میرے ساتھ ایک پتھری بھی تھی عرفات سے واپسی میں، یعنی نماز ظہر کے وقت امام صاحب کے ساتھ ظہر اور عصر ادا کر کے ہم لوگ جبل رحمت کے قریب گئے تھے۔

(اور وہاں سے فارغ ہو کر ہم لوگ واپس چلتے ہوئے میدان عرفات میں ٹھہر گئے تاکہ وقت غروب میں مزدلفہ کے لیے روانہ ہوں، وہاں تو شام کے قریب ۳ بجے تھے اور میں سر کو پتھری سے لگائے ہوئے یعنی پتھری کے سہارے اس طرح بیٹھا تھا کہ سر میرا پتھری کی اس جگہ تھا جہاں ہاتھ لگا کر پتھری کھولتے ہیں، ہوا یہ کہ اچانک ایک آدمی میرے پیچھے سے گذرا اور میں چونک گیا، اس اچانک چونکنے پر مجھے مسوں ہوا کہ میرے سر کے بال کچھ ٹوٹ گئے، اب جو پتھری کا وہ حصہ دیکھا تو اس میں ایک حصہ بال کا لگا ہوا تھا، یہ بال میں نے جان کر توڑائیں، آپ اس بارے میں بھی لکھیں کہ اس کے لیے مجھے کچھ کرنا ہو گا یا نہیں؟ یعنی دم یا کفارہ وغیرہ۔

۳۔ بیماری کی وجہ سے رمی میں نیابت :

میں نے حج کیا میں جب طواف زیارت یعنی ۱۰ تاریخ کو شیطان کو نکریاں مارنے اور قربانی کرنے کے بعد شام کو طواف زیارت کر کے آیا تو مجھے بخار ہو گیا اور میں ۱۱ تاریخ کو تینوں شیطانوں کو نکری مار کر آیا اور پھر جب ۱۲ تاریخ آئی تو

چونکہ بخار کی وجہ سے میری حالت بہت خراب تھی، مجھ سے چلنا دشوار ہو رہا تھا، میرے ساتھ میرا بھائی بھی تھا، جب میں کچھ دور چلا اور ساتھیوں نے دیکھا کہ اس سے چلنا دشوار ہے اور رش یعنی پبلک بھی تو پوری طرح ہے، انہوں نے کہا کہ اپنی کنکریاں بڑے بھائی کو دے دو یہ اپنی کنکریوں کے بعد تمہاری کنکریاں بھی مار دیں گے، انہوں نے ایسا ہی کیا، پہلے انہوں نے اپنی کنکریاں ماریں اور پھر بعد میں میرا نام لے کر میری طرف سے شیطانوں کو کنکریاں ماریں، اب لکھیں کہ اس بارے میں کفارہ وغیرہ دینا چاہیے یا نہیں؟

۴- کفارہ یا دم کہاں دینا ضروری ہے؟

ہم بمبئی جا رہے تھے، اتفاق سے جدہ ایک رات کے لئے رکے، ہمارا ارادہ ہوا کہ مکہ مکرمہ جا کر کم از کم طواف کر آئیں، چنانچہ ہم نے جا کر طواف کر لیا، کیا ہم نے صحیح کیا یا نہیں اگر نہیں تو کیا ہم کو اس صورت میں کفارہ ادا کرنا ہوگا؟
نوٹ: میں حنفی ہوں اگر آپ یہ لکھیں کہ ہم پر کچھ کفارہ یا دم واجب ہوتا ہے تو ہم وہ کفارہ یا دم اٹھایا جا کر ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ یا مکہ وغیرہ میں کرنا ضروری ہے۔ جزاکم اللہ خیراً انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا آخرت میں اچھا بدلہ دے گا۔

کلیل احمد (سعودی مریہ)

الجواب وبالله التوفیق:

۱- اگر آپ کا جہاز اتنی بلندی سے پرواز کرنا ہوا کہ میقاتی پر سے گزرا ہے کہ وہ زمین سے نظر نہیں آسکتا تو آپ پر کوئی دم دینا واجب نہیں ہے اور اگر آپ کا ہوائی جہاز اتنا نیچے نیچے پرواز کر کے گیا ہے کہ زمین پر سے نظر آسکتا ہے تو ایک دم دینا واجب ہوگا، دم دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک بھیڑ، یا دنب یا بکری خرید کر حرم شریف کی حد میں ذبح کر کے یا ذبح کر کے فقراء حرم پر صدقہ کر دے اور اس میں خود یا غنی کو نہ دے، ہوائی جہاز کے محکمہ سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ ہوائی جہاز کتنی بلندی سے پرواز کرتا ہے (۱)۔

۲- اس صورت میں آپ پر کوئی دم دینا واجب نہیں ہوا اور نہ ہی کچھ صدقہ دینا واجب ہے، البتہ آپ اگر احتیاطاً حیر آدھ پاؤ گیہوں وغیرہ صدقہ کر دیں تو بہتر ہے۔

۱- "فإن عليهما أي مكّي ومنع دما لمجاوزة ميقات المكّي بلا إحراق" (الدرع الثانی ۲۲۶، ج ۲)۔

۳- اس صورت میں بھی کوئی کفارہ دیا دم وغیرہ دینا لازم نہیں ہے (۱)۔

۴- سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ جھیل میقات سے باہر اتفاق میں ہے اور وہیں سے جدہ آئے اور بغیر احرام باندھے طواف کر آئے یہ غلط ہو گیا، احرام باندھ کر جانا ضروری تھا، پھر عمرہ طواف وغیرہ کرنا چاہیے تھا، ایک دم جنائیت دینا واجب ہو گیا، یعنی ایک بھیڑ یا بکری یا دنبہ خرید کر حرم میں ذبح کرنا اور اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے، نیز ایک عمرہ بھی احرام باندھ کر کرنا ضروری ہو گیا (۲)۔

نوٹ: ہم لوگ بھی سنی حنفی ہیں اور سب جو بات فقہ حنفی سے دیے گئے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

دم جنائیت کی ادائیگی حدود حرم میں ضروری ہے؟

(الف) سائل نے سابقہ فتویٰ (۱۳۳۹ الف) جواب ۹۶۰ الف کا حوالہ دیا ہے نیز تحریر کیا ہے کہ ہم لوگوں کو قربانی ادا یا نہیں بھی کرنا درست ہے یا یہاں پر ہی کرنا ضروری ہے جہاں پر ہم قیام پذیر ہیں مطلب صرف یہ ہے کہ ہم یہاں حصول معاش کے لئے آئے ہوئے ہیں اگر کوئی گنجائش ہو اور کوئی راستہ ہو تو تحریر کریں۔

کیوں کہ یہاں پر قربانی کرنے سے کافی خرچ آتا ہے اور ادا یا میں کم آئے گا، عمرہ کی قضاء ہم لوگوں نے کر لی ہے، مگر قربانی ابھی تک نہیں کی ہے، صرف آپ کی جانب سے جواب آنے کی دیر ہے، براہ کرم اگر کوئی گنجائش نکل سکتی ہو تو قرآن وحدیث کی روشنی میں مطلع فرمائیں۔

(نوٹ) اور اب سے تقریباً دو ماہ دس دن کے بعد حج آرہا ہے، لہذا اس وقت تو قربانی کرنا ہے، لہذا اگر کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی ہو تو کیا ایک ساتھ اذنت، گائے، وغیرہ وغیرہ میں جس جانور میں سات حصے ہوتے ہوں تو ایک ساتھ دو

۱- "ومن كان مريضاً لا يستطيع الرمي يوضع في يده ويومي بها أو يومي عده غيره وكذا المغمى عليه، ولو رمى بحصاين إحدهما لنفسه والآخرى للآخر جاز" (المحرر الرائق، ص ۳۱۵، ج ۲، باب الاحرام) (مرتب)۔

۲- "وكل شئ فعله القارن فعله دمان: دم لحجه، ودم لعمره، إلا أن يتجاوز الميقات غير محرم بالعمرة أو الحج فيلزمه دم واحد، لما ان المستحق عليه عدد الميقات إحرام واحد وبناخير واجب واحد لا يجب إلا جزء واحد" (هداية الولي، ص ۲۲۷، کتاب الحج) "ويجب أي الدم على من دخل مكة بلا إحرام لكل مرة" (الدر المختار على حاشي الشارح، ص ۳۲۲ ج ۲، کتاب الحج) (مرتب)۔

حصے کر سکتے ہیں، یعنی ایک قربانی توجح کی اور ایک قربانی عمرہ کی قضاء کی، آیا ان سب کی مجبوری میں گنجانش ہوگی؟ اگر کوئی گنجانش ہو تو تحریر کریں۔

الجواب وبالله التوفیق:

عمرہ میں غلطی کی وجہ سے یہ قربانی جواز میں آئی ہے اس قربانی کو دم جنایت کہتے ہیں اور دم جنایت والی قربانی کا حدود حرم میں ذبح کرنا واجب ہے، حدود سے باہر کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں ایسا کر سکتے ہیں کہ حج میں جو قربانی کی جاتی ہے اس میں بجائے بکرا دنبہ کے گائے یا اونٹ (ایسا جانور جس میں سات حصے ہوتے ہیں) خریدیں اور اس میں جتنے حصے چاہیں اس دم جنایت والی قربانی کے بھی رکھ لیں تو یہ جائز رہے گا (۱)، بلکہ یہ بھی کر سکتے ہیں ساتوں حصہ دم جنایت کا سات آدمیوں کے عمرہ کا ہو اور سب مل کر ایک گائے یا ایک اونٹ خرید کر ساتوں حصہ دم جنایت کی نیت سے ذبح کر دیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند بہار پور

حج کی قربانی کہاں کی جائے؟

ریڈیو کویت اور پاکستانی رسالہ ”اخبار جہاں“ سے معلوم ہوا کہ دوران حج قربانی منیٰ میں نہ کر کے اپنے ملک یا گھروں میں کر سکتے ہیں۔

حافظ مہدی حسن (پوسٹ بکس ۲۲۳ ریاض، سعودی عرب)

الجواب وبالله التوفیق:

یہ مسئلہ بھی غلط بتایا اور وجہ بھی غلط بتائی یا پھر ادھوری بات بتائی، مسئلہ اس طرح ہے کہ قربانی دو طرح کی ہوتی ہے: ایک قربانی تو وہ ہے جو صاحب نصاب مقیم پر واجب ہوتی ہے، خواہ حج کرنے جائے یا نہ جائے۔

۱۔ ”لو ذبح سبعة عن أضحية معة، وقوان واحصار وجزاء الصيد والحلق والعقيقة والنطوع فإنه يصح في ظاهر الأصول“ (ثانی ۵۷۳، مطبع زکریا)۔

اگر حاجی صاحب نصاب ہے اور مکہ مکرمہ یا مدینہ طیبہ کا مکین بھی پندرہ دن سے زیادہ قیام کی نیت کرے تو اس پر قربانی واجب ہو جائے گی، اس کے بارے میں اختیار ہے کہ چاہے تو مکہ مکرمہ میں یا مدینہ طیبہ میں یا گھر پر ہی کرنے کا انتظام کرے، یا اپنے وطن میں قربانی کے لیے رقم بھیج دے کہ وطن کے لوگ وطن میں اس کی طرف سے کر دیں اور اس قربانی کے بارے میں مذکورہ مصلحت سوچی جاسکتی ہے۔

اور دوسری قربانی حاجی پر بوجہ حج واجب ہوتی ہے، اس قربانی کا منی میں کرنا واجب ہے اس میں گوشت کے اضاعت وعدم اضاعت پر نظر نہ ہوگی، بلکہ اس میں صرف اراقہ دم شرعاً مطلوب ہے، اس میں مذکورہ مصلحت بیان کرنا غیر شرعی بات ہوگی، اسی طرح دم احصاء اور دم جنایت کا بھی حکم ہے، کہ اس کا بھی حدود حرم میں کرنا واجب ہوتا ہے، اس کے بارے میں بھی مذکورہ مصلحت صحیح نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پورے ۲۲/۲/۱۳۹۹ھ

منیٰ کی قربانیوں کا گوشت اور چمڑا قابل استعمال بنانے کی اسکیم:

ادارہ ہذا نے منیٰ کی قربانیوں کے جانوروں کے چمڑے، گوشت وغیرہ کو سائنٹفک طریقہ پر کارآمد بنا کر اس کی آمدنی سے مسلمانوں کی تعلیمی و معاشرتی پستی کی امداد کے لیے سفارت خانہ حکومت سعودی عرب، دہلی سے درخواست کی، معزز سفیر نے رابطہ عالم اسلامی کا نفرنس سے رجوع کرنے کی ہدایت کی۔

نیز حکومت ہند نے مذہبی موانعات کا جواز ظاہر کر کے اس میں حصہ لینے سے مجبوری کا اظہار فرمایا۔

ان حالات میں ہمارے اس منصوبہ کی تکمیل و کامیابی کے لیے آپ کی اصابت رائے اور فتویٰ کافی اہمیت کا حامل ہے، براہ کرم اس تعلق سے فتویٰ صادر فرما کر ممنون فرمائیں!

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ تو ظاہر ہے کہ قربانی کا گوشت و چمڑا قربانی کرنے والا خود استعمال کر ڈالے یا کسی غریب کو صدقہ کر دے یا کسی غنی کو تحفہ یا ہدیہ کر دے یہ سب جائز ہے (۱)، بشرطیکہ وہ واجب التصدق نہ ہو (جیسا کہ نذر کی قربانی یا میت کی طرف سے اس کی

۱- ”وینصنف بجلدہا لآلہ جزء منها أو يعمل منه الة يستعمل فی البیت کالطعم والجواب والعربال ونحوها“ (ھدایہ)

وصیت کے مطابق کی ہوئی قربانی یا دم جناہ (ورنہ اس کا حکم دوسرا ہوگا۔ پھر وہ غنی و غریب اس کا مالک ہونے کے بعد خود استعمال کرے یا کسی کو دیدے حتیٰ کہ چڑے کو اگر فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے مصرف میں صرف کر دے اس کا بھی اختیار اس کو حاصل ہے۔

ہاں قربانی کرنے والا اگر خود تجھے، ہدیہ یا صدقہ کرنے کے بجائے فروخت کر دے تو اس پر اس کی قیمت کا تصدق کرنا لازم ہوگا، یہی حکم منیٰ کی قربانی اور مناسک حج کے اخیر کا بھی ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ مناسک حج کا اخیر خالص اور اعلیٰ شعائر اسلامیہ میں سے ہے اور اس میں محض اظہار عقیدہ بشکل اراقۃ دم ہے، جیسا کہ حضور ﷺ کے کسی موقع پر سواونت اور کسی موقع پر سواونت کی قربانی کرنے سے ظاہر ہے، کیونکہ نفس و جوب اخیر تو ایک بکری یا اونٹ کے ساتویں حصہ سے بھی ادا ہو سکتا ہے۔

اور یہ اسکیمیں اگرچہ بظاہر خوشنمائی نہیں قدرے مفید بھی معلوم ہوتی ہیں مگر اظہار عقیدہ کے منافی ہیں اور اس مقصد کو فوت کرتی ہیں جو مشکوٰۃ نبوت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے طرز عمل سے ظاہر ہو رہا ہے، کیونکہ اس طرح کار بند ہونے پر بعد چندے یہ عمل (اراقۃ دم) محض ایک سیاسی، تجارتی، معاشی مقصد ہو کر رہ جائے گا اور اظہار عقیدہ ہو کر قلب موضوع، قلب مابیت اور مخ مذہب کا ذریعہ و سبب بن جائے گا، اس لیے اس اسکیم کو اختیار کرنا شریعت مطہرہ کے ایک اہم مقصد کو فوت کرنا ہے!

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پستی کے ازالہ کی اس سے آسان اور بے کھٹکے دوسری بہت سی صورتیں موجود ہیں اور ان میں سے یہ صورت بہت ہی آسان ہے کہ ایسا نیک چڑ بے رکھنے والے اگر خود صاحب نصاب نہ ہوں جب بھی اپنے گرد و پیش بسنے والے اغنیاء سے پوری پوری رقم زکوٰۃ ادا کرنے اور اس قسم کے پریشان حالوں کی پریشانی رفع کرنے میں کرائیں اور اگر خود بھی صاحب نصاب ہیں تو ان پر اور بھی حکم متوجہ ہے کہ اپنی رقم کی پوری پوری زکوٰۃ صحیح طریقہ اور ان مصارف میں صرف کر کے ایسے لوگوں کی پریشان حالی دور کریں اور دور کروائیں اور ان کا باقاعدہ نظم فرمائیں۔

اسی طرح حکومتوں کو بھی اس طرف متوجہ فرمائیں کہ احوال باطنیہ و ظاہرہ دونوں کی زکوٰۃ کا صحیح نظم اور صحیح استعمال ہونے لگے۔ نقطۃ اللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، پور ۲/۲/۱۳۹۹ھ

بدرجہ مجبوری خواتین کے لئے بحالت حیض طواف زیارت کا حکم:

۱- حیض کی وجہ سے عورت طواف زیارت نہیں کر سکتی یہاں تک کہ جہاز کے چلنے کا وقت آگیا اور وہ ابھی تک پاک نہیں ہوئی دور دراز مسافت اور قلتِ نفقہ وغیرہ کے سبب مکہ مکرمہ میں لوٹ کر آنا ممکن نہیں یا بہت متعذر ہے، اور ظاہر ہے کہ اس رکن کے ترک سے حج نامکمل رہتا ہے، یہاں تک کہ فقہاء حضرات نے لکھا ہے کہ واپس آکر طواف کرنا ہی پڑے گا۔ یہ مسئلہ کثیر الوقوع ہے اور آج کے حالات سفر میں ملکی قوانین کی رو سے اور زیادہ مشکل ہو گیا ہے، چونکہ متعین تاریخ پر جہاز کی روانگی ہے اور اس کے بعد کوئی دوسرا جہاز نہیں مل سکتا۔

نیز ویزا ابھی نہیں مل سکتا تا کہ قیام میں ذرا تاخیر ہو اور پھر واپس آنا بھی مشکل ہے، بہت سے لوگوں کو دوبارہ سفر نصیب نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو چند مہینہ یا چند سال کے بعد اتنی دراز مدت کے لیے الگ رہنا طواف رکن ادا نہ کرنے کی وجہ سے دشوار ہے، مسئلہ ہذا کے متعلق چند فقہی عبارات پیش کی جاتی ہیں:

(۱) "فی الشامی نقل بعض المحشین عن مسلک ابن امیر حاج: لو هم الركب علی القفول ولم تطهر فاستفتت هل تطوف أم لا؟ قالوا: يقال لها: لا يحل لك دخول المسجد، وإن دخلت وطفت أتممت وصح طوافك، فعليك ذبح بدنة وهذه المسئلة كثير الوقوع بتحير فيها النساء" (۱)۔

(۲) "فی المبسوط السرخسی وإن كان طاف للزيارة جنباً حتى رجع إلى أهله فإنه يعود إلى مكة ليحيط طواف الزيارة وإن لم يرجع إلى مكة فعليه بدنة لطواف الزيارة وعلي الحائض مثل ذلك، وليس عليها ترك الصدر شئ الخ" (۲)۔

(۳) "فی البحر الرائق: بعد قول الكنز: طاف للركن محدثاً بدنة لوجنباً ويعيد والإعادة هي الأصل مادام بمكة وأما إذا رجع إلى أهله ففي الحدث الأصغر اتفقوا إن بعث الشاة أفضل من الرجوع، واختلفوا في الحدث الأكبر فاختلفوا في الهداية أن يعود إلى الإعادة أفضل واختار في المحيط إن بعث الدم أفضل" (۳)۔

۱- ۱۸۲/۲

۲- مبسوط السرخسی ۳۱/۳

۳- البحر الرائق ۲۰/۳

(۴) ”فی الہدایۃ: وإن لم یعد وبعث بملذۃ أجزأہ لسا بینا أنه جابر لہ (أي بعد أن طاف للزیارۃ جنباً“ (۱)۔

(۵) ”وفی فتح القدیر: لو طاف المرأة للزیارۃ حائضاً فهو كطواف الجنب الخ“ (۲)۔
عبارت مرقومہ سے ظاہر ہے کہ جنبی یا حائضہ کا طواف صحیح ہو سکتا ہے، لیکن عدم اعادہ کی صورت میں منجر بالہد نہ ہو جاتا ہے اور عدم اعادہ کی صورت یہی ہے کہ وہ وطن لوٹ آئے۔

البتہ شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اثم کا ہونا بھی محقق ہے کہ بدنہ سے اس کا انجبار ہو جاتا ہے تو ہمارے مسئلہ میں جب ایسے قوی اعذار موجود محقق ہیں، کیا پھر بھی وہ عورت گنہگار ہوگی؟ حاصل یہ ہے کہ ان عبارات کے پیش نظر جو عورت حائضہ ہے اور بوقت روانگی جہاز اب تک پاک نہیں ہوئی وہ طواف رکن کر کے بدنہ ادا کر سکتی ہے یا نہیں؟ اور اعذار مذکورہ کی بنا پر اثم کا محقق ہوگا یا نہیں؟

کیا بحالت مجبوری رمی قربانی اور حلق کے درمیان کی ترتیب ساقط ہو جائے گی؟
عند الحنفیہ متمتع اور نثارن کے لیے یوم نحر میں ترتیب بین الرمی والذبح والخلق ہے، یعنی پہلے رمی جمرہ عقبہ پھر ذبح پھر حلق کرائے ترتیب میں تقدیم تاخیر یا تبدیل ہو تو دم واجب ہو جاتا ہے، یہ مسئلہ مسلم ہے کہ آج کے احوال کے پیش نظر ترتیب کا باقی رکھنا ایام حج میں مشکل ہے بلکہ نہایت ہی معذور ہے الا ماشاء اللہ، معذور ہونے کی یہ وجوہات ہیں:

(۱) بے حد ازدحام و ہجوم۔

(۲) مذبح کا قیام گاہ سے بہت دور ہونا یعنی منیٰ میں۔

(۳) گرمی کی شدت، ان تینوں باتوں کے سبب قیام گاہ سے مذبح تک جانا کو ممکن ہے مگر بہت دشوار ہے۔

(۴) وکلاء یعنی جو لوگ وکالۃ دوسروں کی طرف سے قربانی کرتے ہیں، اس میں بہت سی کوتاہیاں کرتے ہیں، کبھی رمی سے پہلے ہی قربانی کر دی یا حلق کے بعد ہی کر دی اور بعض غیر مقلد تو یوم نحر سے پہلے ہی قربانی کر بیٹھتے ہیں۔

(۵) جہالت عامہ کی بنا پر اکثر لوگ ان وکلاء پر اعتماد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ترتیب رمی، حلق و ذبح کے درمیان کوئی چیز ہی نہیں یا ان کو خبر ہی نہیں کہ ترتیب ٹوٹ گئی۔

۱- ہدایہ ۱/ ۲۷۳۔

۲- فتح القدیر ۴/ ۶۲ کتاب الحج۔

(۶) ضعیف و بوڑھے کے حق میں تو یہ اعذار قابلِ تریید ہیں۔

(۷) آج کل کوپن سے جو جانور خریدے جاتے ہیں ان میں بھی زیادہ وثوق نہیں، اس لیے کہ یہ حکومتِ سعودیہ کی طرف سے فروخت کئے جاتے ہیں اور غیر مقلدین کی بنا پر وہ بھی اس ترتیب کا لحاظ نہیں رکھتے، بعض لوگ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہماری قربانی ہوئی، یا نہیں ہوئی اب وہ حلق کب کرے، اگر کر لیا تو خلیجان اور شبہ ضرور رہے گا۔

(۸) خود مذبح میں یہ مشاہدہ ہوا ہے کہ لوگوں کے جھوم اور جانوروں کی کثرت کی بنا پر طبیعت گھبرا جاتی ہے، اور چوٹ لگنے کا بھی اندیشہ ہے، اور اوپر سے تین میل گرمی میں پیدل چلنا پڑتا ہے، اس موقع پر گاڑی ملنا بھی مشکل اور غریب لوگوں کے پاس کرایہ بھی نہیں ہوتا۔

لہذا ان وجوہات کے ماتحت ضرورت سمجھ کر کیا کسی حنفی کو حق ہے کہ اس خاص مسئلہ میں شوافع کے مسلک پر عمل کرے کہ ان کی کتابوں سے عدم وجوب ترتیب ظاہر ہے، تو مذہب شوافع پر عمل کرنے سے یہ سہولت ہوگی کہ اب کسی حاجی کو اس ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری نہ ہوگا اور کسی قسم کا خلیجان یا پریشانی نہیں ہوگی، اگر ضرورت سے قربانی پہلے کی گئی یا حلق پہلے اور قربانی بعد میں کی تو کچھ واجب نہیں ہوگا۔

اس ضروری امر میں حضراتِ علماء کرام سے رہنمائی مطلوب ہے۔

سراج احمد غفرلہ (جنوبی فریقہ، ۱۰ شعبان ۱۴۰۸ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ صحیح ہے کہ اگر کوئی طواف زیارت بالکل نہ کرے نہ بحالت طہارت نہ بحالت غیر طہارت بلکہ بالکل ترک کر دے اور وطن کو رجوع کر جائے اور میقات سے باہر تک پہنچ جائے تو جب تک جدید احرام کے ساتھ واپس آ کر طواف زیارت کا ارادہ نہ کرے، احرام حج سے باہر نہ ہوگا، اور مدتِ عمر تک عورت اس پر حلال نہ ہوگی، لیکن اگر طواف زیارت کر کے خروج عن المیقات کیا ہے خواہ حالت جنابت میں احرام جدید کے ساتھ واپس آ کر اعادہ تو افضل ضرور ہے لیکن اگر واپس نہ آئے بلکہ دم جنابت (بدنہ) بھیج دے تو بھی کافی ہو جاتا ہے، اور انجبار ہو جاتا ہے یعنی واپس آ کر طواف کرنا واجب نہیں رہتا ہے۔

اپنی پیش کردہ عبارت سے ذرا پہلے پڑھ لیجئے تو اس سے یہ مسئلہ واضح ہو جائے گا اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ مسئلہ کثیر الوقوع ہے اور آج کے حالاتِ سفر وغیرہ سے واپسی بسا اوقات دشوار ہو جاتی ہے۔

پھر شامی کی عبارت سے عورت کے گنہگار ہونے کا جو اشکال پیش کیا ہے، اس پر یہ عرض ہے کہ اس عورت کے فتویٰ لے لینے اور اس کا جواب لا مکمل دخول المسجد مل جانے کے باوجود مکہ میں رہتے ہوئے فتویٰ کے خلاف کر کے مسجد حرام میں داخل ہو گئی تو یہ معصیت لازم آئے گی کما اشارہ الیہ قول المفتی، وان دخلت و طافت ائمت۔

بہر حال خلاف فتویٰ داخل ہو کر اگرچہ گنہگار ہو گئی تو اس پر اس کا توبہ کرنا لازم ہوگا لیکن اس کا یہ طواف صحیح ہو جائے گا اور انجبار نقصان کے لیے ذبح بد نہ لازم ہو جائے گا اور جب توبہ و ذبح بد نہ کرے گی تو انجبار مکمل ہو کر معصیت بھی ختم ہو جائے گی۔ ”لأن التائب من الذنب کمن لا ذنب له او كما قال عليه الصلوٰۃ والسلام“ (۱)۔

یہ حکم ایسا ہے جیسا کہ نماز میں کسی واجب کے سہواً ترک ہو جانے پر ارتکاب معصیت ہو جاتی ہے اور جب سجدہ سہو کر لے تو اس سے انجبار ہو کر معصیت مرتفع ہو جاتی ہے، اسی طرح یہاں بھی حکم ہوگا، کیونکہ جس طرح ترک واجب سہواً میں سجدہ سہو منجر ہوتا ہے ایسا ہی یہ ذبح بد بھی منجر ہوتا ہے۔

اور فرق یہ ہوگا کہ نماز میں ترک واجب سہواً میں کوئی مذکر نہیں تھا، اس لیے معصیت نہ ہوگی اور یہاں فتویٰ مفتی مذکر موجود تھا، اس لیے معصیت اور اس پر توبہ کا حکم ہوگا۔

نیز آپ کی پیش کردہ عبارت ح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر حائضہ نے بحالت حیض طواف زیارت کر لیا مکہ میں رہتے ہوئے تو اس پر یہ حکم تھا کہ توبہ اور اعادہ کرے، یعنی دوبارہ بحالت پاکی طواف کرے، لیکن اگر اعادہ نہ کرے، اور وطن لوٹ آئے تو اعادہ کے لیے لوٹ کر آنا واجب نہیں رہتا، بلکہ صاحب ہدایہ کے نزدیک اگرچہ عودا لی لا اعادہ افضل ہے، لیکن صاحب محیط کے نزدیک صرف بد نہ (بدائے دم جنائیت) بھیج دینا افضل ہے، لہذا اگر عودا لی لا اعادہ کرے گی تو فضیلت ہوگی۔

نیز البحر الرائق کی عبارت اور شامی کے سیاق و سباق سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ بحالت حیض طواف کرنے کے بعد اگر مکہ میں رہتے ہوئے پاک ہو کر طواف کرنے کا موقع نہ ملے اور پاکی کے انتظار میں مکہ میں رہنا اختیار میں نہ رہے، مثلاً تانلہ اس کا چل دے گا یا اس کا جہاز چھوٹ جائے گا اس مجبوری سے بغیر اعادہ وطن چلی گئی تو حسب نص شرعی ”لا یمکلف اللہ نفساً إلا وسعها“ (۲) اس کے چلے جانے پر مواخذہ نہ ہوگا۔

۱- مشکوٰۃ المصابیح/ ۲۰۶۔

۲- سورہ بقرہ/ ۲۸۶۔

تقریب فہم کے لیے چند فقہی عبارات پیش کی جاتی ہیں:

(۱) ”وَأَمَّا تَرْكُ الْوَاجِبَاتِ بَعْدَ رَفْعِ الشَّيْءِ عَلَيْهِ، ثُمَّ مَرَادُ هُمْ بِالْعُذْرِ مَا يَكُونُ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى، فَلَوْ كَانَ مِنَ الْعِبَادِ فَلَيْسَ بِعُذْرٍ (إِلَى قَوْلِهِ) بِخِلَافِ مَا إِذَا مَنَعَهُ خَوْفُ الْإِزْدِحَامِ فَإِنَّهُ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ“ (۱)۔

(۲) ”وَفِي الشَّامِيَةِ: إِنْ تَرَكَ الْوَاجِبَ بِعُذْرِ مَسْقُطٍ لِلْدَّمِ“ (۲)۔

(۳) ”وَتَجُوزُ أَيْ النِّيَابَةُ فِي الرَّمْيِ عِنْدَ الْعُذْرِ“ (۳)۔

(۴) ”وَلَوْ طَافَ الْمَفْرُودُ وَغَيْرُهُ قَبْلَ الرَّمْيِ وَالْحَلْقُ لَا شَيْءَ عَلَيْهِ وَيَكْرَهُ لِتَرْكِ السَّنَةِ“ (۴)۔

(۵) ”وَلَيْسَ أَنْ يَبِيتَ بِمَنْبَى لِيَالِي أَيَّامِ الرَّمْيِ، فَلَوْ بَاتَ بِغَيْرِهَا مُتَعَمِّدًا كَرَهُ وَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ“ (۵)۔

(۶) جو شخص کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہو یا جمرات تک پیدل یا سوار ہو کر آنے میں سخت تکلیف ہو یا مرض پڑھ جانے کا یا مرض پیدا ہو جانے کا قوی اندیشہ ہو تو وہ معذور ہے (۶)۔

(۷) اگر معذور کا عذر دوسرے سے رمی کرانے کے بعد یا رمی کے رہتے ہوئے زائل ہو جائے تو بھی دوبارہ خود رمی کرنا ضروری نہیں رہتا (۷)۔

(۸) ذبح میں نیابت کا ثبوت عام اور شائع ہے، جیسا کہ آپ کی پیش کردہ عبارت ص ۷ سے بھی اخذ ہوتا ہے۔ ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ ترتیب بین الرمی والذبح واجب ہے لیکن عذر شرعی کی وجہ سے اگر چھوٹ جائے یا ٹوٹ جائے اور اس پر عمل نہ ہو سکے تو اس پر دم جنائیت وغیرہ یا کوئی وزریا کفارہ وغیرہ نہ آئے گا بلکہ ادائیگی حج بلا کر اہت مکمل ہو جائے گی۔

اور جناب کے ذکر کردہ اعذار مذکورہ میں ۱۔ کے عذر کا میسج للترک ہونا تو ظاہر ہی ہے اور باقی غیروں میں بھی ایسا

۱- غیۃ الناسک فی غیۃ المناسک ۱۳۸۔

۲- ۲۰۶/۲۔

۳- غیۃ ۱۰۰۔

۴- شرح مسلک ۱۵۵۔

۵- غیۃ ۹۵۔

۶- زبدۃ المناسک ما قبل من الباب ۱۶۵۔

۷- زبدۃ المناسک ۱۶۶۔

شخص جو ضعیف و بوڑھا ہو یا اتنی لمبی مسافت تک چلنے کا عادی نہ ہو اور شدید گرمی و دھوپ میں چلنے میں ظن غالب ہو کہ بیمار ہو جائے گا یا مرض بڑھ جائے گا یا چوٹ وغیرہ نا قابل تحمل پیدا ہو جائے گی اور سواری نہ ملے گی تو اس کے حق میں یہ ترتیب واجب نہ رہے گی بلکہ محض حسب استطاعت امتثال کا حکم رہے گا، اور وہ اعذار کی وجہ سے اپنے نائب کے ذریعہ رمی و ذبح دونوں کرا سکے گا، اور نائب کے ذریعہ کرانے کے بعد خود غزرمیخ زائل ہو جائے جب بھی دوبارہ خود عمل کرنا اس پر لازم نہ رہے گا۔

اور سچ، سچے میں احتیاط سے کام لینے کا حکم متوجہ ہو جائے گا، مثلاً اپنی جماعت و گروہ سے جو متدین اور محتاط ہو اور اس امر پر قادر ہو اور اس سے یہ ظن غالب ہو کہ صحیح و کالت و نیابت انجام دے دے گا تو اس سے یہ کام کرایا جائے اور اس کو ہدایت کر دی جائے کہ قربانی سے فارغ ہو کر جلد سے جلد اطلاع کرے، پھر جب تک اچھی طرح مقررہ وقت کے ساتھ قربانی ہو جانے کا ظن غالب نہ ہو جائے حلق نہ کرائیں، البتہ طواف و حلق میں نیابت درست نہ ہوگی۔ نیز طواف زیارت کا ان سب چیزوں کے بعد ہونا واجب نہیں ہے، بلکہ صرف سنت ہے کما فی العبارة الرابعة۔

اس لیے طواف زیارت کا ان چیزوں سے پہلے کر لینا علماء نے صرف مکروہ لکھا ہے اور کوئی دم یا صدقہ وغیرہ لاگو ہونا نہیں لکھا ہے، خاص کر ایسی مجبوری کی حالت میں کراہت بھی نہ ہوگی، لہذا ایسی معذوری کی حالت میں اگر باسانی ہو سکے تو خود طواف کے لیے چلا جائے اور طواف کرے، اور پھر قربانی ہو جانے کی اطلاع مل جائے تو حلق کرائے حلق کرا لینے کے بعد عورت بھی حائل ہو جائے گی۔

اور جب ان تمام مسائل میں بوقت معذوری فقہ حنفی سے بھی مذکورہ گنجائش نکل آتی ہے تو اب تقلید حضرت امام شافعی کرنے کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پور ۱۱/۹/۱۳۰۸ھ

عمرہ میں بال قصر کرانے کی مقدار (سر کے ایک طرف کا بال کٹانا درست نہیں):

احمدہ سعودی عرب میں مقیم اکثر حضرات فرصت اور چھٹی کے دنوں میں بیت اللہ شریف جا کر ایصال ثواب کے لئے اپنے خاندان کے مرحومین کی طرف سے عمرہ ادا کرتے ہیں، عمرہ میں طواف اور سعی کے بعد بالوں کو ترشوانے یا قصر کروانے کا شرعی حکم کیا ہے؟ کتنی مقدار میں بال نکلوانے چاہیے جبکہ حسب ذیل صورتیں واقع ہوں:

۱۔ ایک شخص کے کافی لمبے بال ہوں۔

۲- ایک شخص کے مختصر سے بال ہوں۔

۳- ایک شخص کے مکمل صاف ہوں۔

مندرجہ بالا صورتوں میں ایک ہی حکم کا اطلاق ہوگا یا علیحدہ صورتیں ہیں۔

۲- کیا ایک شخص مسلسل عمرہ کر کے $\frac{1}{2}$ کے حساب سے چار عمروں میں اپنا سر صاف کروا سکتا ہے؟ جبکہ بعض فقہ کی کتب میں یہ بات درج ہے کہ حضور ﷺ نے اس طرح کے عمل کو سخت ناپسند فرمایا ہے اور بجائے مسلسل عمرہ کے طواف کی فضیلت بتلائی ہے، براہ کرم اس سلسلہ میں شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

سو۔ سعودی، مصری، سوڈانی، اور یمنی حضرات بعد سعی کے چاروں طرف سے مختصر سے بال قینچی سے نکال لیتے ہیں، ان میں اکثر ثنائی مسلک کے ہیں، اگر ایسی سہولت دوسرے مسلک میں ہو تو کیا اسے حنفی مسلک والے اپنا سکتے ہیں یا نہیں؟ براہ کرم اس سلسلہ میں رہنمائی فرمائیں۔

محمد نور اللہ شریف (پوسٹ بکس ۲۰۹ جدہ سعودی عرب)

الجواب وبالله التوفیق:

۱۔ قرآن پاک میں ہے: ”مُحَلِّقِينَ رُؤُسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ“ (۱)، محلقین رؤس پورے سر کے بال کٹانے والے کو کہتے ہیں، نیز حدیث پاک میں مثلاً مسلم شریف میں سر کا کچھ حصہ موڈ انا اور کچھ چھوڑ دینا اس طرح کچھ حصہ کا بال کٹانا اور کچھ حصہ کا بال چھوڑ دینا منع ہے (۲)، اس لئے آیت کریمہ اور احادیث کی روشنی کے بعد یہی حکم دیتے ہیں کہ یا تو پورے سر کا حلق کرائے یا پورے سر کا قصر کرائے اور اگر سر پر بال ہی نہ ہوں خواہ موڈ لینے سے یا بال پیدا نہ ہونے یا جھڑ جانے سے تو سر پر ہلکے ہاتھ سے محض استرا پیھروالیں اس طرح پر کہ جلد کو نقصان نہ پہنچے (۳)، غرض آیت کریمہ اور

۱- ”لقد صدق الله رسوله الرؤيا بالحق، لقد دخلن المسجد الحرام إن شاء الله أميين محلقين رؤسكم ومقصرين لا تخافون ط فاعلم ما لم تعلموا فجعل من دون ذلك فصحا قريبا“ (سورة الفتح: ۲۷)۔

۲- ”دافع عن ابن عمر أن رسول الله صلى الله عليه وسلم يهي عن القزع قال: قلت لدافع وما القزع؟ قال: يحلق بعض رأس الصبي ويترك بعض“ (مطبع صحيح الطائفة مسلم كتاب اللباس باب كراهية القزع ۲/ ۲۰۳، ابن ماجه ۲/ ۵۹، مکتبہ تھانوی)۔

۳- ”لو لمّا إذا كان لم يكن (أي الشعر) أجوى المومسي على رأسه لأنه إذا عجز عن تحقيق الحلق فلم يعجز عن التلبس بالحلقين وقد قال النبي صلى الله عليه وسلم من تشبه بقوم فهو منهم“ (درائع كتاب الحج بيان الحلق والتقصير: ۲)۔

احادیث مرفوعہ کی متابعت میں تینوں صورتوں کا یہی حکم ہے البتہ عورت کو مردوں کی مشابہت جائز نہیں ہے (۱)، اس لئے عورتوں کا بال مونڈ دینا یا سارے بال منڈا دینا جائز نہیں بلکہ چوٹی کی اجتناء سے صرف دو تین انگلی بال کٹوالیہا کافی ہے (۲)۔

۲- حنفیہ کے نزدیک یہ صورت جائز نہیں ہے۔ آیت کریمہ اور احادیث صحیحہ کے خلاف ہے بلکہ وہ طریقہ ہے جو اوپر مذکور ہوا، طواف و عمرہ میں کون زیادہ افضل ہے اس میں تفصیل ہے عمرہ تو عمر میں صرف ایک مرتبہ بشرط استطاعت و قدرت واجب ہے (۳)، اور طواف زیارت فرض عین ہے اس لئے یہ طواف تو یقیناً عمرہ سے افضل ہے، باقی نفل طواف اور نفل عمرہ میں بعض علماء نے کہا ہے کہ طواف افضل ہے مگر قول محقق آفاقی کے لئے یہ ہے کہ عمرہ میں جتنا وقت لگتا ہے اگر اس تمام وقت کو طواف نفل میں مشغول رکھے تو یہ طواف بے شک عمرہ سے افضل ہے ورنہ عمرہ افضل ہے اور پانچ دنوں (۹ ربی الحجۃ ۱۳ ربی الحجۃ) میں عمرہ کرنا ممنوع اور مکروہ ہے (۴)، باقی اور تمام سال ان میں حنفیہ کے نزدیک عمرہ کرنا آفاقی کے لئے مستحب ہے جب موقع ملے اور جتنا موقع ملے عمرہ کر سکتا ہے اور افضل ہے، البتہ حضرت امام مالکؒ کے نزدیک سال میں صرف ایک مرتبہ عمرہ کر سکتا ہے (۵)، اور حنفیہ کے علاوہ دیگر ائمہ کے نزدیک کچھ بحث ہے کما اشار إلیہ ابن عابدین بقولہ:

- ۱- "عن ابن عباس قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم المنهيات بالرجال من النساء والمنهيات بالنساء من الرجال" (ترمذی ابواب الاستیذان والادب باب ما جاء فی کراهیة التمهيات بالرجال من النساء ۱۰۶/۲، مکتبہ اشرفیہ دہلی)۔
- ۲- "عن عائشة ان النبي صلى الله عليه وسلم ليهي ان تحلق المرأة رأسها" (ترمذی ابواب الحج باب ما جاء فی کراهیة الحلق للنساء ۱۸۲/۱)، "وعن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لبس على النساء حلق إلما على النساء التقصير، وقال في البدل والتمن التقصير فإنه بقدر المدة قال النبو كالي فيه دليل على ان المشروع في حقهن التقصير وقد حكى الحافظ الاجماع على ذلك" (بذل المجمود فی حل ابوداؤد کتاب الحج باب الحلق والتقصير ۱۸۲/۳، مکتبہ اشرفیہ)، "قال في البدائع لأن الحلق في النساء مغلبة ولهذا لم نفعله واحدة من نساء رسول الله صلى الله عليه وسلم ولكنها تقصر فاختد من اطراف شعرها قدر المدة لكن اصحابنا قالوا: يجب أن يزيد في التقصير على قدر الالمدة لأن الواجب هذا القدر من اطراف جميع الشعر واطراف جميع الشعر لا يساوي طولها عادة بل تفاوت، فلو قصر قدر الالمدة لا يصير مستوفيا قدر الالمدة من جميع الشعر بل من بعضه، فوجب ان يزيد عليه حتى يسبقن باسماء قدر الواجب فيخرج عن العهدة بيقين" (بدائع کتاب الحج باب حكم الحلق ۳۲۹/۳-۳۳۰، مکتبہ زکریا)۔
- ۳- "قال أصحابنا: إليها واجبة كصدقة الفطر والأضحية والوتر ومنهم من أطلق اسم السدة، وهذا الإطلاق لا ينافي في الواجب وشرائط وجوبها فهي شرائط وجوب الحج لأن الواجب ملحق بالفرض في حق الاحكام" (بدائع کتاب الحج واجبة الحرة ۲۷۸/۳-۲۷۹، مکتبہ زکریا)۔
- ۴- "وعند أبي حنيفة يكره العمرة في خمسة أيام، يوم عرفة، والنحر، وأيام التشريق" (عمدة القاري شرح بخاري، كتاب الحرة جلد ۱/۳۰۱، مکتبہ زکریا)۔
- ۵- "وقال مالك وأصحابه: يكره أن يعتمر في السنة الواحدة أكثر من عمرة واحدة" (عمدة القاري شرح بخاري كتاب الحرة

ونظيره ما أجاب العلامة القاضي ابراهيم بن ظهيره المكي حيث سئل هل الأفضل الطواف أو العمرة، من أن الأرجح تفضيل الطواف على العمرة إذا شغل به مقدار زمن العمرة (شامی ۲ تحت مطلب العمرة أفضل من الطواف وهو أفضل من العمرة)۔ باقی امام ابوحنیفہ کا مسلک اوپر لکھ دیا گیا کہ پانچ مذکورہ دنوں کے علاوہ ہمیشہ عمرہ کرنا مستحب ہے۔

۳۔ سعودی، مصری، سوڈانی وغیرہ جو کرتے ہیں کہ مختصر بال چاروں طرف سے کٹوا لیتے ہیں، پورے سر کا نہ تو حلق کراتے ہیں نہ قصر کراتے ہیں آیت کریمہ اور احادیث کے مطابق نہیں ہے، بلکہ خفیہ کے نزدیک وہی طریقہ ہے کہ اگر منڈانے کے بعد سر پر بال نہ رہیں تو بار بار نرمی سے استرہ پھیروالیں اور بس۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اگر کوئی شخص ارکان حج کی ادائیگی کے بعد حلق و قصر نہ کراتا ہو؟

۱۔ ایک صاحب چھ ۶ سال سے ریاض میں مقیم ہیں ہر سال حج بھی کرتے ہیں اور ممکن ہے دوران سال کبھی عمرہ بھی کرتے ہوں بد قسمتی سے حلق یا قصر نہیں کرتے زیادہ سے زیادہ چار پانچ جگہ سے چٹکی چٹکی بال قیچی سے کاٹ لئے وہ کہتے ہیں کہ یہاں کے علماء کا فتویٰ ہے کہ پہلے حج کے بعد حلق یا قصر ضروری نہیں حج کے دو تین ماہ بعد یا جب ضرورت ہو جہاں بھی ہو تو بال کٹواتے ہیں اب اگر وہ تلافی مکافات پر آمادہ ہو تو کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ ان کے سابقہ حجوں کی تکمیل صحیح طریقہ پر ہو جائے اور گناہ بھی معاف ہو جائیں، اس سال بھی حج کے لئے ایسا ہی کیا، لیکن ۱۵ پندرہ ذی الحجہ کو اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ حدود حرم میں جا کر حلق یا قصر کے بعد بکری یا بھیڑ ذبح کرنا ہوں اگر وہ ایسا کر لے تو کیا اس سال حج صحیح ہو جائے گا، ایسا شخص حلق یا قصر کر کے حلال نہیں ہو واجب احرام کی پابندیوں سے باہر نہیں۔

الف۔ تو کیا سلعے ہوئے کپڑے پہنیں، واڑھی منڈانے، ناخن کٹوانے اور خوشبو لگانے، میل صاف کرنے، بیوی کے پاس جانے کی وجہ سے جنایات کے ارتکاب کی بنا پر اس کی جزا ادا کرنے کا پابند ہے؟

ب۔ جزاء کی مقدار (دم یا صدقہ) کیا ہوگی؟

ج۔ اگر صدقہ واجب ہو تو اپنے وطن میں مساکین کو دے سکتا ہے یا حرم شریف کے اندر دینا ضروری ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

اگر سر پر بال باقی نہ رہیں تو صرف استرہ پھیر لینا یا پھیر لینا بھی کافی ہو جائے گا (۱)، اور قنجر جڑ سے کاٹنا ضروری نہیں رہتا بلکہ ایک انگلی یا اس سے زیادہ لمبا کاٹنا کافی ہو جاتا ہے (۲)، سالہائے گذشتہ کی ان غلطیوں سے چھٹکارے کے لئے یہ کرے کہ میقات سے احرام باندھ کر آئے اور طواف بیت اللہ کر کے دم دیدے یعنی قربانی کر دے اور اصل تو یہ ہے کہ جتنی مرتبہ ایسی غلطی کی ہے سب کے لئے الگ الگ دم دیدے اگر اتنی قدرت نہ ہو تو جتنے دم کی قدرت ہو ان کے دم دیدے یا کم از کم ایک دم دیکر بقیہ کی تلافی کے لئے توبہ واستغفار کرے اور سال کے اندر کی غلطیوں کے لئے ہر ایک کے عوض میں ایک دم دینا واجب ہے پس اس سال جو غلطی کی ہے اس میں میقات سے احرام باندھ کر طواف کر کے دم دینا واجب ہے پھر ہر دم میں ایک بھیر یا بکری کا حرم کے حدود میں ذبح کرنا لازم ہے (۳)، اس طریقہ سے حج صحیح ہو جائے گا اور اگر خود جا کر ایسا نہ کر سکے تو دم کی قیمت بھیج کر حرم میں قربانی کر دے حرم کے باہر قربانی کا اعتبار نہ ہوگا۔

الف: ہاں ان صورتوں میں جزا ادا کرنے کا پابند ہے۔

ب: جزا کی مقدار دم ہے۔

ج: صدقہ حرم شریف میں خود دینا یا کسی کے ذریعہ بھیج کر وہاں ہی دینا واجب ہے جنایت کا دم یا صدقہ جو بھی ہو اس کو حرم میں دینا واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- بحالت احرام بنیان یا سلی ہوئی چادر پہننے کا حکم:

کیا بنیان پہن سکتا ہے، نہ بندیا احرام کی چادر کہیں پھٹی ہو تو کیا سل کر باندھ سکتا ہے یا نہیں؟

۲- ارکان چھوٹے یا ترتیب میں تقدیم و تاخیر کا حکم:

کوئی نیک چھوٹ گیا یا ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہو گئی تو کیا قرآن کی حالت میں وقربانی کرے یا ایک کرے؟

۱- "من لم یکن علی رأسہ شعر فعليه ان یمر المومسی علی رأسہ" (ہدایہ ۱/ ۲۵۰، مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

۲- "والنقصیر ان یأخذ من رؤس شعرة مقدار الاملعة" (ہدایہ ۱/ ۲۵۰، مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

۳- ہدایہ بالغ المکعبہ، سورۃ المائدہ ۹۵۵۔

۳۔ بحالت احرام خون نکلنے سے کیا دم واجب ہوگا؟

احرام کی حالت میں مرض کی وجہ سے ڈاکٹر نے سوئی لگائی جس سے قدرے خون نکلا تو کیا دم واجب ہوگا، ایسے ہی اگر مسواک کیا جس سے دانتوں سے خون نکلا تو کیا واجب ہوگا؟

۴۔ قرآن کے حج کا احرام باندھنے والے کے لئے عمرہ کرنا:

قرآن کے حج کا احرام باندھنے والا مکہ میں جا کر عمرہ کرے گا، پھر احرام کے ساتھ مکہ میں مقیم رہے گا پھر نفل طواف کرتا رہے اسکے بعد آٹھ ذی الحجہ کو منیٰ جائے پھر وہاں سے عرفات جائے پھر مزدلفہ آ کر رات گزارے پھر ذی الحجہ کو آ کر کنکری مارے اور قربانی کرے اور حجامت بنوا کر زیارت کرے اور سعی صفا و مروہ کرے پھر منیٰ جائے اور ۱۱-۱۲ ذی الحجہ کو قیام کر کے کنکریاں مار کر واپس آئے اور طواف الوداع کر کے مکان ہندوستان آئے تو کیا اس صورت میں حج مکمل ہو گیا؟

الجواب وبالله التوفیق:

۱۔ بنیان پہننا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں آستین ہوتی ہیں اور آستین میں ہاتھ ڈال کر پہننا منع ہے جس پر جزا لازم ہوگی، احرام کی سلی ہوئی چادر پہننا جائز ہے لیکن ترک اولیٰ ہے۔

۲۔ قرآن کی حالت میں بھی ایک جنائیت پر ایک ہی دم واجب ہوگا۔

۳۔ دونوں صورتوں میں کوئی جزا لازم نہیں، خون کا نکالنا منظور احرام نہیں، جیسے قصد لیما، مسواک کرنا ہر حالت میں سنت ہے۔

۴۔ یہ ترتیب صحیح ہے، اس سے حج مکمل ہو گیا، کوئی نسیک نہیں چھوٹا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمد جمیل الرحمن سید، احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/۸/۱۳۸۵ھ

عمرہ کے احرام کی چادر کا کفن میں استعمال:

عمرہ کے لئے جو دو کپڑے استعمال کرتے ہیں وہ کیا مرنے کے بعد کفن میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

محمد شفیع (الجزب سعودی عرب)

الجواب وباللہ التوفیق:

عمرہ میں جو دو ۲/ کپڑے استعمال ہوتے ہیں ان کو کفن میں بلاشبہ استعمال کرنا جائز ہے، بلکہ ان کا کفن میں استعمال کرنا افضل ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

باب الحج عن الغير

حج بدل کے لئے آمر کے نفقہ اور اس کے وطن سے جانا ضروری ہے؟

ایک صاحب استطاعت اور صاحب نصاب میاں بیوی نے ۱۹۷۶ء میں حج کے لیے درخواست دی تھی، مقدر کی بات اس سال قمری اندازی میں نام نہیں آیا، بینک ڈرافٹ جو حج کمیٹی بمبئی نے واپس کر دیا تھا وہ بینک میں محفوظ کر دیا۔ پھر ہوا یہ کہ ان بی کے ایک بیٹے نے والدین کے بغیر علم و اطلاع کے ایک درخواست حج کے لیے دی تھی تاکہ حج کے بعد ملازمت مل جائے تو اختیار کر لیں، بیٹے کا نام قمری میں آنے اور اپنا نام نہ آنے پر بڑے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جن لوگوں پر حج فرض ہے ان کا نام قمری میں نہیں آیا، لیکن جو حج کے عنوان پر ملازمت کرنا چاہتے ہیں ان کا نام آگیا، دوسرے سال صاحب موصوف کو موتیا بند کا آپریشن ہونے والا تھا، اس لیے آپریشن بعد آئندہ سال یعنی تیسرے سال حج کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، اسی عرصہ میں صاحب موصوف کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔

چوتھے سال وہ خود طویل رہنے لگے جس کی وجہ سے دوبارہ حج کے لیے درخواست نہیں دی جاسکی۔

صاحب موصوف نے دوران علالت ان دو بیٹوں میں سے جو مدینہ منورہ میں ملازمت کے سلسلہ میں مقیم ہیں، ان میں سے ایک کو خط لکھا کہ میری صحت دن بدن علالت کی وجہ سے گرتی جا رہی ہے، تم اپنے بھائی سے کہہ دو کہ وہ میری طرف سے حج بدل کر لیں اور اس کے اخراجات تم خود اپنے پاس سے ادا کر دو۔

چنانچہ ایک بیٹے نے والد کی اجازت سے حج کر لیا، صاحب موصوف کا انتقال ہو گیا ہے، اب ان کے بیٹوں کا کہنا ہے کہ مدینہ منورہ میں رہنے والے بیٹے نے حج بدل کر لیا ہے اب پھر حج بدل کرانے اور کرنے کی ضرورت نہیں۔

لیکن دیگر عزیز و اقارب کا کہنا ہے کہ جس کا حج بدل ہوا اس کی طرف سے دوسرا حج بدل کرنے والا شخص اس کے وطن سے حج بدل کو جائے۔ اب سوال یہ درپیش ہے کہ صورت مذکورہ میں حج بدل ہوا کہ نہیں، اگر نہیں ہوا ہے تو پھر حج بدل کرنے والا شخص صاحب موصوف کے وطن سے ہی حج کے لیے سفر کرے، اور کیا یہ بھی ضروری ہے کہ صاحب موصوف کے چھوڑے

ہوئے مال ہی سے حج بدل پر خرچ کیا جائے۔

سید میر حسن (مکان ۵۶ ج ۱ کلاس جدید، جدید حیدرآباد)

الجواب وبالله التوفيق:

زندگی میں حج بدل کرانے کے لئے ضروری ہے کہ جس کی طرف سے حج بدل کرنا ہو اس کے نفقہ سے اور اسی کے وطن سے کیا جائے: ”ومن شرائط النفقة من مال الأمر كليها أو أكثرها ، قال الشامي: قال في البحر: وبهذا علم أن اشتراطهم أن تكون النفقة من مال الأمر احترازاً عن التبوع، لا مطلقاً الخ“ (۱)۔

صورت مسئلہ میں ایسا نہیں ہوا ہے، اس لیے از روئے قیاس جلی تو یہ حج بدل جس کو لڑکوں نے اپنے پیسے سے باپ کے حکم کی بنا پر اور صرف مدینہ طیبہ سے کر دیا کافی نہ ہوگا، البتہ از روئے استحسان و قیاس خفی اور مطابق حدیث شعمیہ رضی اللہ عنہا امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں (۲)۔

بہر حال لڑکے کا یہ حج کر دینا لغو و بے کار نہیں ہوگا، بلکہ تقرب الی الاجابۃ والقبولۃ ہوگا، مرنے کے بعد مورث کے تہائی مال سے اور اس کے وطن سے حج بدل کرنا اس وقت واجب ہوتا ہے جب مرنے والے پہ حج فرض رہا ہو اور وہ وصیت بھی حج بدل کروانے کی کر جائے اور یہاں یہ بھی نہیں ہے، یعنی موصی نے اپنے مرنے کے بعد حج بدل کرانے کی وصیت نہیں کی ہے، اس لیے وارثین پر حج بدل کرنا واجب نہیں ہے۔

البتہ اگر وارثین اپنے طور پر خود والدین کی جانب سے حج کر دیں یا کرا دیں تو بڑی فضیلت اور ثواب کا کام ہوگا اور والدین پر سے سقوط فرض بھی ہو جائے گا (۳)۔

۱- فتاویٰ ثنائی ۲/۲۳۰ کتاب الحج۔

۲- ”ثم ظاهر المذهب أن الحج يقع عن المحجوج عنه يعني (مروءة) الك نشهد الأخبار الواردة في هذا الباب، فإنه صلى الله عليه وسلم قال للخنعمية: رضي الله عنها حين قالت: إن أبي شيخ كبير لا يستطيع أن يمسك علي الراحلة أفجزيني أن أحج عنه؟ قال: نعم حجني عن أبيك واعصري“ (فتح القدير، ص ۶۶ ج ۳ باب الحج من أهر فان كان على أحد هاج لفرض وأوصى به لانه نقط عن خبر الوارث عن مال نفسه)۔

۳- ”وإن لم يوص به لبرع الوارث عنه بالأحجاج أو الحج بنفسه، قال أبو حنيفة رحمه الله: يجزيه إن شاء الله تعالى، لقوله عليه السلام للخنعمية: أرايت لو كان علي أبيك دين؟ الخ“ (ثنائی، ص ۲۳۵ ج ۲ کتاب الحج)۔

حاصل کلام یہ نکلا کہ لڑکے اگر اب حج بدل نہ کرائیں تو ان پر کوئی گرفت نہیں، البتہ جب اللہ نے موقع میسر فرمایا ہے تو والدین میں سے ہر ایک کی جانب سے حج پھر کر ڈالیں مزید فضیلت اور اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہارپور

حج بدل کرنے والا امر کی اجازت کے بغیر تمتع کر سکتا ہے یا نہیں؟

- ۱- حج بدل کرنے والا تمتع کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور اس مسئلہ میں باذن لامر اور بغیر اذنہ دونوں کا حکم یکساں ہے یا اذن کے بعد کر سکتا ہے، اگر اذن کے بغیر کر سکتا ہو تو جس صورت میں حج عن المیت کیا جا رہا ہو، ورثہ کی اجازت کیا اس حج کے لیے جانے والے شخص کے لئے کافی ہو جائے گی یا نہیں؟
- ۲- اور یہ حج بوضیعت حج یا تفرع وارث ہو اس مسئلہ میں دونوں کا ایک حکم ہوگا یا مختلف؟ براہ کرم سب صورتوں کا واضح جواب مرحمت فرمایا جائے تاکہ سمجھنے میں خلجان نہ ہو۔

الجواب وبالله التوفیق:

۱- حجوج عنہ امر پر اگر حج فرض تھا اور بوجہ معذوری خود نہیں جاسکتا ہے بلکہ اپنی نیابت میں کسی کو حج بدل میں بھیجنا چاہتا ہے تو اس صورت میں حج بدل کے صحیح ہونے کے لیے بیس سے زائد شرطیں ہیں، جو باب المناسک وغیرہ میں تفصیل سے مذکور ہیں:

مجموعہ ان کے جو شرطیں مامور حج بدل کے لیے جانے والے شخص سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں:

الف: جب تک حجوج عنہ (امر) مامور کو حج قراں یا تمتع کی اجازت نہ دیدے، مامور کو حج قراں یا تمتع کرنا جائز نہ ہوگا، اگر کرے گا تو حج بھی امر کا نہ ہوگا بلکہ مامور کا ادا ہوگا اور اس صورت میں مامور پر ضمان لازم آئے گا، جو حج بدل کے لیے گیا ہے (۲)۔

ب: اور اگر امر حجوج عنہ نے قراں اور تمتع کی اجازت دے دی ہے خواہ مجملاً ہی دی ہو، مثلاً بایں طور کہ تم کو اختیار

۱- ”من حج عن أبه فقد قضی عنه حجته له ولو كان له فضل عشر حجج“ (فتح القدیر ۶۸/۳ باب الحج عن غیر) (مرتب)۔

۲- ”الرابع: الأمر أي بالحج فلا يجوز حج غيره بغير إذنه“ (مشای ۲۳۹/۲، باب الحج عن غیر)۔

ہے کہ میری طرف سے جس طرح چاہوں حج بدل کر آؤ تو اس صورت میں مامور کو حج تمتع اور قرآن دونوں کرنا جائز رہے گا، لیکن دم قرآن، تمتع، جنایت یہ بذمہ مامور رہے گا، مامور کو اپنے ذاتی مال سے ادا کرنا ہوگا، ”كما في الدر المختار: ودم القرآن والتمتع والجناية على الحاج إن أذن له الأمر..... وإلا فيصير مخالفا فيضمن“ (۱)، معلوم ہوا کہ باذن آمر اور بغیر اذن دونوں کا حکم یکساں نہیں بلکہ دونوں کے حکم میں فرق ہے۔

الف (۳۲) اگر حجج عنہ (آمر) پر حج فرض تھا اور اس نے حج بدل کی وصیت کر کے انتقال کیا ہے اور تہائی ترک بعد ادائیگی قرض وغیرہ حقوق متقدمہ مکان آمر (حجج عنہ) سے حج بدل کے لیے کافی ہے تو اگر کسی متعین شخص کو بھیجنے کی وصیت فرمائی ہے تو جب تک وہ متعین کردہ شخص اظہار معذوری یا انکار نہ کر دے یا ایسا مہمل ہو کہ اس سے حج بدل ادائی نہ ہوگا، اس وقت تک اس متعین کردہ شخص کو بھیجنا ورثہ پر ضروری رہے گا، اگر کسی شخص کو آمر نے متعین نہ کیا ہو تو ورثہ جس کو مناسب سمجھیں بھیج سکتے ہیں، بھیجنا ضروری رہے گا۔

ب: اگر وصیت تو کی ہے مگر تہائی ترک بعد ادائے کی حقوق متقدمہ (قرض وغیرہ) حجج عنہ (آمر) کے مکان سے حج بدل کے لیے کافی نہ ہوگا مگر خارج میقات سے بھیجنے کے لیے کافی ہو تو خارج میقات سے بھیجنا اگر ورثہ کی قدرت میں ہے تو خارج میقات سے ہی جہاں سے کافی ہو بھیجنا واجب رہے گا، ہاں اگر ورثہ اپنے ذاتی مال سے تبرع کر کے اور پہلے سے بلکہ مکان آمر سے ہی کسی کو بھیج دیں تو درست ہوگا، بلکہ بہتر و افضل رہے گا وصیت کی ان تمام صورتوں میں مامور کو حج قرآن و تمتع کرنا درست نہ ہوگا اور نہ ورثہ کی اجازت منجانب موصی کافی ہوگی، بلکہ حج فرائض اور کما ہر حال میں ضروری رہے گا۔

ج: وصیت تو فرمائی ہے مگر اتنا ہی چھوڑا کہ اس کا تہائی حصہ خارج میقات سے حج کے لیے کافی ہو تو وہ رقم مکہ مکرمہ بھیج کر مکی سے حج کروانا ضروری ہوگا۔

د: اور اگر وصیت تو کی ہے لیکن بالکل کوئی ترک نہیں چھوڑا کہ مکی ہی سے حج کر لیا جائے یا ترک کافی چھوڑا مگر وصیت نہیں کی تو اگرچہ اس پر (آمر و حجج عنہ) پر حج فرض باقی رہا ہو مگر اس صورت میں ورثہ پر کسی قسم کا حج مکی یا میقاتی کرانا ضروری نہ رہے گا، البتہ اگر ورثہ اپنی طرف سے تبرع کر دیں تو بہتر و احسن ہوگا اور اللہ نے وسعت دی ہو تو کرنا چاہیے۔
 ہ: اگر حجج عنہ (آمر) پر حج فرض نہیں تھا لیکن حج کرانے کی وصیت فرمادی اور حقوق متقدمہ کی ادائیگی کے بعد تہائی ترک کی مقدار اتنی ہے کہ آمر (حجج عنہ اور موصی) کے مکان سے نہ سہی راستہ ہی کے کسی حصہ سے حج بدل میقاتی کر لیا

جاسکتا ہے اور وہاں سے حج کرنا ورثا کی قدرت میں ہو تو ورثا پر وہیں سے حج کرنا ضروری ہوگا اور اس حج بدل کرنے والے (مامور) کے لیے قرآن و تمتع کرنے کی اجازت نہ رہے گی اور موصی کے ورثا کی اجازت منجانب موصی کافی و صحیح نہ ہوگی۔
و: اگر حج عنہ (آمر) پر حج فرض نہ رہا ہو اور نہ اس نے حج کی وصیت فرمائی ہو یا وصیت کی ہو مگر تہائی بعد ادائیگی حقوق متقدمہ علی الوصیت جیسے قرض و ہبہ وغیرہ اتنی مقدار کا بھی نہ چھوڑا ہو کہ جس سے حج کی عی بھی (وہ حج جو خارج میقات سے آ کر کیا جائے) کیا جاسکے تو اس صورت میں کسی وارث پر حج بدل کرنا ضروری نہ رہے گا، حج بدل کرادے تو کر سکتا ہے بلکہ مستحسن ہے اور ایسے حج بدل میں قرآن و تمتع کر سکتا ہے (۱)۔

ز: اگر صورت نمبرہ میں تہائی ترک کی اتنی مقدار ہو کہ کسی حج (جو اندرون میقات والوں پر ہوتا ہے) کر لیا جاسکتا ہے اور ورثہ کی قدرت میں ایسا حج کرنا ہے تو اس کا بھی ادا کر دینا ضروری رہے گا اور اس صورت میں حج بدل کرنے والا (مامور) قرآن و تمتع، امر اوسب کر سکتا ہے، البتہ مگر ان دو میں جنائیت خود بذمہ مامور رہے گا مامور کو یہ دم اپنے ذاتی مال سے ادا کرنا ہوگا بلکہ ایستغاد من جمیع مباحث الحج عن الغیر۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- حج بدل میں کس کی طرف سے حج کی نیت کرے؟

زید حج بدل کرنا چاہتا ہے تو حج بدل کے احرام میں نیت اس شخص کی طرف سے کرے جس کی طرف سے حج کرنے جارہا ہے یا اپنی طرف سے کرے اور اس کا ثواب بخشے۔

۲- حج بدل کرنے والا قرآن جنائیت کس طرح ادا کرے؟

حج بدل کرنے والا جب قرآن کا احرام باندھے گا تو اگر اسے جنائیت ہو جائے تو یہ ایک قربانی کرے گا یا ہر جنائیت پر دو قربانی کرے گا۔

الجواب وبالله التوفیق:

۱- جس کی طرف سے حج کرنے جارہا ہے اس کی طرف سے حج کی نیت کرنا ضروری ہے کمافی الشامی (۲)۔

۱- "قال: وإن لم یوص أي بالاحجاج لصبر عنه الوارث وكذا من هم أهل الصبر فحج أي الوارث ولو هو بنفسه أي عنه أو غيره جاز، والمعنى جاز عن حجه الإسلام إن شاء الله تعالى"، كما قال في الكبير (فتاویٰ ثنائی، ص ۲۳۹ ج ۲ باب الحج عن الغیر)۔

۲- "ويشترط لبه الحج عنه أي عن الأمر" (الدر المختار مع الرد ۵/۱۵، مکتبہ ذکری)۔

۲- اگر حجج عنہ نے حج افراد کے لئے مامور کیا ہے تو حج قرآن کا احرام غیر آمر کی جانب سے باندھنے میں ضامن ہو جائے گا اس لئے کہ ”کما فی الغنیۃ إذا أمره غیره یا فرداً بحجۃ أو عمرۃ ففہو مخالف ضامن فی قول أبی حنیفۃ وقال أبو یوسف و محمد: یجزی عن الأمر استحساناً وهذا الخلاف فیما إذا قرن عن الأمر أما لونی بأحدهما عن شخص آخر أو عن نفسه ففہو مخالف ضامن بلا خلاف“ (۱)۔

مشورہ: آپ نے چند جزئیات دریافت کئے ہیں حج بدل کرنے میں ان سے یا اسی طرح اور استفتاء کے محض مسائل معلوم کرنے سے آپ کا کام نہیں چلے گا، حج بدل کرنے والا تمام امور میں اپنے آمر کی ہدایت کا پابند ہوگا حتیٰ کہ اگر حج قرآن کیلئے نہیں کہا ہے اور قرآن کر لیا ہے جب بھی ضامن ہوگا کما مرفصلاً، اسی طرح حج افراد میں اس نے میقات سے فقط عمرہ کا احرام باندھ لیا ہے کہ بعد عمرہ حلال ہو کر کچھ دن مثلاً رمضان میں مکہ مکرمہ رہ کر پھر مکہ مکرمہ سے حج کا احرام باندھ لیا تو بھی غلط کیا ہے کما مرفوض حج بدل کے بہت سارے مسائل ہیں آپ چند جزئیات کا استفتاء کر کے کہاں تک کام چلا سکتے ہیں، اس طرح آپ کا کام نہیں چل سکتا ہے، اگر آپ صحیح طور پر ارکان حج بدل ادا کرنا چاہتے ہیں تو معلم الحجاج مصنفہ مفتی سعید احمد صاحب سہارنپوریؒ یا اس کے متبادل کوئی معتبر کتاب جس میں مسائل حج معتد بہ درجہ میں درج ہوں خرید کر بار بار مطالعہ کر لیجئے اور مستحضر کر لیجئے جب کام چلے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۷/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عن سید احمد علی سعید علی عنہ

۱- حج بدل کرنے والا کس حج کا احرام باندھے؟

حج مفرد کا احرام باندھے یا قرآن کا اور کس طرح نیت کرے، یعنی مرنے والے کی طرف سے احرام باندھنے کی نیت کرے یا اپنی طرف سے نفل حج کی نیت کر کے ثواب بخشے۔

۲- حج بدل کرنے والا احرام کہاں سے باندھے؟

کیا رمضان شریف میں یلمام کے میقات سے حج بدل کا احرام باندھ سکتا ہے یا ایام حج مثلاً شوال، ذی قعدہ وغیرہ میں احرام حج باندھنا شرط ہے اور اگر رمضان میں مکہ پہنچنے کا قصد کرے تو پھر حج بدل کا احرام مکہ شریف سے باندھے یا کسی دوسرے میقات سے باندھے۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱۔ جس قسم کے احرام کا آمر نے حکم دیا قرآن یا افراد میں سے اسی کا احرام باندھے، البتہ تمتع کرنا کسی حال میں درست نہیں اگرچہ آمر نے اذن دیا ہو بہتر یہ ہے کہ آمر (حج کرانے والا) مامور (حج بدل کرنے والا) کو عام طرح اجازت دے دے کہ میری طرف سے یا میرے فلاں عزیز کی طرف سے جا کر حج کرو جس طریقہ سے بھی تیری مرضی ہو اور تجھے سہولت ہو، افراد یا قرآن یا تمتع جو بھی کرو تو اس سے آمر کا حج جائز ہو جائے گا اگرچہ تمتع ہی کرے، کیونکہ آمر کے امر کی مامور نے مخالفت نہیں کی، لیکن اس اجازت عام کے باوجود احتیاط اس میں ہے کہ حج بدل میں تمتع نہ کیا جاوے، احرام باندھنے کے وقت نیت آمر کے حج کی کرے، اگر زبان سے کہے لبیک عن فلاں مثلاً تو بہتر ہے ورنہ نیت دل سے بھی کافی ہے بلکہ نیت کو چاہئے کہ اپنے میت کی طرف سے حج کی نیت اس طرح کرے تو افضل ہے: ”اللهم انی ارید الحج عن فلان واحرمت به الله تعالیٰ عنه لبیک لحجتی عنه وبشرط نية الحج عنه ای الامر فيقول احرمت عن فلان ولييت عن فلان ولو نسي اسمه فتوى عن الامر صرح وتكفي نية القلب“ (۱)۔

۲۔ جس کے امر سے یا جس کے لئے حج کر رہا ہے احرام اس کے میقات سے باندھے (۲)، فقط واللہ اعلم

بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۸/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمد جمیل الرحمن، سید احمد علی سعید

جس نے حج نہیں کیا اس کا حج بدل کرنا:

کوئی غریب آدمی جس کے اوپر حج فرض نہیں اور نہ اس سے قبل کوئی حج کیا، ایسا شخص اور کی طرف سے حج بدل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

حنفیہ کے نزدیک ایسا شخص بھی حج بدل کر سکتا ہے جو خود اپنا حج نہ کئے ہو، لیکن یہ افضل نہیں ہے حج بدل ایسے شخص

۱۔ درمختار ۲/۳۲۹

۲۔ ”الغالی عشر ان يحرم من الميقات“ (مشائی ۲/ص ۳۲۹)۔

سے کرانا بہتر ہے جو اپنا حج کر چکا ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۱۰/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عتد

سعودی سے حج بدل کرنا:

اگر کسی کے ماں باپ زندہ ہوں اور حج کے لئے آنے کی انہیں استطاعت ہو، تندرست بھی ہیں پھر بھی نہیں آتے تو ان دونوں کی طرف سے ان کا کوئی بڑا لڑکا یا کوئی رشتہ دار وغیرہ، جو غیر ممالک (سعودی، قطر، بحرین، دبئی، وغیرہ) میں ہو اور وہ اپنے ماں باپ کی طرف سے حج کرنا چاہے، اور اگر والدین اجازت دے دیں تو وہ حج بدل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

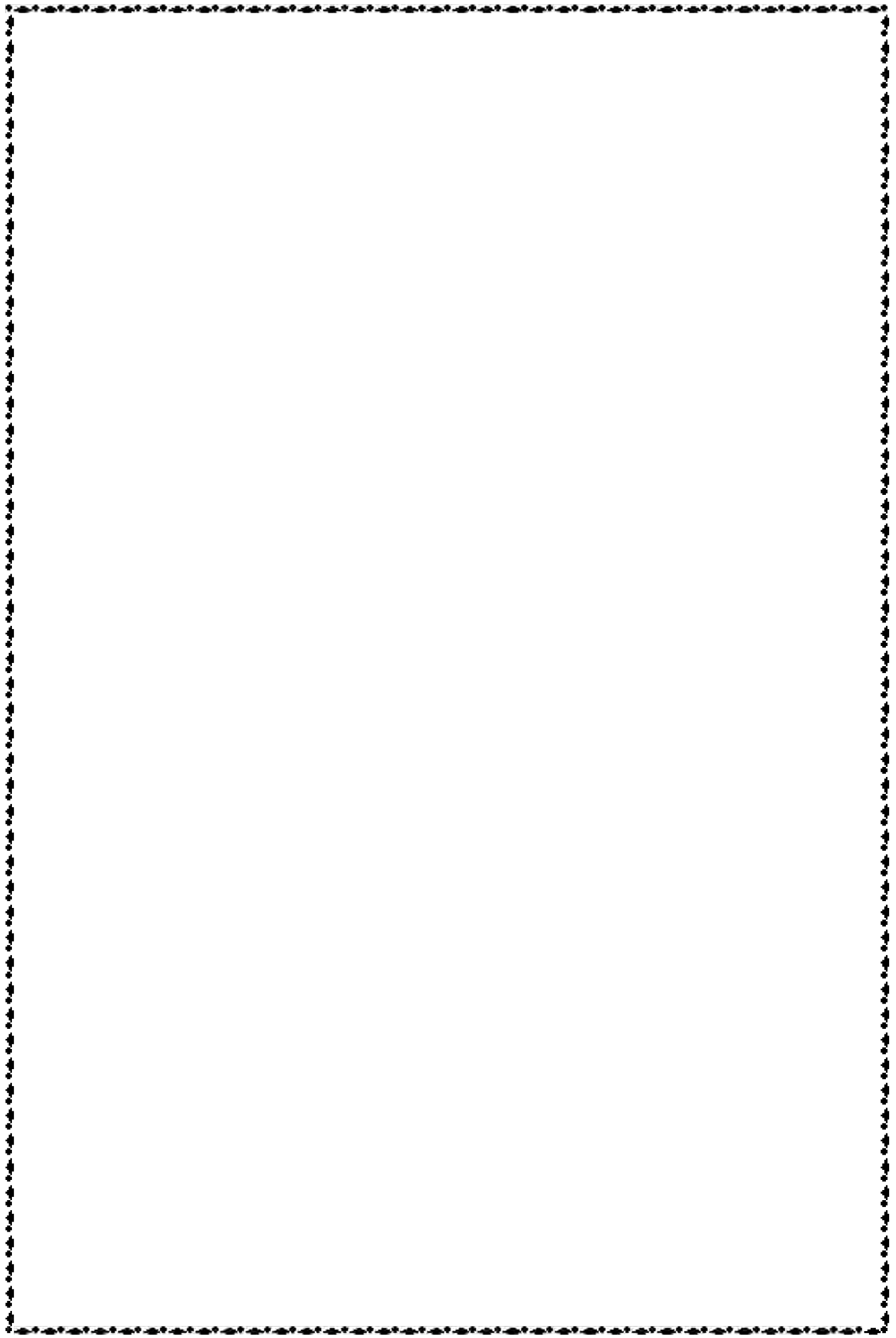
جس شخص میں خود حج میں آنے کی استطاعت و طاقت ہو اور تندرست بھی ہو اس کی طرف سے حج بدل کرنے سے اس کا حج فرض ادا نہ ہوگا (۲)، چاہے اس کی طرف سے حج بدل اس کا لڑکا کرے یا کوئی رشتہ دار، چاہے اس کی اجازت سے کرے یا بلا کسی اجازت کے ہر صورت میں یہی حکم ہے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی اپنا حج کر کے اس کا ثواب ان کو پہنچا دے تو ثواب اس کو پہنچ سکتا ہے باقی حج فرض کرنے سے ادا ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۱۰/۱۳۸۵ھ

۱- "فجاز حج الصورة بمهمة من لم يحج وغيرهم أولى لعدم الخلاف" (الدرع الرد ۲/۲۱)۔

۲- "وجود العذر قبل الإحجاج فلو أحج صحيح ثم عجز لا يجزيه" (فتاویٰ ۳۲۹/۲)، "قبل البابۃ عدد العجز فقط لكن بشرط دوام العجز إلى الموت، لأنه فرض العمر حتى يلزم الإعادة بزوال العذر" (الدر المختار علی الرد ۳/۱۳-۱۵، مکتبہ زکریا، دیوبند)۔

كتاب النكاح



کتاب النکاح

آپ ﷺ سے پہلے نکاح کا طریقہ
آپ ﷺ کے دور سے پہلے نکاح کا کیا طریقہ تھا؟

الجواب وبالله التوفیق:

جاہلیت کے نکاح کئی طرح رائج تھے (۱)، شریعت نے صرف ایک طریقہ جو آج کل رائج ہے باقی رکھا اور بقیہ سب کو ختم کر دیا تو اب اس سے کیا کام۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۶/۱۲/۱۴۰۳ھ

۱- ایجاب و قبول کی ایک خاص صورت:

میں نے یہاں لندن میں ایک مسلمان لڑکی کے ساتھ یہاں کے قانون کے مطابق سول میرج کی، جس کا خلاصہ یہ ہے: میں نے یہاں کی کورٹ میں تمیں مسلمانوں کے سامنے یہ قرا کیا کہ میں اس لڑکی کو اپنی بیوی بنانا ہوں اور اسے بیوی کی طرح قبول کرتا ہوں، اسی طرح میری بیوی نے بھی اسی مجلس میں یہ قرا کیا کہ وہ مجھے بحیثیت شوہر قبول کرتی ہے، مگر اب تک ہم لوگوں کا اسلامی نکاح نہیں ہوا ہے تو آیا یہ ہمارا نکاح ہو گیا ہے یا نہیں؟

۲- صرف بیوی کے بیان پر تفریق کا حکم:

اگر یہ نکاح ہو گیا ہے تو اگر کسی وجہ سے یہاں کا قانون صرف بیوی کی بات سن کر طے ہو گیا کر اوے (بیوی اپنی خوشی

۱- "عن عمروة ابن الزبير ان عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم اخبرته ان النكاح في الجاهلية كان على أربعة أحواء فنكاح منها نكاح الناس اليوم النخ" (بخاری ۶۹/۲، مطبعہ سرمد دیوبند)۔

سے علیحدگی چاہیے) تو یہ طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟ (جبکہ یہاں کے کورٹ میں تمام وکیل و جج غیر مسلم ہیں)۔

محمد شعیب (فلپ ۵۳۱-۱۶۰، واٹ کنسٹن روڈ، لندن)

الجواب وبالله التوفیق:

۱- اگر تین مسلمانوں کے سامنے مرد نے یہ کہا کہ میں اس لڑکی کو اپنی بیوی بنانا ہوں اور اسے بیوی کی طرح قبول کرنا ہوں اور پھر اس لڑکی نے بھی اسی مجلس میں ان لوگوں کے سامنے یہ قرار کر لیا کہ میں اس مرد کو بہ حیثیت شوہر قبول کرتی ہوں تو شرعاً نکاح منعقد ہو گیا اور دونوں شرعاً بھی میاں بیوی ہو گئے (۱)۔

۲- جب شرعاً بھی دونوں میاں بیوی ہو گئے تو جب تک شوہر خود طلاق نہ دیدے یا شوہر سے طلاق دینے کے الفاظ نہ کہلوائے جائیں یا ضابطہ شرع کے مطابق خلع یا تفریق شرعی واقع نہ ہو جائے محض عورت کا بیان یک طرفہ منکر تفریق و علیحدگی کر اوینے سے شرعاً طلاق واقع نہ ہوگی بلکہ شرعاً دونوں حسب سابق میاں بیوی باقی رہیں گے (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۲/۱۴۰۱ھ

دوسری شادی سے قانوناً روکنے کا کیا مقصد ہے؟ (۳)

الجواب وبالله التوفیق:

اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ دوسری شادی کرنے سے فی زمانہ عموماً پہلی بیوی کے ساتھ انسانی یا ظلم ہونے لگتا

- ۱- ”النکاح یعقد بالایجاب والقبول (ہدایہ ۲/۲۸۵)، وأما ركنه فالإيجاب والقبول كلما في الكافي والإيجاب ما يلفظ به أولاً من أي جانب كان والقبول جوابه هكذا في العداية“ (فتاویٰ ہانگیر ۱/۲۶۷)، ”ولا یعقد لکاح المسلمین إلا بحضور شاهدين حریین عاقلین بالغین مسلمین رجلین أو رجل وامرأتین عدولاً کالوا أو غیر عدول أو محدودین فی القلم“ (ہدایہ ۲/۲۸۶)۔
- ۲- ”عن عصمة قال: جاء مملوک إلى النبی ﷺ فقال: يا رسول الله إن مولای زوجنی وهو یزید أن یفرق بینی و بین امرأتی قال فصعد رسول الله ﷺ المبر فقال: یا أيها الناس إنما الطلاق یبد من أحد بالساق، وفيه الفضل بن المختار وهو ضعيف“ (مجمع فروغ ۳/۳۳۳)، نیز زوجین کے درمیان حاکم یا قاضی کے ذریعہ تفریق کے لئے شرط ہے کہ وہ مسلمان ہوں، کیونکہ ”لا ولاية لکافر علی مسلم لقوله تعالى: لن يجعل الله للمکافین علی المؤمنین سبیلاً“ (فتح القدیر ۵/۲۱۲)۔

۳- حضرت مفتی صاحب سے تعدد ازدواج کے نتجانات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک سوال کیا گیا تھا، سوال کے مندرجات محفوظ نہیں رہ سکے، اس لئے صرف جواب کو بغرض افادہ شائع کیا جا رہا ہے۔

ہے یا ان میں سے کسی ایک کے حقوق کی ادائے گی میں کوتاہی اور حق تلفی ہونے لگتی ہے، اس لئے قانوناً روک تھام کی ضرورت ہے تو پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس روک تھام سے کیا مقصد ہے؟ اگر اس سے مقصد یہ ہے کہ ایک سے زائد نکاح کر لیا قانوناً ممنوع قرار دیا جائے کسی شخص کی ایک بیوی رہتے ہوئے دوسرا نکاح کرنے کی قانوناً اجازت ہی نہ ہو اگر کوئی کرے، تو قانون کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم قرار دیا جائے۔ تو یہ چیز سماجی مقصد و مصالح کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ عقلاً بھی غلط اور ناقابل عمل یا قابل قبول ہوگا اور ناقابل نفاذ۔

اس لئے کہ نکاح کے اہم مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے عورت اور مرد دونوں کو عنست و پاک دامن اور پاکیزہ زندگی نصیب ہو، اور ایک صالح و خوشگوار معاشرہ جنم لے اور پاکیزہ توالد و تناسل کا سلسلہ جاری ہو کر آپس میں مودت و محبت کا خوش آئند ماحول وجود پذیر ہو۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے بسا اوقات تعداد ازواج لازمی اور ضروری ہوگا۔ تعداد ازواج کی لاجست و اجازت کے بغیر ان مقاصد کی تکمیل ممکن و جود نہیں ہو سکتی:

● تعداد ازواج ضروری ہے، اس لئے کہ عورتیں اپنی خلقت کے اعتبار سے عموماً مردوں کے بہ نسبت کمزور اور بار بار المراج واقع ہوتی ہیں، ان میں جنسی خواہشات کا پہچان بھی مردوں کے اعتبار سے کم ہوتا ہے، بالخصوص پاک نگاہ عورتوں میں، بخلاف مردوں کے کہ یہ باعتبار خلقت کے عورتوں کی بہ نسبت قوی اور حار المراج ہوتے ہیں اور ہر قسم کے مباح میں آمد و رفت کی وجہ سے، نیز بعض دیگر وجوہ کی وجہ سے ان میں جنسی خواہشات کا پہچان بھی زیادہ ہوتا ہے، تجربہ اس پر شاہد ہے، ان باتوں کا تقاضا یہ ہے کہ محض ایک ہی عورت پر ہر مرد کو محبوس نہ کیا جائے، ورنہ اس کا قدم حد اعتدال سے متجاوز ہو کر بدکاری کی طرف بڑھ جانے کا قوی خطرہ ہے، بالخصوص طاقت ور لوگوں کے لئے، اور یہ چیز انسانی سوز ہونے کے ساتھ ساتھ مقاصد نکاح میں بھی مغل و مضر ہوگی۔

● اس لئے کہ عورت بسا اوقات تیس چالیس سال کی عمر میں دس پانچ بچے جن کر بوڑھیا یا مثل بوڑھیا ہو چکی ہوتی ہے، اور مرد کے لئے یہ عین جوش و ثبات کا وقت ہوتا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ عورت ہر وقت اس قابل نہیں ہوتی کہ خاوند اس سے ہمبستر ہو سکے، مثلاً لازمی طور پر ہر عورت کو ہر مہینہ کچھ دن حیض (ماہواری) آتا ہے، اسی طرح ولادت کے بعد کچھ دن وہ نفاس میں رہتی ہے جن میں صحبت کرنا ممنوع ہے۔ اور طبعاً بھی عورت کے لئے اس حالت میں صحبت ضرر رساں ہے۔

اسی طرح یام حمل و یام رضاحت (بچہ کو دودھ پلانے والے دن) میں صحبت کرنا بھی کبھی مضر ہوتا ہے جن میں حمل

کی حفاظت کے لئے صحبت و ہمبستری سے پرہیز کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ان حالات کے پیش نظر مردوں کو ایک پر مجبور کرنا بالخصوص قوی مردوں کو اور گرم ملک اور گرم مزاج والوں کو جن کے لئے ایک روز بھی بغیر جماع کے اپنی عنفت مآبی کو محفوظ رکھنا دشوار ہوتا ہے اور چین نہیں آتا، ان پر ظلم کرنے کے مترادف ہوگا، بلکہ حرام کاری کے اسباب مہیا کرنے کے مترادف ہوگا، یہاں مرطوب اور بلغمی لوگوں کا ذکر نہیں ہے۔ پھر ان سب باتوں کے ساتھ عقل و شرع کے ان احکام کو بھی پیش نظر رکھئے کہ حرام کاری ایسی گھناؤنی بیماری ہے کہ اس سے بچنے کے لئے کسی دوسری عورت کو بری نظر سے بھی نہ دیکھو اور نہ کسی غیر محرم کو ہاتھ لگاؤ، اس سے تخلیہ میں بات چیت بھی نہ کرو اگر بازنہ آؤ گے اور بلوث ہو جاؤ گے تو بدترین سزا کے مستحق ہو گے۔ ستم بالائے ستم نہ ہوگا، تو اور کیا ہوگا؟

● اس لئے کہ بعض مرتبہ عورت ٹی بی یا کسی دوسرے مہلک مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے اور ایسی کمزور ہو جاتی ہے کہ خدمت کرنے کے بجائے خود خدمت لینے کی محتاج ہو جاتی ہے اور اس کی سابقہ خدمتیں اور بھلا ہوتا و ایسا ہوتا ہے کہ طلاق دے کر علیحدہ کر دینا شوہر کی نگاہ میں انتہائی نا انسانی ہوتی ہے، اس کی غیرت و محبت کسی طرح طلاق دینے کو قبول نہیں کرتی، کبھی عورت بے سہارا کسم پرسی کی حالت میں ہوتی ہے کہ طلاق دے کر علیحدہ کر دینا اس کو زندہ درگور کر دینے کے مترادف ہوتا ہے، کبھی وہ عورت (مریضہ) دو چار بچوں کی ماں بھی ہو چکی ہوتی ہے اور وہ بچے بھی کسی ایسی عورت کے محتاج ہوتے ہیں جو ان کی دیکھ بھال کرے۔ ایسی حالتوں میں عقل و انصاف کا تقاضا ہوتا ہے کہ مرد ایک ایسی شادی کرے جس سے خود اس کی عنفت مآبی بھی محفوظ رہے اور ساتھ ہی اس بے بسی اور مجبور عورت کی بھی بطور حسن مکافات کے خدمت ہو سکے اور بچوں کی بھی نگہداشت و پرداخت ہو سکے۔

اور کبھی ایسی عورت شوہر سے خود اصرار کرتی ہے کہ کسی عورت سے شادی کر لو جو تمہاری اور میری دونوں کی خدمت بھی کرے اور گھر بھی آباد رکھے، اور ان بچوں کی پرورش بھی کرے، خاص کر جب عورت سمجھدار ہوتی ہے تو اکثر ایسا اصرار کرتی ہے اور بسا اوقات ان حالات میں لازم ہو جاتا ہے کہ اس قائل رحم پر رحم کھا کر اس کی درخواست پوری کی جائے اور اس کے ہوتے ہوئے دوسری عورت سے شادی کر لی جائے، تاکہ پرسکون زندگی کا راستہ کھلے اور صالح معاشرہ بھی نصیب ہو۔

● اسی طرح کبھی عورت بانجھ ہوتی ہے اور مرد کو گھر کے ماحول سے غائب ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور یہ بانجھ بھی ایسی سلیقہ مند اور مناسب مزاج ہوتی ہے کہ اس کو علیحدہ بھی کرنا نہیں چاہتا یا کسم پرسی کی حالت میں ہوتی ہے (مثلاً اس کے میکہ وغیرہ میں کوئی نہیں ہوتا) کہ اس کو علیحدہ کر دینا اس کو ہلاک کر دینے کے مترادف ہوتا ہے یا وہ عورت خونہش کر کے شوہر کو اپنے علاوہ

ایک اور عورت سے نکاح کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

ان حالات میں تعدد ازواج کو یکسر روک دینے کا قانون کس قدر تنگی کا باعث ہوگا؟ اور کس قدر عقل و دانش سے دور ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان ملکوں کے حالات کا اور ان لوگوں کا مشاہدہ کیجئے اور جائزہ لیجئے جن ملکوں میں، جن لوگوں میں عورت کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے شادی کرنے کا دستور نہیں ہے، بلکہ ایسی بوڑھیا بد شکل، کج خلق یا بیمار بد وضع کو تاہ اندیش مخالف مزاج ہی کو گلے باندھے رکھنے کی تاکید ہے، ان کو کیا کیا مصائب پیش آتے ہیں، بلکہ مطابق بیان صاحب ”تفسیر حقانی“ کہیں عورت کو زہر دے کر مارا جاتا ہے، کہیں اسے ہلاک کرنے کی سعی کی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

● اس لئے کہ بسا اوقات ملکی اور حکومتی سطح پر کوئی بڑی جنگ چھڑ جاتی ہے اور اس ترقی آلات کے دور میں ایک معمولی جنگ کے اندر بھی محض چند دنوں میں لاکھوں نوجوان کام آتے ہیں اور ان کے بے شمار بچے یتیم و بے سہارا ہو جاتے ہیں اور لاکھوں عورتیں اچانک بیوہ اور بغیر شوہر کے رہ جاتی ہیں جس کا اندازہ آج کی دنیا میں مشکل نہیں ہے، ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم سے لے کر ۱۹۱۷ء کی متعدد جنگوں کے اندر کام آنے والے اور مرنے والے جوانوں کی تعداد سے اس کا آسانی اندازہ ہو سکتا ہے ہم نے مانا کہ حکومت وقت ان بے سہاروں کے کھانے پینے رہنے سہنے، بلکہ روزگار کا انتظام کرتی ہے، لیکن کوئی بتائے کہ ان بے شمار نوجوانوں اور اچانک بیوہ ہو جانے والی عورتوں کی عفت و عصمت کا کیا علاج ہے؟ تعدد ازواج کے علاوہ کیا اس کا کوئی اور انتظام ہو سکتا ہے؟

غرض تعدد ازواج کو قانوناً بند کر دینا اور اس کو جرم قرار دے دینا عقل سلیم کے تو خلاف ہے ہی سماج کے لئے بھی بے حد مضرت اور تباہ کن ثابت ہوگا۔ تعدد ازواج کو روکنا صریح مداخلت فی الدین ہے، رہ گئی اس مسئلہ کی شرعی حیثیت تو یہ قانوناً خلاف شرع ہے، بلکہ ایسا قانون مداخلت فی الدین ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ رب العزت نے حسب ضرورت و مصلحت چار تک نکاح کر لینے کی سہولت اور صریح اجازت و بلاحت مرحمت فرمادی تو اب اس کے خلاف قانون بنانا مداخلت فی الدین نہیں تو اور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لَا تَقْسُطُوا فِي الْبَيْتَامِ فَإِنَّكَ حَوَا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ، فَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لَا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا“ (۱)۔

اگر غور کیا جائے تو علی الاطلاق اس سے روک دینے کا قانون بنانا مداخلت فی الدین کے ساتھ ساتھ اس میں ق اور

قانون کے بھی خلاف ہوگا جس میں حکومت نے ہر مذہب کو آزاد رہنے کی ضمانت دی ہے، بلکہ غور کرو تو سیکولر اسٹیٹ کے لئے بھی یہ ایک بد نما داغ ہوا۔

شوہر کے ظلم سے بچنے کی کیا صورت ہے؟

اور اگر عدم تعدد ازدواج کے اس قانون سے مقصد یہ ہو کہ بالکل ختم نہ کیا جائے، بلکہ کچھ ایسے قیود شرائط کے ساتھ اجازت دی جائے جس سے ان لوگوں کو جو متعدد نکاح کر کے پہلی بیویوں کو پریشان کرتے ہیں، پریشان کرنے کا موقع نہ ملے، انسداد ہو جائے تو اس کا لحاظ تو خود نص میں موجود ہے، یہی نہیں، بلکہ یہ قید مذکورہ فی النص اس ذات کی لگائی ہوئی ہے جو تمام جذبات انسانی کو محض جانے والی ہی نہیں، بلکہ ان کی خالق و مالک بھی ہے اور سب اس کے قبضہ قدرت میں ہے، اس ذات سے اچھی و جامع مانع قید کون لا سکتا ہے؟ اس مذکورہ فی النص قید کے ذریعہ سے ان تمام مذکورہ مظالم کا انسداد علی وجہ الکمال ہو جائے گا، البتہ اس کو صحیح طریقہ سے استعمال کرنا اور بدلتا شرط ہے، پھر اس بحث کے اٹھانے کے کیا معنی؟

اگر یہ کہا جائے کہ نص میں مذکورہ قید کا فائدہ تو صرف یہ ہے کہ متعدد نکاح کر لینے کے بعد جب کچھ دن گزر جائیں اور تجربہ ہو جائے جب جا کر معلوم ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں عدل ہو رہا ہے یا نہیں اور اگر عدل نہ ہوتا ہو تو اب روکا جائے، جیسا کہ بعض مضمون نگاروں نے یہ لکھا بھی ہے، تو یہ ایک کھلی ہوئی غلطی ہے، نص میں (وَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لَا تَعْدِلُوا) ہے "ان لم تعدلوا" نہیں ہے کہ اس کے معنی یہ لئے جائیں کہ بعد نکاح اگر عدل نہ کرے تو فقط ایک پر قناعت کرے، بلکہ نص کا مطلب یہ ہے کہ نکاح ثانی سے قبل ہی اگر تم کو خوف غالب ہو کہ بعد نکاح عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی عورت پر قناعت کرو، یا "ما ملکت ایمانکم" (۱) سے کام لو الخ جس کا کھلا ہوا مفہوم صرف یہ ہے کہ نکاح سے قبل اپنے حالات اور اس عورت کے حالات اور اپنی پہلی بیوی کے حالات پر خوب غور کرے اور پھر ان میں عدل نہ کرنے کی صورت میں دنیا میں جو نتائج بد عموماً پیش آتے ہیں ان پر بھی نظر کرے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی دیانت سے آخرت کی باز پرس کو بھی متحضر کرے کہ عدل نہ کرنے کی صورت میں خدا کے حضور میں جب سوال ہوگا تو کیا جواب ہوگا اور پھر اس کی سزا سے بچاؤ کی کیا صورت ہوگی، غرض آخرت کو بھی پیش نظر رکھ کر خوب سوچ لے کہ ان سب کے مان و نفقہ و لباس و پوشاک وغیرہ میں عدل و انصاف اور ان سب کے حقوق کی ادائے گی اور ان سب کے نفسیاتی تقاضوں کی سرانجام دہی ہو سکے گی یا نہیں، اگر نہ ہونے کا اندیشہ غالب ہو تو نکاح ثانی پر قدم نہ کرے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب فی زمانہ باندیوں کا وجود نہیں ہے اور طاقتیں بھی کمزور ہو چکی ہیں، ان مذکورہ امور میں غور و خوض کرنے میں کوئی متوقع اور قریب الوقوع ہے جس کا لازمی نتیجہ بے اعتدالی اور بے انسانی کا صدور ہوگا، اس لئے یکسر روک دینے کے قانون کی ضرورت ہے کہ ایسے احتمالات تو پہلے نکاح کو بھی بند کر دینے کا حکم یا اس کو قانوناً جرم قرار دے دینے کا مشورہ دیا جائے گا۔

اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر یہاں کیوں مشورہ دیا جاتا ہے اور ایسا عمل کیوں تجویز کیا جاتا ہے جس سے نص میں تغیر و تبدیلی اور مداخلت فی الدین کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ بالخصوص ایسا عمل کیوں نہیں تجویز کیا جاتا ہے جس میں نص کے اندر بغیر کسی تبدیلی و تغیر یا ترمیم وغیرہ کے ان کے بے اعتدالیوں اور بے انسانیوں کا اسناد ہو سکتا ہے؟ مثلاً یہ کہ نکاح ثانی کرنے والے سے ایک اتر ارامہ (کابین نامہ) نکاح ثانی سے قبل ہی لکھوا لیا جائے جس کا مضمون و عنوان یہ

ہو:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کابین نامہ

اما بعد میں..... کہ..... پسر..... قوم..... ساکن.....
 ضلع..... کا ہوں میرا نکاح مسماۃ..... دختر..... قوم ساکن ضلع.....
 کے ساتھ شرائط ذیل پر بعض مہر..... روپیہ سکہ رائج الوقت کے قرار پایا ہے۔

لہذا میں بدرستی ہوش و حواس بلا کسی جبر و اکراہ کے مندرجہ ذیل اتر ارامہ لکھتا ہوں، تاکہ میں اس کا پابند رہوں اور در صورت عدم پابندی مسماۃ سے نکاح کروں تو نکاح کرنے کے بعد جب کبھی اس کو نکاح میں رکھتے ہوئے شرائط ذیل (جس کو دیندار اور سمجھدار لوگوں کے مشورہ سے مرتب کیا جائے) میں سے کسی شرط کے خلاف کروں اور اس خلاف ہونے کو اور ہم دونوں میں علیحدگی کو مندرجہ ذیل اشخاص میں سے کم سے کم دو شخص تسلیم کر لیں تو اس کے بعد مسماۃ مذکورہ کو اختیار ہوگا کہ خلاف شرط ہونے سے ایک ماہ کے اندر اندر جب چاہے اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کر کے اس نکاح سے الگ ہو جائے اور جب کبھی کسی شرط کے خلاف واقع ہو ہر بار ایک ایک ماہ کے لئے یہ اختیار رہے گا۔ مگر یہ اختیار ایک ہی نکاح تک محدود رہے

گا۔ اگر کسی وقت فرقت اور علیحدگی کے بعد نکاح کا اعادہ ہو تو اس کے بعد یہ اختیار اور یہ شرائط نہیں رہیں گی، بلکہ اس وقت جو کچھ دوبارہ طے ہو جائے گا اس کے مطابق عمل درآمد ہوگا۔

شرائط یہ ہیں————— نیچے یہ لکھا ہوا:

اس کا بین نامہ کو میں نے منظور کیا اور لکھوا کر مننے دیکھنے اور تسلیم کرنے کے بعد آج بتاریخ
ماہ————— سنہ میں دستخط کرتا ہوں————— نشان انگوشا————— گواہ شدہ
————— گواہ شدہ————— گواہ شدہ

قائدہ: اسی کا بین نامہ سے (شرطوں میں تھوڑی مناسب ترمیم کے بعد) پہلے نکاح کے بعد جو مظالم بعض شوہروں کی جانب سے یا جو نشوز سرکشی بعض عورتوں کی جانب سے رونما ہوتی ہے اس کا انسداد بھی ہو سکتا ہے۔

نیز کا بین نامہ میں مندرجہ ذیل شرط بڑھا کر اس تلوار سے بھی حفاظت کی جاسکتی ہے جس کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کے لئے نصوص قطعیہ میں تغیر و تبدیلی تک کر ڈالنے کا منصوبہ کاٹھڑکھا ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس موقع کی تعبیر شریعت مطہرہ کے ساتھ نہایت گستاخانہ اور خطرناک قسم کی جرأت ہے، اگر قہار مطلق کی شمشیر قہری کا تصور بھی صحیح معنی میں ہو جائے تو اس کے احکام کی تعبیر اس طرح کرنے پر کبھی جرأت نہ ہو، بہر حال اضافہ کی ہوئی شرط بہ الفاظ ذیل ہوگی:

”اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں گا تو اس کو تین طلاق نہ دوں گا۔ اور اگر میں نے بلاوجہ شرعی اس کو تین طلاق دے دیں تو جب تک وہ عورت اپنا نکاح کسی سے نہ کرے گی اس کا مان و نفقہ اس مقدار سے برابر دیتا رہوں گا جس مقدار پر مندرجہ بالا دونوں فریق کے کم از کم تین اشخاص متفق ہو جائیں گے اور دینے کا حکم کر دیں گے۔“

اگر میں کسی مادمان و نفقہ نہ دوں تو ایک ماہ گزر جانے کے بعد عدالت مجاز کے ذریعہ وصول کر سکتی ہے۔

دو شبہات اور ان کا حل:

(۱) پہلا شبہ یہ ہے کہ شریعت جب خود نکاح میں بطور عوض کے مہر کو لازم تر اردے چکی ہے اور طلاق میں عدت کا نفقہ واجب تر اردے چکی ہے تو اب مزید نفقہ کا بار شرط لگانا اور لازم کرنا یہ ظلم بھی ہوگا اور حکم شرعی پر زیادتی بھی ہوگی۔ جس کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اس وقت ہو سکتا ہے جب حکومت کی جانب سے قانوناً یہ شرط لگا دی جائے یا کسی بھی دوسرے شخص کی جانب سے شوہر کی مرضی کے خلاف یہ شرط اس پر لازم تر اردے دی جائے، یا عقد نکاح کی صلب حقیقت میں یہ شرط داخل کر لی جائے کہ بغیر اس شرط و قید کے شرعاً بھی اس نکاح کو

منعقد تصور نہ کیا جائے اور جب ایسا نہیں ہے، بلکہ شوہر خود اپنی صواب دید سے اپنی مصالح کے پیش نظر نکاح سے الگ اور مستقل طور پر از خود اس قید کو اپنے اوپر لازم کر رہا ہو تو مثل دیگر اقرار، تعلیق، عہود اور غتود معلقہ کے یہ شرط بھی صحیح و معتبر ہوگی۔

(۲) دوسرا شبہ یہ ہے کہ طلاق کے بعد زمانہ عدت کے علاوہ پھر کوئی نفقہ لازم کرنا یہ از قبیل جرمانہ مالی ہوگا جو جائز نہیں۔ اس کا جواب بھی وہی ہے جو شبہ اول کا جواب ہے، اس لئے کہ جرمانہ مالی یا تعزیر مالی لازم کرنے کا حق کسی دوسرے شخص کو تو بے شک نہیں ہو سکتا صریح نص کے خلاف ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

”لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفسه“ (۱)۔

لیکن اسی نص کے استثناء کے مطابق ہر شخص کو خود اپنے اوپر جرمانہ مالی اور تعزیر مالی اس حد تک کہ اس سے دوسرے کے حق کا تلف نہ ہو جائز ہے، جیسا کہ حالت حیض میں بیوی سے مباشرت کر لینے کی صورت میں صدقہ کی ایک مقدار ادا کر دینا روایات میں ملتا ہے اور مثلاً اگر کوئی شخص نماز قضاء ہو جانے کے جرم میں بطور جرمانہ اپنے اوپر ایک روپیہ کا صدقہ کر دینا ایک دن کا روزہ رکھ لینا لازم کرے تو یہ بلاشبہ جائز ہے۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ اس طویل گفتگو سے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ جس ترمیم یا نام نہاد اصلاح سے کسی حکم شرعی میں تغیر یا تبدیلی یا کسی اطلاق میں تنقید لازم آتی ہو اس کا پیش کرنا، یا قبول کرنا بلکہ اس کا سوچنا بھی کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے، بلکہ قطعاً حرام و ناجائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۱/۱۳۹۲ھ

نکاح سے قبل لڑکا لڑکی کے لئے ایک دوسرے کو دیکھنا:

کیا نکاح کرنے کے قبل مرد عورت کو اور عورت مرد کو دیکھ سکتی ہے اور کس قدر اگر یہ جائز ہے تو سند میں حدیث حضور ﷺ اور امام اعظم کا قول تحریر کریں۔

الجواب وبالله التوفیق:

تہائی میں بالکل ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے ہیں، البتہ دوسرے لوگ بھی وہاں موجود ہوں تو صرف چہرہ دیکھ سکتے ہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ۲۳/۱۰/۱۳۸۵ھ

نصرانی اور یہودی لڑکیوں سے نکاح کرنا اور ان کا نکاح پڑھانا:

کنیڈا اور امریکا میں اکثر مسلمان لڑکے نصرانی اور یہودی لڑکیوں سے شادی کر رہے ہیں، یہ لڑکیاں اکثر اپنے دین پر عمل نہیں کرتی ہیں بعض دفعہ اللہ ہی کے وجود سے انکار کرتی ہیں، تو کیا ایسی صورت میں ہم ان کی شادی کر سکتے ہیں؟

اسلامک سینٹر آف عربک، کنڈا

الجواب وبالله التوفیق:

اگر یہ لڑکیاں اللہ کی وجود سے انکار کرتی ہیں یا اپنے دین (نصرانیت و یہودیت) سے منکر ہیں تو پھر یہ اہل کتاب ہی نہیں ہیں بلکہ دہری ہیں اور ان سے نکاح قطعاً جائز نہیں ہے (۲) اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ وہ انجیل یا توریت کو آسمانی کتاب مانتی ہیں اور خدا کی قائل ہیں تو وہ اہل کتاب میں سے شمار ہونگی اور فی نفسہ ان کے ساتھ اباحت نکاح میں کلام نہیں ہوگا، البتہ ان کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں اور نسل کی حفاظت اور ان کی صحیح تعلیم و تربیت کی خاطر نکاح نہ کرنا چاہئے، اس عمل کی

۱- ”قال رسول الله ﷺ إذا خطب أحدكم المرأة فإن استطاع أن ينظر منها إلى ما يدعوه إلى نكاحها فليفعل“ (رواه احمد و رجاله ثقات وصححه الحاكم بلوغ المرام مع السبل ۹/۳۷۷، ولو أراد أن ينزوج المرأة فلا بأس أن ينظر إليها (رد المحتار ۵۳۲ مکبہ ذکر کیا)۔

۲- ”در مختار میں ہے: ”و حرم نکاح الوثیۃ بالإجماع وصح نکاح کلابۃ وإن کره نزیہا“، اس کے تحت علامہ مٹائی لکھتے ہیں: ”نسبة إلى عبادة الوثن.... وفي الفصح: ويدخل في عبدة الأوثان عبدة الشمس والنجوم والصور التي استحسوها والمعطلة والزادقة والباطية والإباحية وفي شرح الوجيز: وكل ملهب يكفر به معتقده“ (رد المحتار علی الدر المختار ۱۳۵/۳)، ”ولا نكحوا المشركات حتى يؤمن ولائمة مؤمنة خير من مشركة ولو أعجبتكم ولا نكحوا المشركين حتى يؤمنوا، ولعبد مؤمن خير من مشرك ولو أعجبكم....“ (سورہ بقرہ ۲۲۱)۔

تائید حضرت عمر فاروقؓ کے رجحانات سے بھی ہوتی ہے (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۱۲/۱۴۰۰ھ

اہل کتاب عورتوں سے نکاح:

اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے یا نہیں، اور کیا آج کل کے عیسائی یہودی اہل کتاب میں داخل ہیں یا نہیں؟

دینی معاملات میں بیوی کی تنبیہ کا حکم:

اپنی بیوی کو دینی یا دنیوی معاملات میں مارا جاسکتا ہے یا نہیں، اور کس حد تک مارنے کی اجازت ہے؟
نابالغہ اولاد کو مارنے کی حد:

اپنی اولاد کو نابالغہ ہو یا بالغہ مارنے میں شریعت نے کتنی حد مقرر فرمائی ہے؟
متعہ کا حکم شرعی:

متعہ کے بارے میں اگر قرآنی آیات ہوں تو تحریر فرما کر مشکوٰۃ فرمائیں!

پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرنے سے دوسری بیوی مستحق وراثت ہوگی یا نہیں؟

ایک شخص نے پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کر لی کچھ عرصہ کے بعد شوہر کا انتقال ہو گیا، پہلی بیوی کا دعویٰ ہے کہ مرحوم نے میری اجازت کے بغیر دوسری شادی کی تھی، اس لئے دوسری بیوی حق وراثت سے محروم ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ دونوں بیویوں کو پوری پوری وراثت ملے گی یا صرف پہلی کو؟

حافظ محمد صفدر خاں

الجواب وبالله التوفیق:

کتابیہ عورت سے خواہ نصرانیہ ہو یا یہودیہ مسلمان مرد سے نکاح کی اجازت نص قرآنی سے معلوم ہوتی ہے اور کتابی

۱۔ ”ویجوز لزواج الکتابات والاولیٰ ان لا یفعل“ (رد المحتار علی الدر المختار ۳/۱۳۳)، ”والمحصنات من المین اولوا الکتاب من لکم اذا آتیوہن أجورہن...“ (سورہ مائدہ ۵۵)۔

سے مراد یہ ہے کہ اپنے نبی مرسل اور کتاب منزل من السماء (تورات و انجیل) پر ان کا اعتقاد ہو تو ان سے نکاح درست ہے، لیکن فقہائے کرام نے دوسرے دلائل سے حربی کتابیہ سے نکاح کرنے کو مکروہ (تحریمی) فرمایا ہے، اس لئے کہ اس سے فتنہ کے دروازے کھلنے کا خوف ہے، اس لئے اگر ہو سکے تو مسلمہ بنا کر نکاح کرے، ورنہ احتیاط کرنا اولیٰ ہے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی اگر سرکشی کرے یا نامرمانی کرے تو سب سے اول طریقہ وعظ و نصیحت کا ہے، اگر وہ محض وعظ و نصیحت سے باز نہ آئے تو بستر سے الگ کر دے، شاید اس علیحدگی سے شوہر کی ناراضگی کا احساس کر کے اپنے فعل پر مادم ہو اور عبرت پکڑے، اس کے باوجود بھی راہ راست پر نہ آئے تو پھر مارنے کی اجازت دی ہے، لیکن حدیث شریف میں اس کا بیان ہے کہ چہرہ و مذاکیر پر جائز نہیں ہے، نہ اس طرح مارے کہ بدن کہیں سے الگ ہو جائے یا کہیں کی ہڈی ٹوٹ جائے یا سیاہ دھبے پڑ جائیں یا ایسی مارجس کا اثر قلب پر پڑتا ہو یہ بھی ناجائز ہوگا۔

پس ضرورت کے وقت اعتدال کے ساتھ مارے، نیز ہاتھ سے مارے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مسواک وغیرہ جیسی چیز سے مارے، ”عن ابن عباس أنه يضرب بالسواك ونحوه“ (۱) اگر حد مذکور سے تجاوز کر کے مارا، یا چہرہ و مذاکیر پر مارا خواہ ایک ہی ہاتھ سے کیوں نہ مارا ہو گنہگار ہوگا۔

اگر شوہر نے بیوی کو مارا (خواہ ترک نماز کے سبب ہو یا گھر سے بلا اجازت باہر نکلنے پر اور کسی وجہ سے مارا) اور وہ اس سے مرگئی تو شوہر اس کا ضامن ہوگا۔ ”ما لگیر یہ“ میں ہے:

”اگر شوہر نے اپنی بیوی کو بسبب ترک نماز کے، یا بسبب بے مرضی شوہر کے گھر سے باہر نکلنے کے تعزیر دی۔ پس وہ عورت اس تعزیر سے مرگئی تو شوہر اس کا ضامن ہوگا“ (۲)۔

بعض علماء کے نزدیک عورت کو ترک نماز پر بھی مارنا جائز نہیں۔ شامیؒ میں ہے: ”وذكر الحاكم لا يضرب امرأته على ترك الصلوة“ (۳)۔

سو بدائی و مزائیں وعظ و نصیحت اور بستر سے الگ کرنا ملحوظ رہے کہ جدائی صرف بستر میں ہو مکان کی جدائی نہ کرے، یعنی اس کو گھر سے باہر نکالے، بلکہ خود عورت کو تنہا مکان میں چھوڑ کر چلا جائے یہ شریفانہ سزائیں ہیں، مگر تیسری سزا مار پیٹ کو (اجازت کے باوجود) حضور ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے۔

۱- روح المعانی ۴/۳۷۷۔

۲- فتاویٰ ما لگیر یہ ۳/۳۸۱۔

۳- شامی ۳/۲۶۲۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "وَلَنْ يَضْرِبَ خِيَارَكُمْ" (یعنی اچھے مرد یہ ماریٹ کی سز اور توں کو نہ دیں گے)۔
ضرب الصبیان کا بھی وہی حکم ہے جو نمبر سہ پر گذرا کہ چہرہ و مذاکیر کے سوا بدن پر مارے، زیادہ نہ مارے، نہ لکڑی سے مارے، اور یہ بھی نماز کے ترک پر آیا ہے اور عمر دس سال یا اس کے قریب ہو شامی میں ہے:
"وَالْمُرَادُ ضَرْبُ بَدَنِ بِيَدِهِ لَا بِخَشَبَةٍ" حدیث میں جو آیا ہے کہ بچے کو نماز پر مارے تو اس سے مراد ہاتھ سے مارنا ہے، لکڑی یا ڈنڈے سے نہیں، باقی امور دینیہ اور دنیویہ کے لئے مارنا درست نہیں، زبانی کلام پر اکتفاء کیا جائے اور اگر لڑکی بالغہ ہو تو باپ کا اس کو مارنا درست نہیں۔

حرمت متعہ پر قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ صریح ہے: "وَالَّذِينَ هُمْ لِغُورِجِهِمْ حَافِظُونَ الْأَعْلَىٰ أَرْوَاجِهِمْ أَوْ مَمْلُكَتٍ أَيْمَانِهِمْ فَانْهَمُوا عَنْ مَلُومِينَ فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعُدُونَ" (۱)۔
(اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامے ہیں، مگر اپنی ازواج پر یا اپنے ہاتھ کے مال باندیوں پر سوان پر کچھ الزام نہیں، پھر جو کوئی اس کے سوا ڈھونڈے سو وہی ہے حد سے تجاوز کرنے والا)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعہ کا مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا حرام ہے اور میں تو اس کی حرمت کو صریح قرآن کریم سے پاتا ہوں، پھر مذکورہ بالا آیت تلاوت کی "تفسیر مواہب الرحمن" (۲)۔
اس کے علاوہ حضرت امام مالکؒ موطا میں حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: "أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَىٰ عَنْ مَتَاعِ النِّسَاءِ يَوْمَ خَيْبَرَ (انتہی)" (۳)۔ اسی طرح فرقہ امامیہ کی ایک معتبر کتاب "الاستبصار" میں حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: "قَالَ حُرْمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: لِحُومِ الْحِمْرِ الْأَهْلِيَّةِ وَنِكَاحِ الْمَتَاعَةِ" نیز شیعوں کے امام علامہ احقاق الحق لکھتے ہیں کہ متعہ کے حرام ہونے پر ائمہ اربعہ کا کوئی اختلاف نہیں۔

اس سے پتہ چلا کہ متعہ کے حرام ہونے پر اہل سنت کے علاوہ شیعہ کی کتابوں میں بھی اس کے شواہد موجود ہیں، اس کے باوجود اگر اس میں کوئی کلام کرے تو اس کی بدبختی اور بد نصیبی کی انتہا ہے۔

۱۔ شوہر کے نکاح ثانی کے لئے پہلی بیوی کی اجازت لازمی اور فرض نہیں۔ کما اشارہ الیہ قولہ تعالیٰ:

۱۔ سورہ مومنون: ۵۵-۵۷۔

۲۔ ص ۶ پ ۱۸۔

۳۔ موطا باب نکاح المتعہ حدیث: ۶۹۲ عن علی بن طالب ۶۔

”فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع“ (۱) دوسری بیوی شرعاً اس کی بیوی ہے، اس کے انتقال کے بعد دوسری بیوی کو بھی پہلی کی طرح پورا پورا حق وراثت ملے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند بہار پور

شادی کے موقع پر عورتوں کا گیت گانا یا نظم پڑھنا:

۱۔ بعض جگہ شادی بیاہ میں یہ رواج ہے کہ عورتیں جمع ہو کر گیت گاتی ہیں اور ایسے لوگ جمع ہوتے ہیں کہ جن میں اکثر غیر محرم مرد ہوتے ہیں۔

۲۔ بعض جگہ ایسا ہے کہ گیت وغیرہ تو نہیں گاتے، لیکن غیر محرم مردوں کے مجمع میں خصوصاً جبکہ بارات آتی ہے تو بارات کے سامنے مکان کے اوپر عورتیں کھڑی ہو جاتی ہیں اور نعت اور نظمیں وغیرہ خوش الحانی سے اور خوب سریلی آواز سے پڑھتی ہیں، ہر مصرع کے بعد لا لا للہ لا اللہ وغیرہ الفاظ کہتی ہیں اس کو جائز بلکہ باعث ثواب سمجھ کر پڑھا جاتا ہے۔

۳۔ ایسے عی مجالس میں اکثر ایسے الفاظ پڑھتی ہیں، حسن کے لئے میں نے منہدی منگائی مہندی لگاؤ، جناب رسول اللہ ﷺ یا حسن کے لئے میں نے گانا بنایا گانا گانا پہن لو جناب رسول اللہ ﷺ، اس قسم کے اشعار وغیرہ پڑھتی ہیں اور تمام مجمع کو سناتی ہیں اور گرماتی ہیں۔

دریافت ہے کہ ایسے امور جائز ہیں یا کہ نہیں اور حضور ﷺ کی طرف مہندی گانا اور گانا وغیرہ کا اس طرح انتساب اور شادی وغیرہ کے مجمع میں پڑھنا آیا یہ تو ہیں نبوت ہے کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔ ہر گانا بجانا جو محض کھیل و تماشہ کے لئے کیا جاتا ہے شرعاً جائز نہیں ہے، ان الملاحی کلہا حرام اور پھر جو طریقہ اپنے عورتوں کے گانے کا بیان کیا ہے یہ تو بالکل حد سے گزرا ہوا ہے یہ گیت گانا اور انکو شوق سے سننا اور اس سے لذت حاصل کرنا سب حرام ہے۔

”قال ابن مسعودٌ وصوت اللہو والغناء یبیت النفاق کما یبیت السماء النبات، قلت وفی

الموازاة استماع صوت الملاهي كضرب قصب ونحوه حرام لقوله عليه الصلوة والسلام: استماع الملاهي معصية والجلوس عليها فسق والتلذذ بها كفر بالنعمة“ (۱)۔

۲- مذکورہ طریقہ پر غیر محرم مردوں کے مجمع کے سامنے چاہے وہ برات ہو یا غیر برات بلند مقام پر مع زیب و زینت کے جوان عورتوں کا بلا پردہ کامل کے کھڑا ہونا یا گانا اور نعتیں وغیرہ یا لا الہ الا اللہ مذکورہ طریقہ پر خوش الحانی کیساتھ پڑھنا، غیر محرم مردوں کو سنانا اور ان کا سننا تمام قطعاً حرام ہے، کیونکہ یہ خلاف شرع طریقہ ہے اور ثنادی میں اختیار کرنا داعی الی الفتنہ بھی ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے اور آزاد مسلمان عورتوں کو بلا ضرورت شرعیہ کے بلند آواز کرنا بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ عورت کی آواز میں بھی فتنہ ہے: ”صوت المرأة عورة بلا ضرورة شرعية تمنع المرأة الشابة عن كشف الوجه بين الرجال، لا لأنه عورة بل لخوف الفتنة“ (۲)، لقوله تعالى: ”ولا تهرجن تبرج الجاهلية الاولى“ ولقوله تعالى: ”غير متبرجات بزينة“ (۳) ”ولا يبدین زینتھن“ (۴)۔

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ جوان عورتوں کو بلا پردہ کامل غیر محرم کے سامنے آنا یا غیر محرم کے مجمع میں مذکورہ طریقہ پر گانے وغیرہ کا اختیار کرنا قطعاً حرام ہے، غیر محرم عورتوں سے تو قرآن بھی غیر محرم مردوں کو سننا جائز نہیں ہے، تو سریلی آواز سے نظم میں لا الہ الا اللہ غیر محرموں کو سنانا کیسے جائز ہو سکتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ ہم ثواب سمجھ کر سنتے ہیں یا سناتے ہیں یہ غلط کہتے ہیں یہ محض اپنے نفس کو تباہی کے گڑھے میں ڈالتا ہے، مسلمان عورتوں کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، انکو زمین پر زور سے چلنے کی بھی ممانعت ہے۔

”كما قال الله تعالى: ”ولا يضر بن بارجلهن ليعلم ما يخفين من زينتهن“ (۵)، قال تعالى: ”يلدين عليهن من جلابيبهن“ (۶)، وقال ابن عباس وابو عبيدة: ”امرت النساء المومنات ان يغطين رؤسهن ووجوهن بالجلابيب الا عينا ليعلم انها حرائر“۔

۱- در مختار ۲/۲۳۸۔

۲- در مختار۔

۳- سورة النور ۱۸/۶۰۔

۴- سورة النور ۱۸/۳۱۔

۵- سورة النور ۱۸/۳۱۔

۶- سورة الاحزاب ۲۲/۵۹۔

مندرجہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو مذکورہ طریقہ اختیار کرنا اور مردوں کو یہ طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے عورتوں کو پردہ میں رہنا چاہئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشيطان“ (۱)۔

سورہ حضور ﷺ کی طرف ہر انگلی وغیرہ کی نسبت کر کے گانا گناہ ہے مسلمانوں کی شان یہ نہیں ہے، کیونکہ یہ شعار کفار کا ہے، جو مسلمان یہ رسم ادا کرے گا یا اسکو اچھا جانے گا وہ رسم کفار کی تائید کرتا ہے اور پھر ان رسموں کو حضور ﷺ کی طرف نسبت کرنا سر اسر توہین نبوت ہے، مسلمانوں کو ایسی حرکتوں سے قطعاً باز رہنا چاہئے، نیز اور لوگوں کو بھی باز رکھنا چاہئے، قال علیہ الصلوٰۃ والسلام: ”من رأى منكم منكراً فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان“ (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۱۰/۱۳۸۵ھ

قرآن کریم کی تلاوت سے روکنے اور اس کی بے حرمتی کرنے والے شوہر کے ساتھ بیوی کا سلوک:

ایک لڑکی ہمیشہ بیچ وقتی نماز ادا کرتی ہے اور قرآن شریف فجر کی نماز کے بعد تلاوت کیا کرتی ہے، ایک دوسرے اپنے شوہر کے مکان گئی بھی اور آئی بھی ہے، اس کے شوہر کا اخلاق اچھا نہیں ہے، اس سال رمضان شریف میں اپنے شوہر کے گھر تھی، ایک روز لڑکی بعد نماز قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھی اس کا شوہر آیا اور اس نے کہا جو پوچھی تم پڑھ رہی ہو تمہارا پاؤں اور ہاتھ میں مار کر توڑ دوں گا اور اس پوچھی کو پھاڑ ڈالوں گا، لڑکی نے قرآن شریف کا پڑھنا بند نہیں کیا، پھر دوبارہ بولا بند کر دو اگر پڑھنا بند نہیں کرتی تو میں آگ لگا کر جاؤں گا اور کلام پاک کی بڑی بے حرمتی کی اور کلام پاک کو گالی دیکر کہا کہ میں اس کو جاؤں گا تو ایسے خامد کے ساتھ لڑکی کا کیسے گذر بسر ہو سکتا ہے کیسے رہن سہن ہو سکتا ہے؟

شہاب الدین خاں (اسلامیہ اسکول چھوڑا پوسٹ پٹنہ ضلع پٹنہ گڑھ پولی)

الجواب وبالله التوفيق:

سوال کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شرابی میں لڑکی کے بھی سخت رویہ کو دخل ہے، جیسا کہ سوال کے اس

۱- رواہ ابن ماجہ ۱/۲۳۲، بیہق، مشکوٰۃ، دیوبند۔

۲- مسلم ۱/۵۱، مکتبہ رشیدیہ دہلی۔

خط کشیدہ جملہ (پھر دوبارہ بولا بند کرو اگر پڑھنا بند نہیں کرتی تو الخ) سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی شوہر نے تلاوت بند کرنے کا حکم دیا ہوگا اور نہ ماننے پر اس تشدد پر اتر آیا ہے، حالانکہ بعد اسی وقت تلاوت کرنا واجب شرعی نہیں تھا، بہت سے بہت مباح یا مستحب تھا اور شوہر کے حکم کی تعمیل واجب تھی (۱)، اس لئے لڑکی پر واجب تھا کہ شوہر کے حکم کی تعمیل کر لیتی اور پھر بعد میں شوہر کا غصہ جب اتر جاتا تو اسکو سمجھا لیتی، غرض دونوں کی غلطی کو اس جرم میں ڈھل ہو گیا، اور دونوں ہی (میاں بیوی) اس گناہ کے کم و بیش سبب بن گئے، اس لئے دونوں ہی کو مل جل کر نباہ کرنے کی تلقین کرنی اور مسائل سیکھنے کی اہمیت اور قرآن پاک کی عظمت و عزت کے بتلانے کی ضرورت ہے، اگر دونوں تائب ہو کر اپنے حالات سدھار لیں تو التائب من الذنب کمن لا ذنب له اور کما قال علیہ السلام (۲) کی فضیلت و ثواب کے عند اللہ مستحق ہو جائیں گے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۱۱/۱۴۰۰ھ

مباشرت سے قبل ولیمہ:

بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ولیمہ کا کھانا تب تک درست نہیں ہوتا جب تک کے پچھلی رات دلہا دلہن آپس میں مباشرت نہ کر لیں، یہ دعویٰ شرع سے کس حد تک قریب ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ جب تک زوجین مباشرت نہ کر لیں دعوت ولیمہ کا کھانا درست نہیں ہوتا ہے، یہ بالکل غلط اور لغو ہے، بلکہ دعوت ولیمہ کا مطلب یہ ہے کہ زوجین کی پہلی شب کی ملاقات کے بعد جو دعوت کی جاتی ہے اس کو ولیمہ کہا جاتا ہے، جیسا کہ ایک روایت میں ہے:

”قال أولم رسول الله ﷺ حين بنى زينب بنت جحش فأشبع الناس خبزاً ولحماً“ رواه

۱- حدیث میں ہے ”لو کانت امراً واحداً أن یسجد لأحد لا مروت النساء أن یسجدن لأزواجهن لما جعل الله لهم علیهن من الحق“ (سنن ابوداؤد ۲/۲۴۳، کتاب النکاح باب فی حق خروج علی المرأة حدیث ۲۱۳۰)، ”وعن النبی ﷺ إذا دعا الرجل امرأته إلى فراشه فأبت فلیم ذنابه فبانت غضبان علیها لعنہا الملائكة حتی یصبح“ (خوارزمی حدیث ۲۱۳۱)۔

۲- سنن ابن ماجہ ۲/۱۳۲۰ کتاب النکاح باب ذکر التوبہ حدیث ۴۲۵۰۔

شادی و بارات میں شرکت کا شرعی حکم:

- ۱- آج کل جو ہمارے یہاں شادیاں ہوتی ہیں اس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟
- ۲- زید کہتا ہے بارات میں شرکت حرام ہے، کیونکہ بارات ہنود کی رسم ہے۔ بارات نکالنا ہے بری سے اور بری کہتے ہیں ہندوئی رسم کو، دلیل میں بہشتی زیور پیش کرتا ہے۔ کیا زید کا مذکورہ بیان صحیح ہے، اگر نہیں تو پھر حکم کیا ہے؟
- ۳- بارات میں جانا کیسا ہے اگر لڑکی والا بارات لانے کی اجازت دے تو کیا حکم ہے اور اس کے اندر باجا وغیرہ نہیں ہے؟

- ۴- زید کہتا ہے کہ لڑکیوں کی شادی میں اعزہ و قارب کو کھانا درست نہیں ہے اور دلیل میں حضور اکرم ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا کی شادی کو پیش کرتا ہے تو کیا زید کا مذکورہ بیان اور استدلال صحیح ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

- ۱- اگر وہ شادی منکرات و رسومات سے پاک ہو اور طریق مسنون پر ہو یعنی ہو تو اس میں شرکت کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ نکاح میں شرکت باعث ثواب ہے۔
- ۲- بارات بری سے نکالنا ہے یہ تحقیق اگر زید کی ہے تو اس کی دلیل مطلوب ہے۔ اور اگر مولانا تھانویؒ کی نقل کی ہے تو حوالہ درکار ہے، کیونکہ مولانا تھانویؒ نے بہشتی زیور یا اصلاح الرسوم میں شادی کے رسوم کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بات کہیں نہیں ہے کہ بارات بری سے نکالنا ہے اور یہ اہل ہنود کی رسم ہے، صرف اتنی بات ہے کہ ”بری“ بارات کا اصل مقصد اور اہم رکن ہے، جس کو اہل زمانہ نے خواہ مخواہ اپنے ذمہ لازم کر لیا اور اس سے پہلے یہ بات کہی ہے کہ کسی زمانے میں چورڈاکو کے خطرے سے حفاظت کے لئے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی ہوگی کہ دولہا کے ساتھ اور لوگ بھی رہیں، لہذا اس زمانے میں بھی باراتوں کی تعداد ضرورت و استطاعت کی حد تک میں تو کوئی حرج نہیں ہے جس سے لڑکی والوں پر بار نہ پڑے اور جب

۱- صحیح بخاری مع فتح الباری ۸/۵۲۸ کتاب التفسیر باب لا تدخلو بیوت النبی... الخ حدیث ۵۳۷۳۔

ضرورت سے بڑھ کر ریا عیانمو کے لئے ہو یا غیر مشروع چیزوں کی شمولیت ہو تو ایسی بات میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے۔

۳- چونکہ اس زمانہ میں شادیوں میں عام طور سے تکلفات کا التزام کیا جاتا ہے اور اس کو ایک ضروری چیز سمجھا جاتا ہے، اگر لڑکی والے نہیں پوچھتے تو شکایت کی جاتی ہے، بعض جگہ اس سے بڑھ کر نیوٹہ وغیرہ دینے کا رواج ہے جس میں بدلہ اور ریا و افتخار کا پورا التزام کیا جاتا ہے یہ سب چیزیں ناجائز ہیں، اس لئے روکا جاتا ہے، ورنہ اعزہ و احباب کو حد شرع میں رہتے ہوئے کھانا کھلانے میں کوئی مضائقہ نہیں اور حضرت فاطمہ زہرہؓ کے نکاح کے وقت حضرت بلالؓ کو حکم دیا گیا کہ وہ دعوت کا انتظام کریں، اور اس دعوت کو دعوت مسنون ہونے کی خواہش ظاہر کی، لہذا زید کا الطعام طعام عند النکاح کے عدم جواز پر حضرت فاطمہ زہرہؓ کے نکاح کو پیش کرنا قلعاعج نہیں ہے۔ آپ ﷺ کے اس الطعام طعام سے دعوت و لیے ہر گز مراد نہیں لی جاسکتی، اس واسطے کہ دعوت و لیے کی مدت شب زفاف کے بعد ہے، اور یہاں زفاف کے پہلے عند النکاح فوراً دعوت کا تذکرہ مل رہا ہے جیسا کہ اس روایت میں ہے: ”(قال علی) یا رسول اللہ ﷺ متی تبتنی، قال: الثالثة إن شاء الله ثم دعا بلالا فقال: یا بلال انی زوجت ابنتی ابن عمی و أنا أحب أن یکون من سنة أمتی إطعام الطعام عند النکاح فأت الغنم فخذ شاة و اربعة امداد أو خمسة فاجعل فی قصعة لعلی أجمع علیها المهاجرین و الأنصار، فإذا فرغت فاذهنی بها فانطلق ففعل ما أمره ثم أتاه بقصعة فوضعها بین یدیه فطعن رسول الله ﷺ فی رأسها ثم قال: ادخل علی الناس زفة زفة (الی قوله) و انی دافعها إلیه (ای إلی علی) الآن إن شاء الله“ (روى الحديث بطوله عبد الرزاق فى مسنده بسنده)، فقط والله أعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

لازمی رجسٹریشن نکاح کا شرعی حکم:

حکومت یوپی نے مرکزی حکومت سے درخواست کی ہے کہ ایک مرکزی نکاح رجسٹریشن ایکٹ بنا دیا جائے تاکہ اس قانون کے مطابق پورے ملک میں ہونے والے نکاحوں کا اندراج وغیرہ مکمل ہو سکے، حکومت یوپی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ نکاح کے رجسٹریشن کو ابھی تک حکومت نے لازمی قرار نہیں دیا ہے، جس کی وجہ سے حکومت عدلیہ اور عوام کے پاس کسی بھی نکاح کا موثق ریکارڈ کا موجود رہنا ضروری نہیں ہے، جس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ جب زن و شوہر میں تعلقات خراب ہوتے ہیں اور معاملات کی تحقیق کی نوبت آتی ہے تو اطمینان بخش کو ایسی نہیں مل پاتی، اکثر و بیشتر دین مہر کا مسئلہ بہت اختلافی

بن جاتا ہے اور صحیح طور پر دین مہر نہ گواہوں کو یاد رہتا ہے یا دوسرے حاضرین مجلس نکاح کو، یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ گواہ اکثر بوڑھے لوگ بنائے جاتے ہیں جن کے دنیا سے گزر جانے کے بعد گواہی اور مہر کے ثبوت کا مسئلہ قانونی لحاظ سے زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ حکومت یوپی کا خیال ہے کہ ان دشواریوں کو دور کرنے اور نکاح کے مکمل ریکارڈ کو محفوظ رکھنے کے لئے نکاح کے اندراج کو لازمی قرار دیا جانا چاہیے تاکہ ہر ایک نکاح کی تفصیلات کا معتمد علیہ وثیقہ موجود رہے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرکزی حکومت کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ نکاح رجسٹریشن ایکٹ ایسا بنایا جائے کہ رجسٹریشن کی حیثیت نکاح کے لئے شرط کی سی ہو جائے اور اس قانون سازی کے بعد ہونے والا وہی نکاح حکومت اور عدلیہ کی نگاہ میں معتبر ہو جس کے اندراجات حکومت کے قانون کے مطابق کرائے جاتے ہوں اور نفاذ قانون کے بعد وہ سارے نکاح جو رجسٹریشن کے بغیر ہوں حکومت اور عدلیہ کی نگاہ میں غیر معتبر سمجھے جائیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت کو ایک دوسرا مشورہ بھی دیا گیا ہے کہ نکاح رجسٹریشن قانون اس طور پر بنایا جائے اگر اس قانون کے نفاذ کے بعد کوئی شخص رجسٹریشن کے بغیر نکاح کر لے تو وہ نکاح تو صحیح اور حکومت اور عدلیہ کے نزدیک قابل قبول ہوگا، لیکن رجسٹریشن نہ کرانے کو ایک جرم قرار دیا جائے اور جو بھی اس جرم کا مرتکب ہو اس کے لئے جرمانہ یا جیل کی سزا تجویز کر دی جائے، کو یا اس طور پر رجسٹریشن نہیں کرانے سے نکاح تو متاثر نہیں ہوگا، لیکن نکاح کی تفصیلات کے اندراج اور کسی بھی اٹھنے والے اختلاف کے لئے شہادت و ثبوت کی خاطر رجسٹریشن کا نہ کرنا ایک مستقل جرم قرار دیا جائے گا جس کی سزا کی جاسکے گی، ان تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ نکاح کے رجسٹریشن کے سلسلہ میں حکومت یوپی کس انداز پر غور و فکر کر رہی ہے اور حکومت میں موجودہ کچھ اور لوگوں کا نقطہ نظر کیا ہے، ایسی حالت میں ضروری ہے کہ معاملہ کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور فیصلہ کیا جائے کہ رجسٹریشن کو اگر نکاح کے لئے شرط قرار دیا جائے اور رجسٹریشن کے بغیر نکاح کا عدم سمجھا جائے تو فقہی لحاظ سے یہ رجسٹریشن قابل قبول ہوگا، رجسٹریشن کو اگر نکاح کیلئے شرط قرار نہیں بنایا جائے، لیکن شہادت اور ثبوت کی خاطر رجسٹریشن نہیں کرانے کو تعزیری جرم قرار دیا جائے اور اس کے لئے کوئی سزا تجویز کی جائے تو فقہی لحاظ سے ایسے رجسٹریشن کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ مسئلہ کی نزاکت و اہمیت کے پیش نظر آپ سے جلد سے جلد جواب دینے کی درخواست ہے ۶ دسمبر ۱۹۸۱ء کوئی دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں مسئلہ کی قانونی اور فقہی جہتوں پر غور ہوگا اس لئے براہ کرم ماہ ۲۵ نومبر تک اپنی رائے ضرور ارسال فرمائیں تاکہ فکر و بحث میں آپ کی گرفتار رائے سے استفادہ کیا جاسکے۔

منت اللہ (جنرل سکریٹری، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ خانقاہ سوگمیر، ۶ بحرم ۱۳۰۲ھ ۳۰ نومبر ۱۹۸۱ء)

الجواب وبالله التوفیق:

امور مستفسرہ کے متعلق عرض ہے کہ رجسٹریشن کو اگر نکاح کے لئے شرط قرار دیا جائے اور رجسٹریشن کے بغیر نکاح کا عدم سمجھا جائے تو شرعیاً صحیح نہیں اور نہ ایسی شرط شرعاً قابل قبول ہو سکتی ہے (۱)، اسی طرح رجسٹریشن نہ کرانے کو تعزیری جرم قرار دیا جائے اور رجسٹریشن نہ کرانے پر کوئی سزا یا جرمانہ تجویز کیا جائے تو شرعیاً بھی درست نہ ہوگا، بلکہ ہندوستان کی مسلم پسماندہ قوم پر بے پناہ ظلم کا دروازہ بھی کھل جائے گا اور امن برباد ہوگا۔ فقط والسلام مع الاحترام

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۱/۱۳۰۲ھ

نا قابل مجامعت لڑکی سے نکاح کا حکم:

ہندہ کو لیڈی ڈاکٹر نے جواب دیا تھا کہ یہ لڑکی شادی کے قابل نہیں ہے، پھر بھی اس کے ماں باپ نے اس کی شادی زید کے ساتھ کر دی، جب ہندہ سرسلی آئی تو راز کھلا کہ یہ صحبت کے لائق نہیں ہے وہ دوبارہ اپنے میکہ چلی گئی ہندہ کے باپ زید سے طلاق مانگتے ہیں اور زیورات وغیرہ زید کا لے لیا ہے، زید کے کسی سامان کو واپس نہیں کرنا چاہتے ہیں، ایسی صورت میں کیا حکم ہے کہ ان کا نکاح ہوا ہے یا کہ نہیں اگر نکاح کرنا صحیح ہے تو زید طلاق دینے میں گنہگار تو نہیں ہوگا، اگر نکاح درست نہیں ہے تو ایسی صورت میں ایسا نکاح پڑھنا پڑھانا اور مجلس کی شرکت کا کیا حکم ہے؟۔ بیو اتوجروا

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں نکاح منعقد ہو گیا ہے، اگر مقصد زوجیت کے قابل نہیں ہے تو طلاق دیدینے میں زید گنہگار نہ ہوگا، ہندہ کے والد کو چاہئے کہ زید کے زیورات وغیرہ سب واپس کر دے، اس لئے کہ قصور ہندہ کی طرف سے ہے، بلکہ ہندہ کے والد کو مناسب ہے کہ میر بھی معاف کرادے بالخصوص جب خود ہی طلاق چاہتا ہے یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ لیڈی ڈاکٹر نے لڑکی عورت (مؤنث عی) سمجھ کر کہا ہے اور اگر لڑکی کی حقیقت میں مؤنث عورت نہ ہو بلکہ خنثی مشکل ہو تو اس کا حکم دوسرا ہوگا (۲)، لہذا لیڈی ڈاکٹر سے تحقیق کی جائے اگر وہ خنثی مشکل بتائے تو پھر لکھ کر حکم معلوم کیجئے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۱/۱۳۰۲ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود علی عنہ

۱- ”النکاح یعقد بالإيجاب والقبول بلفظین معبر بہما عن الماضي“ (ہدایہ ۲/۲۸۵)۔

۲- ”وفی العیادۃ محلہ المراءۃ لم یمنع من نکاحها مالم یمنع فیخرج الذکر والخنی مطلقاً“ (رد المحتار ۴/۶۰، مکتبہ زکریا)۔

بلا اجازت نکاح ہوا اور لڑکی رخصت ہو کر سسرال چلی گئی تو کیا نکاح ہو گیا؟

ایک لڑکی جس کی عمر ۲۴ سال ہے، شادی ہوئے آٹھ سال ہوا، لیکن اب تک شوہر بیوی کا تعلق قائم نہیں ہوا اور نہ کبھی وہ اپنی مرضی سے سسرال گئی ہے، ایک آدھ بار خلوت بھی ہوئی مگر وہ اس طرح کہ لڑکی اپنے نیکے گھر کے اندر سوئی ہوئی تھی، لڑکا جھٹکے سے اندر داخل ہو گیا، جب لڑکی بیدار ہوئی تو جھپکا چھوری کر کے باہر بھاگ گئی لڑکا ماکا میاب رہ گیا، کبھی کبھار ماں باپ اور دیگر رشتہ دار کے دباؤ سے ایک دو دن کے لئے سسرال بھی گئی، صرف دن بھر کے لئے رات کو اپنی ماں کے یہاں سوتی تھی، لیکن اب تک وہ جانے سے انکار کرتی ہے اور کہتی ہے کہ عقد کے وقت مجھ سے اجازت لئے بغیر نکاح پر لٹھا دیا گیا ہے، لہذا میری شادی ہی نہیں ہوئی، میں جاؤں ہی کیوں، لڑکا جس سے شادی ہوئی ہے وہ لڑکی کا میرا بھائی ہے اور ایک ہی آنگن میں رہتا ہے، صرف کمرہ الگ الگ ہے، لڑکی شادی کے قبل ہی سے یعنی جب سے شادی کی بات چلی اشارے کنائے سے اپنی ماضی مندی ظاہر کرتی رہی ہے کہ میں اس لڑکے سے شادی نہیں کروں گی، اس کے ولی اور تمام رشتہ دار بھی اس بات کو دیکھ رہے تھے، لیکن اس کے ماں باپ نے زبردستی شادی کر دی ہے، اب لڑکی جانے سے براہ انکار کرتی ہے اور لڑکی پر بھی لکھی ہے اور لڑکا پڑھا ہوا تو ہے لیکن سادہ سدا ہے اور لڑکی شادی کے دن بھی سسرال نہیں گئی، یعنی خلوت اس وقت بھی نہیں ہوئی، اب لڑکا رخصتی کے لئے کہتا ہے، لیکن وہ نہیں جاتی اور انکار کرتی ہے وہ کہتی ہے کہ وہ دوسری شادی کر لے میں نہیں جاؤں گی، اس نے شوہر کے یہاں کی کوئی چیز استعمال نہیں کی ہے، والدین کے دھمکانے سے بھی ایک آدھ مرتبہ استعمال کر لیا لڑکا طلاق دینے سے انکار کرتا ہے، ایسی صورت میں آپ کیا کہتے ہیں لڑکی اگر دوسری جگہ شادی کرنا چاہے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق :

حسب تحریر سوال اس وقت لڑکی کی عمر ۲۴ برس ہے، ۸ سال قبل شادی ہوئی تو بوقت نکاح ۱۶ سال کی بالغہ غیر شادی شدہ باکرہ تھی۔ اور نکاح باپ نے کیا۔

لہذا صورت مسئلہ میں بوقت عقد نکاح اجازت لیتے ہوئے لڑکی نے سکوت کیا تھا اس وقت انکار نہیں کیا تھا یا انکار کیا تھا مگر باپ نے زور زبردستی نکاح پڑھا دیا تھا، اس وقت انکار نہیں کیا اور رخصت کر دی گئی اور وہ خاموشی کے ساتھ رخصت ہو گئی ان دونوں صورتوں میں نکاح ہو گیا ہے، لڑکی کا شادی سے پہلے بوقت تذکرہ اپنی ماضی مندی کا ظاہر کرنا اس پر اثر انداز نہ ہوگا۔

”لوجود علة صحة النکاح وهي الرضاء أو الإکراه كما صرح به الشامي حيث قال: إذا حقيقة الرضاء غير مشروطة في النکاح لصحته في الإکراه ثم قال: عباراتهم مطلقة في ان نکاح المکره صحيح كطلاقه، ولفظ المکره شامل للرجل والمرأة“ اور اگر بوقت عقد نکاح لڑکی سے اجازت ہی نہیں لی اور نہ لڑکی کو اس وقت علم ہی ہوا تو اس صورت میں یہ نکاح لڑکی کی اجازت پر موقوف تھا، اگر علم ہونے پر رد کردیتی تو رد ہو جاتا، لیکن لڑکی نے ایسا نہیں کیا ہے جیسا کہ سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کبھی کبھار (متعدد بار) ایک دو دن کے لئے سسرال بھی گئی کو با دل نحو استہی گئی اور خواہ شب میں میکے آکر سوتی گردن میں پھر چلی گئی جیسا کہ متعدد دن کے لئے رخصتی میں جانے کی صورت میں ظاہر ہے اور گو ایک ہی مکان رہائش میں یہ صورت پیش آئی پس اس صورت میں تسلیم و اجازت ثابت ہوگئی اور نکاح نافذ ہو گیا ہے اور خاص کر جب لڑکی اتنی جبری ہے کہ شوہر نے اس کے ہوتے ہوئے کئی بار خلوت کیا اور چھپکا چھوری کر کے کمرہ سے باہر بھاگ گئی اگر چاہتی تو صاف انکار کردیتی اور سسرال بھی ہرگز نہ جاتی اور اگر باپ کے ڈر سے ایک دفعہ جاتی بھی تو پھر شب میکہ میں گزارنے کے بعد دوبارہ سسرال نہ جاتی اور میکہ کا کپڑا وغیرہ استعمال نہ کرتی وغیرہ وغیرہ یہ سب بہت سے بہت اس امر پر قرینہ ہیں کہ وہ اس نکاح سے خوش نہیں اور اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہے، صحت نکاح پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔

لڑکی اگر اس شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہے، اپنا دوسرا نکاح کرنا چاہتی ہے تو بلا وجہ شرعی ایسا کرنا سخت گناہ اور باعث عذاب خداوندی ہے، ایسی عورت پر بڑی سخت وعیدیں وارد ہیں اور سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت پر بھی لکھی ہے، ایک عزت دار گھرانے کی ہے، چال چلن بھی اچھا ہے تو شاید مسئلہ مسائل بھی جانتی ہو پھر اس کو ایسا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اسی شوہر کے ساتھ رہ کر اسلامی زندگی گزارنی چاہئے اور اگر وہ شرعی وجہ کے ساتھ تفریق کرنا چاہتی ہے تو شوہر سے طلاق حاصل کر لے یا مہر معاف کر کے یا کچھ اور بھی مال دینا پڑے دیگر خلع کرالے اور عدت (تین حیض) گزار کر اپنا دوسرا نکاح کرے بغیر اس کے نہیں، اور جب صورت حال ایسی ہے تو شوہر کے لئے خود ہی مناسب ہے کہ وہ اس کو طلاق دیکر اپنی دوسری شادی حسب منشاء کرے وہ اس میں گنہگار نہ ہوگا، ورنہ موجودہ صورت میں متعدد ازدواج (خوشگوار زندگی) نصیب ہونا دشوار ہے، علاوہ ازیں دیگر طرح طرح کے مناسبات میں ابتلاء کا سخت اندیشہ ہے جس سے بچنا واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پتہ ۸/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عہد

لڑکا اور لڑکی کے بالغ ہونے کی عمر کیا ہے؟

ایک پندرہ سالہ لڑکی بالغ ہے یا نابالغ ہے شرعاً و قانوناً لڑکی کس عمر میں اور لڑکا کس عمر میں بالغ ہوتا ہے۔

بالغہ ہونے کے بعد نکاح کے لئے ولی کی اجازت ضروری نہیں ہے:

۱۔ ایک یتیم لڑکی جس کا حقیقی باپ نہیں سوتا ہے اب لڑکی کا جائز وارث لڑکی کا حقیقی بھائی ہے یا چچا یا حقیقی ماں کیا بالغہ

ہونے کی صورت میں کون لڑکی مذکور کے عقد کی اجازت دے گا اور اس کے بغیر اذن کے نکاح نہ ہوگا یعنی وارث کی اجازت کی کیا بالغہ ہونے پر بھی ضرورت پڑے گی؟

الجواب وبالله التوفیق:

۱۔ اگر پندرہ سال کی ہو چکی ہے تو بالغ ہے معیار بلوغت شریعت مطہرہ میں یہ ہے کہ لڑکی کو اگر پندرہ سال سے پہلے

حیض آجائے یا حمل ٹھہر جائے تو پندرہ سال کی عمر سے پہلے بھی بالغ قرار دی جائے گی ورنہ پندرہ سال پورے ہونے پر حکم

بلوغت ہو جائے گا، اور لڑکے (مذکر) کو اگر پندرہ سال کی عمر سے قبل احتلام ہو جائے یا عورت کو حاملہ بنادے تو پندرہ سال کی

عمر سے قبل بھی بالغ قرار دیں گے ورنہ پندرہ سال ہو چکنے پر بالغ شمار ہوگا، ”وبلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال

والإنزال والحجریة بالاحتلام والحیض والحبل..... فإن لم یوجد فیہما شیء فحتى یتیم لکل منہما خمس

عشرة سنة به یفتی“ (۱)۔

۲۔ اس یتیم لڑکی کا ولی عقد نکاح کے لئے اس کا حقیقی بھائی ہوگا، بھائی کے ہوتے ہوئے چچا یا ماں نہ ہوگی، لڑکی کے

بالغ ہو جانے کے بعد غیر کفو میں یا کفو میں مہر مثل سے کم پر نکاح تو منعقد صحیح ہو جائے گا مگر اولیاء کو حق ہوگا کہ وہ منہج نکاح

کرالیں اور کفو میں اور مہر مثل کے مطابق نکاح کر لینے میں ولی سے نکاح کی اجازت لینا ضروری نہیں ہے خود کر سکتی ہے

، ”فنفذ نکاح حرة مکلفة بلا رضا ولی“ (۲)، لیکن اجازت لے لینا بہتر ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود علی عنہ ۱۲/۸/۱۳۸۵ھ

۱۔ الدر المختار کتاب النکاح ۲۲۵-۲۲۶۔

۲۔ الدر المختار ۱۵۵۔

لڑکے نے کہا: میں نے تم سے نکاح کر لیا لڑکی نے کہا: منظور ہے تو کیا نکاح ہو گیا؟
 زید نے بندہ کو دو بالغ شخص صحیح العقل صورتہ منشرع مسلم کے سامنے کہا کہ میں نے تم سے نکاح کیا تمکو منظور ہے،
 بندہ جو ایک بیوہ عورت تھی اس نے زبانی اقرار کر لیا کہ مجھے منظور ہے، اسی طرح تین بار زبان سے اقرار کر لیا ہے، یہ واقعہ ان
 دونوں نے ارادۃ اور حقیقتہ کیا ہے تو کیا اس فعل سے ازروئے شرع ان دونوں کا نکاح صحیح ہو جائے گا۔ بیوہ تو تہموا

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں بشرط صحت سوال اگر اس بیوہ کی عدت و قات ۴ ماہ و ۱۰ دن گزر چکی تھی تو نکاح شرعاً منعقد اور
 لازم ہو گیا اور دونوں عند اللہ اور عند الشرع میاں بیوی ہو گئے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۹/۱۳۸۵ھ
 الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند محمود علی عند

نکاح صحیح ہونے کے لئے سرکاری کاغذات میں اندراج ضروری نہیں ہے:

زید اور بندہ زن و شوہر شرعی ہیں زید کا بیان ہے کہ بندہ بد چلن ہے، چنانچہ ایک رشتہ کے بھائی سے پکڑی گئی، ہد نام
 ہو گئی تھی جس سے زید لاعلم تھا بندہ اس عمل کو نباہ کے لئے متعلقین بندہ پر وغیرہ نے زید کو ورغلا کر اور اکھڑا کر۔ روپیہ کا لالچ
 جوڑے کا دیکر بندہ کی شادی زید سے کر دی اور کسی قسم کا چیز وغیرہ نہیں دیا گیا ہے، زید درس و تدریس کا کام کرتا ہے، پھر بندہ
 اپنی سابقہ بیوی کے فوت ہونے پر یہ دوسرا عقد کر لیا، پھر بندہ بندہ کے ساتھ اپنی سابقہ بیوی کے بچے خالدہ اور فرزند نابالغ
 کو بھی بھجوا دیا ہے، اب زید اس بندہ کو طلاق دیکر خالدہ سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو عند الشرع کر سکتا ہے یا کہ نہیں اور چند
 گواہوں کی موجودگی میں زید نے بندہ کو طلاق دیدی ہے اور اس طرح چند گواہوں کی موجودگی میں عقد بھی خالدہ سے کر لیا
 ہے، لیکن یہ عقد سرکاری کاغذات میں درج نہیں ہے تو کیا یہ عقد عند الشرع درست ہے؟

۱- ”ويعقد بايجاب من أحدهما وقبول من الآخر وشرط سماع كل من العاقلين لفظ الآخر ليحقق رضاهما وشرط
 حضور شاهدين حرين أو حر واحد من مكلفين ما معين قولهما معاً“ (الدرمخ الزمر ۶۹، ۹۱)۔

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں زید نے کم از کم دو گواہوں کے سامنے بندہ کو واقعی طلاق دینے کے بعد اس کی عدت گزرنے کے بعد خالده سے نکاح کیا ہے تو خواہ سرکاری کاغذات میں درج نہیں کر لیا ہے، یہ نکاح خالده کا شرعاً درست اور جائز ہے اور خالده اور زید دونوں زن و شوہر کی طرح رہ سکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بیوی کا یہ کہنا کہ مسئلہ ملاؤں کی ڈھونگ ہے، سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا:

مریم نے شوہر زید سے معلوم کیا کہ چچا زاد بھائی کا نکاح چچا زاد بہن کیساتھ درست ہے؟ زید نے جواب دیا کہ درست ہے، مریم نے کہا کہ آج دنیا میں نئے نئے مسئلہ چل گئے ہیں جو سب ملاؤں کی ڈھونگ ہیں، مریم کا یہ عقیدہ اس کے شعور کے بعد ہی سے ہے تو مریم اور زید کا نکاح درست ہو لیا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

نکاح قائم اور درست ہے یہ جملہ شریعت سے انکار نہیں ہے بلکہ اپنی جہالت کی وجہ سے اس مسئلہ کو غلط مولویوں کا ڈھکوسلہ بازی سمجھتی ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۵/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

بالغہ کی اجازت کے بغیر نکاح:

بالغ لڑکی کا نکاح بلا اس کے دریافت کئے اور اجازت لئے بغیر گواہ کے جائز ہو لیا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

بغیر دو گواہوں کے کوئی نکاح صحیح نہیں ہوتا ہے (۱)، اور گواہوں کے ساتھ بالغ لڑکی کا نکاح اس سے بغیر پوچھے

۱۔ ”و شرط حضور شاہین“ (الدرع المرد ۸۷/۲)۔

پڑھائے تو اس کی اجازت پر مقوف ہوگا (۱)، اگر چاہے تو قبول کرے بشرطیکہ کفو میں ہو اور اگر غیر کفو میں ہوا ہو تو دو گواہوں کے سامنے بغیر اجازت ولی اقرب صحیح نہیں ہوتا ہے خواہ لڑکی بغیر اجازت ولی خود اجازت کیوں نہ دیدے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۱۰/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عہد

زانیہ کو نکاح میں رکھ سکتا ہے یا نہیں؟

ایک عورت جو شادی شدہ ہے جس کا دماغی توازن کافی عرصہ سے ٹھیک نہیں ہے، جس کے تین بچے بھی ہیں اس کے ساتھ ایک غیر مرد نے زنا کر لیا ہے جس کی شہادت ایک اور عورت ہے اور وہ شادی شدہ عورت خود بھی قمر کر رہی ہے، اب سوال یہ ہے کہ اسے اپنے نکاح میں رکھ لیا جاوے یا آزاد کر دیا جاوے، اگر میں نے اپنے نکاح میں اس کو رکھ لیا تو میں گنہگار نہ ہوں گا؟

الجواب وبالله التوفیق:

شوہر اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے (۳)، البتہ ایک حیض آنے تک اس کے پاس نہ جائے اس کو نکاح میں رکھ لینے سے شوہر پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

عمر دراز عورت سے نکاح:

کسی بڑی عمر کی عورت سے نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

ہاں! کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۱۰/۱۳۸۵ھ

۱- "ولا نجبر البالغة البكر على النكاح لا لقطاع الولاية بالبلوغ" (الدرمغ الرد ۱۵۹/۳)۔

۲- دیکھئے رد المحتار ۲۰۹/۳۔

۳- "لا يجب على الزوج تطبيق الفاجرة" (الدر المختار ۳۲۳/۳ باب الحرامات)۔

خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دیکر پھر آٹھ روز کے اندر نکاح کر لیا صحیح ہو یا نہیں؟

۱۔ ایک شخص نے رخصتی سے پہلے اپنی بیوی کو تین طلاق دی اور آٹھ روز کے اندر پھر نکاح ہو گیا ہے، تو نکاح ہو یا کہ نہیں؟ (اسی مرد سے)۔

۲۔ اس کے بعد مرد نے پھر ساس کے سامنے طلاق دی اور پانچ آدمیوں کے سامنے مرد نے خود بیان کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی جب لڑکی کے نکاح کے متعلق دوسری جگہ بات ہونے لگی تو مرد کہتا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے۔

۳۔ وہ شخص اپنی سسرال میں آتا جاتا تھا اور کئی کئی گھنٹے رہتا تھا لیکن خلوت صحیح کی بھی نوبت نہیں آئی ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

(۲ و ۳) اگر میاں بیوی میں خلوت صحیح نہیں ہوئی تھی اور تین طلاق تین لفظ سے دی تھی تو ایک طلاق بائن سے عورت مطلقہ ہوئی اور دوسرا نکاح جو شخص آٹھ روز بعد ہوا وہ صحیح ہوا اور پھر جب مرد نے اپنی ساس کے سامنے خلوت صحیح کرنے سے پہلے پہلے طلاق دیدی تو عورت طلاق بائن سے ہی مطلقہ ہوئی اور چونکہ ابھی خلوت صحیح نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس پر عدت بھی نہیں ہے، بلکہ جب چاہے کسی دوسرے مرد سے اپنا نکاح کر سکتی ہے اور مرد کا یہ کہنا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے صحیح نہیں ہے، اگر یہ دونوں آپس میں تعلق زن و شوئی قائم کرنا چاہتے ہیں تو پھر سے جدید نکاح کر سکتے ہیں حالانکہ کی ضرورت نہیں اور اگر تینوں طلاق بیک لفظ ہٹا بائن لفظ دی تھیں کہ میں نے تجھ کو تین طلاق دی تو تینوں طلاقیں واقع ہو کر حرمت مغلطہ ہوگئی اور دوسرا نکاح صحیح نہیں ہوا ہے اور اس صورت میں بھی عورت اپنا دوسرا نکاح جس مرد سے چاہے کر سکتی ہے، شوہر اول کا خلل ڈالنا جائز نہ ہوگا اور اس صورت میں (تین طلاق والی) عورت بغیر حالہ کے شوہر اول کے لئے کسی طرح اور جائز نہ ہوگی (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعیدنا رب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱۔ ”إذا طلق الرجل امرأته ثلاثاً قبل الدخول بها ولعن عليها فإن فرق الطلاق بائناً بالاولیٰ ولم تقع الغایة والغایة“ (ہندیہ ۱/۳۷۳)۔

کسی کو محض بیٹی کہنے سے حقیقتاً وہ بیٹی نہ ہوگی اور نکاح اس سے درست ہوگا:

زید کی ممانی کی بھتیجی کوڑکی لڑکی بانو کو زید نے اپنے چھوٹے بھائی سلیم کی شادی کے لئے منتخب کر کے سلیم اور بانو کے رشتہ کا پیغام دے ڈالا اور یہ بھی کہا کہ اگر لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند کر لیں تو رشتہ کر لیا جائے۔ زید اپنے ماموں کے یہاں پہلے سے دس سال سے آتا جاتا ہے، جب کہ زید کی والدہ و ماموں ایک دوسرے سے کبھی ملنے جلنے نہیں جاتے۔

کیونکہ زید کی بیوی کی بیماری اور بچہ زندہ نہ رہنے کی وجہ سے اور سلیم کے چھوٹا بھائی ہونے کے ماطہ زید سلیم سے محبت کرتا ہے، لہذا زید نے سلیم اور بانو کے رشتہ کا ذکر کرتے وقت بات چیت کے درمیان یہ کہا کہ اگر بانو کا سلیم سے رشتہ ہوا تو بانو ایک رشتہ سے بھانجی ہونے کے ماطہ بیٹی کے برابر ہے اور پھر اگر چھوٹے بھائی کی دہن بن گئی تو اس ماطے بھی بیٹی کے برابر ہوگی، اور کیونکہ میری اولاد نہیں ہے، اس لئے اس کی بیٹی کی طرح شادی کروں گا اور بانو کو بیٹی کہہ کر پکارنا اور بات چیت کرنا شروع کر دیا، بانو کو سلیم نے دیکھنے کے بعد ناپسند کر دیا اور اس پیغام کے چلنے کے دوران صرف عرصہ ۱۱/۲ ماہ میں بانو وزید ایک دوسرے کو اتنا پسند کرنے لگے کہ ایک دوسرے کی علیحدگی برداشت نہیں کرتے ہیں۔ زید کی بیوی صفیہ پچھلے دو سال سے زید کو دوسری شادی کی اجازت دے چکی ہے اور کیونکہ صفیہ لگاتار بیمار رہتی ہے اور اولاد بھی زندہ نہیں رہتی، لہذا زید نے اولاد کی خواہش کے ساتھ اپنی جسمانی ضروریات کے لئے اپنی دوسری شادی کے لئے تیاری کر رکھی ہے، بانو کو جب کہ سلیم نے ناپسند کر دیا ہے اور بانو کی زید کے ساتھ بے تکلفی اور محبت کو دیکھ کر زید کی بیوی صفیہ نے زید کو مشورہ دیا کہ جب دوسری شادی ضروری ہے اور آپ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو بانو سے ہی نکاح کر لیں، بانو کا جھکاؤ بھی زید کی طرف ہے۔ مگر زید کی ممانی فاطمہ کا کہنا ہے کہ جب زید نے بانو کو بیٹی کہا ہے تو بیٹی سے نکاح حرام ہے۔

ان سب حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے زید کا بانو سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟ وہ بھی اس صورت میں کہ زید نے اس بانو کو بارہا بھائی، بہن اور بارہا بیٹی کہہ کر مخاطب کیا ہے اور خطوں میں بیٹی لکھا ہے اور بانو کا اپنے چھوٹے بھائی سلیم سے رشتہ کرنا چاہا ہے، سلیم کے انکار کا سبب بھی یہی لگتا ہے کہ زید کی بانو سے بے حد بے تکلفی ہے۔ اس صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ اور احکام خداوندی کا کیا فیصلہ ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں زید کا نکاح بلا کر اہت اور بلا شبہ جائز ہے، بلکہ دونوں کی محبت کا یہ حال ہے تو یہ نکاح کر دینا بہتر

ہے۔ فاطمہ کا یہ کہنا کہ زید کا نکاح بائو سے حرام ہے، اس لئے کہ اس کو بیٹی کہہ چکا ہے بالکل غلط ہے اور شریعت کے حکم و منشاء کے خلاف ہے، کسی کو منہ بولا بیٹا کہہ دینے سے یا کسی کو بیٹی یا بھانجی یا بہن وغیرہ کہہ دینے سے حقیقتہً وہ بیٹا، یا بیٹی یا بہن نہیں ہو جاتا ہے۔ اس سے نہ تو ترکہ کا استحقاق ہوتا ہے اور نہ نکاح و مصاہرت کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ چنانچہ اکیسویں پارہ سورہٴ اہزاب کے پہلے ہی رکوع میں یہ آیتیں نازل فرمائی ہیں: **قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: "وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمْ الشَّيْءَ تَظْهَرُونَ مِنْهُنَّ أَمْهَتَكُمْ وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ادْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ فَإِنْ لَمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَاُولَٰئِكَ فِي الدِّينِ" (۱)۔**

پس فاطمہ کو بہن، زید کو بھائی، بائو کو بیٹی وغیرہ کہنے سے ہرگز اس نکاح کے جواز میں اور حلال ہونے میں کوئی شبہ نہ کیا جائے، اسی طرح کسی قسم کا اور کوئی شبہ ان دنیاوی معاملات و رسوم کے تعلق سے ہرگز نہ کیا جائے۔

نوٹ: صفیہ کا مشورہ بالکل درست ہے، زید کو بائو سے نکاح کر لینا انسب و بہتر ہے۔ بائو کو بھانجی، بیٹی وغیرہ کہنے سے یا لکھنے سے یہ نکاح ہرگز مکروہ بھی نہ ہوگا۔ تفصیلی جواب اوپر صفحہ پرگز رچکا ہے وہ دیکھئے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۸/۱۳۹۸ھ

حاملہ بالزنا سے نکاح اور اس کے پڑھانے والے کا حکم:

بندہ زنا سے حاملہ ہوگئی اور اپنے حمل کا الزام تین آدمیوں پر لگائی، انکو چھوڑ کر بندہ کا نکاح اور آدمیوں سے پڑھوا دیا ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ نکاح پڑھاتے وقت امام نے دولہا سے دریافت کیا کہ یہ حمل تمہارا ہے دولہا نے طہجدگی میں امام صاحب سے کہا ہاں میرا ہے، امام نے ایک زانی اور زانیہ کا نکاح پڑھوا دیا ہے۔

ان کو کوئی شرعی سزا وغیرہ نہیں دی گئی ہے، کیا امام صاحب کا یہ فعل گناہ ہے کہ نہیں اگر امام کا یہ فعل گناہ ہے تو امام کے لئے شرعی کیا حکم ہے، کیا یہ نکاح صحیح ہے یا کہ نہیں اور امام کی امامت درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں بندہ کا جو نکاح پڑھوا دیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے، اگر یہ حمل زنا کا اس شخص کا ہے جس سے نکاح ہوا تو وضع حمل سے پہلے بھی بندہ کے پاس وہ جاسکتا ہے اور اگر حمل اس کا نہیں ہے تو وضع حمل سے قبل بندہ کے پاس اس نکاح

پڑھا دینے سے نکاح پڑھانے والے یا اس کے کوہان پر کوئی شرعی گرفت نہیں ہے، بلکہ اس نکاح پڑھا دینے سے ایک باب زنا کا اسناد ہو گیا ہے (۱)، کوئی گرفت نہیں جب تک کہ چار عینی شہادت یا خود انکو اقرار نہ ہو اور یہاں دونوں باتیں نہیں اور اب اگر وہ سب اقرار بھی کریں تو نکاح میں فرق نہیں آئے گا، زانی اور زانیہ پر لازم ہے کہ اللہ رب العزت کے سامنے نہایت ندامت اور عجز و نیاز کے ساتھ توبہ و استغفار اور آئندہ اس گناہ کے مرتکب نہ ہونے کا عہد کرتے ہوئے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں اور آئندہ اپنا رویہ طور طریقہ صحیح رکھیں، حکومت اسلامی ہو تو ایسے مجرم کی سزا شادی شدہ ہو تو سنگسار کر ڈالنا ہے ورنہ سو کوڑے لگانا، مگر یہ حق محض حکومت کو ہے دوسروں کو نہیں، لہذا ایسی صورت میں توبہ و استغفار بدرگاہ رب العزت ضروری ہے مجمع عام توبہ و استغفار کے لئے ضروری نہیں ہے، عوام کیلئے ضروری ہے کہ وہ بھی خواہانہ اور ناخواہانہ انداز سے دونوں کی اصلاح کی اس طرح کوشش کریں کہ وہ دونوں اپنے گزشتہ گناہ سے واقعی مادم و نائب ہو کر سیدھے راستہ پر جم جائیں اور بس۔

عوام الناس کو حد شرع کے اندر رہنا چاہئے جذبات سے مشتعل ہو کر حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے، ہاں اگر یہ نکاح نہ ہو گیا ہوتا بلکہ وہ سب اس زنا کے مرتکب رہتے تو عوام کو حق ہوتا کہ جہاں تک ممکن ہو بلا کسی فساد اور فتنہ کے دباؤ ڈال کر باز رکھنے کی کوشش کرتے۔ اب سب مرحلے ختم ہو گئے اب کسی پر کوئی حکم نہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۹/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی

حاملہ بالزنا سے نکاح اور بچہ کے نسب سے متعلق:

ایک شخص مرتکب زنا ہے اور اس سے علوق ہو گیا ہے، اہل خاندان نے مذکورہ شخص کو مجبور کر کے نکاح کر دیا ہے، نکاح رضامندی سے ہوا ہے، طرفین رضامند ہیں اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بحالت حمل نکاح صحیح ہوا ہے کہ نہیں یہ بات ثابت ہے کہ اسی آدمی کا حمل ہے، عزت کے واسطے اہل خاندان نے جلدی سے نکاح کر دیا ہے، یہ نکاح صحیح ہوا ہے کہ نہیں اور لڑکا اس کے زانی باپ سے ثابت ہوگا کہ نہیں اور لڑکے کو حرامی کہنا کیسا ہے؟

شفیق احمد (پوسٹ بکس ۲۰۲، انجیر سعودیہ عربیہ)

۱۔ ”وقال أبو حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى: يجوز ان يزوج امرأة حاملا من الزنا ولا يطاقها حتى تضع وفي مجموع النوازل: اذا تزوج امرأة قد زنا هو بها وظهر بها حمل فالنكاح جائز عند الكل وله ان يطاقها عند الكل“ (الہندیہ ۲۸۰ دارالکتب دیوبند)۔

الجواب وبالله التوفيق:

(۱) فی الدر المختار علی رد المحتار: ”صح نکاح حبلی من (۱۱۱)۔

(۲) ”وتحتہ فی الرد ای عندهما وقال أبو یوسف لا یصح والفتویٰ علی قولہما“ (۲)۔

(۳) ”و فی صفحہ (۲۹۲) تحتہ فی الدر: لو نکحہا الزانی حل لہ وطوہا اتفاقاً“ (۳)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ جب کنواری غیر شادی شدہ کو حمل ٹھہر جائے تو چونکہ وہ یقیناً زنا کا حمل ہوگا اور ایسی حالت میں انکا نکاح کر دینا بلاشبہ جائز و درست ہوگا اور وہ نکاح صحیح ہوگا مفتی بقول یہی ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کا حمل ہے اگر اسی کے ساتھ نکاح ہو جائے تو وہ اس کے ساتھ صحبت قریبت بھی کر سکتا ہے اور میاں بیوی کی طرح رہ بھی سکتا ہے، پھر اس نکاح سے فقط چھ ماہ پورے ہونے پر بھی بچہ پیدا ہوگا تو وہ بھی حلال اور ثابت النسب ہو جائے گا اور اس کو حرامی کہنا جائز نہ ہوگا اور باپ و دادا وغیرہ کے ترکہ سے وراثت بھی پائے گا۔

اگر نکاح کے بعد چھ ماہ گزرنے سے پہلے ہی وہ حمل پیدا ہو جائے اور شوہر کہے کہ یہ میرے نطفہ سے نہیں ہے تو اس کو ثابت النسب نہیں قرار دیں گے بلکہ اس کو منسوب الی امہ کہیں گے اور باپ و دادا سے وراثت بھی نہ پائے گا بلکہ صرف ماں مانی کی جانب سے وراثت پائے گا۔

اور اگر چھ ماہ کے اندر ہی پیدا ہوا مگر باپ نے اپنا لڑکا ہونے سے انکار نہیں کیا بلکہ اپنا ہی لڑکا بتایا تو اس کو اس صورت میں بھی ثابت النسب ہی کہا جائے گا اور منسوب الی امہ نہیں کہیں گے، البتہ باپ و دادا سے وراثت نہیں پائے گا باقی حرامی وغیرہ اس انداز سے کہنا جس میں طنز یا توہین کا یا ایذا رسانی کا پہلو نکلے جائز نہ ہوگا، بلکہ منع رہے گا (۴)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۲/۱۴۰۱ھ

۱۔ الدر المختار مع رد المحتار ۱/۳۱۳۔

۲۔ رد المحتار علی الدر المختار ۱/۳۱۳۔

۳۔ الدر المختار مع رد المحتار ۲/۳۱۳۔

۴۔ ”ولو زلی باموأة فحملت ثم تزوجها فولدت، إن جانت به لسنة أشهر فصاعداً ثبت نسبہ، وإن جانت به لأقل من سنة أشهر لم یثبت نسبہ إلا أن یدعیہ ولم یقل إله من الزنا، أما إن قال إله می من الزنا فلا یثبت نسبہ ولا یورث منه کذا فی البدایع“ (فتاویٰ مانگیر ۱/۵۳۰)۔

جس لڑکی نے غیر مسلم لڑکے سے شادی کر لی ہو اس سے تعلق رکھنا:

آج سے لگ بھگ ۱۰۱ بارہ سال قبل میری ایک لڑکی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہماری سخت مخالفت اور اظہارِ نارضا مندی کے باوجود ایک غیر مسلم لڑکے سے شادی سول میرج کر کے مجھ کو اور پورے خاندان کو بڑی پریشانی اور بدنامی میں ڈال دی ہے، اگرچہ لڑکی اپنے مذہب پر قائم ہے اس کا خاندان کو یہ اجازت دیتا ہے کہ اپنے مذہب پر قائم رہ کر زندگی بسر کر سکتی ہے، لڑکی کی یہ حرکت اپنے مذہب میں ناجائز اور زنا ہے، اس وجہ سے ہم نے لڑکی کے ساتھ چند سال سے قطع تعلق کر لیا ہے، تاکہ لڑکی راہِ راست پر آجائے اور لڑکے کے ساتھ ازدواجی رشتہ توڑ دے، اب ان دونوں کے درمیان تین چار بچے ہیں، اس لئے اظہارِ اب ان دونوں کا یہ ناجائز رشتہ ٹوٹنا کچھ ناممکن سا ہے۔

اس دوران لڑکی ہمارے پاس چلی آئی اور یہ خواہش ظاہر کرتی رہی کہ ہم اس کے ساتھ کچھ تعلقات رکھیں، اب ہمارے سامنے خدشہ ہے کہ ہم نے اس کے ساتھ قطع تعلق کر رکھا ہے اور اس کو کسی صورت میں اپنے گھر آنے کی اجازت نہ دی تو شک آکر یا مجبور ہو کر تبدیل مذہب کر کے پوری طرح مرتد نہ ہو جائے، اس صورت میں ہمارے لئے زیادہ پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے ہمارے چند رشتہ دار یہ مشورہ دیتے ہیں کہ لڑکی کے ساتھ قطع تعلق کرو اس کے ساتھ تعلق رکھنا اور اس کو اپنے گھر آنے کی اجازت دینا شرعاً ناجائز ہے، میں اور میرے گھر کے دوسرے افراد ذہنی پریشانی میں مبتلا ہیں، اس وقت ہمارا لڑکی کے ساتھ تعلق رکھنا صرف مجبوری سے تالیفِ قلب کے پیشِ نظر ہے ورنہ لڑکی کی موجودہ زندگی کو ہم ناجائز سمجھتے ہیں۔

حاجی عبدالحق

الجواب وبالله التوفیق:

ہندوستان چونکہ دارِ غیرِ اسلامی ہے، اس لئے مجبوری و معذوری کے درجہ میں یہ حکم شرعاً دیا جائے گا کہ لڑکی اور لڑکی والے انتہائی کوشش و سعی بذریعہ ترغیب و تخریض کریں کہ لڑکا مسلمان ہو کر شرعی ضابطہ کے مطابق نکاح کر لے جب تو اس کی اصلاح و تبلیغ کے درجہ میں تعلق ضروری رکھنے کی اجازت ہوگی اور اعلیٰ بات پھر بھی یہی ہے کہ لڑکی اپنے پیدائش شدہ بچوں کو بھی قربان کر کے اگر وہ شخص مسلمان نہ ہو تو اس سے علیحدہ ہو جائے اور بالآخر جب اس کے مسلمان ہونے سے مایوسی ہو جائے تو لڑکی کے لئے یہی حکم متعین رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ہارپور
الجواب صحیح: محمد ظہیر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۱۱/۱۴۰۲ھ

بیوہ ممانی سے نکاح:

زید کا سگا بھانجا محمود بعد وفات زید محمود کا نکاح سائرہ سے ہو سکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

سوال میں مراد سائرہ سے اگر زید کی بیوی ہے تو سائرہ محمود کی ممانی ہوئی اور اس سے زید کے انتقال کے بعد محمود کا نکاح ہو سکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمد جمیل الرحمن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسلم لڑکی نے غیر مسلم لڑکے سے نکاح کیا تو نکاح اور اولاد کا حکم:

بندہ نے ایک ہندو مرد کے ساتھ شادی کی ہے اور اس سے اس کو اولاد بھی ہوئی ہے، اب ان اولاد سے کوئی مرچاؤے تو اس کی تجھیز و تکفین مسلمانوں جیسی ہو یا کہ نہیں اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر سکتے ہیں یا نہیں اور ان بچوں کی شادی مسلمان کے یہاں کر سکتے ہیں یا کہ نہیں وہ عورت اب تک اسلام پر ہی قائم ہے۔

حسن شہاب الدین

الجواب وبالله التوفیق:

مسلمان عورت کے مسلمان رہتے ہوئے اور ہندو مرد کے ہندو رہتے ہوئے شادی کیسی یہ کہنے کا ناجائز تعلق ہوا، شادی کے عنوان سے زنا ہوتا رہا ہے اور زنا سے اولادیں پیدا ہونیں، بہر حال یہ سب اولادیں ماں کے تابع ہو کر مسلمان شمار ہوں گی اور مسلمانوں کی طرح مرنے جینے، شادی بیاہ تمام امور میں ان کے ساتھ معاملہ کیا جاوے گا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود علی عسہ ۳/۱۰/۱۳۸۵ھ

۱- ”ذمی نزوج مسلمة يفوق“ (الہندیہ ۱/۳۳۷) ”والولد یصیح خیر الابین دینا“ (الدرمخ ارد ۳۷۰ مکتبہ زکریا) وقال اشاعی: یشعر الصبیور بالابین ولد الزنا (رد المحتار ۳۷۰ ک۔)

۱- بیوی کے لڑکے کا نکاح اپنی لڑکی سے:

اپنی زوجہ کے بیٹے سے اپنی لڑکی کا عقد نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟

۲- مطلقہ بابت سے نکاح:

جس عورت کو طلاق بابت دی گئی ہو ان کو اپنے نکاح میں واپس لانے کے لئے نکاح کی ضرورت ہے کیا؟ اب

دوسری مرتبہ مہر دینا پڑے گا یا نہیں۔

براہیم بن محمد صالح جی فریقہ

الجواب وبالله التوفیق:

۱- اپنی زوجہ کا لڑکا جو دوسرے شوہر سے ہو اور اس کو ساتھ لیکر آئے اس کا نکاح اپنی اس لڑکی سے جو دوسری بیوی

سے ہو جائز ہے۔

قرآن پاک پ ۴ کے اخیر میں مذکور ہے کہ صرف ۱۴ رشتے ایسے ہیں جن سے نکاح حرام ہے اور اس کے علاوہ

جو رشتے ہیں ان سے نکاح حلال ہے چنانچہ اخیر آیت میں ارشاد ہے: ”وَأَحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ“، چونکہ یہ رشتہ ان

(۱۴) رشتوں کے علاوہ ہے، اس لئے بلاشبہ جائز ہے (۱)۔

۲- اپنی جس عورت کو صرف طلاق بابت دیا ہو تین طلاق نہ دیا ہو، اس کو پھر اپنے نکاح میں لانا ہو تو محض عورت کی

اجازت و مرضی سے خواہ عدت کے اندر ہو یا عدت کے بعد بغیر حلالہ کے صرف دو گواہوں کے سامنے جدید نکاح پڑھا کر لا سکتا

ہے، البتہ اس جدید نکاح کا مہر جو آپس کے مشورے سے بوقت نکاح طے ہو جائے دینا ہوگا، ”هَكَذَا فِي الرَّدِّ وَالْبَحْرِ

۱- ”حرمت علیکم أمہانکم وبنانکم وأخوانکم وخالاتکم وبنات الأخ وبنات الأخت وأمہانکم اللہی أرضعکم وأخوانکم من الرضاعة وأمہات لسانکم وربانکم اللہی فی حجورکم من لسانکم اللہی دخلتم بہن فإن لم نکولوا دخلتم بہن فلا جناح علیکم وحلائل أبنانکم الممن من أصلابکم وأن تجمعوا بین الأخین إلا ما قد سلف إن اللہ کان غفوراً رحیماً، والمحصات من النساء إلا ما ملکتم أیمانکم کتاب اللہ علیکم وأحل لکم ما وراء ذلکم أن یبغوا بأموالکم محصین غیر مسافحین، فما ائتمنکم بہ منہن فأنوهن فجورہن ففویضہ ولا جناح علیکم فیما نواظبکم بہ من بعد الفریضۃ إن اللہ کان علیماً حکیماً“ (سورہ نسا ۲۳، ۲۴) ”واما بابت زوجۃ ایہ او ایدہ فحلال“ (الدر المختار مع رد المحتار ۱۰۵/۳)۔

و غیرہما فی باب ایقاع الطلاق“ (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۶/۱۳۰۱ھ

مرحوم بھائی کی بیوہ سے نکاح:

مسلمان کا کوئی بڑا بھائی یا چھوٹا بھائی فوت ہو جائے تو ان کی بیوہ بیوی سے نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

بڑا بھائی ہو یا چھوٹا بھائی اس کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ سے نکاح کر سکتے ہیں جائز ہے، بشرطیکہ رضاعت وغیرہ کا کوئی ایسا رشتہ نہ ہو جس سے نکاح حرام ہوتا ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۲/۱۳۰۳ھ

دو سگے بھائیوں کا دو سگی بہنوں سے نکاح:

دو بھائی، دو سگی بہنوں سے نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ واضح فرمادیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

ہاں! دو سگے بھائیوں کا نکاح دو سگی بہنوں سے جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۲/۱۳۰۳ھ

مزنئیہ کی بہن سے نکاح:

ایک شخص کسی عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب رہا ہے، اب اس عورت کی سگی بہن کی شادی زانی کے ساتھ ہو رہی ہے

۱- (وینکح مبالہ فی العدة وبعدها ای المبالہ بما دون الفلث لأن المحلۃ بالقبۃ) (البحر الرائق ۲/۴۳، الدر المختار والرد علیہ ۲/۵۰۷)۔

یہ شادی جائز ہے یا کہ ناجائز ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

ہاں یہ شادی جائز ہے، ”قال فی البحر: أراد بحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة علی اصول الزانی وفروعه نسبا ورضاعا وحرمة أصولها وفروعها علی الزانی نسبا ورضاعا كما فی الوطاء الحلال ويحل لأصول الزانی وفروعه أصول المزنی بها وفروعها.....وتقییدہ بالحرمات الأربع مخرج بما عداها“ (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۸/۱۳۸۵ھ

عیسائی مجسٹریٹ کے کرائے ہوئے نکاح کی شرعی حیثیت:

عدالتی کورٹ میں عیسائی مجسٹریٹ کے سامنے نکاح ہو، اور مجسٹریٹ ایجاب وقبول کرائے اور دو گواہ مسلمان موجود ہوں، ایک مرد کی طرف سے اور دوسری عورت کی طرف سے تو یہ نکاح شرعاً منعقد سمجھا جائے گا یا نہیں؟ مع دلائل جواب سے مشرف فرمائیں۔

نوٹ: ایجاب وقبول کے الفاظ انگریزی میں ہوتے ہیں جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

تم زید ابن عمر کہہ سکتے ہو کہ تمہاری دانست میں کسی طرح سے باقاعدہ تمہارا نکاح مسکنی ہندہ بنت بکر کے ساتھ ہوا جو یہاں حاضر ہے تو اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہے اور تم ان گواہوں کے اور حاضرین کے رویہ و جو یہاں موجود ہیں، باقاعدہ ہندہ بنت بکر کو اپنی بیوی کے طور پر قبول کرتے ہو۔ پھر مجسٹریٹ نکاح کرنے کے لئے جو عورت وہاں حاضر ہے اس سے سوال کرتا ہے کہ: ”تو ہندہ بنت بکر کہہ سکتی ہے کہ تیری دانست میں کسی طرح سے باقاعدہ تیرا نکاح مسکنی زید ابن عمر کے ساتھ ہو جو یہاں موجود ہے تو اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں، تو ان گواہوں اور حاضرین کے رویہ و جو یہاں موجود ہیں باقاعدہ زید ابن عمر کو اپنے شوہر کے طور پر قبول کرتی ہے۔ مجسٹریٹ کے اس سوال کے جواب میں عورت کہتی ہے کہ ”ہاں“ میں زید ابن عمر کو اپنے شوہر کے طور پر قبول کرتی ہوں۔ پھر فوراً اس ایجاب وقبول کے بعد مجسٹریٹ دونوں مرد اور عورت کے واسطے ہاتھ طلب کرتا ہے اور دونوں کی ملاقات کر دیتا ہے اور ان الفاظ میں نکاح کر دیتا ہے: ”میں ظاہر کرتا ہوں کہ زید ابن عمر اور ہندہ بنت بکر جو

یہاں حاضر ہیں دونوں نے باقاعدہ نکاح کر لئے۔ مزید وضاحت کے لئے کورٹ کا جو یہاں پر طریقہ رائج ہے، اس کی انگریزی نقل ارسال ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال جب عقد نکاح کی مجلس میں زوجین (مرد و عورت) دونوں خود موجود تھے، تو اگر چہ عیسائی مجسٹریٹ کے کہنے سے یا پوچھنے سے مرد نے کہا: ”میں قبول کرتا ہوں“ اور عورت نے کہا: ”میں قبول کرتی ہوں“ تو چونکہ ”میں قبول کرتا ہوں“ اور ”میں قبول کرتی ہوں“ یہ دونوں قول فعل حال کے صیغے ہیں جو عقد میں مثل صیغہ ماضی کے یکساں مفید اور باعث انعقاد عقد ہوتے ہیں، خواہ کسی زبان میں ہوں، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ”وہما (أی الايجاب والقبول) عبارة عن كل لفظین ینبئان عن معنی التملیک ماضیین أو حالین“ (۱)۔

لہذا پہلا قول ایجاب اور دوسرا قول قبول بن گیا اور عقد نکاح کا ایجاب و قبول دونوں جو رکن نکاح ہیں پائے گئے اور یہ دونوں (میاں بیوی) خود عاقد نکاح اور مباشر نکاح (خود اپنے نکاح کا عقد کرنے والے) ہو گئے اور جب یہ ایجاب و قبول دونوں دو مسلمان کو اہوں کے رو برو ہوا تو نکاح بلاشبہ منعقد ہو کر لازم بھی ہو گیا۔ اور مجسٹریٹ محض واسطہ و نگراں کے درجہ میں رہ گیا تا کہ بوقت انکار ثبوت ہو سکے جیسا کہ مندرجہ ذیل فقہی عبارتوں سے واضح ہوتا ہے:

- الف: ”وبصح (النکاح) بلفظ تزویج ونکاح..... وبکل ما یملک بہ الرقاب“ (۲)۔
- ب: ”إذا کان المؤکل حاضراً کان مباشراً الخ، لأن العبارة منتقل إلیہ وهو فی المجلس (۳)۔
- ج: ”قوله: إنها تجعل عاقده الخ لا تنتقل عبارة الوکیل إلیها وهي فی المجلس فكانت مباشرة ضرورة“ (۴)۔
- د: ”قوله: وینعقد متلبساً بإيجاب أحدهما الخ أشار إلی أن المتقدم من کلام العاقلین إيجاب، سواء کان المتقدم من کلام الزوج أو من کلام الزوجة والمناخر قبول“ (۵)۔

- | | |
|----|-----------------|
| ۱- | توہد البصار |
| ۲- | کتاب النکاح ۱۶۳ |
| ۳- | کتاب النکاح ۲۵۳ |
| ۴- | عولہ سابق۔ |
| ۵- | مصدر سابق۔ |

۵: ”وتقبل شهادة المأمور عند التجاحد وإرادة الإظهار، وأما من حيث الاعتقاد الذي الكلام فيه فهي مقبولة مطلقاً كما لا يخفى“ (۱)۔

اور جب مرد و عورت (زوجین) دونوں نے مجلس عقد نکاح میں خود موجود رہتے ہوئے ایجاب و قبول کے الفاظ کہہ دیئے تو اب مجسٹریٹ کو مندرجہ بالا عبارت کی بناء پر شرعاً تاقضی نکاح اور عقد نکاح نہیں قرار دیا جائے گا، اسی طرح خطبہ نکاح، نکاح کے شرائط و واجبات میں سے نہیں ہے، بلکہ سنن نکاح میں سے ہے اور سنن کے ترک ہو جانے سے اصل شئی ختم یا باطل نہیں ہوتی، بیش از بیش اگر خود کسی جبر و اکراہ کے اور بغیر کسی قانونی مجبوری کے محض اپنی مرضی سے ایسا عقد (یعنی بغیر خطبہ و بغیر تذکرہ مہر کے) کیا جائے تو خلاف سنت کے ارتکاب کا گناہ ہوگا، اور اگر قانونی مجبوری سے یا کسی جبر و اکراہ و باؤ سے ایسا کر لیں تو ارتکاب کا گناہ بھی نہ ہوگا، جیسا کہ عبارات ذیل سے معلوم ہوتا ہے:

(۲) ”أمر السلطان إكراه وإن لم يتوعله“ (۲)۔

(۲) ”فی الحديث: إن الله تجاوز عن أمتي الخطاء والنسيان وما استكروها عليه، وفي شرحه أي وما طلب منهم من المعاصي على وجه الإكراه“ (۳)۔

اسی طرح تذکرہ مہر نہ ہونے سے بھی اس عقد میں کوئی خرابی یا فساد نہیں آیا (۴) ”ويصح النكاح وإن لم يسم فيه مهرًا“، وهكذا في الدرر والرد وغيرهما۔

خلاصہ یہ کہ صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال اس عقد نکاح کے صحیح و لازم ہو جانے میں کوئی شبہ نہیں، بلاشبہ بالکل صحیح ہو کر لازم و نافذ ہو جاتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۱۳۹۶ھ

بیوی کے مرنے کے فوراً بعد دوسرا نکاح کرنا:

کیا مرد اپنی عورت کے مرتے ہی سالی کے علاوہ دوسری عورت سے نکاح کر سکتا ہے، اس میں عورت کی عدت پوری

۱- مصدر نقیہ۔

۲- ۱۸۲/۹ کتاب الاکراہ، دارالکتب العلمیہ بیروت۔

۳- مشکوٰۃ، ص ۵۸۳، کتاب المناقب حدیث: ۶۲۹۳۔

۴- ہدایہ ۲/۶۲ باب المہر ۲۔

ہونے کا انتظار کیا جاوے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

جی ہاں بیوی کے مرنے کے بعد یا زندگی میں بھی کر سکتا تھا مرنے کے بعد بھی فوراً کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ بیوی کی بہن یا بیوی کی اور محرمات میں جیسے خالہ پھوپھی وغیرہ نہ ہو بلکہ اجنبی ہو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱۰/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عہد

ممتدة الطهر مطلقہ کے نکاح ثانی کے لئے جواز کی ایک صورت:

ہندہ کے ساتھ بکر کی شادی ہوئی، شادی ہونے کے بعد بچی پیدا ہوئی، بکر نے اپنی منکوحہ کو طلاق بائن دیدی، بکر کی بچی تقریباً پونے دو سال کی ہے، اب تک ہندہ کو پیدائش کے بعد سے حیض نہیں آیا ہے، ہندہ اب ایک دوسرے شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے، مگر حیض نہ آنے کی وجہ سے عدت پوری نہیں ہو رہی ہے، اس کو لوگوں نے حیض جاری کرنے کے لئے علاج کا مشورہ دیا ہے، ایک ماہ تک علاج ہوا، مگر حیض جاری نہیں ہو رہا ہے، اگر کوئی صورت شادی کرنے کی ہو تو تحریر فرمائی جائے، یا اس سلسلہ میں کوئی مشورہ تحریر فرمایا جائے۔ شادی کی سخت ضرورت ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

ایسی عورت کو دوسرے شخص سے نکاح کے لئے، حنفیہ کا مسلک مختار تو یہی ہے کہ مدت یاس تک جس کی کم سے کم مدت تیس برس کی عمر ہو جانے تک ہے، انتظار کرے، اگر تیس سال کی عمر تک حیض نہ آئے تو آئندہ سمجھ کر تین ماہ عدت گزار کر دوسرا نکاح کرے، اس لئے اگر اس کو نکاح کی ضرورت ہے تو بہتر یہی ہے کہ اسی سابق شوہر سے نکاح کرے کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے میں کوئی عدت گزارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن اگر سابق شوہر پھر نکاح کرنے پر تیار نہ ہو، اور یہ عورت بے سہارا ہو، مان و نفقہ کا کوئی نظم نہ ہو یا حالات ایسے ہوں کہ بغیر دوسرا نکاح کئے با عصمت زندگی گزارنا دشوار ہو تو اس کو اختیار ہے کہ جماعت مسلمین (شرعی پنچایت) بنا کر جس

میں کم از کم تین دیندار با اثر معاملہ فہم معزز مسلمان ہوں، اس شرعی پنچایت کے سامنے درخواست دے کر بغیر دوسرے نکاح کے ہوئے اپنی عصمت زندگی دشوار ہونے کو، نیز مان و نفقہ وغیرہ کی اگر مجبوری ہو بے سہارا ہو، ان باتوں کو ثابت کر کے دوسرے نکاح کر لینے کی اجازت کا مطالبہ کرے۔

پس جماعت مسلمین (شرعی پنچایت) اگر اس کے مطالبہ کو معنی بر حقیقت و صحت سمجھتے ہوئے حیلہ ناجزہ میں لکھے ہوئے ان وجوہ و علل کے مطابق جو موجب ہوتے ہیں حضرت امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق زوجہ مفقودہ و عصمت وغیرہ میں فسخ نکاح کے فیصلہ کے لئے، اگر اس عورت کو بھی حضرت امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق ۹ ماہ یا ایک سال مزید حیض کے انتظار کے بعد ختم عدت کا حکم دے کر دوسرے نکاح کر لینے کی اجازت دے دے، تو اس عورت کو جماعت مسلمین کے اس فیصلہ کے مطابق عمل کر لینا اور دوسرے نکاح کر لینا درست رہے گا۔

اس فیصلہ کے جواز و نفاذ کے دلائل شامی (۲/۸۴۹)، اور حیلہ ناجزہ (ص ۵۰ و ۶۳) سے بھی مستنبط ہوتے ہیں اور یہ مسئلہ زوجہ مفقودہ و عصمت کی نظیر بن سکے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۳/۱۳۹۳ھ

شوہر کے مرتد ہونے سے نکاح فسخ ہو گیا:

زید نے جو اہل سنت مسلمان تھا یا اپنے آپ کو سنی مسلمان ظاہر کرتا تھا، کئی سال پہلے ایک سنی لڑکی سے شادی کی، نکاح حنفی المذہب عالم نے پڑھایا، کچھ عرصہ کے بعد مختلف اثرات کے ماتحت زید پکا مرزائی قادیانی ہو گیا۔ اس عرصہ میں اس کی اولاد بھی ہوئی جس میں دو لڑکے اور لڑکیاں بقید حیات ہیں۔ اس کی بیوی بدستور سنی رہی اور ہے، کئی دفعہ اسے ربوہ جا کر مرزائی خلیفہ سے بیعت کرانے پر مجبور کیا، مگر اس نے انکار کر دیا۔ اب ملک کی نمائندہ جماعت اور جمہور اہل اسلام کے فیصلہ کے بعد جب مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے زید کو توبہ کرنے کا مشورہ دیا گیا، مگر وہ اپنے مرتد رہنے پر مصر ہے۔ کیا اس کے بعد زید کا نکاح مسلمان خاتون سے قائم رہے گا اور کیا یہ ضروری ہے کہ زید اسے طلاق دے یا طلاق خود بخود واقع ہو جائے گی۔

الجواب وبالله التوفیق :

حاصل سوال یہ ہے کہ بوقت نکاح زوجین مسلمان تھے بعد میں شوہر قادیانی ہو کر مرتد ہو گیا، اس کا حکم شرعی اسلام میں یہ ہے کہ شوہر کے مرتد ہوتے ہی اس کا نکاح ٹوٹ گیا اور منکوحہ مسلمہ اس کے نکاح سے خود بخود بالکل خارج ہو گئی، طلاق وغیرہ کے دینے کی حاجت یا شرط نہیں رہی، بلکہ منکوحہ اس کے نکاح سے نکل کر آزاد ہو گئی اور نفقہ عدت اور کامل مہر کی بھی مستحق رہی ” ارتداد أحدهما فسخ عاجل بلا قضاء فلموطونة كل مهرها ولغيرها نصفه لو ارتد وعليه نفقة العدة“ (۱)، بالخصوص جب کہ سمجھانے اور توبہ کا مشورہ دینے کے بعد بھی وہ مرتد (قادیانی) رہنے پر مصر رہا تو یہ حکم اور بھی واضح ہو گیا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مطلقہ عورت سے نکاح :

رہنمائی اپنے قریب کے ایک گاؤں میں ایک لڑکی جس کا نام انوری بیگم ہے، سے شادی کی کچھ دن بعد ان دونوں میں نا اتفاقی پیدا ہو گئی جس سے وہ دونوں لڑ جھگڑ کر کے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور دونوں اپنے گھر جدا ہو کر رہنے لگے، اس کے بعد گاؤں والوں نے دونوں کے معاملے کا فیصلہ کرنے کی غرض سے ایک میٹنگ بلائی اس میں دونوں فریق نے گاؤں کی پنچائت کو حکم بنایا کہ وہ جو فیصلہ کریں گے ہم دونوں قبول کریں گے، اس پر پنچائت نے دونوں کی زبان بندی لی، اس میں انوری بیگم نے کہا کہ میرا شوہر میرے دل کے مطابق نہیں ہے، میں اس سے خوش نہیں ہوں اس لئے میں اس سے الگ ہو جانا چاہتی ہوں، پنچائت سے التجا ہے کہ میرا سامان دلو اگر اس سے طلاق دلوادے۔ اس کے بعد پنچائت نے رہنمائی کی زبان بندی لی تو اس نے کہا کہ میری عزت پر دھبہ لگانے والی عورت کی مجھے ضرورت نہیں ہے میں اس کے جہیز کے تمام سامان واپس کر دینا چاہتا ہوں، تب پنچائت نے ایک فیصلہ نامہ لکھ کر دونوں کی چاہت کے مطابق سامان کا فیصلہ کرنے کے بعد دونوں کو الگ کر دیا اور انوری بیگم کو عدت گزارنے کے لئے حکم دے دیا گیا، اس کے بعد رہنمائی نے دوسری لڑکی سے شادی کر لی، مگر اس سے بھی کچھ بہتر تعلق نہ رہے کچھ دن بعد یعنی قریباً دو سال بعد اس نے طلاق دیکر آزاد کر دینے اس دوسری لڑکی کے مہر اور خوراک کی بابت فیصلہ ہونے کے زمانے میں رہنمائی نے کہا کہ میں اپنی پہلی بیوی جو مطلقہ ہے جس کا نام انوری بیگم

ہے سے پھر دوبارہ نکاح کروں گا، یہ بات انہوں نے گاؤں کے پنچائت سے کہی، پنچائت نے کہا کہ ایک مرتبہ وہ تمہیں ٹھکرا چکی ہے اور تم اسے طلاق دے چکے ہو، پھر کیسے اسے لاؤ گے؟ اسے نہ لاؤ، پھر تم دوسری بیوی کا حق اب تک نہ دے سکے ہو، اسے پورا کر متب گاؤں والوں کے دستور کے مطابق ہم دونوں گاؤں کے پنچائت کے آدمی بیٹھ کر اس کا نکاح کر دیں گے، مگر رنما علی نے بہت سی بے چینی کا اظہار کیا اور پنچائت سے الگ ہو کر گاؤں کے طور طریقے کو چھوڑ کر الگ ایک جگہ کوچا کر وہاں اپنی پہلی بیوی انوری بیگم سے دوبارہ نکاح کر لیا، لہذا اب آپ سے ہم تمام لوگوں کی التجا ہے کہ آپ اس معاملہ پر پوری توجہ سے غور فرمائیں اور ہر ایک کا جواب تشفی بخش عنایت فرمائیں۔

۱۔ مطلقہ عورت سے کیا دوبارہ شادی کی جاسکتی ہے، رنما علی کی انوری بیگم سے یہ دوسری شادی صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو طلاق کے کون قسم سے ہے جو اس کے لئے صحیح طریقہ ہو، اور اگر صحیح نہیں ہے تو بھی وجوہات کی وضاحت فرمائیں۔
۲۔ گاؤں والوں کے مشورے کو نہ مان کر ان کو اور گاؤں والوں کے دستور کو چھوڑ کر الگ جگہ شادی کر لینا کیا درست ہے؟ اگر نہیں تو اس کے اپنے لئے کیا سزا ہے اگر ہے تو جواز کے وجوہات بیان فرمائیں۔

روشن علی

الجواب وبالله التوفیق:

۱۔ صورت مسئلہ میں حسب تحریر سوال، پہلی بیوی کو فقط ایک طلاق بائن واقع ہوئی، اس لئے کہ سوال کا خط شدہ جملہ طلاق کنائی کا ہے، اور بہنیت طلاق کہا ہے اور بہنیت طلاق کہنے سے ایسے جملہ سے صرف ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے اور طلاق بائن میں عدت کے اندر رہو یا بعد عدت دونوں کی آپسی رضا مندی سے بغیر حالہ نکاح درست ہے مگر صرح بہ انفہاء عامۃ (۱)، پس یہ نکاح جو رنما علی نے کیا ہے، شرعاً صحیح ہے، اگرچہ برادری کے خلاف کیا ہے اس خلاف مرضی کر لینے سے نکاح میں شرعاً کوئی خرابی نہیں آئی، البتہ گاؤں والوں کے مشورے کے مطابق عمل کرنا اس کے لئے بہتر تھا۔

پھر دوسری بیوی کا اگر مہر یا جہیز کا سامان واپس نہیں کیا تو گنہگار بھی ہو رہا ہے، اس پر لازم ہے کہ جہاں تک جلد ہو سکے دوسری بیوی کا مہر جو باقی ہو اور جہیز کا سب سامان واپس کر دے، واپس نہ کرنے کی صورت میں برادری اس پر اخلاقی

۱۔ ”فإذا طلق زوجته طلاقاً واحدة أو اثنين جاز له العود إليها في العدة وبعدها ولكن ليس بالرجعة وإنما بعقد جديد“ (الموسوعة الفقهية ۲۹/۲۹)، ”وینکح مبانة بما دون الثلاث في العدة وبعدها“ (بالإجماع) (الدر المختار علی الدرر ۴۰، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

و باؤ ڈال سکتی ہے، باقی ان باتوں سے پہلی مطلقہ بیوی سے جو نکاح کر لیا ہے اس میں خرابی نہ آئے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب
کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پورے ۱۸/۱۲/۱۳۰۳ھ

منکوحتہ الغیر سے نکاح:

۱- گزارش ہے کہ سائل سن ۱۹۴۷ء سے پہلے انگریزی حکومت میں فوج میں تھا، نیاز مند کی بیوی گھر پر موجود تھی جس سے ایک بچی تھی، نیاز مند ۱۹۴۷ء کے دوران پاکستان چلا گیا، نیاز مند کی نوکری کی پیشکش جو تھی نیاز مند نے اپنی بیوی کے نام کی تھی جو نیاز مند کی بیوی کو ملتی رہی۔

۲- نیاز مند نے پاکستان سے خط و کتابت بھی جاری رکھی، اس کے بعد نیاز مند حج کے لئے مکہ مدینہ چلا گیا اور وہاں ایک سال رہا، اس کے بعد نیاز مند سیدھا اپنے ملک یعنی اپنے گھر چلا آیا نیاز مند عرصہ تیس سال کے بعد گھر آیا۔

۳- یہ کہ میرے پاکستان جانے کے ۲ سال کے بعد میری بیوی نے ایک اور شخص کے ساتھ عقد کر لیا، جس کا نام چودھری خان ہے جو کہ حلقہ پلایا نگر کا رہنے والا ہے، چودھری خان کے عقد سے میری بیوی کے چھ بچے بچیاں ہوئی ہیں، جنگلی شادی ہو چکی ہے۔

۴- مسئلہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ ہے کہ ۹۰ سال تک بیوی خاوند کا انتظار کر کے دوسری شادی کر سکتی ہے لیکن عرصہ تیس ۳۰ سال میں میری بیوی نے دوسرا خاوند اختیار کیا ہے جبکہ نیاز مند گم بھی نہیں تھا، بلکہ ایک دوسرے کے خطوط بھی جاری رہے یعنی خطوط میرے بھائی کی طرف سے مجھے آتے جاتے رہے اب جناب حضرات سے گزارش ہے کہ شرع محمدی کے مطابق کیا میری بیوی کو دوسرا خاوند کرنے کا حق تھا یا کہ نہیں؟ اگر جناب کے مسئلہ میں حق بنتا ہو تو نیاز مند کو خلع مل سکتا ہے یا نہیں؟ مطابق مسائل نیاز مند کو فتویٰ بھیج کر بتائیں کہ وہ میری بیوی بنتی ہے یا نہیں؟ کیونکہ نیاز مند کی زندگی میں اس نے دوسرے آدمی سے عقد کیا جائز ہے یا ناجائز؟

حاجی دل مند چودھری (سکسٹینڈیاں ڈاکخانہ ریکماں ضلع راجوری)

الجواب باللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال جب آپ کے بھائی کی آپ سے خط و کتابت تھی اور پھر عورت نے آپ کے پاکستان جانے کے بعد دوسرے شخص سے عقد کیا اور آپ کے بھائی نے نہ خود اعتراض کیا اور نہ آپ کو مطلع کیا تو یہ ہے کہ طلاق ہو چکی تھی۔ غرض یہ

نحر یر مدعی کو مشکوک اور کمزور بناتی ہے اور ایسی صورت میں بالخصوص اتنی مدت کے بعد جبکہ دوسرے شوہر سے چھ بچے بچیاں ہو کر بالوغ ہو گئے اور شادی شدہ بھی ہو گئے اور کنبہ و خاندان میں بھی کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا یہ بھی قرینہ ہے کہ نکاح فسخ ہو چکا تھا وہ عورت مطلقہ ہو چکی تھی، اور بعد طلاق عدت گذار کر دوسرے شخص سے عقد کیا ہے اور اس کے خلاف ہونے کی صورت میں سارے کنبہ و خاندان والے بھی متہم ہوں گے۔

ایسی صورت میں اب اتنے زمانے کے بعد اس دوسرے شخص سے نکاح کر لینے کو غلط و باطل قرار نہیں دیا جاسکتا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح کفیل احمد نائب مفتی دارالعلوم دیوبند مفتی محمد ظفر الدین مفتاحی

دوسرے کی بیوی سے نکاح:

بلا طلاق حاصل کئے ہوئے سائرہ عورت کے ساتھ زید کا نکاح ہوا ہے بعد نکاح (بیت اللہ) اول شوہر نے طلاق دیا طلاق دینے کے قبل کا نکاح صحیح ہو یا کہ نکاح لوٹا یا جاوے؟

الجواب وبالله التوفیق:

طلاق دینے کے قبل کا نکاح صحیح نہیں ہوا ہے طلاق کے بعد نکاح لوٹا یا جاوے نکاح لوٹنا واجب ہے جب تک پھر سے نیا نکاح دونوں میں نہ ہوئے دونوں بالکل الگ الگ رہیں تعلقات زن و شوئی ہرگز نہ رکھیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمد جمیل الرحمن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

زوجہ غائب کی عورت کا نکاح دوسری جگہ کب صحیح ہوگا؟

زمینب کاشوہر اسلم برضا و خوشی اپنے گھر سے ۱۹۶۲ء کی بارہ مئی میں ملازمت پر راولپنڈی کے اطراف میں چلا گیا ۱۶

۱- "ولا يجوز لرجل أن يزوجه زوجة غيره وكذا المعصدة" (الہندیہ ۲۸۰)۔

ستمبر ۱۲ء تک مراسلہ کا سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد سے اب تک کوئی خبر نہیں ملی ہے خبر گیری کے لئے کوئی آدمی تو نہیں گیا لیکن خط و کتابت وغیرہ کے ذریعہ پتہ لگایا جا رہا تھا کہ ۱۲ء کے مارچ میں وہاں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا اس کے بعد ہفتہ تک اخباروں میں شائع بھی کر لیا گیا، لیکن کہیں سے کوئی خبر نہیں ملی ہے ۱۵ء کے ماہروری میں اسلم کی تلاش میں خود اس کی والدہ اور ماموں راور کیلا گئے اور اس کے گرد و نواح کے علاوہ دیگر مقامات بھی گئے مگر کوئی سراغ نہیں ملا وہ واپس آ کر انہوں نے یہ بیان دیا کہ دریافت کرنے پر اکثر لوگوں نے اس کے ہلاک ہو جانے کا خیال ظاہر کیا ہے، اس لئے ہم کو اسلم کے شہید ہونے کا یقین ہو گیا ہے، چنانچہ اس کی والدہ نے اکثر قرآن خوانی کے رسومات انجام دیئے جس میں رشتہ دار بستی کے لوگ اس کے سرال والے شریک ہوئے اور اسلم کی بیوی زینب کو یہ کہہ دیا گیا ہے کہ لڑکا شہید ہو گیا ہے تم اپنا دوسرا انتظام کر سکتی ہو نوجوان زینب شوہر کے مان نفقہ سے محروم اپنے میکہ میں بیوہ ماں کیساتھ نہایت مصیبت کی زندگی گزار رہی تھی ناچار رشتہ داروں قریب و جوار اور بستی والوں کے مشورہ سے چار مہینے دس روز موت کی عدت پوری کر کے ۱۵ء کے ماہ نومبر میں دوسرے سے عقد کر لیا ہے، صورت مذکورہ میں زینب کا دوسرے سے عقد کر لیا جائز اور درست ہے یا کہ نہیں جہاں حاکم شرعی یا قاضی موجود نہیں ہے وہاں کیا طریقہ اختیار کیا جاوے؟

الجواب وبالله التوفیق:

جب شوہر (اسلم) کی والدہ اور ماموں نے خود بھی تلاش کر لیا اور واپس آ کر یہ بیان کیا کہ اسلم کے شہید ہو جانے کا ہم کو یقین ہو گیا ہے اور زینب کے اعزہ و اقرباء اور پاس پر وین والوں کو بھی اسلم کے شہید ہو جانے کا یقین ہو گیا تو زینب کا یہ عقد کر لیا درست و جائز ہو گیا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بالغہ کا اپنی مرضی سے کئے ہوئے نکاح نیز طلاق نامہ پر جبراً نشان اگلوٹھالینے کا حکم:

لڑکی اور لڑکا دونوں جوان ہیں، لڑکی لڑکے سے ملکر کہیں چلی جاوے اور پھر اس سے نکاح کرے تو کیا نکاح ہو گیا کچھ دن بعد اس لڑکے کے والدین لڑکی کو اپنے گھر لے آئیں اور پنچائت کر کے اس لڑکی کے شوہر سے زبردستی طلاق کے خواہاں ہیں اور لڑکی کی بھی یہی مرضی ہے کہ مجھے طلاق مل جائے اور لڑکا طلاق دیتا نہیں، زبردستی لڑکے سے نشان انگشت فارغ

خطی پر پچھایت والے لگوائیں تو کیا یہ نکاح ٹوٹ گیا اور طلاق ہوئی یا کہ نہیں، بیٹو او تو جروا

الجواب وبالله التوفیق:

اگر دونوں ہم کفو ہیں اور مہر مثل پر شرعی کو اہوں کے سامنے نکاح ہوا ہے تو یہ نکاح صحیح ہوگا ایسی صورت میں بلاوجہ شرعی زبردستی طلاق لینا یا لڑکی کا طلاق چاہنا دونوں بہت برا ہے، اور زبردستی محض نشان اٹکھٹا فارغ خطی پر لگوا لینے سے نکاح نہ ٹوٹے گا اور نہ طلاق ہی واقع ہوگی جب تک لڑکا زبان سے بھی طلاق نہ دیرے، ”وفی البحر أن المراد الإكراه علی التلفظ بالطلاق فلو أكره علی أن یكتب طلاق امرأته فكتب لا تطلق، لأن الكتابة أقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة والحاجة هنا“ (۱)، فقط والله اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود علی عنائت مفتی دارالعلوم دیوبند

باب المحرمات

بیوی کے کم عقل ہونے کی وجہ سے سالی سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟
 زید کی بیوی بہت کم عقل ہے، عقل سے کوئی کام یا کوئی بات بھی کرنا دشوار ہے اور اس کے تین چھوٹے بچے ہیں،
 زید کی بڑی سالی کے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں سہراں میں کوئی نہیں ہے، سالی کے بچوں کی پرورش کا کوئی ذریعہ نہیں ہے،
 ایسی صورت میں سالی بہنوئی سے نکاح کرنے کی آرزو مند ہے، کیا زید اپنی سالی سے نکاح کر سکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

بیوی کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کی بہن سے کسی طرح آپ کا نکاح نہیں ہو سکتا ہے، کلام اللہ شریف میں اسکی صریح ممانعت وارد ہے، ”وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأَخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ“ (۱)، سالی سے نکاح کرنے کی خواہش میں بیوی کو طلاق دیدینا یہ بھی اچھی چیز نہیں ہے قوی خطرہ ہے کہ عنداشرع باعث غضب و بلاکت نہ ہو جاوے، صبر کیجئے جیسے نباہا آئندہ بھی نباہ دیجئے، اس میں آپ کے درجات بلند ہوں گے اور اللہ خوش ہوگا، سالی کا نکاح کسی دوسرے سے کر دیجئے کہ اس کی زندگی با عصمت و عزت گذرے اور اپنی موجودہ بیوی جب بے عقل و کم سمجھ ہے اور آپ اس کو طلاق دیدیں تو دوسرا اس سے نکاح بھی نہ کرے گا ورنہ رشو کریں کھائے گی اور اس کا دل دکھے گا اور آپ پر اس کی آہ پڑے گی جو بہت ڈرنے کی بات ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
 الجواب صحیح محمد جمیل الرحمن ماسک مفتی دارالعلوم دیوبند

بیوی اور اس کی ماں کو رکھنا:

زید نے اپنی بیوی کو رکھتے ہوئے بیوی کی ماں کو بھی رکھ لیا ہے اور دونوں کو حمل بھی رہ گیا ہے، آیا بیوی کا نکاح باقی رہا یا کہ نہیں، اور اگر باقی نہیں تو پھر کس طرح سے اس سے نکاح کیا جاوے اور کچھ برادری اس کے ساتھ کھانی رہی ہے اور کچھ برادری اس سے جدا ہے تو اس کے ساتھ کھانا کیسا ہے اور جو برادری اس کے ساتھ ہے اس کے لئے مسئلہ کیا کہتا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں زید کی بی بی ہمیشہ کے لئے زید پر حرام ہوگئی زید پر واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کو فوراً طلاق دیکر اپنے نکاح سے الگ کر دے اور ہرگز اس کے قریب بھی نہ جائے، اب ان دونوں میں نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے جس طرح زید کی ماں زید پر ہمیشہ کے لئے حرام ہے اسی طرح اس کی بیوی بھی ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی (۱)، جب تک زید اپنی بیوی سے متارکت نہ کرے اور طلاق نہ دے برادری کو چاہئے کہ اس کے ساتھ متارکت کرے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۹/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: جب تک زید اپنی بیوی اور ماں کو علیحدہ نہ کرے برادری اس سے ترک تعاون کرے جو اس کے ساتھ تعاون کرے گا گنہگار ہوگا، قال اللہ تعالیٰ: ”وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

سید احمد علی سعید ۲۳/۹/۱۳۸۵ھ

بیوی کو طلاق دینے یا اس کے انتقال کر جانے کے بعد اس کی بہن سے نکاح:

ایک مرد نے اپنی عورت کو طلاق دیدی یا اس مرد کی عورت کا انتقال ہو گیا تو اب ہر دو صورت میں یہ مرد اپنی سالی سے نکاح کر سکتا ہے یا کہ نہیں اگر کر سکتا ہے تو کب کر سکتا ہے اور اس مرد کو ایام عدت کے پوری ہونے کا انتظار کرنا پڑیگا یا زوجہ کے مرتے ہی اس کی دوسری بہن سے شادی کر لے۔

۱- ”وَحُرْمٌ أَيْضًا بِالصُّهُورِيَّةِ أَصْلٌ مِنْ لُبِّهِ“ (الدرمخ المرد ۳۷۷)۔

۲- سورة مائده ۲۔

الجواب وبالله التوفیق:

بیوی کو طلاق دیا پھر تو بیوی کی عدت گزرنے کے بعد بیوی کی بہن سے نکاح جائز ہوگا، اس کی عدت کے اندر اس کی بہن سے نکاح جائز نہیں ہے، ہاں اگر بیوی مرگئی ہے تو عدت گزارنی کوئی شئی نہیں ہے، مرد پر عدت نہیں ہوتی جب چاہے اس کی بہن سے نکاح کر سکتا ہے کما فی الثامی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۱۰/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عہد

دوسرے کی مطلقہ سے بغیر عدت گزارے نکاح:

ہمارا ایک عزیز ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے، لیکن لڑکی شادی شدہ تھی اب اس کی طلاق ہوگئی ہے، لڑکی بے سہارہ ہے اسکا نہ کہیں رہنے کا اور نہ کہیں پیٹ پالنے کا ٹھکانہ ہے، نہ تو اس کے ولدین ہیں اور نہ گھر ہے، لڑکے کے گھر والے کہہ رہے ہیں کہ جب تک تین مہینہ ۳ دن گزر نہ جائیں گے ہم اپنے گھر میں نہیں رکھیں گے اور رشتہ دار بھی کہہ رہے ہیں کہ جب تک نکاح نہیں ہو جائے گا تب تک ہم بھی اپنے گھر میں نہیں رکھیں گے آخر اس کا کوئی فتویٰ ہے کہ بغیر عدت پورا کئے ہوئے نکاح ہو جائے، اس بے سہارے لڑکی کا گھر بس جائے نہیں تو یہ لڑکی بے موت مر جائے گی، شرعی حکم کا فتویٰ لکھ کر روانہ کر دیجئے۔

الجواب وبالله التوفیق:

اس لڑکی کو جب سے طلاق ہوئی ہے اس وقت سے جب تین حیض آجائیں اسکا دوسرا نکاح کیا جاسکتا ہے جائز ہے، خواہ یہ تین حیض تین مہینے پر آجائیں یا کم میں، جس عورت کو حیض (ماہواری) آتی ہے اسکی عدت تین مہینے نہیں ہے بلکہ محض تین حیض ہے (۲)، لہذا اگر اس لڑکی کو طلاق کے بعد سے تین حیض آچکے ہیں تو فوراً اب اپنے عزیز سے اس کا نکاح کر دیجئے ورنہ

۱- دیکھئے رد المحتار ۵/۱۷۸۔

۲- ”وَإِذَا طَلَّقَ الْمَرْءُ امْرَأَتَهُ طَلًّا بَاتِنًا أَوْ رَجْعًا أَوْ تَلَائِمًا أَوْ وَقَعَتِ الْفُرْقَةُ بَعْدَ طَلَاقٍ وَهِيَ حُرَّةٌ مِنْ نَحْبِ لِحْنِهَا تَلَائِمًا“
القرآن (البقرہ ۲۲۶)۔

جب تک تین حیض نہ آجائیں کسی محفوظ جگہ جہاں اس کی عزت و آبرو محفوظ رہے رکھیں، خواہ اپنے گھر میں خواہ کسی معتبر آدمی کے گھر میں یہ سب جائز ہے، بلکہ ایسی لا وارث لڑکی کی عزت و آبرو بچانے کی نیت سے ایسا کرنا ثواب کا باعث ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۱۱/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عند

شوہر کے انتقال کے بعد بیوہ کا تین ماہ کے بعد نکاح کر دینا:
زید کے انتقال کے تین ماہ بعد زید کی بیوی بندہ کے ولی نے عدم علم کی بناء پر ایام عدت طلاق پر قیاس کرتے ہوئے نکاح تین ماہ کے بعد بکر سے کر دیا ہے، یہ نکاح باعتبار شریعت کے کیا ہوا اگر نکاح فاسد ہوا تو کس طرح ہوا اور یہ بتائیں کہ اگر بندہ کو پھر دوبارہ بکر کے نکاح میں دیا جائے تو اسکی کیا صورت ہوگی؟

الجواب وبالله التوفیق:

وفات کی عدت چار ماہ دس دن ہے (۱) اور عدت کے اندر نکاح کرنا درست نہیں جو نکاح عدت کے اندر ہوتا ہے وہ فاسد ہوتا ہے، اس لئے یہ نکاح فاسد ہوا (۲)، لہذا دونوں فوراً علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور اگر آپس میں تعلق زن و شوئی رکھنا چاہتے ہیں تو چار ماہ دس دن گزارنے کے بعد پھر سے نکاح پر حالیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۱۱/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عند

سو تیلی خالہ سے نکاح:

اپنی سو تیلی خالہ سے نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

۱- ”والعدة للموت باربعة اشهر بالاهلة لوفى العرة وعشرة من الايام“ (الدرمخ المرد ۱۸۸/۵)

۲- ”لايجوز للرجل ان يتزوج زوجة غيره ولا المعدة سواء كانت العدة من طلاق او وفاة“ (الہندیہ ۲۲۸/۱)۔

الجواب وبالله التوفیق:

اپنی سوتیلی خالہ سے مثل سگی خالہ (حقیقی خالہ) کے نکاح جائز نہیں قطعی حرام (۱) ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب
کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۳/۱۴۰۳ھ

شوہر کو مردہ بتلا کر نکاح کر لینا:

۱- خدیجہ بی نامی ایک عورت نے جو منکوحہ تھی تافضی صاحب کے پاس یہ ظاہر کر کے کہ میرا شوہر فوت ہو گیا، عبدالرحمن نامی ایک شخص سے جو ملازم سرکار تھا عقد کر لیا، حالانکہ اس کا شوہر عبدالحجیب زندہ تھا وہ پاکستان چلا گیا تھا لیکن عبدالرحمن کو اس کا علم نہ تھا۔

۲- عبدالرحمن شوہر ثانی بعد عقد تین سال تک زندہ رہا اس کے بعد فوت ہو گیا ہے۔

۳- اس کا شوہر اول عبدالحجیب بعد وفات شوہر ثانی عبدالرحمن نامی آیا اور اس نے اس نکاح ثانی پر اپنے احباب اور رشتہ داروں سے شکایت کی، مگر اس کے متعلق کوئی کاروائی سرکاری نہیں کی، عبدالرحمن شوہر ثانی کی وفات پر چونکہ عبدالرحمن ملازم سرکار تھا منجانب اس کی زوجہ اولیٰ سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں مبالغہ نہیں خدیجہ بی نے اس وظیفہ اور انعام کے روپیہ سے عبدالرحمن کی اولاد کو کچھ نہیں دیا ہے، اس لئے انہوں نے اس کے مقابلہ میں ایک مالش عدالت دیوانی میں کر دی کہ وہ عبدالرحمن کی زوجہ شرعی نہیں ہے ناجائز ہے، اس لئے وظیفہ و انعام کی مستحق نہیں ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ عبدالحجیب شوہر اول جو بعد وفات شوہر ثانی آیا تھا، اس نے کوئی اعتراض اس نکاح پر نہیں کیا ہے، تو کیا ایسا نکاح جائز متصور ہو گا یا نہیں؟ ورنہ عبدالرحمن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس نکاح پر اعتراض کریں اور اس کو ناجائز قرار دلائیں جس سے خدیجہ کو نقصان پہنچتا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال خدیجہ بی کا شوہر اول زندہ تھا، عام اس سے کہیں چلا گیا تھا یا مفقود الخبر تھا اور خدیجہ بی نے تفریق

۱- "حومت علیکم امہانکم و اخوانکم و عمامکم و خالاتکم الخ" (سورہ نسا ۲۳)، "للنص الصریح ودخل فیہ الاخوات المصفرات وبنائهن.... والعمات والخالات المصفرات" (المحرر الرائق ۳/۹۳، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

شرعی حاصل کئے بغیر دھوکہ دیکر اپنے شوہر کو فوت شدہ بتلا کر عبد الرحمن سے اپنا عقد کر لیا تھا مگر چونکہ عبد الرحمن کو شوہر اول (عبد الحبيب) کی زندگی کا علم نہیں تھا بلکہ اس نے اس کو فوت شدہ سمجھ کر اور نکاح جاری سمجھ کر عقد کیا تھا، اس لئے اس کی یہ طی بالقبضہ ہوئی اور یہ نکاح حقیقت واقعہ پر نظر کر کے فاسد ہوا اور ایسی صورت میں عبد الرحمن کے نطفہ سے جو اولادیں خدیجہ بی کے ہوں گی وہ ثابت النسب ہوں گی، ”وتجب العدة بعد الوطء..... ویثبت النسب“ (۱)، اور مستحق وراثت ہوں گی اور خدیجہ بی کا چونکہ نکاح فاسد ہے وراثت نہیں ملے گی، البتہ مہر مسمی اگر مہر مثل کے برابر یا کم ہے تو ملے گا اور مہر مسمی مہر مثل سے زیادہ ہے تو محض مہر مثل ملے گا اور شوہر اول کا بعد انتقال عبد الرحمن نافذیر کا اپنے احباب و اعزہ سے شکایت کرنا اثر انداز نہ ہوگا۔

لہذا صورت مسئلہ میں خدیجہ بی کے بطن سے اگر کچھ اولادیں عبد الرحمن کی ہوئی ہوں گی تو وہ بھی زوجہ اولی کی اولادوں کی طرح جو عبد الرحمن سے ہیں وارث ہوں گی اور حسب قاعدہ تخریج شرعی سب کو حصہ ملے گا، تنہا عبد الرحمن سے نہیں وارث ہوں گی اور حسب قاعدہ تخریج شرعی سب کو حصہ ملے گا تنہا عبد الرحمن کی زوجہ اولی کی اولاد کو نہیں البتہ رقم پنشن یا انعام جو خدیجہ بی زوجہ عبد الرحمن کو حکومت نے دیا ہے وہ تنہا خدیجہ بی کا ہے بقیہ اس کے سوا جو متروکہ عبد الرحمن کا ہوگا اس میں تمام ورثہ کو حسب تخریج شرعی ملے گا۔ تمام ورثہ کی تفصیل لکھ کر سب کے حصے معلوم کریں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود علی عنایت مفتی دارالعلوم دیوبند

مفتی و الخیر کی بیوی سے نکاح:

مریم کا شوہر اب سے ۱۸ سال قبل ٹریبونگ کے زمانہ میں ہندوستان سے پاکستان جانے کے ارادہ سے مکان سے گیا، اس کے بعد سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی کہ وہ راستہ میں ہی مر گیا یا پاکستان چلا گیا وہ تنہا تھا کوئی اسکے ساتھ نہیں تھا، اس وقت سے اب تک مریم کو پہلے شوہر کی کوئی خبر نہیں ہے، اس کی ماں نے کلکٹر کی اجازت لیکر دوسرا نکاح کر دیا اتفاق سے اس کے بچے ہوئے اور دوسرا شوہر بھی مر گیا ہے، آج تک پہلے شوہر کی کوئی خبر نہیں ہے، مریم نے دوسرا شوہر مرنے کے بعد اور اس کی عدت گزرنے کے بعد خالد سے نکاح کر لیا، اب یہ تیسرا نکاح مریم کا صحیح ہے یا کہ نہیں، خالد کے لئے مریم حلال ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

مریم کا یہ نکاح خالد کے ساتھ صحیح نہیں ہے، اگر خالد سے صحیح نکاح کرنا چاہتی ہے تو جماعت مسلمین یعنی کم از کم تین دیندار باوقار معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت کے سامنے اپنے سارے واقعات کو بیان کر کے اصل شوہر کے نکاح کو فسخ کرنے کی درخواست کرے اور وہ جماعت مسلمین قاعدہ شرع کے مطابق واقعات کی تحقیق بین شہادت اور ثبوت کے ذریعہ اس نکاح کو فسخ کر کے مریم کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دیدے تو مریم فسخ نکاح کے وقت سے عدت تین حیض گزار کر اپنا نکاح خالد سے پھر سے پرہوائے اور جب تک جماعت مسلمین کے ذریعہ تفریق شرعی حاصل ہو کر دوسرا نکاح خالد سے نہ ہو جاوے، خالد سے بالکل علیحدہ رہے ہرگز اس کے قریب نہ جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند بہار پور ۵/۹/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عہد

س اس سے نکاح:

آخلق نامی ایک شخص نے اپنی بیوی کو ۸ سال پہلے طلاق دی تھی جس کا آخلق کو خود اقرار ہے، لیکن بیوی کو بلا نکاح ثانی اپنے پاس رکھے رہا ہے اس درمیان میں بچے بھی ہوئے اور میں نے اس آخلق کی بیوی کی لڑکی نجمہ سے اب سے ایک سال پہلے شادی کر لی تھی اور ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی تھی اس سال چار یا پانچ ماہ ہوئے اس شخص نے پھر کئی طلاقیں دیدی ہے۔ سو ۴ دن کے درمیان میں نے آخلق کی بیوی کی لڑکی نجمہ کو تین طلاقیں دیدی ہے۔

اب دریافت کرنا یہ ہے کہ آخلق کی بیوی سے جو میری ساس تھی اور میں نے نجمہ کو طلاق دیدی ہے ابھی نہ تو نجمہ کی طلاق مغلطہ کی عدت گزری ہے اور نہ تو اس آخلق کی بیوی کی دوبارہ طلاق کی عدت گزری ہے نکاح کر سکتا ہوں یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئلہ میں نجمہ کا نکاح صحیح اور منعقد ہوا تھا اور مرد نکاح صحیح منعقد ہونے سے ہی نجمہ کی ماں نجمہ کے شوہر پر ہمیشہ کیلئے حرام ہو گئی تھی جیسا کہ در مختار علی ہامش الشامی ج ۲ ص ۲۷۸ کی عبارت: ”و حرم بالمصاهرة بنت زوجته الموصولة و أم زوجته و جداتها مطلقا بمجرد العقد الصحيح وإن لم توطأ الزوجة الخ“ سے معلوم ہوتا

ہے کہ نجہ کے شوہر کا نکاح نجہ کی ماں سے کسی طرح اور کسی حال میں جائز نہیں ہو سکتا ہے، خواہ نجہ کی رخصتی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، خواہ نجہ یا نجہ کی ماں عدت میں ہو یا عدت سے باہر، ہر حال میں ناجائز اور حرام ہے، نجہ کی ماں نجہ کے شوہر پر بمنزلہ اپنی ماں کے حرام ہو چکی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

عدت میں کسی کا بھی نکاح صحیح نہیں۔

الجواب صحیح اختر محمود علی عمنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۰/۸/۱۳۸۵ھ

باب حرمة المصاهرة

حرمت مصاہرت کی ایک صورت:

زید نے اپنی ساس، یعنی بیوی کی ماں کی شرمگاہ پر انگلی لگائی جس سے اس کا مقصد اس سے زنا کرنا یا کوئی اور کچھ نہیں تھا اور نہ اور کوئی بات تھی، زید بچپن سے ہی گندے خیالات کا تھا اور گندے خیالات کی بناء پر اس نے یہ کیا، ہوا یہ کہ ایک رات زید اور اس کی بیوی اور زید کی ساس ایک ہی کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں، ساس اور بیوی دونوں سو رہی تھیں، زید نے جان بوجھ کر کہ یہ میری ساس ہے اس کی شرمگاہ پر انگلی لگائی، تو اب شریعت کے قانون کے مطابق اس کو کیا کرنا چاہئے جس سے اس کی تلافی ہو جائے؟

الجواب وبالله التوفیق:

سوال واضح نہیں ہے، آیا شرمگاہ پر اتنا مونا کپڑا تھا کہ انگلی رکھنے سے ایک کے جسم کی حرارت دوسرے کے جسم تک نہیں پہنچ سکتی تھی تو اپنی بیوی کے حرام ہونے کا حکم نہ ہوگا، بلکہ دونوں بدستور زن و شوہر باقی ہیں، اور اگر باریک کپڑا جس سے ایک کی حرارت جسم دوسرے تک پہنچتی ہے یا ننگے جسم پر ایسا کیا تو اس کا حکم یہ ہے کہ ساس کا شوہر اگر زندہ ہے اور اس واقعہ کی تصدیق کرتا ہے کہ واقعی میرے داماد نے ایسا کیا ہے (۱)، جب تو اس شخص کی بیوی کے حرام ہونے کا حکم ہو جائے گا، (۲)، اس لئے کہ ننگی شرمگاہ پر یا باریک کپڑے پر انگلی لگانا عموماً شہوت سے ہی ہوتا ہے۔

۱- "فی المس والنظر إلى الفرج لا يعنى بالحرم إلا إذا بين أنه فعل بشهوة، لأن الأصل في التقبيل الشهوة بخلاف

المس والنظر كلما في المحيط هذا إذا كان المس على غير الفرج وأما إذا كان على الفرج فلا يصدق (الفتاویٰ الہندیہ ۶/۲۷۱)۔

۲- "رجل قبل امرأة أبه بشهوة أو قبل الأب امرأة ابنه بشهوة وهي مكروهة وألکر الزوج أن يكون بشهوة فالقول قول

الزوج وإن صدقه الزوج وقعت الفرقة" (الفتاویٰ الہندیہ ۶/۲۷۱)۔

اسی طرح ساس کے شوہر کے تصدیق کرنے سے جس طرح ساس اپنے شوہر پر حرام ہو جائے گی، اسی طرح اگر داماد بھی اس کا قرا کرے کہ ایسی حرکت ہوگئی ہے تو ساس کی بیٹی اس پر حرام ہو جائیگی، یعنی اگر داماد کو قرا ہو کہ اس نے ایسا کیا ہے تو داماد پر اس کی بیوی بھی حرام ہو جائے گی، اور اگر ساس کا شوہر مر چکا ہے اور ساس کو اس قبیح فعل کی تصدیق ہے، پھر بھی جب تک داماد اس قبیح فعل کا قرا نہ کرے گا، اس کی بیوی کے اس پر حرام ہونے کا حکم نہ کریں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۵/۱۳۱۱ھ

شہوت کے ساتھ دو چار سال کی بچی کو چھونے سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی:
شہوت کی حالت میں اگر بیٹی یا ساس پر بھول کر بھی ہاتھ پڑ جائے تو بیوی نکاح سے باہر یعنی طلاق پڑ جائے گی، لہذا گزارش یہ ہے کہ بعض لوگوں کو خواہش نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر بیوی کو سوتے ہوئے جگانا پڑتا ہے اور بیوی کے پاس چھوٹی بچی دودھ پینے والی یا دو چار سال کی سوئی ہوئی ہوتی ہے تو بچی کے اوپر ہاتھ پڑنے سے تو نکاح نہیں ٹوٹتا؟

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسنورہ میں نکاح نہیں ٹوٹتا ہے، مسئلہ آپکو ادھورا معلوم ہوا ہے پورا مسئلہ یہ ہے کہ بھول سے اور بلا شہوت کے ہاتھ لگانے سے نکاح نہیں ٹوٹتا ہے اور یہ کہ جس بیٹی یا ساس کو ہاتھ لگایا ہو تو پہلے تو بلا کسی حائل کے بدن پر لگایا ہو یا اگر بدن پر کپڑا ہو تو اتنا مونٹا یا ایسا نہ ہو کہ اپنے ہاتھ کی گرمی اس کے بدن تک نہ پہنچ سکے دوسرے یہ کہ جس کو ہاتھ لگائے وہ مشہوۃ یعنی کم از کم ۹ برس کی ہو تیسرے یہ کہ اس پر ہاتھ لگانے سے شہوت ہو اور پھر ہاتھ لگانے میں ازدیا شہوت بھی ہو جب جا کر حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے ورنہ نہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عہد

۱- "وأصل مسمومة بشهوة بحائل لا يمنع الحرارة..... هذا إذا كانت حبة مشهواة" (الدرمخ المرد ۳/۱۱۰)۔

بہو کا خسر پر زنا کی تہمت لگانے سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

ایک ۵۰ سال والے بوڑھے موذن کو اس کے بیٹے کی بہو زنا کی تہمت لگا رہی ہے کہ میرے خسر نے زبردستی زنا کیا مجھ سے اور بڑھا اس بات کو نہیں مانتا ہے اور کوہ کوئی نہیں ہے، بلا کوہ بہو کا قول معتبر اور صحیح ماننا جائز ہے کہ بہو کا قول معتبر مانکر اسکو اذان دینے سے روکا جائے گا، نیز یہ بھی بتلایا جائے کہ جب وہ عورت اس فعل کا اقرار کرتی ہے تو کیا وہ اب اپنے شوہر کے پاس رہ سکتی ہے یا اس پر حرام ہوگئی ہے، عندا شرع کیا فتویٰ ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

جب بوڑھا آدمی زنا کا اقرار نہیں کرتا ہے اور کوئی کوہ موجود نہیں ہے تو محض اس عورت کے کہنے سے اذان دینے سے نہ روکا جائے گا، اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ وہ عورت اپنے اس اقرار سے شوہر پر حرام ہوئی یا نہیں؟ تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر شوہر کو عورت کے اس کہنے کا یقین ہے کہ وہ سچ کہہ رہی ہے تو وہ عورت اس پر حرام ہوگئی فوراً اس سے الگ ہو جاوے اور اس کو طلاق دیدے۔

اور اگر عورت کے کہنے کا یقین نہیں ہے، اس کو سچا نہیں سمجھتا ہے تو عورت حرام نہیں ہوئی ہے، ”رجل تزوج امرأة علی أنها عذراء فلما أراد وقاعها وجدها قد افترض فقال لها: من افترضک ففعلت أبوک، إن صدقها الزوج بانت منه ولا مهر لها وإن کذبها فھی امرأته“ (۱)، اور نہ اس کے لئے کوئی اور حکم ہے البتہ عورت اپنے اس کہنے سے فاسقہ ہوگئی اسکو توبہ کرنا واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند محمود علی عنہ

مزنیہ کی لڑکی سے نکاح:

ایک آدمی نے ایک عورت سے زنا کیا جس سے لڑکی بھی ہوئی پھر وہی زانیہ اس عورت کی بڑی لڑکی سے جو اس عورت کے شوہر سے ہوئی تھی شادی کرنا چاہتا ہے کیا یہ درست ہے؟

شیخ محمد الدین (سینٹرل ڈیپارٹمنٹ سٹڈنٹس - سعودی عرب)

الجواب وبالله التوفیق:

وفي رد المحتار: يحرم كل من الزاني والمزنية على أصل الآخر وفرعه لورضاعها، قال في البحر: وبحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة على أصول الزاني وفرعه نسبا ورضاعا وحرمة أصولها (أي المزنية) وفروعها (أي المزنية) على الزاني نسبا ورضاعا كما في وطء الحلال، (۱)، وفي الهداية: ومن زنى بامرأة حرمت عليه أمها وبنتها (۲) وتحتته في فتح القدير: ” روى في حرمة أحاديث كثيرة منها، قال رجل: يا رسول الله إني زنيت بامرأة في الجاهلية أفأ نكح ابنتها؟ قال: لا أرى ذاك“ (۳)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ یہ شخص اپنی مزنیہ کی بڑی لڑکی سے نکاح نہیں کر سکتا، یہ نکاح بھی حرام و ناجائز ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/۲/۹۹ھ

۱۔ شاہ ۳۱-۳۲ کتاب النکاح فصل فی الحرمات، النکاح المسمیٰ کہنی کراچی۔

۲۔ ہدایہ ۵/۲، کتاب النکاح، فصل فی بیان الحرمات، (ادارہ القرآن وعلوم الاسلامیہ کراچی)۔

۳۔ فتح القدير ۲۱۲ فصل فی بیان الحرمات، دارالکتب العلمیہ بیروت۔

باب الرضاۃ

رضاعی بہن سے نکاح کرنے کے متعلق حکم شرعی:

زید نے ایک عورت سے شادی کی جس پر تین معتبر عورتوں نے اس کے دودھ بہن ہونے کی شہادت دی، لیکن زید نے اپنی غرض کے ماتحت ان کی تصدیق نہ کر کے شادی کر لی، حالانکہ شاپدین میں ایک اپنی ماں، دوسری رضاعی ماں، تیسری ایک اور معتبر عورت ہے، مگر کسی عالم سے فتویٰ منگوا کر شادی کر لی، لیکن خدا کی مرضی اس عورت کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ عورت چونکہ مالدار ہے، اس غرض سے سب سے ٹکراؤ رہتا ہے، لیکن ہمسایہ کے لوگ جانتے ہیں کہ یہ زید کی دودھ بہن ہے، ایسی حالت میں اس شادی کو توڑنا واجب ہے یا نہیں؟

عبد اللطیف چودھری تیل باڑی

الجواب وباللہ التوفیق:

اس کا جواب گزر چکا ہے، صرف واقعہ میں اتنا فرق ہے کہ وہاں شادی ابھی تک نہیں ہوئی تھی، بلکہ کرنا چاہتا تھا اور یہاں خود رانی کر کے کر لی ہے، لہذا اس کے حکم میں سابق حکم کے ساتھ اتنا اضافہ ہے کہ جب رضاۃ کی شہرت ہے تو طلاق دے کر علیحدگی اختیار کر لیا ہی بہتر ہے، بلکہ ایک درجہ میں واجب ہے اور احتیاطاً تنزیہ کا حکم ہے۔ ”فتاویٰ خانہ“ میں بھی اسی طرح کا جزئیہ منقول ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمود غفرلہ، سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

ثبوت رضا کے لئے تنہا عورتوں کی شہادت:

ہمارے پڑوس میں دو بہنوں کی شادی کئی سال قبل ایک گاؤں میں انجام پائی، بڑی بہن کے بیٹے ہوئے اور لڑکیاں بھی، جبکہ چھوٹی بہن کی لڑکیاں ہی ہوئیں، دونوں بہنیں اتر کر کرتی ہیں کہ وہ اپنے ہم عمر بیٹے بیٹیوں کو ایک دوسرے کا دودھ پلا چکی ہیں اور اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، تاہم خاندان کے کسی مرد کے ذہن میں یہ بات نہیں ہے، آیا وہ رضائی بہن بھائی ہیں یا نہیں ہیں؟ چھوٹی بہن جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی اس کی بڑی بہن کے بیٹے کے ساتھ عمل میں آئے، لیکن دونوں بہن اس حقیقت کا بار بار اعتراف کرتی رہی ہیں کہ وہ دونوں بچوں کو ایک دوسرے کا دودھ پلا چکی ہیں، چنانچہ خاندان کے بزرگوں نے متوفیہ کی چاہت کے پیش نظر مفتیان دین سے رجوع کیا اور اس سلسلہ میں ایک بات پیش آئی کہ رضا مت ثابت ہے، اس لئے رشتہ نہیں ہو سکتا جبکہ ایک اور مفتی کا دعویٰ ہے کہ جب تک کوئی مرد رضا مت کے بارے میں شہادت نہ دے رضا مت قرار نہیں پاسکتی اور یوں رشتہ ازدواج ہو سکتا ہے، آپ سے استدعا ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عطا فرمائیں۔

پروفیسر عبدالغنی (راکن ہٹنگٹن، شولا پورہ، ہولہ کشمیر)

الجواب وبالله التوفیق:

ثبوت رضا کے لئے دو مرد یا ایک مرد و دو عورتوں کی شہادت ہے، صرف تنہا عورتوں کی شہادت معتبر نہیں، لیکن صورت مذکورہ میں چونکہ نکاح سے پہلے نکاح کے جواز و عدم جواز میں شک واقع ہو گیا ہے، اس لئے جانب حرمت کو ترجیح ہوگی، ان کا باہم نکاح کرنا جائز نہ ہوگا۔

”أفاد أنه لا يثبت بخبر الواحد امرأة كان أو رجلاً قبل العقد أو بعده وبه صرح في الكافي والنهاية تبعاً لما في رضا ع الخانيه: لو شهدت به امرأة قبل النكاح فهو في سعة من تكذيبها لكن في محرمات الخانيه: إن كان قبله والمخير عمل ثقة لا يجوز النكاح وإن بعده وهما كبيران فالأحوط التنزه وبه جزم البزازي معاً بأن الشك في الأول وقع في الجواز وفي الثاني البطلان والدفع أسهل من الرفع“ (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

عورت کی شہادت پر حرمت رضاعت کا شرعی حکم:

محمد سراج الحق چودھری نے ایک ایسی عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا جس پر تین معتبر عورتوں نے شہادت دی کہ سراج الحق نے اس عورت کی ماں کا دودھ پیا ہے، شاہد میں ایک سراج الحق کی ماں ہے جس کو تمام ہمسایہ والوں نے معتبر وثقہ ہونے کی شہادت دی، لیکن سراج الحق اس بارے میں اپنی ماں کی تصدیق نہیں کرتا، بلکہ فاسقہ بھی کہتا ہے۔ دوسری عورت، عورت مذکورہ کی ماں، یعنی دودھ ماں وہ بھی معتبر اور ثقہ ہے، سوم ہمسایہ کی ایک عورت حاجی، بہر حال تینوں معتبر لوگ جانتے ہیں خصوصاً ہمسایہ کے لوگ جانتے ہیں، ایسی حالت میں سراج الحق کو اس عورت سے جو اپنی دودھ بہن ہے (شہادت کی شہادت کی وجہ سے) اس سے شادی کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب وبالله التوفیق:

مانا کہ حرمت رضاعت ثابت ہونے کے لئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کی ضرورت ہے، محض عورتوں کی شہادت سے حرمت ثابت نہ ہوگی، لیکن حرمت ثابت نہ ہونے پر نکاح کر لینا واجب بھی تو نہ ہوگا، بہت سے بہت مباح و جائز ہو سکے گا، اور حقیقی ماں کی اطاعت مباح امور میں واجب ہوتی ہے، اسی طرح رضاعی ماں احترام و عظمت اور اس کی اطاعت بھی امور مباح میں ضروری ہوتی ہے، پس جب یہ دونوں کہتی ہیں کہ یہ دونوں رضاعی بہن بھائی ہیں، نیز اس کی شہرت بھی ہو چکی ہے، تو ہرگز اس کو دونوں حقیقی ماں و رضاعی ماں کی مخالفت جائز نہ ہوگی اور نکاح کی اجازت نہ ہوگی۔ علاوہ ازیں ماں کو فاسق کہنا سخت گناہ ہے، اگر بغیر وجہ شرعی کہا ہے تو خود فاسق شمار ہوگا، کیونکہ حکم قرآنی: ”وَلَا تَقُلْ لِهَٰمَا اٰفٌ“ (۱) کے خلاف ہے اور حدیث میں عقبہ بن حارث کا واقعہ بالکل اسی قسم کا منقول ہے کہ حضور ﷺ نے ان کو اس نکاح سے منع فرما دیا۔ پھر انہوں نے دوسری عورت سے نکاح کیا (۲)، اس لئے سراج الحق صاحب کو ہرگز ایسی عورت سے شادی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۷/۷/۱۳۹۱ھ
الجواب صحیح: محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند، سید احمد علی سعید

۱- سورۃ اسراء: ۲۳۔

۲- مشکوٰۃ شریف ص ۲۷۳۔

بیوی کا دودھ پینا:

ایک شخص نے اپنی بیوی کا دودھ پی لیا ہے؟ کیا اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل گئی؟ دوبارہ نکاح پڑھانا پڑے گا۔

شیخ احمد الاعظمیٰ

الجواب وبالله التوفیق:

بیوی کا دودھ پی لینے سے نکاح نہیں ٹوٹتا بلکہ نکاح بحال باقی رہتا ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ بالغ ہو جانے کے بعد کسی عورت کا بھی دودھ ہو بلا اضطراری ضرورتوں (علاج وغیرہ کے) کے پینا حرام ہے درست نہیں ہے اور یہی حکم اپنی بیوی کے دودھ کا بھی ہے اور اسی وجہ سے مسئلہ یہ ہے کہ اگر بیوی کا پستان منہ میں لے لیا اور دودھ نکل آیا تو اس کو نہ پیے اور نہ نگلے بلکہ کلی کر دے اور تھوک دے۔ اس کے علاوہ جو مسئلہ یہ مشہور ہو گیا کہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے غلط ہے اور مسئلہ یہ لکھا ہوا ہے کہ اگر فرط محبت یا جوش شہوت وغیرہ میں بیوی کا پستان منہ میں لے تو یا تو دودھ نکلنے کی جگہ بچا کر منہ میں لے یا پھر اگر دودھ منہ میں آجائے تو فوراً تھوک دے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بیوی کا دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی ہے:

حمیدہ اپنے بچہ کو اپنا دودھ پلا رہی تھی قریب ہی اس کا شوہر کھانا کھا رہا تھا، کسی طرح بچے کے منہ سے دودھ کے قطرے کھانے میں گر گئے، جسے زید اور حمیدہ دونوں نے دیکھا، دیکھنے کے باوجود زید نے دیدہ و دانستہ اس کھانے کو کھا لیا ہے، اب عمداً ایسی حرکت کرنے پر اس کی منکوحہ اس کے عقد میں باقی رہے گی یا کہ نہیں یا حرام قرار پائے گی؟

۱- ”مصر دجل فمدی امرأه لم تحرم“ (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۴۱۲)، ”لأنه جزء آدمی والاتضاع به بغیر ضرورة حرام علی الصحیح“ (ایضاً ۳/۴۹۷) ”وعلی هذا لا يجوز الاتضاع به للمداوی“ (البحر الرائق ۳/۳۸۹)۔

الجواب وبالله التوفیق:

اس کی منکوحہ ہرگز اس پر حرام نہ ہوگی بلاشبہ حلال رہے گی (۱)، البتہ جس جگہ قطرے گرے تھے وہ حصہ اس کو طہیجہ کر دینا چاہئے تھا اور اس کو کھانا اس کو جائز نہیں تھا، ”وَلَمْ یَسِغِ الْاَرْضَاعُ بَعْدَ مِلْقَتِهِ لِأَنَّهُ جِزءٌ آدَمِیٌّ وَالْاِنْتِفَاعُ بِهِ لَغَیْرِ ضَرْوَرَةٍ حَرَامٌ عَلَی الصَّحِیْحِ“ (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

دودھ دوائیں ملا کر پلانے سے رضاعت کا حکم:

ایک لڑکی مسماۃ زینب اپنی بچپن کی حالت میں ایک بار بہت سخت بیمار ہوئی، اسی حالت میں زید کی والدہ کا دودھ صرف ایک قطرہ دوائیں ملا کر زینب کو پلایا گیا تھا، بغیر دواء کے اس صورت میں رضاعت ثابت ہو جاتی ہے یا کہ نہیں اور اس لڑکی یعنی زینب سے زید کی شادی ہو سکتی ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

زید کی والدہ کا دودھ اگر ڈھائی سال کی مدت کے اندر ہی پلایا گیا ہے اور حلق کے اندر اتر بھی گیا تو رضاعت ثابت ہوگئی اور نکاح بھی حرام ہو گیا ہے، یہ جب کہ خالص دودھ پلایا گیا ہو اور اگر دودھ دواء میں ملا کر پلایا گیا ہے تو دودھ کے غالب ہونے کی صورت میں حرمت نکاح اور رضاعت ثابت ہیں اور دواء غالب ہونے کی صورت میں نہ حرمت ثابت ہوئی اور نہ رضاعت، ”وَمَخْلُوطٌ بِمَاءٍ وَ دَوَاءٍ (الی قولہ) اِذَا غَلَبَ لَبَنُ الْمَرْأَةِ“ (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمد علی اعظمی ۱۶/۷/۱۳۸۵ھ

۱- ”وَ اِذَا مَضَتْ مَدَّةُ الرِّضَاعِ لَمْ یُعْلَقِ بِالرِّضَاعِ نَحْوِیْمٌ“ (الہندیہ ۱/۳۳۳)۔

۲- الدر المختار ۴/۳۹۷۔

۳- در مختار۔

رضاعت سے متعلق:

مسنی رسول ڈار کی پہلی عورت فوت ہو چکی ہے، اس کے بطن سے دو لڑکیاں جانہ بی بی و خدیجہ بی بی موجود تھیں پھر رسول ڈار مذکور نے دوسری شادی مسماۃ خورشیدی کے ساتھ کی ہے خورشیدی مذکور کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں شوہر مذکور سے موجود ہیں، لیکن خورشیدی مذکورہ اپنی دونوں سوتیلی لڑکیوں کے لڑکوں یعنی جانہ بی کے لڑکے رشید کو خدیجہ کے لڑکے منذر کو دودھ پلائی ہے، لہذا خورشیدی مذکورہ رشید و منذر مذکورین کی ایک طرف سوتیلی مانی بھی ہے دوسری طرف دودھ پلانے والی ماں بھی ہے اور ان دونوں یعنی رشید کی بھی بہن ہے، اور منذر کی بھی بہن ہے دریافت یہ ہے کہ رشید کو منذر کی بہن کے ساتھ اور منذر کو رشید کی بہن کے ساتھ عقد نکاح کریں شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

مذیر احمد تحصیل زیارت، حضرت شاہ عہد ان، مقام تڑالی ضلع پہلو والہ، کشمیر

الجواب وبالله التوفیق:

۱۔ خورشیدی کے بطن سے اور رسول ڈار کے نطفہ سے جو لڑکا ہے وہ مصرہ اور جمیلہ کے نسب کے اعتبار سے سوتیلی ماموں ہے اور اس کا نکاح مصرہ اور جمیلہ سے حرام ہے اور رشید اور منذر رضاعت کے اعتبار سے سوتیلی ماموں ہیں (سوالنامہ میں مصرہ اور جمیلہ کے متعلق صراحت نہیں ہے کہ وہ کس کی لڑکیاں ہیں) اور نسب کے اعتبار سے جو رشتہ حرمت کا ہوتا ہے وہ رشتہ رضاعت کے اعتبار سے بھی حرمت کا ہوتا ہے، ”یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب“ (۱)۔

پس مصرہ کا نکاح منذر سے اور جمیلہ کا نکاح رشید سے قطعاً حرام ہوگا اگرچہ ایک رشتہ سے دونوں خالہ زاد بھائی بہن ہونے کی وجہ سے نکاح جائز معلوم ہوتا ہے مگر یہ رشتہ اب مفید حلت نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۲/۱۴۰۰ھ

۱۔ صحیح مسلم کتاب الرضاع حدیث نمبر (۱۴۳۵) میں ایک حدیث ان الفاظ میں مروی ہے: ”لأنه یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب“ نیز یہ حدیث ”ما یحرم من الولاء“ اور ”ما یحرم من الرحم“ کے الفاظ میں بھی منقول ہے۔

نتخبات نظام الفتاوى - جلد دوم

کتاب النکاح (باب الرضاة)

باب الاولیاء والا کفاء

والد کے ماموں کے لئے نابالغہ کا نکاح کرنا:

تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر میں اس کے والد کے ماموں نے والد کے سامنے ہی اپنے اختیار سے زید کیساتھ نکاح کرادیا۔

والد نے اپنے ماموں صاحب کے خوف کی وجہ سے انکار نہیں کیا ہے لیکن اجازت بھی نہیں ہے اور نہ بہار کبادی دی اور اسی وقت گھر پہنچے تو ہندہ کی والدہ نے یہ کہا کہ تم نے ایسا کیوں کر دیا ہے اس پر ہندہ کے والد نے یہ جواب دیا کہ نکاح کر دینے کی میری بالکل مرضی نہیں تھی اور نہ ہی میں نے اجازت دی ہے اس پر ہندہ کے والد کو غصہ آیا ہے ماموں کے خوف کی وجہ سے پہلے رہنے دیا اور تقریباً ہندہ کی چار سال عمر تک حیات رہ کر وفات پا گئے اور اب ہندہ بالغ ہے اور بالکل اس نکاح سے متفق نہیں ہے اسی طرح موجودہ ولی برادر کھاناں اور والدہ کی بھی مرضی نہیں ہے، لہذا اگلا ارش ہے کہ شریعت کے مطابق جو حکم ہو تحریر فرما کر ممنون و مشکور فرماویں۔

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سولی بوقت نکاح باپ ولی تھا اور اس نے اجازت نہیں دی پھر اس کے بعد اسکا لڑکا یعنی ہندہ کا بھائی ولی ہوا اس نے بھی ابھی تک اجازت نہیں دی ہے اور نہ لڑکی ہی نے بالغ ہو کر نافذ کیا تو اس صورت مسئولہ میں ہندہ کا بھائی جو ولی ہے اور خود لڑکی بھی اس نکاح کو فتح کر سکتے ہیں (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۱۳۸۵ھ

۱- ”وإن كان المزوج غیرهما ای غیر الاب والجد... لا یصح النکاح من غیر کفوۃ او بغین فاحش... دون کان من کفوۃ وبمہر المفل صح ولكن لهما ای الصغیر وصغیرۃ خیار الفسخ ولو بعد الدخول بالبلوغ إذ العلم بالنکاح بعدہ“ (الدرمخ الرد ۵/۲۵۴، مکتبہ ذکریا)۔

والد نے نابالغہ کا نکاح کر دیا تو بعد بلوغ اس کو اختیار بلوغ نہیں ملے گا:

گزارش ہے کہ کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کے والدین نے کر دیا ہو اور اس لڑکی کو یہ نہ معلوم ہو کہ میرا نکاح ہو گیا ہے اب وہ لڑکی سن بلوغ کو پہنچ گئی ہو اور اپنے شوہر کے یہاں جانا پسند نہیں کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ میں خود اپنی مرضی سے نکاح کرتی ہوں اور شوہر اس کا اختیار نہیں دیتا ہے اور نہ طلاق دیتا تو اس کا پہلا نکاح ٹوٹ گیا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

والدین کے کئے ہوئے نکاح میں لڑکی کو اختیار بلوغ نہیں حاصل ہوتا ہے، لہذا صورت مسئلہ میں لڑکی کو اپنے اسی شوہر کے پاس جانا چاہئے لڑکی کا جانے سے انکار کرنا یا جانے کو پسند کرنا صحیح نہیں ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب
کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

والد کے لئے نابالغہ لڑکی کا جبراً نکاح کرنا:

ایک لڑکی جو کہ ابھی نابالغ تھی اس کے باپ نے اس کا رشتہ ایک جگہ کر دیا، جب لڑکی بالغ ہوئی تو اس نے رشتہ کرنے سے انکار کر دیا، باپ کے سامنے وہ بول نہ سکی، اس نے قریب کے ہر ایک مرد و زن کے سامنے انکار کیا، والد نے مطابق اپنے وعدہ کے شادی کرنی چاہی، اس وقت اس لڑکی کے سب قریب و آلے بھی اس شادی میں آنے سے انکار کر گئے حتیٰ کہ اس کے بھائی بہن اور سب رشتہ دار اس جگہ کو چھوڑ کر چلے گئے اور بوقت نکاح وہاں موجود نہ رہے تب منکوحہ لڑکی نے کہا کہ اچھا آپ اپنی بات پوری کر لو، میں بھی اپنی بات پوری کروں گی جس سے اجازت نہ دینا مقصد تھا بوقت نکاح کیڑے زیور بالکل نہیں لئے، نکاح ہوئے سات سال ہو گئے ہیں، لڑکی آج تک اپنے والد کے گھر پر ہے اور اس نے آج تک کوئی حق زوجیت اور انہیں کیا ہے اور نہ خاوند کے ساتھ اور پاس رہی ہے، خانہ داماد سے شرط لی گئی تھی کہ اگر وہ کوئی ہر اکام کرے، چوری کرے، زنا کرے تو اس پر لڑکی کو طلاق واقع ہو جائے گی، اس کے بعد اس خاوند سے کئی غلطیاں بار بار سرزد ہوئیں ہیں، اس سے یہ بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ اس کے گھر سے نہ بھاگے گا، لیکن وہ بار بار بھاگا ہے، اب وہ لڑکا پاکستان چلا گیا ہے، بلا مشورہ کے دریافت ہے کہ نکاح میں کوئی خلل واقع ہوا ہے یا کہ نہیں؟

۱- ”للولی النکاح الصغیر والصغیرۃ... ولزم النکاح... إن کان الولی أبا أو جدًا... لم یعرف منہما من الاختیار مجالۃ وفلسفان عرف لایصح“ (الدرع الرد ۳/۱۷۲)۔

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال صورت مسئلہ میں بوقت نکاح لڑکی جب بالغ تھی اور باپ نے لڑکی کی بلا رضا مندی کے زبردستی نکاح کیا ہے تو یہ نکاح لڑکی کی اجازت پر موقوف ہوا، اگر لڑکی نے ایک دفعہ بھی اپنے شوہر کو اپنے اوپر قابو دے دیا ہو یا ایک دفعہ بھی شوہر سے ہم صحبت یا خلوت صحیح ہو چکی ہو تو رضا مندی ثابت ہوگئی اور اس کا نکاح لازم ہو گیا ہے (۱)۔

اور نکاح ہوئے سات (۷) سال ہو چکے ہیں اور شوہر خاندان دانا ہے، اس لئے اٹلب یہ ہے کہ ایک آدھ دفعہ تو ضرور ان باتوں میں سے کسی بات کا موقع آ گیا ہوگا۔ دیکھو خدا سے معاملہ ہے اور حلال و حرام کا معاملہ ہے دنیا سازی سے ہرگز اس قسم کے معاملات میں کام نہ لینا چاہئے۔

بہر حال اگر ایک دفعہ بھی عورت نے رضا دیدی ہو یا اپنے اوپر شوہر کو قابو دیدیا ہو تو نکاح لازم ہو گیا اور اب اس شرط نامہ کے خلاف شوہر سے کوئی بات واقع ہوگئی ہو تو عورت پر پہلی خلاف ورزی میں طلاق واقع ہوگئی ورنہ شوہر سے طلاق ہی لینا پڑے گا، شرط نامہ کے خلاف شوہر سے کیا واقع ہو یا دیکھ لیا جائے اور حکم لگایا جائے۔

ہاں اگر واقعی ایک دفعہ بھی لڑکی نے اپنی رضا نہیں دی اور نہ ایک دفعہ بھی تنہائی و یکجائی شوہر سے اس نے (۷) سات برس کی مدت میں کی ہے تو لڑکی کو اب بھی اختیار باقی ہے کہ اپنے اس نکاح کو کم از کم تین دیندار با وقار معاملہ شناس اور قوم کے ذمہ دار کے سامنے یہ کہہ دے کہ میں اس نکاح کو رد کرتی ہوں اور توڑتی ہوں اور وہ لوگ تینوں آدمی (جو بمنزلہ جماعت مسلمین کے ہیں) واقعات کی تحقیق شریعت کے مطابق کر کے عورت کے اس رد کو تسلیم کر لیں اور فسخ نکاح کا فیصلہ دیدیں جب بھی یہ نکاح رد اور فسخ ہو جائے گا، عورت کو دوسرا نکاح کرنے کا حق شرعاً حاصل ہو جائے گا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۶/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی منہ محمد جمیل الرحمان

نابالغہ لڑکی کا نکاح اس کے والد کی اجازت کے بغیر کرنا:

ایک لڑکی صغیر السن کی شادی عرصہ ۱۰ اوس سال ہوئے ہوئی تھی، ما بالغ لڑکی کا والد شادی کا پیغام بھیجنے کے وقت بھی

۱- "قال الزوج للبکر البالغة بلغك النکاح فسکت ولات رد دت النکاح ولا بید لهما علی ذلک ولم یکن دخل بها فی الاصح فالقول قولهما (المختار) وقال الشامی: واحصرز به عما اذا دخل بها طوعا حیث لا تصدق فی دعوی الرد فی الاصح" (رد المحتار ج ۲ ص ۱۶۷ مکتبہ زکریا)۔

مارض تھا، لڑکی کے والد کا حقیقی چچا لا ولد ہے، اس کی ملکیت زمین وغیرہ کے دباؤ سے لڑکی کا والد اپنے حقیقی چچا سے دبا رہا، لیکن طبیعت اس نکاح کے خلاف رہی، نکاح ہونے کے وقت بھی لڑکی کا والد نکاح میں شریک نہیں ہوا اپنے گھر میں بھی نہیں رہا، اس وقت لڑکی بالغ ہو چکی ہے، معزز حضرات کے کہنے اور سمجھانے کے باوجود بھی لڑکی کا والد آج بھی مارض ہے، لڑکی بھیجنے پر کسی حالت میں آمادہ نہیں، کچھ معزز حضرات حافظ ظہور احمد و بابو انوار احمد و حافظ اقبال احمد نے لڑکی کو تنہائی میں الگ بلا کر سمجھایا اور کافی دباؤ دیا کہ جہاں پر تیرا نکاح تیرے دادا نے کیا ہے اپنی مرضی سے کیا ہے تم وہیں چلی جاؤ، لڑکی نے سمجھانے کے باوجود بھی جانے سے صاف انکار کر دیا، ان حضرات کے سامنے کہا کہ میں وہاں کسی بھی حالت میں جاؤں گی ایسی حالت میں کیا یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟

مسلم الدین (۷ فریقی منزل دارالعلوم دیوبند)

الجواب وبالله التوفیق:

اس نابالغہ کا نکاح اس نابالغہ کے والد کی اجازت پر موقوف تھا، پس اس کے والد نے علم نکاح ہونے کے بعد اس نکاح کو رد کر دیا تو یہ نکاح اس رد کرنے کے وقت ختم ہو گیا (۱)، اب لڑکی کو وہاں بھیجنا بھی جائز نہیں اب وہیں اس نکاح کی بنیاد پر بھیجنا حرام کاری کرانے کے مترادف ہوگا، ہاں اگر لڑکی وہاں جانے کو تیار ہو جائے تو پھر سے چند گواہوں کے سامنے نکاح پڑھا کر بھیجا جائے ویسے ہرگز نہ بھیجا جائے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- "فی شرح السویر: فلو زوج الأب بعد حال قیام الأقرب توقف علی إجازته ولی الشامي تحت (قوله توقف علی إجازته) فلا يكون مكوذ إجازة لنكاح الأب بعد وإن كان حاضراً في مجلس العقد مالم يرض صريحاً أو دلالة دأمل" (رد المحتار ۹۹/۳، کتاب النکاح، باب الولی)۔

۲- "لقد نكاح حرة مكلفة بلا ولی عند ابی حنيفة وأبی يوسف رحمهما الله تعالى في ظاهر الرواية كلها في النسيب" (ہندیہ ۲۸۷/۱، کتاب النکاح، الباب الرابع فی الاولیاء، مکتبہ دارالکتاب)۔

عدم کفو کی بنیاد پر فسخ نکاح

حمید اور رضیہ میں بے حد محبت ہے رضیہ نے اپنے باپ کو اطلاع کئے بغیر حمید سے نکاح کی تیاری کی، دن اور وقت مقرر کیا، دو گواہ بنائے دونوں بائع تھے ان کے سامنے ایجاب و قبول ہوا، نکاح نامہ مرتب ہوا، یقین اور گواہ نے دستخط کئے، عرصہ تک بغیر اعلان نکاح کئے زن و شوئی کی طرح زندگی گزاری ہے، جب رضیہ کے باپ زید کو علم ہوا تو اول تو نکاح تسلیم نہیں کیا اور کہتا ہے کہ اگر نکاح واقع ہو گیا ہے تو لڑکے کے ہم کفو نہ ہونے کی وجہ سے مجھے فسخ کرانے کا حق ہے حمید دیندار اور ایم اے تک تعلیم یافتہ ہے، اور رضیہ کا باپ دیندار اور سید خاندان سے ہے۔

مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:

کفو کی تعریف:

کفو کی کیا تعریف ہے؟

عربی النسل وغیر عربی النسل میں کفو کا مسئلہ:

☆ کیا ہندوستان میں عربی النسل وغیر عربی النسل کفو اور غیر کفو کا مسئلہ معتبر ہے یا کہ نہیں؟

☆ کیا رضیہ اور حمید ہم کفو ہیں؟

☆ کیا یہ نکاح واقع ہو گیا ہے یا کہ نہیں واقع ہوا ہے؟

☆ کیا زن و شوئی کے تعلقات قائم ہو جانے کے بعد اور ہم کفو نہ ہونے کی بناء پر زید کو اپنی لڑکی کا نکاح فسخ

کرانے کا حق ہے؟

☆ اس دور میں جب عہدہ قضاء کا وجود نہیں ہے فسخ کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب وبالله التوفیق:

☆ (در مختار علی الشامی) باب الکفائة میں ہے: (الکفائة) من کافاه إذا ساواه والمراد هنا مساواة

مخصوصة أو کون المرأة أدنى اور اس کی تشریح (شامی ۴/۸۳۸) میں ہے:

شعر: ان الکفائة فی النکاح تكون فی ست لها بیت بلیع قد ضبط

نسب واسلام کذا لک حرفة حرية وديانه ومال فقط۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کفائۃ نسب، اسلام، پیشہ، حریت، دیانت اور مال میں یعنی ان باتوں میں مخصوص قسم کی مساوات کا نام ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

☆ عربی النسل تو میں خواہ ہندوستان میں ہوں یا غیر ہندوستان میں ان میں باعتبار نسل کے کفائت معتبر ہے جیسا کہ عبارت ذیل سے معلوم ہوتا ہے: ”تعتبر (الكفائة) نسباً فقر يث أكفاء والعرب أكفاء“ (۱)۔

☆ حمید کے بارے میں کچھ تحریر نہیں کہ وہ کس خاندان و نسب اور کس پیشہ کا ہے اس کا جواب بغیر اسکے نہیں ہو سکتا ہے جو ۳ کا ہے۔

☆ اس کا بھی وہی جواب ہے۔

☆ ”وله اذا كان عصبه الا اعتراض في غير الكفوء فيفسخه القاضى (۲) زاد لفظ يسكت للاشارة الى ان سكوته قبل الولادة لا يكون رضا (الى قوله) ويفهم منه انه لو لم يسكت بل خاصم حين علم فكذلك بالاولى“

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ زن و شوئی کے تعلقات قائم ہونے کے بعد بھی ہم کفو نہ ہونے کی بناء پر فسخ نکاح کا حق باقی رہتا ہے، لیکن فتویٰ اس پر ہے کہ بالذکور جو اپنا نکاح بلا اذن ولی غیر کفو میں کرے اس کا نکاح منعقد نہیں ہوتا ہے جیسا کہ عبارت ذیل سے معلوم ہوتا ہے: ”وفيتى في غير الكفوء بعدم جوازه أصلاً وهو المختار للفتوى (۳) وفي الشامي تحته وقال شمس الانسة وهذا اقرب الى الاحتياط كذا في تصحيح العلامة قاسم“۔

۶۔ مسلمان حکام جو منجانب حکومت وقت اس قسم کے معاملات فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں اور بقاعدہ شرعیہ فقہیہ کے مطابق سماعت و تحقیق و اقدار و مدار مقدمہ سب مرتب کر کے فیصلہ دیں تو معتبر ہوگا۔ یا پھر جماعت مسلمین جو کہ کم سے کم تین دیندار و قار معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت جو قائم مقام قاضی شرعی کے ہو سکے بقاعدہ شرعیہ فقہیہ سماعت و تحقیق و اقدار و مدار مقدمہ وغیرہ مرتب کر کے فیصلہ دے، یہ ایسی جگہوں کا طریق کار ہے جہاں عہدہ قضاء شرعی کا وجود نہ ہو (الحيلة الناجزة للحلية العاجزة) فقط والله اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۷/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عن سید احمد علی سعید

۱۔ تنویر علی حاشی الثانی ج ۲ ص ۳۳۷ باب الکفاءۃ۔

۲۔ درمنا علی حاشی الثانی ج ۲ ص ۳۳۷ فی الثانی ۲۳۸ تحت قولہ لم یسکت حتی یتلد۔

۳۔ درمنا علی الثانی ۲/۳۰۹۔

لڑکی نے غیر کفو میں نکاح کر لیا تو کیا حکم ہے؟

شرائط کفو	حمید	رضیہ بالغہ
نسب	غوری	سیدہ
اسلام	قدیم الاسلام	قدیم الاسلام
حریت	آزاد	آزادی
دیانت	پرہیزگار	پرہیزگار
پیشہ	معلیٰ	کھرکی
دینداری	زیادہ	کم
علم دین	علم دین سے واقف زیادہ بہت کم واقف	

۱۔ کیا حمید اور رضیہ ہم کفو ہیں؟

بالغہ رضیہ کو حمید کے حسب نسب کے بارے میں علم ہونے کے باوجود رضیہ نے بلا رضا مندی ولی حمید سے عقد کر لیا اور زن و شوئی کی زندگی بسر کی۔

(الف) کیا یہ نکاح واقع ہو گیا یا کہ نہیں؟

(ب) اگر نکاح نہیں ہوا ہے تو کیا زن و شوئی کے تعلقات حرام کاری کے مترادف ہوئے؟

۲۔ امام محمدؒ نے اپنی کتابوں میں امام ابو حنیفہ کا قول نقل کیا ہے کہ (الف) ایسی حالت میں بالغہ عورت کا نکاح جائز ہے گو ولی کی اجازت اور رضا مندی نہ ہو، ملاحظہ ہو حاشیہ علم الفقہ ص ۷۷ مصنفہ حضرت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنؤی باب النکاح۔

(الف) غیر عربی النسل عربی النسل کا کفو نہیں ہو سکتا ہے، اس سے ایک صورت مستثنیٰ ہے وہ یہ کہ اگر غیر عربی النسل علم دین کا عالم ہو تو وہ عربی النسل بلکہ خاص قریشی عورت کا جو علم سے بے بہرہ ہو کفو ہو جائے گا (مقول از علم الفقہ جلد ششم ص ۷۲)۔

(ب) دارالافتاء ہنگی محلی کا فتویٰ ہے کہ نکاح واقع ہو گیا۔

(ج) دارالافتاء اعداء العلوم دیوبند کی کیا رائے ہے۔

(۳) کیا آپ اپنے فتویٰ کے جواز میں ہیں، یعنی غیر کفو میں بلا رضا مندی والدین نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا ہے؟

(الف) کسی آیت قرآن مجید یا حدیث شریف کا حوالہ دیں گے۔

(ج) بھراہ کرم کسی ایسے اسلام کے مسلک کی رہنمائی کر دیتے جو خفی مسلک کے مقابلے میں زیادہ وسیع نظر ہو۔

سائل شوکت علی

الجواب وبالله التوفيق:

پہلی بات تو یہ ہے کہ جدول کے اندر حمید کو پرہیزگار، زیادہ دیندار، علم دین سے زیادہ واقف دکھایا گیا ہے اور پھر آخر حصہ سوال میں اسکے عقیدے اور ایمان کا جو حال لکھا ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ ایک عورت کی محبت و عشق میں اس کے مرتد تک ہو جانے کا اندیشہ ہے، نیز مسلک حنفی کو مخرف اور غیر صحیح سمجھتا ہے جس کے حق ہونے پر اجماع امت ہے، نیز اس موجودہ اسلام کو ترک کر کے ایسے اسلام کی جانب رہنمائی کا خواہاں ہے جو مسلک حنفی کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہو، یہ سب چیزیں اس کی انتہائی بدعتیہ گئی، ضعف ایمانی بلکہ زندہ تقیہ کی جانب مشعر ہیں، پھر اس کو دیندار و پرہیزگار کس طرح کہا جا رہا ہے؟ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ کمال ایمان کی دلیل یہ ہے کہ انسان دنیا کے آگ میں جل جانا اختیار کرے مگر آخرت کی آگ میں جانا کو ارادہ نہ کرے چہ جائے کہ محض حظ نفس کی خاطر قبول ارتداد پر تیار ہو جاوے اور قبول ارتداد کے بعد دخول مارچنم میں کوئی شبہ نہیں اعیاذ باللہ) اگر جدول کا مفہوم صحیح ہے تو اس متضاد تحریر کا کیا منشا ہے اور اس سے کیا مفہوم ہوتا ہے؟ ذرا غور سے سوچئے کیا جس طرح فقہ حنفی کو ماوراء النہر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچنے ہی کی وجہ سے مخرف و غیر صحیح سمجھتا ہے، اسی طرح کیا وہ احادیث کو بھی مخرف ناقابل قبول نہیں سمجھ سکتا؟ جبکہ اکثر ذخیرہ حدیث بھی ماوراء النہر کے ہی ذرائع سے ہم تک پہنچا ہے اور جب اس کا یہی اصول ہے تو وہ کلام الہی کو بھی مخرف و غیر معتبر (نعوذ باللہ) کہہ سکتا ہے، اس تحریر سے چند اور دعویٰ بھی ظاہر ہوتے ہیں مثلاً

یہ کہ وہ صرف قرآن کریم و حدیث ہی میں دلیل شرعی کو محصور سمجھتا ہے، اجماع و قیاس کا منکر ہے، پھر اپنے کو مجتہد بھی سمجھتا ہے جیسا کہ سولہ ۳۰ کے الف وباء سے ظاہر ہوتا ہے، خود غور کیجئے ایسا آدمی دیندار ہو گا یا بد دین و نفس پرست و مشغوف بحب النساء، ہر اور مآدان کی دوستی بسا اوقات بجائے نفع دینے کے مضر بھی ہو جاتی ہے، اگر کچھ لکھنا ہی تھا تو صرف اتنا لکھتے کہ دارالعلوم کے فتویٰ کے خلاف فرنگی محل لکھنوی کا یہ فتویٰ ہے اور ان کے یہ دلائل ہیں، اب ہم کیا کریں؟ بہر حال آپ نے فرنگی محل لکھنوی کے دلائل تو لکھے نہیں یہ تو وہ حضرات جانیں البتہ علم الفقہ سے جو استدلال آپ نے لکھے ہیں وہ آپ کے لئے مفید مطلب نہیں، علم الفقہ باب النکاح ص ۲۶ سے جس عبارت کا حوالہ آپ دے رہے ہیں وہ بہت مبہم اور نا کافی بلکہ نامتام ہے۔

امام محمد سے جو قول بھی منقول ہے اس کا پورا مفہوم یہ ہے کہ نکاح بغیر الکفو ء ولی کی اجازت و رضا مندی کے بغیر منعقد تو ہوتا ہے مگر موقوف رہتا ہے مانڈ نہیں ہوتا ہے، ولی مانڈ کرے گا تو مانڈ ہوگا اور اگر فسخ کر دے تو فسخ ہو جائے گا اور جب ولی فسخ کر دے گا تو قاضی کے مانڈ کرنے سے بھی مانڈ نہ ہوگا، حتیٰ کہ بعد اجازت دوبارہ پھر سے تجدید نکاح نہ کر لیا جائے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس دوران میں جو اولادیں پیدا ہوں گی وہ اس شخص کی جائز وارث نہ ہوں گی ”کما صرح بہ فی المبسوط (ج ۵ ص ۱۳) کو محمد بقول: لما توقف العقد علی إجازة الولی لتمام الاحتیاط فکما یعتقد بإجازته لیفسخ بفسخه و بعد ما یفسخ لیس للقاضی ان یجیزه ولكن یتقبل العقد إذا تحقق العزل (ثم بعد اسطر) و علی قول محمد لا یتوارثان، لأن أصل العقد کان موقوفاً و فی العقد الموقوف لا یجری التوارث الخ“

یہاں ولی کو اعتراض ہے اور اس پر یہ سب طو مار ہے، لہذا یہ نکاح مانڈ نہ ہوگا اور ایسی صورت میں تعلق زن و شوقی غلط اور حرام ہوگا، علم الفقہ کی عبارت میں یہ سب تفصیلات نہیں، لہذا اس سے استدلال صحیح نہیں ہے، یہی حال علم الفقہ ص ۷۲ کی عبارت کا بھی ہے جس کو شامی کے حوالے سے نقل کیا ہے، اس عبارت میں شامی کے استثناء پر قیاس کیا گیا ہے اور وہ قیاس مع الفارق ہو گیا ہے جس سے استدلال صحیح نہیں الخ علامہ شامی ہر عالم کو مستثنیٰ نہیں فرما رہے ہیں بلکہ حضرت امام ابو حنیفہ اور حسن بصری رحمہما اللہ جیسے معظم و مسلم مقتدا عالم دین کو مستثنیٰ فرما رہے ہیں: ”قال العلامة ابن عابدین الشامی: ”و کیف یصح لأحد أن یقول: إن مثل أبی حنیفة والحسن البصری و غیرهما ممن لیس بعربی انه لا یكون کفواً البنت قرشی جاہل أو لبنت عربی بوال علی عقبیہ الخ“ (۱)۔

اور یہ کلیہ مسلم ہے کہ مثال مثال کی وضاحت و تبیین کے لئے ہوتی ہے، اس مثال سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شامی کی مراد ہر عالم نہیں ہے بلکہ وہ عالم دین مراد ہے جو ایسا برگزیدہ محترم اور مسلم مقتداء ہو کہ قریش و سادات کو بھی اس کے عقد میں لڑکی دینے سے عار نہ ہو، چہ جائیکہ ایسا عالم جس کا حال وہ ہے جو سوال میں مذکور ہے، نیز اس کے ولی کو ایسی عار لاحق ہو جس پر یہ شدید نزاع واقع ہو، غرض ان جزئیات سے اجتناب کی مقصد براری و شواری ہے، پہلے استفتاء میں حمید کے نسب کے بارے میں سکوت تھا، اس لئے اس کے جواب میں کچھ نہ لکھا گیا تھا کہ یہ نکاح ہوایا نہیں، اب لکھا جاتا ہے کہ اگر حمید و رضیہ دونوں زن و شوئی رکھنا چاہتے ہیں تو بجز اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ رضیہ کے ولی اقرب کو راضی کر کے اس کی اجازت اور رضامندی سے پھر سے جدید نکاح کر دیا جائے اور جب تک نکاح جدید بعد اجازت و رضاء ولی اقرب نہ ہو جائے قطعاً دونوں الگ الگ رہیں، ہرگز یکجا نہ ہوں ورنہ جتنی اولادیں اس درمیان میں ہوں گی وہ سب غیر ثابت انساب ہوں گی اور دونوں ہمیشہ حرام کاری کے جرم میں و گناہ کے مرتکب رہیں گے اور اس کے وبال دنیوی اور اثر وی میں مبتلا ہوں گے، یہ حکم شرعی تو خود ان دونوں زن و شوہر کے ہیں، رضیہ کے ولی کو جب شریعت مطہرہ نے حق اعتراض و حق فسخ دیدیا ہے اور وہ اسے ہی استعمال کر رہا ہے تو اس کو تو کوئی حکم دوسرا نہیں دیا جاسکتا ہے، البتہ مشورہ بھی خواہا نہ دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ اس طرح کے تعلق سے جو رسوائی و بے عزتی ہوتی تھی ہو چکی کسی قیمت و شکل سے واپس نہیں آسکتی ہے، بلکہ اس رشتہ کو منقطع کرنے اور مخالفت کرنے میں لڑکی کے اور آوارہ اور شراب ہو جانے کا اندیشہ قوی ہے اور ایسی صورت میں سارے خاندان کی بھی آئندہ رسوائی و رسوائی محتمل ہے اور بخلاف اس کے اس رشتہ کو قائم کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ دونوں ہی سدھر جائیں گے اور اپنے کئے پر مادم ہو کر اپنی اثر وی زندگی بنانے کی فکر میں لگ جائیں جس سے یہ عار اور رسوائی بالکل ختم ہو جائے، یا کم از کم ہلکی و بے اثری ہو جائے اور اولادیں بھی صحیح انساب ہوں، انکی حفاظت پر بھی نظر شفقت ایک درجہ میں ضروری ہے۔

پس ایسی صورت میں ولی رضیہ کو بھی خیر خواہانہ مشورہ یہ ہے کہ اس کیلئے بہتر صورت یہ ہے کہ اس رشتہ کو اپنی اجازت و رضامندی سے نکاح جدید کے ذریعہ قائم کرادے اور پھر خوش اخلاقی و حسن بردار سے خود بھی اور کسی اللہ والے مصلح عالم دین کی مدد سے دونوں میں جذبہ دینداری و صحیح تعلق مع اللہ پیدا کرنے کی سعی کرتا رہے اور معاملہ اللہ کے حوالہ اور سپرد کر دے۔

(نوٹ) اتنی تحریر سے جواب مسئلہ تو منسوخ ہو گیا ہے باقی جو مطالبات ہیں انکا مستفتی کو حق نہیں ہے تسکیناً للخیاطہ اور تبرعاً اتنا عرض ہے کہ کم از کم مبسوط للمرجس، فتح القدیر باب الاولیاء والاکناف کا مطالعہ دیانت سے سمجھ کر کر لیں تو آیات و احادیث و وجہ استدلال و ترجیح سب کا علم ہو جائے گا اور اگر اس کے بعد بھی کسی کو اطمینان اور تشفی نہ ہو اور شروع عن الاعتدال

یا طغیان عن الشرع کرے تو خود غور کر کے دیکھ لے کہ نقصان کس کا ہے خود اس کا ہے خسر الدنیا والآخرة کا مصداق وہی ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود علی عنایت مفتی دارالعلوم دیوبند

لڑکی کا ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کرنا:

لڑکی اپنی اور اپنی ماں کی مرضی سے ولی کے ہوتے ہوئے غیر برادری میں نکاح کر لے تو کیا ایسا نکاح ہوگا یا نہیں، اور اگر لڑکی بالغ ہے اور نکاح ہو جائے تو ولی کو تاقضی کے نکاح توڑ دینے کا حق ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

بغیر ولی کی اجازت کے اگر بالغ لڑکی غیر کفو میں اپنا نکاح کر لے گی تو وہ نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

”ویفتی فی غیر الکفو بعدم جوازہ اصلاً و هو المختار للفتویٰ لفساد الزمان“ (۱)۔

بالغ لڑکی پر ولی کی ولایت مستحبہ ہے جبری نہیں ہے اس لئے وہ اپنے نفس کی مختار ہے جہاں چاہے نکاح کر لے لیکن اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ ایسے شخص سے نکاح کرے جس سے لڑکی کے خاندان والوں کی بے عزتی اور تحقیر ہوتی ہو اسی کو غیر کفو کہا جاتا ہے، اگر ایسے شخص سے بغیر ولی کی اجازت کے نکاح کر لے گی تو ولی کو اس کے فسخ کرانے کا اختیار ہوتا ہے کہ حاکم وقت مسلم سے فسخ کرا لے۔

نکاح پر اصرار والے تاقضی فسخ نہیں کر سکتا ہے، متاخرین فقہاء کرام کا فتویٰ اس زمانہ فساد میں یہ ہے کہ غیر کفو میں نکاح کرنے سے نکاح ہوتا ہی نہیں جو جواب میں مذکور ہے کہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا اور قطعاً جائز نہ ہوگا۔ مگر ہندوستان میں فحل اور پٹھان آپس میں کفو سمجھے جاتے ہیں بہت سے مقام میں دونوں میں رشتہ داریاں ہوتی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اگر لڑکی کے خاندان کی اس نکاح سے بے عزتی ہے تو نکاح جائز نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: سید مہدی حسن مفتی دارالعلوم دیوبند، محمود علی عنایت

راجہوت، شیخ صدیقی کا کفو نہیں:

ہم حنفی ہیں، واقعہ اس طرح ہے کہ میری ایک عزیزہ نے جو کہ بالغ ہے اپنے والدین کی اجازت کے بغیر خاموشی سے اپنا نکاح کر لیا ہے، کچھ عرصہ کے بعد اصل نکاح کی اطلاع ملنے پر لڑکی کے والدین چونکہ اس رشتہ کو پسند نہیں کرتے تھے، لڑکی کو بہت زور دیکر طلاق کے لئے تیار کر لیا، لڑکے کے ماں باپ نے بھی اس نکاح کو پسند نہیں کیا ہے، انکے مجبور کرنے کے بعد طلاق دلوائی، اس واقعہ کا اثر لڑکے اور لڑکی پر بہت ہوا، لڑکی کی صحت روز بروز بگڑنے لگی اس واقعہ کو قریب چار سال ہو گئے ہیں اس دوران میں ہر طرح کا علاج کیا مگر لڑکی کی صحت بدستور رہی اور اب گمان غالب ہے کہ اگر یہی حالت رہی تو وہ سال ڈیڑھ سال میں اپنی زندگی کے اختتام کو پہنچے گی۔

دوسری جگہ رشتہ کی کوئی امید نہیں ہے تو اس صورت میں اس کا کامیاب رہنا محال نظر آتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ لڑکا راجہوت مگر حنفی عقیدہ کا ہے اور لڑکی شیخ صدیقی ہے، کفو کے بارے میں تحریر فرمادیں، اب اس حالت میں معلوم کرنا ہے کہ لڑکی کا نکاح اس لڑکے سے پھر کیا جاسکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

راجہوت شیخ صدیقی النسل کا کفو نہیں ہوگا اور ایسی صورت میں لڑکی کا اپنے والدین کے خلاف مرضی نکاح منعقد و صحیح بھی نہیں تھا، اس لئے طلاق بھی واقع نہیں ہوئی تھی (۱) لیکن جب لڑکی اور لڑکے میں اس درجہ کی محبت ہو چکی تھی تو لڑکی کے والد کے لئے مناسب تھا کہ راضی ہو کر پھر سے نکاح پڑھا دیتا، بہر حال اب بھی جب صحت اور محبت کا یہ حال ہے تو طرفین کے والدین کے لئے مناسب ہے کہ آپس کی رضامندی کے ساتھ دونوں کا آپس میں نکاح پڑھا کر تعلق زن و شوئی قائم کرادیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند بہار پور
الجواب صحیح احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "ونعبر الکفاۃ للزوم النکاح (المختار) وقال الشامی للزوم النکاح ای علی ظاہر الروایۃ ولصحہ علی روایۃ الحسن المختار للفتاویٰ رد المحتار ۳/۲۰۹، مکتبہ زکریا۔"

باب المهر والجهاز

ادائیگی مہر میں کس وقت کے سکے کا اعتبار ہوگا؟

دارالتضواء امارت شریعہ مدرسہ رحمانیہ سوپول در بھنگہ کی عدالت میں ایک ساٹھ سالہ بیوہ خاتون نے اپنے زرمہر کی وصولی کا مقدمہ دائر کیا ہے جو زوج کے مال متروکہ سے ادا ہوگا، مقدمہ کی نوعیت اور فقہاء کی تصریحات کی وجہ سے کچھ شبہات ہیں جن کا تعلق قصور فہم سے زیادہ ہے، امید ہے کہ مسئلہ مذکورۃ الذیل کے چند پہلوؤں پر مدلل جواب سے نوازا جائے گا۔

دعویٰ اس خاتون کا یہ ہے کہ میرا نکاح پچاس سال پہلے ہوا، مہر پانچ سو روپیہ مقرر ہوئے، شوہر کے انتقال کے بعد اب ٹھکوتر کہ میں سے میرا مہر دین اس طرح ملنا چاہئے کہ پچاس سال پہلے چاندی کے سکے رائج تھے، لہذا اب مجھے اس وقت کے پانچ سو روپے کے سکے کی قیمت موجودہ زمانہ کے سکے کے حساب سے دس ہزار ملنا چاہئے۔ عدالت اسلامیہ مجھے اس وقت دس ہزار روپے دلوائے۔

اب قابل تحقیق امر یہ ہے کہ مہر کی رقم میں عقد نکاح کے وقت کا مروجہ سکے پانچ سو روپے (جس کی قیمت دس ہزار روپے ہے) ادا کرنا ہوگا یا جس وقت مہر ادا کیا جا رہا ہے اس وقت کا رائج سکے پانچ سو روپے ادا کرنا ہوگا۔

یہ امر بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ بوقت نکاح عموماً دو طرح کی تعمیر ہوتی ہے:

الف۔ تمہارا نکاح پانچ سو روپے سکے رائج الوقت کے عوض کر دیا۔

ب۔ کبھی بغیر قید سکے رائج الوقت کہا جاتا ہے کہ پانچ سو روپے پر تمہارا نکاح کر دیا، کیا ہر دو تعمیر کا حکم ایک ہی ہوگا؟ جبکہ مہر عموماً اس دیا رہیں عرفاً موجب نہیں ہوتا ہے۔

ج۔ اگر کسی نے ساٹھ سال قبل کسی سے قرض سو روپے لئے اور اب اس کی ادائیگی کرنا چاہتا ہے تو وہ موجودہ سکے میں سو روپے ادا کر دینے سے بری الذمہ ہو جائے گا یا ساٹھ سال پہلے کے رائج اور دینے ہوئے سکے کی قیمت موجودہ سکے کی شرح میں ادا کرنا ہوگا، بر تقدیر ثانی کیا موجب رہوا ہوگا یا نہیں، کیا مسئلہ مہر کفر قرض پر قیاس کر کے حکماً متحد مانا جائے گا علامہ

شامی نے مطلب مہم فی احکام الحقو اذا کسدت او اقطعت او غلت اور خصت میں جو تفصیلات ذکر کی ہیں کہ باب قرض و بیع میں یوم القرض اور یوم البیع کی قیمت واجب نہ ہوگی اور یہی مفتی بہ ہے، اس تفصیل پر اگر یوم القرض کے سکہ اور مالیت کا اعتبار ہو تو پھر کیا یہ منطقی الی الرباء اور سبب الافتتاح اب ربا کا باعث ہوگا یا نہیں، بہر حال اب مہر کی ادائیگی کس شرح سے شرعاً واجب ہوگی برہ کرم اس کی وضاحت شرعی بنیادوں پر فرمائی جائے۔

محمد قاسم مظفر پوری (خادم مدرسہ ریس والقضاء الشرعی، مدرسہ رحمانیہ سوہول درہنگہ بہار)

الجواب وبالله التوفیق:

پہلی تنقیح تو اس مقدمہ میں یہ ہوگی کہ شوہر کے انتقال کو کتنا زمانہ گزرا، اگر ابھی حال میں انتقال ہوا ہے جب تو دعویٰ قائل سماعت ہونے میں شبہ نہیں، یا انتقال شوہر کو زمانہ دراز گزرا ہے لیکن مدعا علیہم کو مہر کا باقی رہنا تسلیم ہے یا زوجہ نے مہر کا مطالبہ کیا تھا اور ابھی تک کامیاب نہ ہوئی، اس لئے کہ یہ دعویٰ جب ہی دعویٰ قائل سماعت ہوگا اور اگر انتقال زوج کے بعد زوج کی کوئی جائیداد فرخت ہوئی مگر زوجہ نے مہر کا مطالبہ نہیں کیا تو آنحضرت صاحب حال کی بنیاد پر اور المسکوت فی معرض البیان بیان کے اصول پر نیز علامہ شامی کی اس تصریح کی بناء پر کہ اذا ترک المدعوی ثلثة وثلاثین سنة لا تسمع (۱) دعویٰ قائل سماعت ہی نہ ہوگا، غرض جب دعویٰ قائل سماعت ہو جائے تو پھر یہ تنقیح ہوگی کہ انعقاد عقد میں مہر صرف پانچ سو روپیہ مقرر ہوا یا پانچ سو روپیہ سکہ رائج الوقت مقرر ہوا، اگر سکہ رائج الوقت کی قید کے ساتھ مقرر ہوا تو عرف میں رائج الوقت بوقت ادا مراد ہوتا ہے پس اس صورت میں اس وقت کا پانچ سو روپیہ واجب الادا ہوگا۔

اور اگر سکہ رائج الوقت کی قید نہیں تھی تو اس صورت میں وقت عقد کا پانچ سو روپیہ ادا ہوگا اور اس صورت میں یہ تنقیح ضروری ہوگی کہ پچاس سال پہلے (بوقت عقد) جو روپیہ تھا وہ غالب الفش تھا یا مغلوب الفش تھا اگر اس وقت سکہ غالب الفش تھا تو قیمت واجب الادا ہوگی اور امام محمد کے نزدیک رفقا بائناس یوم الکساد کی قیمت واجب الادا ہوگی اور امام یوسف کے نزدیک یوم العقد کی قیمت واجب الادا ہوگی، اور فتویٰ بعض فقہاء کے نزدیک امام محمد کے قول پر ہے اور بعض فقہاء کے

۱- "اذا ترک المدعوی ثلاثاً وثلاثین سنة ولم یکن مایع من المدعوی ثم ادعی لا تسمع دعواه، لان ترک المدعوی مع السمکن یدل علی عدم الحق ظاهراً، ولی جامع الفتوی عن فتاوی العباسی: قال المتأخرون من أهل الفتوی: لا تسمع المدعوی بعد ست وثلاثین سنة إلا أن یكون المدعی غائباً أو صبیاً أو مجنوناً ولس لهما ولی أو المدعی علیہ أمیراً جائراً" (رد المحتار علی الدر المختار ۸/ ۱۱۷)۔

نزدیک فتویٰ امام ابو یوسف کے قول پر ہے، لہذا گنجائش دونوں پر عمل کی نکل آتی ہے، سہولت جس شق کو لینے میں ہو عمل کر سکتے ہیں اور اگر اس وقت سکہ مغلوب الغش تھا تو روپیہ چونکہ چاندی کے سکہ کا نام ہے اس لئے اس وقت سکہ میں جتنی مقدار چاندی کی تحقیق ہو اس مقدار سے کچھ زائد چاندی شبہ ربو اسے بچنے کی غرض سے واجب الادا ہوگی، ہاں اگر عورت چاہے تو اتنی چاندی کی اس وقت کی قیمت یا کوئی جائیداد یا عریض بھی لے سکتی ہے اور اگر اس وقت کے سکہ میں چاندی کی مقدار حین کی تحقیق نہ ہو سکے تو اس مقدار کا تخمینہ لگا کر جنس بدل سونے کے جنس سے ادائیگی واجب ہوگی، ہاں اگر عورت آج کے سکہ سے اس کی قیمت لینے پر یا کوئی جائیداد یا عریض لینے پر راضی ہو تو یہ بھی لے سکتی ہے، احقر کے نزدیک حکم مسئلہ یہی نکلتا ہے اور ماخذ کے لئے شامی ۴۴۵-۴۴۶ اور شامی ج ۴، ص ۲۵، ۲۴ کا دیکھنا بھی کافی ہوگا (۱)، اور اگر مزید تحقیق مطلوب ہے تو فتاویٰ خیریکا اور تحقیق فتاویٰ حامدیکا مطالعہ بھی کر لیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مہر کی ادائیگی میں کس سکہ کا اعتبار ہوگا؟

۱- نکاح کے وقت مہر دین میں اگر مثلاً پانچ سو روپے مقرر کئے جائیں تو بوقت ادائیگی کتنے روپے ادا کرنے پڑیں گے؟

۲- نکاح کے وقت مہر دین میں اگر اشرفی مقرر کی جائے تو روپے کی شکل میں اشرفی کی کس وقت کی قیمت ادا کرنی پڑے گی؟ نکاح کے وقت کی یا ادائیگی کے وقت کی؟

۳- اشرفی کیا چیز ہے اور اس کا وزن کیا ہے۔ اسی طرح دینار اور درہم کیا چیز ہے اور ان کا وزن کیا ہے؟
محمد علی (امام جامع مسجد لاہور، طبع بیگوسرائے بہار)

الجواب وباللہ التوفیق:

مرکزی دارالافتاء امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ خانقاہ رحمانی مونگیر سے نمبر ۱ کا جواب دیا گیا کہ بوقت نکاح پانچ سو

۱- جامع دعویٰ کے متعلق (رد المحتار علی الدر المختار ۸/ ۱۱۵-۱۱۷) اور غالب الغش یا مغلوب الغش روپیوں کے متعلق (رد المحتار علی الدر المختار ۷/ ۵۵، ۵۶) پر تفصیل موجود ہے۔

روئے کا جتنا سونا ملتا تھا۔ اب ادائیگی کے وقت اتنے سونا کے بدلے جتنے روپے ملتے ہوں وہ روپے ادا کرنے پڑیں گے چاہے وہ پانچ سو سے کم ہوں یا زیادہ اس جواب کا ماخذ امام ابو یوسف کا قول ہے جو مفتی بہ ہے عبارت درج ذیل میں:

”وقال الثاني ثانيا عليه قيمتها من الدراهم يوم البيع والقبض وعليه الفتوى“ (۱) ”ای یوم البيع فی البيع ویوم القبض ومثله فی النهر فهذا ترجیح للخلاف ما مشی علیه الشارح ووجه المصنف ایضا كما قدمناه فی فصل القرض وعليه فلا فرق بین الکساد والغلاء فی لزوم القيمة“ (۲/۵۳۳)۔

سوال نمبر ۴: کا جواب دیا گیا کہ اشرفی کی قیمت وہ ادا کرنی پڑے گی جو ادائیگی کے وقت ہے نہ کہ وہ قیمت جو وقت نکاح تھی جیسا کہ ثامی ۴/۳۳۳:

”اعلم ان الذي فهم من كلامهم ان الخلاف المذكور انما هو في الفلوس والدراهم الغالبة الغش ويبدل عليه انه في بعض العبارة اقتصر على ذكر الفلوس وفي بعضها ذكر العدالي معها وهي كما في البحر عن البنايه بفتح العين المهملة والذال وكسر اللام دراهم فيها غش وفي بعضها تقييد الدراهم بغالبة الغش وكذا تعليلهم قول الإمام بطلان البيع بان الثمنية بطلت بالكساد لان الدراهم التي غلب غشها انما جعلت ثمننا بالاصطلاح فإذا ترك الناس المعاملة بها بطل الاصطلاح فلم تبقى ثمننا فبقي البيع بلا ثمن فبطل ولم ار من صرح بحكم الدراهم الخالصة او المغلوبة الغش سوى ما افاده الشارح هنا وينبغي انه لا خلاف في انه لا يبطل البيع بكسادها ويجب على المشتري مثلها في الكساد او الانقطاع والرخص والغلاء اما عدم بطلان البيع فلا نها ثمن خلقة فترك المعاملة بها لا يبطل ثمنيتها فلا يتأتى تعليل البطلان المذكور وهو بقاء البيع بلا ثمن واما وجوب مثلها وهو ما وقع عليه العقد كمائة ذهب مشخص او مائة ريال فرنجي فلبقاء ثمنيتها أيضا وعدم بطلان تقومها“ (۲)۔

سوال نمبر ۵: کا جواب دیا گیا کہ اشرفی سونا کی ہوتی ہے جس کا وزن دس ماشہ ہوتا ہے جیسا کہ لغات کشوری میں ہے اور دینار سونے کا ایک سکہ ہے جس کا وزن ساڑھے چار ماشے ہوتا ہے اور درہم چاندی کا ایک سکہ ہے جس کا وزن ساڑھے تین ماشے ہوتا ہے جیسا کہ حاشیہ فتاویٰ دارالعلوم جدید مرتبہ مفتی ظفر الدین میں ہے۔

محمد علی (امام جامع مسجد ولایت گریہ، طبع بیگومرائے بہار)

۱- رد المحتار علی الدر المختار ۵/۵۵۷۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار ۵/۵۶۷، ۵۷۷۔

الجواب وبالله التوفیق:

سوال نمبر ۲ و ۳ کے جواب سے احقر کو اتفاق ہے۔

البتہ سوال نمبر ۱ کے جواب سے اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ سوال میں صراحت ہے کہ نکاح کے وقت پانچ سو روپے دین مہر مقرر ہوئے پانچ سو اشرفی مقرر نہیں ہوئی ہے اور روپیہ چاندی کے سکہ کا نام ہے پس اس کو سونے میں منتقل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ سیدھا سادہ حکم یہ ہے کہ وہ پانچ سو روپیہ کیا تھا نوٹ تھا یا سکہ۔

اگر نوٹ تھا تو اس نوٹ کی اس وقت جتنی چاندی ملتی تھی وہی چاندی مہر شمار ہوگی اور وہی چاندی یا اس کی جو قیمت اس وقت کے نوٹ سے ہوتی ہو اتنے نوٹ دلائے جائیں اور اگر وہ پانچ سو روپیہ نوٹ نہیں تھا بلکہ سکہ تھا تو سکہ دو حال سے خالی نہیں غالب الفش تھا تو اس وقت اس غالب الفش کی جتنی چاندی ملتی تھی اتنی چاندی مہر ہوگی اب اتنی چاندی آج کل کے جتنے روپے میں ملے اتنے روپے آج کل کے نوٹ سے دیئے جائیں

اور اگر وہ پانچ سو روپیہ مغلوب الفش سکہ تھا تو چونکہ روپیہ ہر زمانہ میں ایک تولہ کے برابر شمار ہوا ہے اس لئے اس پانچ سو روپیہ کے پانچ سو تولہ چاندی شمار ہوں گے اور وہ مہر پانچ سو تولہ چاندی شمار ہوگی اور پانچ سو تولہ چاندی آج کل جتنے نوٹوں سے ملے اتنے نوٹ دینے ہوں گے اور دلیل میں حضرت امام ابو یوسف کا ہی قول اختیار کریں گے کیونکہ وہی مفتی بہ ہو چکا ہے اور اشبہ بالنقہ ہے (۱)۔

باقی علماء کرام کی بحثیں بھی احقر کی سمجھ میں نہیں آئیں اسلئے ان سے بھی اتفاق نہیں ہے۔

هذا ما ظهر لي فان كان صوابا فمن عند الله وان كان خطأ فمن نفسي ومن الشيطان فيعود
بالله من شرور النفسنا ومن خدع الشيطان، نقلاً والله أعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پتہ ۲۵/۷/۱۳۰۱ھ

مہر میں اشرفی طے کرنا:

زید نے ۱۹۵۳ء میں ہندہ سے شادی کی اور مبلغ دس ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت وگیارہ اشرفیاں مہر مقرر کیا، جبکہ اس سے برسوں قبل اشرفی کا رواج بند ہو گیا تھا۔ اب ۱۹۸۲ء میں ہندہ مہر کی طلبگار ہے اور زید بھی اس دین کو ادا کرنا چاہتا ہے،

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے رد المحتار علی الدر المختار ۷/۵۵، ۵۶۔

اشرفی کا وجود اس وقت بھی ہندوستان میں ما پید ہے، یعنی ملک میں اس کا رواج اس وقت بھی نہیں ہے تو زید اس مہر کو کس طرح ادا کرے گا۔ بعض لوگ ایک اشرفی کو ایک تولہ سونے کے برابر قرار دے کر ایک تولہ سونا کی قیمت دو ہزار روپیہ قرار دے کر گیارہ اشرفیوں کو بائیس ہزار کی مالیت کے برابر کا مطالبہ کرتے ہیں از روئے شرع زید پر کتنی رقم واجب الا داء ہوگی؟

محمد نواز عالم

الجواب وبالله التوفیق:

بہار کے علاقہ میں عموماً شیر شاہ سوری کی اشرفیاں رائج تھیں اور وہ صرف اشرفی کے برابر ہوتی تھیں پس اس کے مطابق صرف ۲۵ (سائڑھے پانچ) تولہ سونے کی موجودہ قیمت دینی ہوگی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زوجین کے درمیان مہر میں اختلاف ہو تو مہر کتنا واجب ہوگا؟ نیز مہر شرعی کی تحقیق:

میری لڑکی کو اس کے شوہر نے طلاق دیدی ہے اور مہر شرع محمدی بوقت نکاح طے ہوا تھا، لڑکی نے اپنے مہر وصول کرنے کیلئے عدالت میں چارہ جوئی کی ہے، آپ یہ بتائیں کہ مہر شرع محمدی کی کتنی تعداد ہے، لڑکی اپنا مہر ایک ہزار روپیہ طلب کر رہی ہے، کیونکہ بوقت نکاح اتنے ہی متعین ہوئے تھے اور اس کا خاوند ۲۷/۴ ادا کرنا چاہتا ہے اس کا شرعی حکم اس معاملہ میں مطلع فرماویں۔

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال جب بوقت نکاح مہر ایک ہزار روپیہ طے ہو گئے تھے، جیسا کہ عورت کا دعویٰ ہے تو اب مہر شرع محمدی کتنے بھی ہوں جتنے مہر بوقت نکاح طے ہوئے تھے اتنی دینا واجب ہوگا، اگر خاوند اس سے انکار کرتا ہے تو لڑکی پر بیہوشی پیش کرنا واجب ہوگا، اگر بیہوشی اور ثبوت پیش کر دے تو فیصلہ اس کے مطابق ہوگا، اور اگر عاجز رہے تو خاوند سے حلف لیں گے جو حقدار کہے گا فیصلہ اس پر ہوگا۔ باقی مہر شرع محمدی کی محض تحقیق تو ہر جگہ کے عرف کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے اور مہر فاطمی کو بھی کہتے ہیں، اگر مہر فاطمی مراد ہے تو مہر فاطمی تقریباً ۱۳۴ تولہ بھر خالص چاندی کے برابر ہوتی ہے چاندی کا جو نرخ

جس زمانہ میں ہوگا اس وقت اس کے اعتبار سے قیمت لگا کر مقدار معلوم کر لیں گے، مثلاً آجکل چاندی اگر تین روپیہ بھر ہو تو ۳۲ تولہ چاندی کا دام تقریباً ۳۹۶ روپیہ ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود علی عثمانی مفتی دارالعلوم دیوبند

جنابت کا غسل نہ کرنے سے کیا عورت مرد پر حرام ہو جاتی ہے اور اس کا مہر مرد پر واجب ہوتا ہے؟
ایک آدمی کی شادی کسی غیر عورت سے ہوتی ہے، دونوں میاں بیوی ہمستر بھی ہوئے ہیں اور صحبت بھی کرتے ہیں، لیکن عورت کبھی غسل نہیں کرتی ہے، اس کو کہا بھی جاتا ہے کہ غسل کیا کرو، لیکن کبھی غسل نہیں کرتی، تو کیا ایسی عورت ایک مسلمان مرد پر حلال ہے؟ اگر اس کا خاوند اس وجہ سے اس کو طلاق دیدے تو کیا اس پر مہر واجب ہوتا ہے یا کہ نہیں اور اگر واجب ہے تو کیوں؟ جبکہ عورت اسلامی اصولوں پر نہ چلے۔

الجواب وبالله التوفیق

اگر کوئی عورت مباشرت اور مجامعت کے بعد غسل نہیں کرتی تو اپنے شوہر پر حرام نہیں ہو جاتی ہے، البتہ ایسی عادت ذالناخت گناہ ہے اور کبھی غسل نہیں کرتی تو نماز وغیرہ کیسے پڑھتی ہوگی، ایسی عورت کو طلاق دینا شوہر پر واجب نہیں ہے، ”لا یجب علی الزوج تطہیق الفاجرة“ (۱)۔

جہاں تک ہو سکے سمجھا بچھا کر ڈانٹ پھینکا کر اس کی اصلاح کرے ثواب ملے گا، اگر سمجھانے سے نہ مانے تو اس کے ساتھ سونا چھوڑ دے اگر پھر بھی نہ درست ہو تو بالکی مار پیٹ بھی کر سکتے ہو ”والنسی تخافون نشوزهن فعضوهن واهجروهن فی المضاجع و احضر بوهن“ (۲)۔

اگر پھر بھی نہ مانے تو ہمیشہ یہی خیر خواہی سے سمجھاتے رہیں اور اس سے خوش نہ ہو، لیکن حقوق زوجیت مان نفقہ ادا کرتے رہیں تو خود گنہگار نہ ہوں گے مہر پورا واجب ہوگا مہر تو استمتاع بالبضع کا عوض ہے اور اس کو یہ حاصل کر چکا ہے اور یہ

۱- الدر المختار فصل فی الحرامات ۳/۱۳۲۔

۲- سورہ نساء ۳۴۔

سب شراییاں معاشرہ اور رہائش کی ہیں، اور اس کا تعلق مہر سے نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب
کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۸/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عند

ماشرہ عورت اور اس کے مہر وغیرہ کا حکم:

ایک عورت اپنے شوہر کی ممان مان ہوئی اور بغیر اذن زوج خود بھاگ کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہے، زوج کے خلوت صحیح سے انکار کرتی ہے، شوہر کے گھر کو آباد کرنے کی کوئی پروا نہیں کرتی ہے، اگر ایسی عورت کو شوہر طلاق دینا چاہے تو شوہر پر مان و نفقہ اور مہر دینا لازم ہوگا یا کہ نہیں، کیا ماشرہ کی تعریف میں اسکو شمار فرما دیا جائے گا اور عورت ممان مان کے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

زوج اپنی مدخلہ بیوی کو جب بھی خود طلاق دیگا تو مان و نفقہ عدت کا اور مہر دینا ہوگا، ہاں اگر عورت خود طلاق طلب کرے اور اپنا مان و نفقہ اور مہر معاف کر دے یا اس کے بدلہ میں طلاق طلب کرے تو معاف ہوگا یہ حکم غیر ماشرہ کا ہے اور عورت کا بغیر اذن شوہر کے خود سے بھاگ کر چلا جانا اس کا یہ نشوز ہے اور جب تک واپس نہ آجائے، اس وقت تک کے مان و نفقہ کی وہ مستحق نہیں رہتی ہے، لہذا صورت مسئلہ میں اگر واقعہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے اور اسی نشوز کی وجہ سے اور اسی حالت میں شوہر نے طلاق دیدی ہے تو عورت نفقہ کی مستحق نہ ہوگی (۱)، لیکن اگر ایک بار بھی دونوں میں خلوت صحیح ہو چکی ہے تو عدت تین حیض اور پورا مہر واجب ہوگا اور اگر ایک بار بھی خلوت صحیح نہیں ہوئی ہے تو عدت طلاق واجب نہ ہوگی، ”رجل تزوج امرأة نکاحاً جائزاً فطلقها بعد الدخول وبعد الخلوة الصحيحة كان عليها العدة“ (۲)، مگر مہر نصف واجب ہوگا، ”وإن طلقتموهن من قبل أن تمسوهن وقد فرضتم لهن فريضة فنصف ما فرضتم“ (۳)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ”فإن لئنزلت فلا نفقة لها حتى تعود إلى منزلها“ (البند ۵۱/۵۳)۔

۲- الفتاویٰ البندیہ ۱/۵۲۶۔ ۳- سورہ بقرہ ۲۳۷۔

وسعت سے زائد مہر مقرر کرنا:

اگر کوئی معمولی آدمی خاندانی رواج کے مطابق یا برائے نام شادی کے موقع پر لاکھوں روپیہ مہر باندھے اور اس کو دینے کی طاقت نہ ہو تو یہ جائز ہے یا کہ حرام ہے؟ کسی مستند فقہ کا حوالہ دیجئے۔

الجواب وبالله التوفیق:

نکاح تو منعقد ہو جائے گا، لیکن اتنے زیادہ مہر باندھنا جس کی ادائیگی طاقت میں نہ ہو بہت برا ہے۔

هكذا في عامة كتب المعتمدة. فقط والله اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جواب صحیح ہے۔

جس شخص کے دل میں یہ ہو کہ میرا دائیں کرے گا، حدیث شریف میں اس کو زانی فرمایا ہے، یعنی قیامت میں اس کا حشر ایسا ہوگا جیسا زانی کا (۱)۔

احقر محمود علی ع

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کے مہر کا حکم:

☆ بیوہ کا دین مہر موجد محل مرحوم نے اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا تھا اور نہ زوجہ نے کبھی معاف کیا ہے، ایسی صورت میں کیا دین مہر کی رقم ترکہ سے منہا کی جاسکتی ہے؟

۶۵۔ مرحوم عبدالعلیم کے مرنے کے وقت اگر مرحوم کے باپ و ماں زندہ نہیں تھے تو مرحوم عبدالعلیم کا کل ترکہ، خواہ بصورت مکان ہو یا بصورت سامان یا زیورات فقط ہو یا بینک وغیرہ کسی جگہ جمع شدہ ہو، ان سب کے مجموعہ میں سے پہلے بیوہ کا مہر جو باقی ہے وہ ادا کیا جائے، اسی طرح اگر اور کوئی قرض باقی ہے تو اسے ادا کیا جائے، پھر اس کے بعد باقی ترکہ صرف ایک تہائی کے اندر مرحوم کی وصیت صحیحہ مانند کی جائے، پھر اس کے بعد جو کچھ ترکہ بچے اس کو چالیس سہام پر تقسیم کر دیں۔ چالیس سہام میں پانچ سہام بیوہ کا حق ہوگا۔ اور چودہ سہام منفر زندہ کا حق ہوگا۔ اور سات سات سہام تینوں لڑکیوں کا حق ہوگا، جو

لڑکی کسی غیر ملک کی شہری ہوگئی ہے محض اس سے اس کا حق وراثت سوخت نہ ہوگا، بلکہ اس کا حصہ محفوظ رکھ کر اس کو مطلع کیا جائے، اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے، یا اس سے بیع و شراء وغیرہ کا کوئی شرعی معاملہ بذریعہ مراسلت وغیرہ کر لیا جائے، اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگر مرحوم کے انتقال کے وقت ماں یا باپ کوئی زندہ تھے تو ان کو واضح کر کے پھر تخریج شرعی معلوم کی جائے۔

نوٹ: یاد رہے کہ فنڈ میں جو رقم حکومت اپنی طرف سے ملاتی ہے وہ صورت مسئولہ میں مرحوم کا ترک نہیں ہے، بلکہ وہ رقم تنہا بیوہ کا حق ہے۔ جیسا کہ نمبر ۲ کے جواب میں درج ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمار پورہ ۳۰/۳/۱۳۹۶ھ

مہر سے متعلق مختلف قسم کے سوالات:

ہم ایک بڑی تعداد میں انگلینڈ میں مقیم ہیں اور ہماری جماعت کا نام ”نمرت پارچورا خلیفہ سنت والجماعت (یو کے)“ ہے، اس جماعت کی ماتحتی میں ہم خوشی غمی وغیرہ کے طور طریق شریعت کے موافق انجام دیتے ہیں، ہمیں یہاں انگلینڈ کی اقتصادی حالت کے پیش نظر مہر کے سلسلہ میں چند مسائل درکار ہیں۔ یہاں کا معاشرتی انتظام مختصر طور پر یہ ہے:

لوگوں کی اقتصادی حالت بہت اونچی ہے۔ متوسط شخص کی ایک ہفتہ کی آمدنی اندازاً چالیس سے پچاس پونڈ ہے، دلہیا جس وقت مجلس نکاح میں آتا ہے تو کم از کم ایک سو پونڈ کا لباس زیب تن کیے ہوتا ہے، نیز نکاح پر کھانے والے اور مسجد و مدرسہ کو بطور ہدیہ اندازاً ۲۰ پونڈ دینے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ دوسرا خرچہ الگ ہوتا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے:

(۱) جس عورت سے نکاح ہوتا ہے، اس کا مہر فقط ۱۲ ۱۲ ۱۲ روپیہ ہوتا ہے، پونڈ کے حساب سے مقرر نہیں کی جاتی، اب بہت سے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مہر کی یہ موجودہ رقم حالت کے اعتبار سے بہت ہی کم ہے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) مہر فاطمی کتنی ہے اور کیا ہے؟ ۱۲ ۱۲ ۱۲ روپیہ یہ مہر فاطمی شمار ہوتی ہے یا نہیں؟

(۳) شریعت میں مہر کی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم مقدار کیا ہے؟

(۴) شریعت کی نظر میں کتنا مقرر شدہ مہر عمدہ مہر ہے؟

مندرجہ بالا سوالات کے جوابات حدیث کی روشنی میں اور کتابوں کے حوالہ کے ساتھ عنایت فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

آج سے تقریباً ۵۰-۶۰ سال قبل ۱۲۷۷ھ تولد خالص چاندی کے برابر شمار ہوتا تھا۔ اب تو ایسا نہیں ہے اب تو پیسے کاغذ کے ہونے لگے ہیں اور ۱۲۷۷ھ روپیہ صرف ۸-۹ تولد خالص چاندی کے برابر بھی بمشکل ہوں گے اور مہر فاطمی کے برابر تو کسی بھی طرح نہیں ہو سکتے مہر فاطمی کی مقدار بعض محققین کے نزدیک ایک سو چالیس (۱۴۰) تولد چاندی کے برابر ہے، اتنی چاندی ایک سو چالیس (۱۴۰) تولد جس زمانہ میں جتنے کاغذی روپیوں میں ملے گی اتنے روپیہ مہر فاطمی میں دینے ہوں گے اور بعض محققین کے نزدیک مہر فاطمی کی مقدار تقریباً ۱۳۲ تولد چاندی کے برابر ہے۔ اتنی چاندی (۱۳۲ تولد) جس زمانہ میں جتنے کاغذی روپیوں سے ملے گی اتنے روپیہ مہر فاطمی میں دینے ہوں گے۔ یہی دوسرا قول (تقریباً ۱۳۲ تولد چاندی) حضرت مفتی عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند صاحب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کا ہے اور یہی ہمارے نزدیک ماخوذ ہے۔

وہاں کے جو معاشرہ و تمدن کا حال سوال میں درج ہے اور جو حقیقت مذکور ہے اس کے اعتبار سے واقعی یہ مقدار (۱۲۷۷ھ روپیہ ان کاغذی روپیوں سے) بہت کم ہے، اس لئے کہ مہر کی اقل مقدار اگرچہ صرف دس درہم ہے جو تقریباً تین یا ساڑھے تین تولد چاندی کے وزن کے برابر ہوتا ہے، لیکن مہر کی مقدار کیا ہے؟ اس کے بارے میں اپنے اکابر علماء کی دورائے ہیں:

۱۔ اول تو یہ ہے کہ شوہر کی حیثیت کے اعتبار سے اتنی مقدار ہو کہ اس کا ادا کرنا تو شوہر کے استطاعت میں ہو مگر ادا کرنے میں شوہر کچھ دشواری اور بار محسوس کرے۔ یہ رائے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور اشبہ بالفقہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ اور ایسر للعمل ہے۔ اور جماعتی طور پر یکساں عمل کے لئے یہی مقدار زیادہ مناسب ہوتی ہے۔ خواہ ایک سو چالیس تولد چاندی رکھ لی جائے چاہے ۱۳۲ تولد چاندی دونوں کی گنجائش ہے۔

۲۔ اس نمبر کا جواب ۱ کے جواب میں آچکا بلکہ ۳ و ۴ کے جوابات بھی ۱ کے ہی جواب میں آچکے۔ فقط

واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۱۳۹۶ھ

۱۔ چیز کا شرعی حکم:

زید کہتا ہے کہ چیز لینا و دینا درست نہیں اور دلیل یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ نے حضرت علی کو چیز اس لئے دیا تھا کہ حضور اکرم ﷺ کے چچا زویہائی تھے۔ حضور ﷺ نے ان کی پرورش کی تھی تو اپنا سمجھ کر چیز دیا تھا تو کیا یہ قول صحیح ہے۔ اور جو آج کل لین دین ہوتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟

۲۔ شریعت یا جہالت میں بیان کردہ احادیث سے استدلال:

مولانا پالن حقانی کی کتاب ”شریعت یا جہالت“ کا کیا درجہ ہے اور اس کے اندر جو احادیث ہیں ان سے کسی مسئلہ پر استدلال کرنا بغیر دوسری کتب کی مدد کے درست ہے یا نہیں؟ جواب سے نوازیں۔

۳۔ لڑکی والوں سے شادی کے لئے کچھ لینا جائز نہیں:

مولانا مشتاق صاحب جامع مسجد بھنڈاریڈی گریڈیہہ کے امام ہیں اور گزشتہ چند سالوں سے امامت کرتے آرہے ہیں، امام صاحب کے بھتیجے محمد ریاض الدین ولد مراد علی کی شادی مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۹۰ء بروز جمعہ ہوئی، لڑکی والے سے آٹھ ہزار روپے سامان کے علاوہ لیے، ۲۸ اپریل ۱۹۹۰ء بروز سنچر لڑکی والے بڑے کے یعنی ریاض الدین کے یہاں پہنچے اور بہت سے لوگوں کی موجودگی میں پانچ ہزار روپے دیے، اس میں مولانا مشتاق موجود تھے۔ پھر مولانا مشتاق کے سالے محمد طیب ولد شیخ پوات علی کی شادی ۱۷ مئی ۱۹۹۰ء بروز جمعرات ہوئی تو لڑکی والے سے چھ ہزار روپے سامان کے علاوہ لئے لڑکے والے نے جمعرات کو شادی کے موقع پر کھانے کی دعوت دی اس دعوت میں مولانا مشتاق شریک ہوئے اور کھانا بھی کھایا، اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ تکمیل لینا کیسا ہے؟ اور مشتاق کو امام رکھنا کیسا ہے؟ اور مولانا مشتاق کو امام رکھنا درست ہے یا نہیں اور ایسے امام کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

لڑکی والوں سے شادی کے لئے یا شادی کے موقع پر لڑکے والوں کا لینا تکمیل کہلاتا ہے اور یہ عمل و رواج کافروں غیر مسلموں کا ہے اور شریعت کی نگاہ میں ناجائز اور گناہ ہے مگر آن پاک میں اس کی ممانعت موجود ہے: قال اللہ تعالیٰ: ”یا ایہا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین کفروا“ (۱)، اور اس طرح لینا نکاح کی شرط کے درجہ کی چیز ہو کر حرام و رشوت کے

درجہ کی چیز ہو جاتی ہے جس کا واپس کر دینا لڑکے پر اور لڑکے والوں پر ضروری ہو جاتا ہے اور اگر لڑکی والے لڑکے سے یا لڑکے والوں سے نکاح سے قبل نکاح کی شرط کے طور پر کچھ لیں تو شرعی چیز ممنوع اور رشوت کے درجہ میں ہو کر واجب الاعادہ ہو جاتی ہے۔ ماصرح پنی الشامی (۲/۶۵۷ نعمانی)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، ۱۱/۱۱/۱۴۱۰ھ

سامان جہیز کے ضیاع کے بعد مطالبہ:

ہندہ جو کہ بکر کے نکاح میں تھی، ہندہ ایک شخص کے ساتھ شوہر کے یہاں سے فرار ہو گئی، کچھ دنوں کے بعد وہ لڑکی پکڑی گئی، لڑکی جو ساز و سامان ساتھ لے گئی تھی، اس میں سے اکثر ان دنوں نے بیچ کھایا، لڑکی کے باپ کا بیان ہے کہ لڑکی کے پاس بہتر ۷۲ تولہ چاندی تھی، پچائیت میں معاملہ رکھا گیا، پچائیت والوں نے اتنی چاندی اس لڑکے کے باپ سے دلوادی اور سامان مذکور کو برادری کے ایک معزز آدمی کے پاس امانت رکھ دیا گیا، اس واقعہ کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اب اس لڑکی کے باپ نے اس کی ثادی دوسری جگہ کر دی اب اس سامان کے تین دعویٰ ہیں۔

۱۔ لڑکی کا باپ، ۲۔ اس لڑکی کا اصل شوہر، ۳۔ وہ شخص جس کے ساتھ یہ بھاگی تھی، دعویٰ تو سب کرتے ہیں مگر اس آٹھ سال کے عرصہ میں کوئی ایک بھی ثبوت فراہم نہ کر سکا۔ سوال یہ ہے کہ یہ سامان کسی کو دیا جائے یا نہیں؟ اور دیا جائے تو کس کو اور اگر کوئی بھی ان تینوں میں سے اس کا مستحق نہیں ہے تو کیا اس چیز کو فروخت کر کے کسی مسجد وغیرہ میں لگایا جاسکتا ہے؟

مولانا قمر صاحب دیوبندی

الجواب وباللہ التوفیق:

بہتر ۷۲ تولہ چاندی اگر لڑکی کو اس کے باپ نے دیا تھا تو وہ چاندی اور سامان جہیز خود لڑکی کی ملک شرعاً ہو گیا، اب اس کے ضیاع کے بعد مطالبہ کا حق کسی کو نہیں رہا (۱)۔ اور اگر یہ چیزیں جہیز میں دی ہوئی نہیں تھیں تو باپ مدعی ہو اور المہتر علی المدعی (۲) کے ضابطہ شرعی کے مطابق بینہ وثبوت پیش کرنے کے بعد اثبات دعویٰ اور واپسی کا حق دار لڑکی کا باپ ہوتا، پس

۱۔ ”جہیز ابضہ بجہاز و مسلمہا ذلک لبس لہ الامداد مہیا“ (الدر المختار) علامہ مٹائی اس کے تحت لکھتے ہیں: ”ہذا اذا کان العرف مسموً ان الاب يدفع مفلہ جہازاً لا عاریۃ“ (رد المحتار علی الدر المختار ۳/۳۰۶)۔

۲۔ دیکھئے شرح المجملہ ۱/۵۱ ماہ ۶، ”وعن الأشعث بن قیس قال: کان یبوی و بین رجل من الیہود أرضاً فجعل یدلی فقدمہ

جب ثبوت شرعی اور بینہ باپ پیش نہ کر سکا تو اب اس کے واپسی کے مطالبہ کا حق باپ کو بھی نہیں رہا اور لڑکی کے اصلی شوہر کو بھی اس کے مطالبہ کا حق نہیں رہا، البتہ جس سے وہ چیزیں وصول کی گئیں ہیں، اس کو واپس کر دینا ضروری ہے، اس کے علاوہ پنچایت کا خود کہیں خرچ کر دینا جائز نہ ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱۰/۱۴۰۱ھ

إلى النبي ﷺ، فقال لي رسول الله ﷺ: هل لك بدة قلت: لا، قال لليهودي: إحلف، قلت: إذا يحلف فيه، فليذهب بمالي، فأنزل الله سبحانه: (إن الملحن يشرون بعهد الله وأيمانهم ثمناً قليلاً) الخ (سنن ابن ماجه ۲/ ۷۸ ۷۹ كتاب الاحكام باب البيعة علي المديني واليهم علي المديني عليه السلام ۲/ ۲۳۲)۔

۱- ”والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم“ (رد المحتار على الدر المختار ۷/ ۳۰۱)۔

باب المعاشرة بالمعروف

پاکی و ناپاکی کا خیال نہ رکھنے والی بیوی کے ساتھ برتاؤ:

ایک لڑکی سے میری شادی ہوئی تھی اسے بچہ بھی ہے، جب اس سے شادی ہوئی میں راضی نہیں تھا، یہ لڑکی رہن سہن میں پاکی و ناپاکی کا کوئی خیال نہیں کرتی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ خوبصورت ہے، لیکن میری اپنی نظر میں خوبصورتی دکھائی نہیں دیتی، جب نگاہ اٹھاتا ہوں دیکھ کر ایک قسم کی کوفت ہوتی ہے، اس کو چھوڑ کر دوسری شادی کروں تو کیسے مہر ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے، دوسری عورت پہلی ہوتے ہوئے کوئی دینے کو تیار نہیں ہے، بہر حال کوئی ایسی صورت بتلائیے کہ اس انسان نما حیوان سے چھٹکارا ہو جائے، میرے کہنے میں بھی نہیں ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ کا حل یہ ہے کہ آپ صبر کریں اور اس کے حقوق ادا کرتے رہیں، اس سے آپ کے درجات بلند اور آخرت درست ہوگی، اور اس عورت کو نرمی سے سمجھاتے رہیں، انشاء اللہ ایک دن حسب منشاء بھی ہو جائے گی (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۸/۱۳۸۵ھ

۱- تنفر دور کرنے کے لئے مشکوٰۃ شریف ۲۸۰، درج ذیل حدیث کو بھی سامنے رکھیں: "قال رسول اللہ ﷺ لا یفرق المؤمن من مؤمنہ ان کثرہ مبہا خلقا رضی مبہا آخر" (رواہ مسلم)۔

نافرمان بیوی کی اصلاح کا طریقہ:

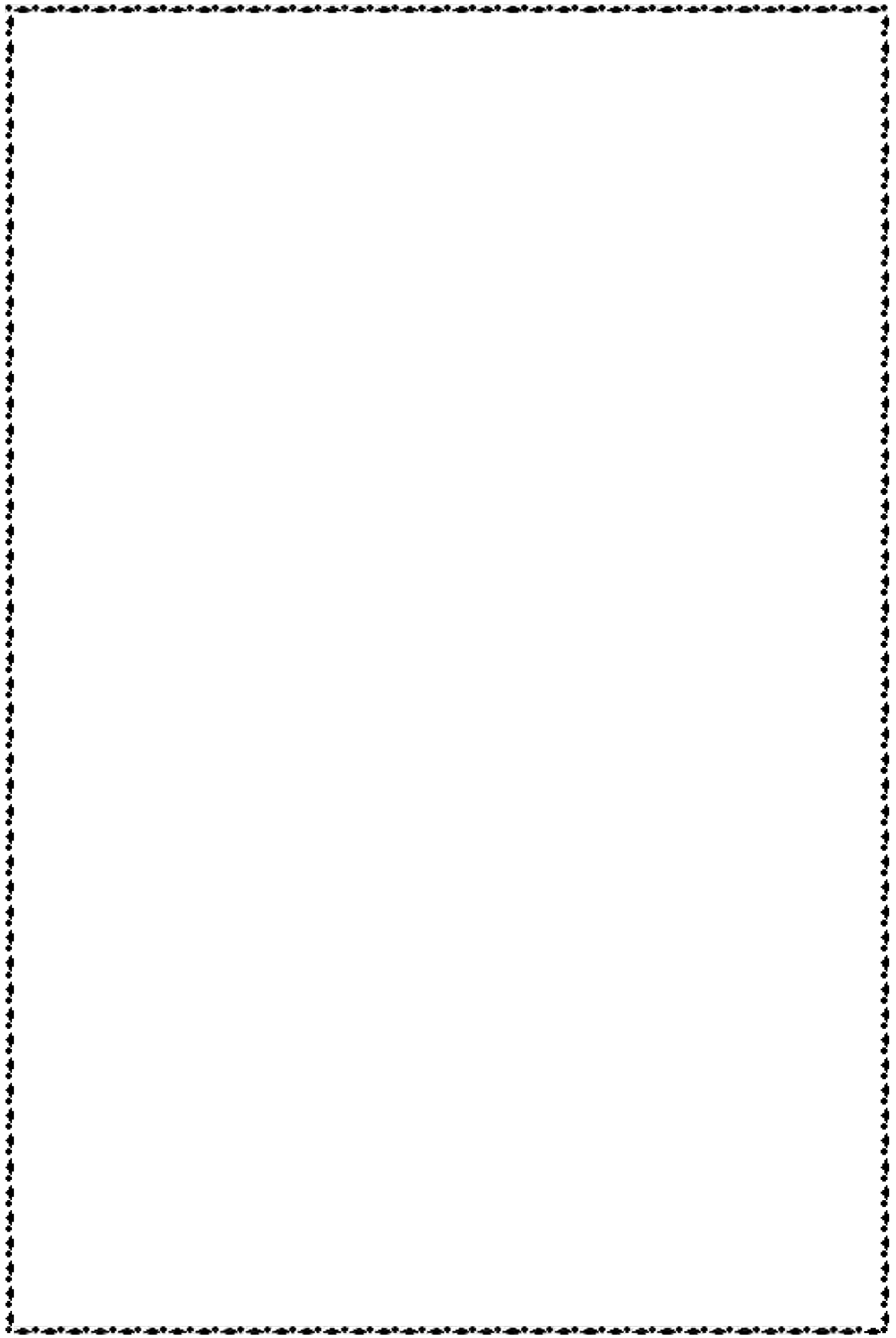
زید کی بیوی نہایت بد مزاج اور زبان دراز ہے، زیادہ تر کام زید کی مرضی کے خلاف کرنے والی ہے، وہ شریعت نبوی کی مکمل طریقہ سے پابند نہیں ہوتی ہے، مثال کے طور پر اگر اس کو غسل کرنے کی پاکی کی غرض سے ضرورت ہے اور اس کو معمولی رکام بھی ہے تو وہ کئی کئی روز تک غسل نہیں کرتی ہے اور نمازیں ترک کرتی رہتی ہے، جن کی قضا بھی بعد کو نہیں پرہستی ہے، مانتوں پر سرخی لگانا بھی نہیں چھوڑتی، جبکہ اس کو یہ بتلایا گیا ہے کہ ایسا کرنے سے وضو مکمل نہیں ہوتا ہے اور جب وضو نہیں ہوتا تو نماز بھی نہیں ہوتی ہے، وہ تعلیم یافتہ بھی ہے، زید چاہتا ہے کہ وہ خوشگوار اور شرعی زندگی مع اپنے گھر کے ماحول کے گزارے، وہ خود سنیما نہیں دیکھتا ہے، لیکن بیوی زید کی عدم موجودگی میں بلا شوہر کی اجازت اور اس کے علم میں لائے ہوئے سینما دیکھنے لگتی، زید اس کو بار بار سمجھایا، مارا، غصہ ہوئے، غرضیکہ اس کو سمجھانے اور انسانیت اور شرافت سے زندگی گزارنے کی نصیحت میں زید نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، لیکن وہ اپنی جگہ پر قائم ہے، اب زید کو اپنی بیوی کے ساتھ کیا کرنا چاہئے؟

الجواب وبالله التوفیق:

جب آپ اس ماحول میں ہر طرح نصیحت کر کے تھک چکے ہیں، تو اب آپ دونوں میاں بیوی اس ماحول کو چھوڑ کر کسی ایسے دوسرے دینداری کے ماحول میں قیام پذیر ہو جائیں جہاں عام طور سے عورتوں میں بھی دینداری ہو اور پردہ پوشی کا پورا پورا لحاظ ہو، اور وہاں بیوی کے سابق حالات کے دوست و احباب و تعلق والے نہ ہوں یا نہ ملیں تو امید ہے کہ حالات استوار و درست ہو جائیں گے، یا پھر آپ صبر کے ساتھ نصیحت و کوشش کرتے رہیں بڑے ثواب کے مستحق ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

كتاب الطلاق



کتاب الطلاق

طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہے عورت کو نہیں:

الف کی بیگم بذات خود اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہے؟ اور دونوں کا نکاح خارج مانا جائے گا؟ اگر ایسا کرنے سے الف کی بیگم آزاد نہیں ہو سکتی تو کونسا ایسا عمل ہے جس سے وہ آزاد ہوگی، اگر الف کی بیگم اپنے شوہر سے آزاد ہوتی ہے تو بچے کس کے رہیں گے۔ جب کہ بچوں کی عمریں بالترتیب ۹ سال ۷ سال ۴ سال ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق :

طلاق دینے کا حق اللہ نے، اللہ کے رسول نے و شریعت نے صرف مرد کو دیا ہے، اگر عورت طلاق دیدے تو وہ طلاق واقع ہی نہ ہوگی (۱)، بلکہ اگر شوہر حقوق زوجیت ادا کرتا رہے اور پھر عورت طلاق کا مطالبہ کرے تو اس پر اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ملائکہ کی سب کی لعنت پڑتی ہے اور عورت سخت گنہگار ہوتی ہے اور اگر شوہر سے طلاق کے بغیر کسی سے نکاح کرے تو ہمیشہ زنا کاری کے گناہ اور وبال میں مبتلا رہے گی۔

اور اگر شوہر سے طلاق حاصل ہو جائے تو اس کے نطفہ سے جو بچے پیدا ہوئے ہیں، وہ سب اسی طلاق دینے والے شوہر کے شمار ہوں گے اور جب یہ مطلقہ کسی دوسرے سے شادی کرے گی تو وہ شوہر ان بچوں کو اس مطلقہ سے الگ کر دینے کا شرعاً حقدار ہو جائے گا۔

لہذا اس قسم کا خیال بھی ترک کر دینا اس عورت پر لازم ہے، ورنہ آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کے اندر بھی سخت

۱- ”عن ابن عباس قال: أئى النبی ﷺ رجل فقال: یا رسول اللہ مبدی زوجی أمہ وھو یزید أن یفرق بی و بیہا قال
إلما فصعد رسول اللہ ﷺ المنبر فقال: یا أئیہا الناس: ما بال أحدکم یزوج عبده أمہ ثم یزید أن یفرق بیہما إلما الطلاق لمن
أخذ بالمساق“ (ابن ماجہ باب طلاق العبد ۱۵۲)۔

وہاں میں بتلا ہو جانے کا شدید خطرہ ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

محض دل میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی:

زید کی شادی کو ۲۷ دن ہوئے، زید کو اپنی بیوی سے محبت ہے، مگر ملازمت کے سلسلہ میں اپنی بیوی کو چھوڑ کر دوسرے صوبہ میں جا رہا ہے، دوران سفر بیوی کی جدائی سے بہت مغموم تھا، اچانک ذہن میں برے برے خیالات اور وسوسے آنے لگے، اسی جنونی کیفیت میں زید نے سوچا کہ میں نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا، فوراً ہی پھر خیال آیا کہ یہ کیا کیا، اس صورت میں جب کہ زبان سے کچھ نہیں کہا کیا طلاق ہو جائے گی، اور اگر خدا نخواستہ طلاق ہو جائے تو رجوع کی کیا صورت ہوگی؟

سید ظہیر احمد

الجواب وبالله التوفیق :

طلاق دینا زبان کا فعل ہے، زبان سے دینے سے واقع ہوتی ہے اور محض دل میں دینے سے اور سوچنے سے کوئی طلاق نہیں پڑتی (۱)، پس جب آپ نے زبان سے کچھ نہیں کہا ہے تو اس سوچنے سے اور وسوسہ آنے سے کوئی طلاق نہیں پڑی بالکل مطمئن رہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۱۲/۱۴۱۱ھ

بیوی کے سامنے طلاق لکھ کر دینے سے طلاق نہیں پڑتی:

اگر کوئی شخص بیوی کے سامنے زبان سے طلاق دے بغیر محض طلاق لکھ کر بیوی کو دیدے تو کوئی طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

۱- "إن الله تجاوز عن أمي ما وسوست به صدورهم ألام لم يعمل بها أو تكلم بهارواه الشيخان" (مشکوٰۃ المصابیح / ۱۸)۔

الجواب وبالله التوفيق:

اس (اشکال) کا جواب سمجھنے کے لئے پہلے ان باتوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے، وقوع طلاق کی حقیقت شرعیہ تلفظ الطلاق بلفظ الايقاع ہے (۱) یعنی ايقاعی لفظ کے ساتھ طلاق کا تلفظ کیا جائے اور تلفظ زبان کا فعل ہے۔ جس طرح تکبیر تحریمہ میں تکبیر کہنا زبان کا فعل ہے (۲) اور تسمیہ عند الذبح میں تسمیہ کہنا زبان کا فعل ہے۔ اگر کوئی شخص تحریمہ کی تکبیر زبان سے ادا نہ کرے، صرف دل ہی دل میں تکبیر کہ کر یا بغیر زبان سے کہے ہوئے کاغذ پر محض لکھ کر تحریمہ باندھ لے تو انعقاد صلوة متحقق نہ ہوگا اور نماز نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی ذبح کے وقت زبان سے تسمیہ نہ پڑھے، بلکہ صرف دل ہی دل میں کہہ کر یا صرف کاغذ پر لکھ کر ذبح کر دے تو ذبیحہ حلال و جائز نہ ہوگا۔

بالکل اسی طرح کا معاملہ طلاق میں بھی ہے، اگر کوئی شخص محض دل ہی دل میں طلاق کہہ لے، یا بغیر زبان سے ايقاع طلاق کا لفظ بولے ہوئے اور بغیر کسی مجبوری کے محض کاغذ پر لکھ ڈالے تو اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی البتہ ”الدین یسر“ (۳) کے قاعدہ سے شریعت مطہرہ نے ضرورت کے موقع میں بقدر ضرورت کتابت کو بھی قائم مقام تلفظ قرار دے دیا ہے۔

مثلاً ایک شادی شدہ شخص افسس کوٹنگا ہے، اشارہ سے بھی اظہار طلاق پر قادر نہیں اور طلاق دینے کی اسکو ضرورت ہے، یا مثلاً مغفل اللسان ہے اور یہ اعتقال دائم ہو گیا ہے اور زبان سے تلفظ طلاق پر قادر نہیں ہے اور ضرورت طلاق دینے کی ہے یا مثلاً ایک شخص جو دور ہے یا سامنے نہیں ہے اور وہ طلاق کی اطلاع عورت کو دینا چاہتا ہے، اس کی اسکو ضرورت ہے تو ان سب صورتوں میں کتابت طلاق بمنزلہ تلفظ طلاق کے قرار پا جاتی ہے اور اسی کو فقہاء نے بایں عبارت نقل فرمایا ہے:

۱- البحر الرائق مطبوعہ مکتبہ زکریا ۳۱۰ میں طلاق کی تعریف میں مذکور ہے ”رفع اليد عن النكاح حالاً أو مآلاً بلفظ مخصوص“، اور شامی ۳/۵۷۳ میں ہے ”لان دکن الطلاق اللفظ أو ما يقوم مقامه“، نیز در مختار مع شرح رد مختار للہامی (۲/۵۲-۲/۵۳) میں مذکور ہے ”و ادلی (المخافة اسماع لفسه) ومن يقوبه..... (ويجوز ذلک) المذکور (فی کل ما يتعلق بطلاق كسمية علی ذبيحة ووجوب سجدة تلاوة وعناق وطلاق واستبراء، علامہ شامی نے اس کے تحت تحریر فرمایا ہے ”قال فی البهر: أقول: ينبغي أن يكون الحكم كذلک فی کل ما يتوقف مقامه علی القبول ولو غير مبادلة كالنكاح“ (۲/۵۳)۔

۲- تحریر کی شرط میں سے نطق کے تحت مذکور ہے ”فمن همس بها أو اجراها علی قلبه لا تجزیه“ (رد المختار ۲/۱۳۱)۔

۳- عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال: ”إن العین یسر، وإن يشاد الذین أحد إلا غلبه، فسددوا وقاربوا، وأبشروا استعبروا بالعدوة والروحة وحشی من الدلجة“ (صحیح بخاری مع فتح الباری ۹۳ کتاب الايمان باب الدین یسر حدیث ۳۹)۔

”ان الکتابہ اقیمت مقام العبارة عند الحاجة“ (۱) اور یہ علت مطرودہ ہے ہر جگہ جاری و مانڈ ہوگی اور اسی بناء پر چونکہ اقامت کتابت مقام العبارة محض بوجہ ضرورت اور بقدر ضرورت پر دائر ہے، اس لئے نکرہ کی طلاق بالکتابۃ واقع نہیں ہوتی، اس لئے کہ یہاں کتابت کی حاجت نہیں بغیر کتابت کے بھی زبان سے طلاق دلوائی جاسکتی ہے اور بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص بیوی کے سامنے موجود ہوتے ہوئے زبان سے کوئی طلاق دینے کے بجائے محض لکھ کر دیدے تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ بجائے لکھنے کے زبان سے طلاق دے سکتا تھا، اگر اس وقت زبان سے کہنے سے کوئی شخص کسی مانع کی وجہ سے زبان سے ادا نہ کر سکتا ہو تو بعد میں یا اسی وقت وہاں سے ہٹ کر بذریعہ کتابت طلاق نامہ بھیج سکتا تھا مگر جب اس نے ایسا نہیں کیا تو یہ حاضرا نہ کتابت لغو و بیکار غیر مفید ہے، اسی کو علامہ ابن عابدین نے (شامی ج ۵ ص ۷۰) میں بایں الفاظ ادا کیا ہے:

”وظاہرہ أن المعنون من الحاضر الناطق غیر معتبر“ (۲)۔

علاوہ ازیں فقہاء نے جہاں جہاں بھی طلاق بالکتابۃ کو مفید سمجھا ہے وہاں وہاں جو مثالیں لائے ہیں ان سب میں کہیں کہیں ارسل وغیرہ ایسے الفاظ لائے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ یہ طلاق بالکتابۃ غائبانہ ہوئی ہے، سامنے اور روبرو کی نہیں ہے اور مثال چونکہ مثل لہ کی وضاحت کے لئے ہوتی ہے، اس لئے بطریق دلالتہ النص یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غائبانہ کتابت طلاق مفید ہوتی ہے، پھر چونکہ تصانیف کا مفہوم مخالف جتہ ہوتا ہے، اس لئے بطریق اشارہ نص یہ حقیقت بھی کھل جاتی ہے کہ بالمشافہ کی کتابت بغیر کسی شدید ضرورت کے معتبر نہ ہوگی جیسا کہ شامی (ج ۵ ص ۷۰) کی عبارت سے اوپر واضح ہو چکا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۷/۱۳۸۰ھ

طلاق دے دوں کہنے سے طلاق نہیں پڑتی:

صورت مسئلہ یہ ہے کہ مستی محمد ناصر علی ابن اللہ رکھا کا عقد نکاح مسماۃ پروین بنت شبیر احمد سے ہوا میری بیوی پروین میرے مکان پر تھی کہ میں اس کو اپنی خالہ کے یہاں شرکت شادی میں لیجانا چاہتا تھا، کیونکہ میری خالہ کے دھیرا ضلع سہارنپور تحصیل رڑکی نے اس کے لانے کا اصرار فرمایا تھا مجھے گھر کے کچھ فرائض منع کرنے لگے، میرے تقاضے میں شدت ہو گئی،

۱۔ البحر الرائق ۳/۳۹۲۔

۲۔ رد المحتار علی الدر المختار ۱۰/۳۶۱۔

گھر والوں نے مزید رکاوٹ پیدا کرنی چاہی، تو میں نے از روئے حق زوجیت بغرض سرپرستی اپنا حق ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ طلاق دے دوں، یعنی کیا آپ لوگ میری مفارقت پسند کرتے ہو تو میں ایسا کروں محلہ کی کچھ موافق مخالف عورتیں بھی موجود تھیں جنہوں نے میرے اس لفظ کو دوسرے حضرات سے طلاق دیدینا ثابت کیا اور میرے اور میری زوجہ کے سرپرستوں (والد وغیرہ) کو باور کرانا چاہا کہ اس نے تو تمہاری لڑکی کو طلاق دیدی ہے، میرے خسر صاحب ابھی آئے تھے انہوں نے یقین سے کہہ دیا کہ تم نے تو میری لڑکی کو طلاق دیدی ہے، پھر اب میں کیسے بھیج دوں تو حضرت مفتی صاحب جناب سے استدعا ہے کہ بصورت مذکورہ بالا کیا میرے اس بیان سے طلاق واقع ہوگئی ہے؟

محمد صرعلی بن اللہ رکھاچہ نھاول، مظفرنگر

الجواب وباللہ التوفیق:

اگرنا صرعلی نے واقعی صرف یہی جملہ (کہ طلاق دیدوں) کہا ہے تو ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوئی۔ یہ الفاظ ایقاع طلاق کے نہیں ہیں بلکہ محض استفہام یا تہدید کے ہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۲/۱۴۰۲ھ

ایک مجلس کی تین طلاق کے سلسلہ میں احمد آباد اسلامک ریسرچ سینٹر کی جانب سے منعقد سمینار کے فیصلہ پر محاکمہ:

احمد آباد ۴ نومبر ۱۹۷۳ھ یہاں اسلامک ریسرچ سینٹر کے زیر اہتمام ۲/۵/۶۷ نومبر ۱۹۷۳ء کو تین طلاقیوں پر ایک کل ہند سمینار ہوا جس کی صدارت مفتی عتیق الرحمن عثمانی نے کی جس میں حسب ذیل نکات پر اتفاق رائے کیا:

(۱) ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاق معطلہ ہونے کا مسئلہ اجماعی و قطعی نہیں ہے، اس میں سلف ہی کے زمانے سے اختلاف موجود ہے۔

(۲) فقہی جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر مندرجہ ذیل دو صورتوں کے بارے میں مجلس مذکورہ کی رائے یہ ہے:

۱- ”أما تفسيره شرعاً فهو دفع لحد النكاح حالا أو مآلاً بلفظ مخصوص“ (فتاویٰ مالگیریہ ۱/۳۲۸) اور استفہام و تہدید اور وعد و وعید پر مشتمل تعبیرات سے دفع تید نکاح کا تحقق نہیں ہوتا، قولہ طلقی لفسک لکالت أأ طالق أو أأ أطلق لفسی لم يقع لأله وعده (در مختار مع رد المحتار ۴/۵۵۸)۔

الف: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے طلاق، طلاق، طلاق کہتا ہے اور کہتا ہے کہ میری نیت صرف ایک طلاق دینے کی تھی، میں نے طلاق کا لفظ تاکید کے لئے دہرایا تھا تو اس کی اس بات کو باور کیا جائے گا، اور یہ طلاق طلاق مغلطہ شمار نہ ہوگی۔

ب: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے: تجھے تین طلاق مگر وہ حلفیہ بیان دیتا ہے کہ میری نیت تین طلاق دینے کی نہیں تھی، میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تین طلاق کا لفظ کہے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی، اس لئے میں نے تین طلاق کے لفظ استعمال کئے تھے۔ اس کی بات باور کی جائے گی اور یہ طلاق طلاق مغلطہ بائد شمار نہ ہوگی۔

(۳) اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو طلاق کا صحیح طریقہ بتایا جائے، ان کو یہ واضح کیا جائے کہ ایک مجلس میں تین طلاق کا طریقہ بدعت، معصیت اور عورت کے حق میں ظلم و زیادتی ہے، طلاق کے اس غلط طریقہ سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہئے اور طلاق دینا ضروری ہے، تو بس ایک طلاق پر بس کرنا چاہئے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اما بعد ۴/۵/۶ نومبر ۱۹۷۳ء کے اسلامک ریسرچ سینٹر احمد آباد کے زیر اہتمام تین طلاقوں کے بارے میں کل ہند سیمینار کے نام سے جو سیمینار ہوا ہے، اس کا فیصلہ قومی آواز لکھنؤ میں شائع ہوا ہے، اس کا تراشہ سامنے ہے اس پر کچھ عرض کرنا ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ سیمیناروں کی حیثیت عموماً محض ایک علمی مذاکرہ و تبادلہ خیالات کی ہوتی ہے، اس کو شرعی حکم یا فتویٰ قرار دینا صحیح نہیں، اگر کوئی شخص اس کو شرعی حکم قرار دے تو یہ اس کی غلطی اور فریب خوردگی ہوگی، پھر اس سیمینار کو کل ہند سیمینار کہنا بھی تسلیم نہیں، کل ہند سیمینار اس وقت کہا جاسکتا تھا جب پورے ہندوستان کے تمام مکاتب فکر اور ہر طبقہ خیال کے معتد علماء کرام کا کم از کم معتد بہ طبقہ اس میں شریک ہوتا اور ہر ایک کے مقالے و بیانات پر مکمل بحث و تمجیس کے بعد کوئی متفقہ رائے سے فیصلہ کیا جاتا، یہاں ایسا نہیں ہوا، لہذا اس کو کل ہند سیمینار کہنا کیونکر درست ہوگا؟ بلکہ محض ایک حاضر جماعت یا ٹولی کا سیمینار ہوا جو قطعاً کسی دوسرے طبقہ خیال کے افراد پر حجت نہیں بن سکتا اور بالکل لایعبا بہ کے درجہ کی چیز ہے، اس لئے اس پر کچھ کہنا یا اس کی تردید کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ آج کل بے راہ روی کا دور دورہ ہے، مبادا کوئی شخص اس کو شرعی حکم یا شرعی فتویٰ قرار نہ دے دے، اس لیے اس کی حقیقت واضح کر دینے کی ضرورت ہے، اور اسی مقصد کے پیش نظر ذیل

کی چند سطور عرض ہیں۔ مقالے سامنے موجود نہیں کہ ان پر کچھ تفصیلی گفتگو کی جاسکے، اس لئے صرف تراشہ اخبار میں جو چار نکات پر اتفاق ظاہر کیا گیا محض اسی پر عرض کیا جاتا ہے۔

چوتھا نکتہ: جس کو نمبر سب کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے صحیح ہے اور تسلیم ہے کہ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان کو طلاق دینے کا صحیح طریقہ بتایا جائے اور ان پر واضح کیا جائے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا طریقہ بدعت و معصیت و عند اللہ انتہائی مبغوض و مذموم ہے اور عورت کے حق میں اور خود اپنے حق میں ظلم و زیادتی ہے، طلاق کے اس طریقہ سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہئے اور اگر طلاق دینا ضروری ہو تو صرف ایک طلاق پر بس کرنا چاہئے اور وہ بھی خوب سوچ سمجھ کر اور اس کے نتائج و عواقب پر نظر رکھ کر اور غور و فکر کرنے کے بعد طلاق کا اقدام کرنا چاہئے اور وہ بھی اس وقت جب عورت حیض سے پاک ہو کر غسل وغیرہ کر چکی ہو اور اس سے مباشرت نہ ہوئی ہو، جیسا کہ فقہاء نے بیان فرمایا ہے اور اس مسئلہ کی تشہیر و ترویج اور تعلیم کے لئے جتنی بھی سعی کی جائے محمود و پسندیدہ خدمت ہوگی۔

دوسرا نکتہ: (۱) و (۲) کے ضمن میں الف کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بیوی سے طلاق، طلاق، طلاق کہتا ہے الخ، وہ صحیح اور قابل اعتماد نہیں ہے، اس لئے کہ بیوی سے اس طرح براہ راست کہنا اس بات پر قرینہ ہے کہ شوہر نے بیوی کے سامنے اس کو مخاطب کر کے (طلاق، طلاق، طلاق) کہا ہے، لہذا جب بیوی نے خود سن لیا ہو تو لفظ تجھے کہا ہو، یا نہ کہا ہو نسبت بیوی کی طرف مراد ہوگی اور بیوی کے لئے جائز نہیں رہے گا کہ کسی طرح بھی شوہر کو اپنے اوپر تابو پالینے دے، اگر شوہر کھلف بھی بیان کرے کہ میری نیت محض تاکید کی تھی اور صرف ایک طلاق دینے کی تھی یا دو مرتبہ کا لفظ بھی تاکید کے طور پر کہا تھا، شوہر کے اس حلفی بیان کی بھی تصدیق شریعت نہ کرے گی، تصدیق کرنا اس کے لئے جائز نہ رہے گا، اس لئے کہ عورت اس معاملہ میں مثل تافضی کے ہے۔

اسی طرح اگر یہ معاملہ تافضی (یا قائم مقام تافضی جیسے جماعت مسلمین و شرعی کمیٹی) کے سامنے پہنچ جائے گا تو وہ بھی کھلف بیان کرنے کی تصدیق نہ کرے گا، بلکہ تین طلاق کا ہی حکم ہوگا۔ ہاں اگر عورت کو شوہر کے جملہ کے کہنے کا علم نہ ہو اور معاملہ تافضی یا قائم مقام تافضی تک نہ پہنچے، مثلاً شوہر نے غائبانہ کہا ہو کہ اس کو طلاق، طلاق، طلاق پھر کھلف کہے کہ میری نیت صرف ایک طلاق دینے کی تھی، دو مرتبہ طلاق کا لفظ محض تاکید کے طور پر کہہ دیا تھا تو اس صورت میں فیما بینہ، و بین اللہ تصدیق کر لی جائے گی اور اس کی رجعت صحیح قرار دی جائے گی، اسی طرح اگر شوہر کے سوا کسی کو بھی شوہر کے اس جملہ کے کہنے کی خبر نہ ہو، مثلاً بالکل تنہائی میں عورت سے بھی غائبانہ کہہ دیا ہو اور واقعی شوہر نے تاکید کی نیت سے اور تاکید کے لئے ہی

دہر لیا ہے تو معاملہ اس کے اور اللہ کے درمیان رہے گا۔ اور اس کا رجعت کر لینا صحیح رہے گا، جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

الف: ”لو کدر لفظ الطلاق وقع الكل وإن نوى التأكيد دين“ (۱)۔

ب: ”قوله إن نوى التأكيد الخ أى وقع الكل فى القضاء“ (۲)۔

ج: تنقیح فتاویٰ حامدیہ، ص ۳۷ میں اسی قسم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ”لا یصدق فى ذالک قضاء، لأنه مأمور باتباع الظاهر، والله يعلم بسرائره، ولا یصدق أنه قصد التأكيد إلا بيمينه، لأن كل موضع يكون القول منه قوله: إنما یصدق مع اليمين (ثم الى قوله) أن المرأة کا لقاضی فلا تحل لها أن تمکنه إذا سمعت منه ذالک وعلمت؛ لأنها لا تعلم إلا الظاهر“ (۳)، لہذا شوہر کا یہ جملہ اگر عورت نے خود سن لیا ہے یا معاملہ عدالت میں پہنچ گیا ہے تو خاوند کا یہ دعویٰ کہ اس جملہ سے میری نیت صرف ایک طلاق دینے کی تھی اور باقی دو مرتبہ محض تاکید کے طور پر دہرایا ہے، قائل اعتبار اور مفید مطلب نہ ہوگا اور محض اس دعویٰ سے فقط ایک طلاق کا حکم نہ ہوگا اور عورت کے واسطے شوہر کو اپنے اوپر تابو دینا جائز نہ ہوگا، بلکہ اس سے خلاصی کی ہر مناسب تدبیر اختیار کرنا لازم ہوگا۔ جیسا کہ بشامی، (ص ۵۹۲ ج ۲) میں اس کی تصریح موجود ہے، البتہ اگر عورت شوہر کو اپنے سے روک کر یا بھاگ کر یا فدیہ دیکر وغیرہ کسی طرح بھی خلاصی حاصل نہ کر سکے تو معاملہ قاضی تک پہنچائے، اب اگر قاضی کے سامنے بھی شوہر تین مرتبہ لفظ طلاق کہنے سے کھلف انکار کرے اور عورت کے پاس خلاف کا بینہ نہ ہو اور قاضی عورت کے خلاف فیصلہ کر دے تو اب گناہ عورت پر نہ رہے گا، بلکہ صرف مرد پر رہے گا۔

وفى أبرز از یعن لا وز جندی: ”إنها ترفع الأمر للقاضی فإن حلف ولا بینة لها، فالإثم علیه أى إذا لم

تقدر على القداء أو الهرب ولا على منعه عنها“ (۴)۔

ہاں اگر شوہر نے محض ایک طلاق کی نیت کرنے پر اور دوبار محض تاکید کے لئے بولنے پر یہ جملہ بولنے سے قبل ہی ثقہ کواد بنا لیا تھا اور ان کی گواہی سے عدالت میں ثابت کر دیا کہ واقعی محض ایک طلاق کی نیت سے یہ جملہ کہا ہے اور محض تاکید

۱- مٹای ۳۳۳ کتاب الطلاق، باب طلاق غیر المدخول بہا۔

۲- حوالہ سابق۔

۳- تنقیح الفتاویٰ حامدیہ، ص ۳۷۔

۴- مٹای ۳۳۳ کتاب الطلاق، باب مطلب المصرح ۳۵۱/۳۔

دہر لیا ہے تو اس صورت میں شوہر بھی گنہگار نہ ہوگا، اور محض ایک طلاق رجعی کا حکم ہوگا جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

”ووقع بها أي بهذه الألفاظ وما بمعناها من الصريح (إلى قوله) بلافرق بين جاهل وعالم، وإن قال تعدلته تخويفا لم يصدق قضاء، إلا إذا أشهد عليه قبله“ (۱)۔ وہكذا في البحر وغيره۔

اور ابن دمیث العید نے ”احکام الاحکام“ (ص ۱۲۷ ج ۲) میں اسی عذر جہل پر بہت مدلل و مفصل کلام کیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ منصوصات و مامورات میں جہالت کا عذر معتبر نہیں ہے اور تین طلاق کے بعد حرمت منصوص ہے اور بغرض نکاح جدید ”حتی تنکح زوجا غیرہ“ (۲) حکم بھی منصوص ہے پھر اس کا جہل کس طرح معتبر ہوگا۔

تیسرا نکتہ: جو ۲ کے ضمن (ب) کے تحت بیان کیا گیا ہے قطعاً غلط اور ناقابل تسلیم ہے، اس لئے کہ شوہر نے اپنی بیوی سے یہ جملہ (تجھے تین طلاق) کہا تو اب اگر شوہر تکلف بھی بیان دے کہ اس جملہ سے میری نیت تین طلاق دینے کی نہ تھی، بلکہ میری نیت صرف ایک طلاق کی تھی میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تین کا لفظ استعمال کیے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی تو شوہر کا یہ بیان کسی صورت میں معتبر نہ ہوگا، بلکہ تین طلاق ہی کا حکم ہوگا اور حرمت مغلطہ ہوگی اور شوہر کے قول کی تصدیق کر کے محض ایک طلاق شمار نہ ہوگی۔

کمانی الردہ: ”والطلاق يقع بعدد قرون به أي متى قرون الطلاق بالعدد كان الواقع بالعدد بدليل ما أجمعوا عليه من أنه لو قال لغير المدخول بها أنت طالق ثلاثا طَلَّقَتْ ثلاثاً..... وقوله عند ذكر العدد الخ أي عند التصريح بالعدد فلا يكفي قصده“ (۳) اور لائلی کے عذر کا اعتبار نہ ہوگا، ابھی اوپر نکتہ ۲ کے ضمن الف کے تحت کی اخیر عبارت: ”بلافرق بين عالم و جاهل“ سے اور بھی واضح ہوتا ہے، اسی طرح عقل کے بھی مطابق ہے، اس طرح کہ نقل و عقل و شرع سب کے نزدیک مسلمہ ہے کہ جس زبان کا جو لفظ ہوتا ہے اس زبان میں اس لفظ کے لئے جو معنی موضوع ہوتے ہیں وہی معنی مراد ہوتے ہیں۔

اس معنی کے خلاف معنی کا مراد لینا غلط کہا جاتا ہے، اور معتبر نہیں ہوتا ہے جیسے آم (ایک خاص پھل کا نام ہے جس معنی کے لئے وضع ہوا ہے وہی معنی اس سے مراد لئے جائیں گے۔ اور اگر کوئی شخص لفظ آم بول کر اٹی یا انار وغیرہ (دوسری نوع کا پھل) مراد لے تو ہرگز اعتبار نہ کیا جائے گا اور اگر وہ کہے کہ میری مراد اس لفظ آم، سے آم نہیں تھی، بلکہ اٹی تھی تسلیم نہیں کیا

۱- شامی ۳۲۸-۳۲۹ باب الصریح۔

۲- سورہ بقرہ ۲۳۰۔

۳- رد المحتار ۵۱۳-۵۱۴۔

جائے گا، تغلیط و تکذیب کی جائے گی۔ بالخصوص جب کہ آم بول کر اہلی وغیرہ مراد لینے میں اس کا کوئی نفع بھی متصور ہو۔
 ۱۰۔ یہی تین کا لفظ ہے، اس لفظ کے معنی ہر ہندوستانی کے ذہن و علم میں متعین ہیں کہ دو اور چار کے درمیان کا عدد مراد ہے، جو دو سے زائد اور چار سے کم ہوتا ہے اور یہی معنی اس لفظ (تین) کا حقیقی معنی اور معنی موضوعہ ہے جس میں نیت بلا نیت ہر حال میں یہی عدد دو درجہ مراد ہوتا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ میں اس کے معنی نہیں جانتا تھا یا اس کا موقع استعمال نہیں جانتا تھا، یا میری مراد تو صرف دو تھی تکذیب کی جائے گی، قسم بھی اس پر کھائے گا تو اعتبار نہ کیا جائے گا، بالخصوص ایسے موقع پر جب کہ اس مراد لینے میں اس کا ذاتی نفع ہو اور جھوٹ بولنے کا احتمال بھی ہو رہا ہو، بالکل یہی حال یہاں بھی ہے کہ ہرگز اس کے قول کا جو طلاق کے ساتھ تین کا لفظ بولنے کے باوجود کہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ تین طلاق کہنے سے تین طلاق واقع ہو جائیں گی، یا یہ کہے کہ مراد تین سے تین نہیں تھی، بلکہ صرف ایک تھی، یا یہ کہے کہ میں تو سمجھتا تھا کہ بغیر تین کے لفظ بولے ہوئے طلاق ہی واقع نہیں ہوتی تو اعتبار نہ کیا جائے گا، بلکہ تغلیط و تکذیب کی جائے گی، بلکہ اگر قسم کھا کر بھی یہ تو جیہات وناویلات کرے گا تو بھی تسلیم نہ کیا جائے گا اور بہت سے بہت یہ کہا جائے گا کہ تین طلاق تو واقع ہو گئیں، اب آئندہ سے احتیاط کرو تو کم کی زبان اور اس کی لغت و تاءورہ کو دیکھو اور معلوم کرو، اگرچہ ہمارا استدلال محض ان روایات اور ان پر قیاسات پر نہیں ہے، بلکہ نص قرآنی: ”فان طلقھا فلا النخ“ (۱) جو تیسری طلاق کے بارے میں عام اور مطلق ہو کر وارد ہوئی ہے، اسی سے ہے جیسا کہ ہم عنقریب واضح طور سے بیان کریں گے، مگر یہ روایت مذکورہ بھی محض عقلی تک بندی تک نہیں ہے، بلکہ ماخوذ من الکتاب والسنۃ ہے جب منطوق قرآنی: ”وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا“ (۲) اور حسب ارشاد ذہبی: ”انما بعثت الی الاسود والاحمر“ الحدیث حضرت سرکارِ دو عالم نبی آخر الزماں تمام عالم کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں، تمام عالم کو خواہ وہ کوئی زبان و لغت رکھتا ہو سب کے لئے احکام خداوندی پہنچانے سے خواہ بلا واسطہ اور براہ راست زبان مشکوٰۃ سے اور یہ احکام پہنچانا خواہ بلا واسطہ اور براہ راست زبان مشکوٰۃ نہ ہونے میں ہو یا بواسطہ ہو اور منطوق قرآنی: ”وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ“ (۳) کے اشارۃً اخص نے بتایا کہ ہر قوم میں احکام خداوندی کی تعلیم اس قوم کی زبان و لغت میں ہوگی، چنانچہ قوم عرب میں سرکارِ دو عالم ﷺ نے براہ راست خود لغت عرب میں تعلیم احکام فرمائی اور قوم عجم میں آپ کے صحابہ و تابعین

۱- سورۃ بقرہ: ۲۳۰۔

۲- سورۃ سبہ: ۲۸۔

۳- سورۃ ابراہیم: ۴۔

نے اور علماء و مشائخ نے ان جمعیوں کی زبان میں، ابلاغ احکام فرمایا، پس جس طریقہ سے لغت عرب میں لفظ ثلاثہ کے معنی و مصداق میں گفتگو ہوگی، ان نصوص کے تابع ہونے کی وجہ سے محض عقلی قیاسات یا تکبیدی نہیں کہلائے گی، بلکہ روایت شرعی و قیاس شرعی ہی کے دائرہ کی چیز ہوگی، اور مستنبط من القرآن والحديث ہوگی، لیکن یہاں پر چند مخالفت پیش کئے جاتے ہیں، ان کا دفع کرنا بھی ضروری ہے، کہا جاتا ہے کہ تم اپنی عقل و قیاس کے گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہو اور احادیث میں صراحت تمہارے قیاس کے خلاف مذکور ہے کہ جب خیر القرون میں کوئی تین طلاق دیتا تھا تو وہ ایک شمار ہوتی تھی تو ہم تمہارے قیاس کو اختیار کریں یا حدیث کو، اس سلسلہ میں پہلی چیز دھوم دھام سے پیش کی جاتی ہے وہ حضرت ابو الصہبا کی روایت ہے کہ جب کوئی شخص طلاق دیتا تھا تو وہ ایک شمار ہوتی تھی، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم غیر مدخول بہ عورت کا ہے، جب کوئی شخص اپنی غیر مدخول بہا کو تین مرتبہ طلاق دیتا تھا تو بے شک اس کو ایک طلاق بائن سے مطلقہ شمار کرتے تھے اور یہ صحیح ہے کہ یہ روایت مبہم اور مجمل ہے اور ابوداؤد شریف میں تصریح ہے کہ یہ حکم غیر مدخول بہ عورت کے لئے ہے۔

”أما علمت أن الرجل كان إذا طلق امرأته ثلاثا قبل أن يدخل بها جعلوها واحدة“ (۱) اور امام ابوداؤد بیڑے درجہ کے محدث اور منہج ثقہ ہیں، وہ اس حدیث پر کوئی جرح نہیں فرماتے ہیں، اس لئے یہ زیادتی ثقہ کی ہوگی، اور معتبر و مقبول اور صحیح ہوگی، نیز مدخول بہ عورت کے لئے چونکہ نص قرآنی: ”إذا نكحتم المؤمنات ثم طلقتموهن من قبل أن تمسوهن فما لكم عليهن من علة تعتدلوها“ (۲) اس پر عدت نہیں ہوتی، وہ طلاق دے گا تو پہلے ہی طلاق پڑنے پر وہ نکاح وعدت سب سے خارج ہو کر شوہر سے بالکل غیر متعلق و آزاد، بلکہ شوہر کے لئے بالکل اجنبی و حرام ہو جائیگی اور دوسری و تیسری بار کی طلاق لغو و بے کار ہو جائے گی اور یہ بالکل ایسا ہے، جیسے کوئی اپنی مدخول بہ عورت کو طلاق رجعی دے تو عدت کے اندر اندر رجعت کر سکتا ہے اور مزید طلاق دینا چاہے تو مزید طلاق بھی دے کر اس کو بائن یا مغلطہ جو چاہے کر سکتا ہے، لیکن جب عدت ختم ہو جائے تو پھر کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، اگر دے تو لغو و بیکار ہو جائے گی یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ عدت باقی نہ رہنے کی وجہ سے کسی قسم کا تعلق و لگاؤ باقی نہ رہا، وہ ہر طرح آزاد و اجنبی ہو گئی جس طرح کسی اجنبی عورت کو طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی، اسی طرح اس کو طلاق دینے سے کوئی طلاق واقع نہ ہوگی، بالکل اسی طرح غیر مدخول بہا کا بھی حکم ہے، لہذا اس حدیث سے تین طلاق کے ایک طلاق ہونے پر استدلال کرنا درست نہ ہوگا۔

۱- ابوداؤد ۲۶۱/۲، حدیث ۲۱۹۹۵، مکتبہ عصریہ بیروت۔

۲- سورۃ احزاب ۳۹۔

دوسری چیز ابن عمرؓ کی روایت پیش کی جاتی ہے کہ انہوں نے حالت حیض میں تین طلاق دی تھیں، ان کو سرکار دو جہاں رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طلاق قرار دیا تھا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے صرف ایک طلاق بحالت حیض دی تھی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رجوع کر لینے کا حکم دیا تھا تین طلاق دینے کی روایت کی تعلیل خود راوی نے بھی کی ہے۔

تیسری چیز محمود ابن لبید کی روایت پیش کی جاتی ہے جس کی تخریج نسائی نے کی ہے کہ ایک شخص کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو یکدم تین طلاق دی ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم غضبناک ہو گئے کہ کیا کتاب اللہ سے کھیل کیا جائے گا در انحالیکہ میں تمہارے اندر موجود ہوں؟ اس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یکدم تین طلاق دینے پر ڈانٹا ہے، اس لئے تین طلاق بیک دم واقع نہ ہونی چاہئیں، یہ استدلال یوں غلط ہے کہ روایت میں کہیں مذکور نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیا تھا، بلکہ چونکہ تین طلاق بیک دم دینا عند اللہ بحد مبغوض ہے، اس لئے آپ نے نکیر فرمائی اور جو تین طلاق اس نے یکدم دیدی تھیں آپ کا اس کو رد نہ فرماں اس کے نفاذ پر تقریر ہو گئی کہ باوجود مبغوض ہونے کے کوئی شخص اس کا ارتکاب کرے گا تو وہ واقع اور نافذ ہو جائیں گی۔

علاوہ ازیں اس روایت کے بارے میں امام نسائی خود تصریح کرتے ہیں کہ یہ روایت مخرمہ ابن بکیر عن ابیہ کے علاوہ کسی اور نے روایت نہیں کی ہے اور مخرمہ ابن بکیر کا اپنے والد بکیر سے ہمارے مشکلم فیہ ہے، لہذا یہ روایت غریب اور مشکلم فیہ ہو کر اس قائل نہ رہی کہ اس کو دوسری صحیح حدیث اور مستند روایات کے مقابلہ میں ترجیح ہو سکے۔

چوتھی چیز حضرت ابو رکانہ کی روایت پیش کی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تین طلاق کو ایک قرار دیا تھا، لہذا ایک دم تین طلاق ایک طلاق ہونا چاہئے۔ یہ استدلال بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ مسلم شریف میں تصریح ہے کہ ابو رکانہ نے طلاق البتہ (جس کو طلاق بتی بھی کہتے ہیں) دیا تھا، لفظ البتہ کے معنی قطع کامل اور کلی انقطاع کے آتے ہیں اور قطع کامل اور انقطاع کلی جس طرح تین طلاق میں ہوتا ہے، اسی طرح ایک طلاق بائن میں بھی ہوتا ہے، لہذا اسی لفظ ”البتہ“ سے دونوں مراد لے سکتے ہیں اور ایک طلاق بائن باعتبار تین طلاق کے کم مبغوض ہوتا ہے اور صحابہ کے ثبایان شان یہی ہے کہ بغضیت کی طرف میلان نہ ہو، اور ایک ہی طلاق بائن مراد لیا ہو، لیکن اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا ہے اور انہوں نے مختلف بیان فرمایا کہ محض ایک طلاق مراد لی تھی، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ایک طلاق بائن کا حکم دیا نہ یہ کہ تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیا یہ کس قدر مغالطہ ہے، مسند احمد ابن حنبل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو رکانہ نے تین طلاق دے دی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک طلاق قرار دے دیا، دھوکہ نہ کھانا چاہئے، اس

لئے کہ یہ واقعہ ابو رکانہ کا نہیں ہے، جیسا کہ محدثین نے اس کی تصریح کی ہے (کمانی المبدل)۔

بلکہ رکانہ کا ہے اور حضور ﷺ نے رکانہ کی تین طلاق کو ایک طلاق قرار نہیں دیا ہے، راوی کو وہم اور خلط ہو گیا ہے اور اس خلط کو اس طرح نقل کر دیا، جیسا کہ متقدمین محدثین نے اس کی تصریح کی ہے اور توضیح کی ہے (کمانی المبدل)، اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی اس لئے کہ مسند احمد کی اس سند سے مسلم کی یہ سند زیادہ قوی ہے، اور مضبوط ہے اس کے مقابلہ میں، لہذا اس سند اور اس سند کی روایت کو ترجیح نہ ہوگی اور مسلم کی روایت میں امام نووی کا فیصلہ ہے کہ ابو رکانہ نے تین طلاق صریح نہیں دی تھیں، بلکہ طلاق البتہ دی تھیں اور اس پر ساری گفتگو پہلے گزر چکی ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ اسی طرح کا واقعہ حضرت رکانہ کا بھی ہے کہ انہوں نے بھی تین طلاق دی تھیں اور حضور ﷺ نے اس کو ایک قرار دیا تھا تو یہ بھی قائل تسلیم اور صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اولاً تو یہ روایت مجاہل کی ہے جو ہر گز صحاح کے مقابلہ میں قائل استناد نہیں ہے، ثانیاً اگر تعدد کی بنیاد پر تسلیم بھی کر لیا جائے تو کسی راوی نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ان کی تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیا ہو، اس لئے یہ بات کہ تین طلاق ان روایات سے ایک شمار ہوں کسی طرح صحیح نہیں۔

پانچویں چیز یہ کہی جاتی ہے کہ قرآن پاک کے ”الطلاق مرتان فامساک بمعروف أو تسريح باحسن“ (۱) کے سیاق و سباق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تین طلاقیں تین وقت میں اور تین مجلس میں دے تو تین طلاق کا حکم ہوگا اور حرمت مغلطہ ہوگی، ورنہ نہیں، یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ ”الطلاق مرتان“ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دو طلاق دو مرتبہ دو وقت میں دے، پھر جب اس کے بعد فان طلقھا وارد ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ تیسری طلاق تیسرے وقت اور تیسری مجلس میں ہونا چاہئے، یعنی آگے پیچھے ہونا چاہئے بیک وقت بیک مجلس و بیک زبان نہ ہونا چاہئے، پس اگر کوئی شخص ایک ہی وقت میں، ایک مجلس میں یا ایک ہی مرتبہ میں تینوں طلاق دیدے تو تین طلاق واقع نہ ہوں گی، بلکہ اس کا حکم اس آیت میں داخل ہی نہ ہوگا۔

یہ دلیل محض بے بنیاد اور انوکھی ہے، اس دلیل کا تقاضا تو یہ ہے کہ دو طلاق رجعی بھی اس وقت واقع ہونا چاہئے، جب کہ وہ دو وقت اور دو مجلس میں دے اور اگر ایک ہی مرتبہ میں دو طلاق دے دے تو رجعی نہ ہونا چاہئے، بلکہ محض ایک ہی طلاق رجعی ہونی چاہئے، یا بالکل نہ ہونی چاہئے، حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں، پھر اس کے علاوہ یہ حدیدہ ترجمانی جمہور صحابہ و تابعین جمہور ائمہ اربعہ میں سے کسی کے ذہن میں نہیں آئی جو زمانہ خیر القرون میں ہونے کے ساتھ جس طرح کتاب و سنت

کے معاملہ میں محقق و امام تھے، اسی طرح لغت عرب و معارف عرب کے جاننے میں بھی امام مسلم تھے اور آج تو اس زمانہ میں جس کو شرائع و احکام بھی کہنا بے محل نہ ہوگا اور کہنے والا ان حضرات مذکور میں کسی درجہ کا محقق یا امام تو ہرگز نہیں ہے۔

چھٹی چیز: جو بڑے زور و شور سے بیان کی جاتی ہے وہ حضرت ابن عباسؓ کا اثر ہے جس میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں اور حضرت صدیق کے زمانہ اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ میں تین طلاق ایک طلاق شمار ہوتی تھی، مگر لوگ کچھ جلدی اور بے احتیاطی کرنے لگے، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اب لوگ کچھ جلدی اور بے احتیاطی کرنے لگے، اس لئے ضرورت ہے ہم لوگ (مجتہدین صحابہؓ) تین طلاق کو تین ہی مانیں اور تین ہی نافذ کریں (یہ مشورہ فرمایا اور مشورہ کے بعد) تین نافذ کر دیا۔

اس اثر سے استنباط کرتے ہیں کہ تین طلاق دینے میں ایک طلاق ماننا اصلی مشکوٰۃ نبوت سے متفق علیہ طریقہ پر براہِ چارہ آ رہا تھا، اور ایک طلاق کے وقوع کا حکم برآمد دیا جاتا تھا، مگر حضرت عمرؓ نے کسی عارض کی وجہ سے تین طلاق مان لیا اور تین نافذ کر دیا۔

یہ استدلال صحیح نہیں اس میں پوری بات مذکور نہیں، اس لئے کہ اس اثر میں خود اشارہ موجود ہے کہ لوگ کچھ جلدی کرنے لگے اور بے احتیاطی کرنے لگے، لہذا جب تک وہ جلدی اور بے احتیاطی واضح نہ ہو جاوے کہ کیا تھی اور پوری بات سامنے نہ آئے، محض اس اثر سے جس میں محض جزوی بات مذکور ہو استنباط یقیناً نامکمل و ادھورا رہے گا۔

پوری بات یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں جب کوئی اپنی بیوی کو طلاق دیتا تھا تو رجعت کرنے میں دوسروں کے اعتبار سے زیادہ مستحق سمجھا جاتا تھا، اگرچہ تین سے زیادہ طلاق بھی کیوں نہ دیا ہو، بلکہ بہت سے لوگ عورتوں کو پریشان کرنے اور انہیں معلق رکھنے کے لئے مسلسل طلاقیں دیتے اور رجوع کر لیتے تھے، اور اس کے حقوق ادا نہ کرتے تھے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ”الطلاق موتان“ کی آیت کریمہ ”فلان تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجاً غیرہ“ (۱) تک نازل فرما کر تین طلاقیں دینے کے بعد رجعت کر دینے سے قطعاً روک دیا، بلکہ یہ حکم دیدیا کہ اس معاملہ میں عورت کی مرضی کو بھی دخل رہے گا اور وہ بھی اس قید کے ساتھ کہ عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہواں سے مباشرت اور وطی کے بعد تفریق یا طلاق ہو چکی ہو اور پھر عورت قاعدہ شرعی کے مطابق اس کی زوجہ بنے، جیسا کہ حضرت عکرمہؓ خود حضرت ابن عباسؓ سے نقل فرماتے ہیں:

”عن عکومة عن ابن عباس قال: والمطلقات يتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء، ولا يحل لهن أن يكمن ما خلق الله في أرحامهن - الآية، وذلك أي نزول هذه الآية أن الرجل كان في الجاهلية وبعده الإسلام إذا طلق امرأته فهو أحق برجعها وإن طلقها ثلاثاً ذاك فقال: ”الطلاق مرتان“ (الآية)“ (۱)۔

اس آیت کریمہ: ”فلا تحل له من بعد الخ“ میں ایک سرزنش کا پہلو بھی معلوم ہوتا ہے اور صحابہ کرام کل کے کل عدول تھے ان کی شان میں ”اصحابی کالنجوم بأبہم اقتديتم اھديتم“ وارد ہے، ان کے بارے میں یہ شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بغیر کسی شرعی وجہ یا داعیہ کے اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد تین طلاق کے قریب بھی جاتے رہے ہوں، تین طلاق کے بعد پھر رجعت کر لیا اور پریشان کرنا یا مطلق چھوڑے رکھنا تو بڑی بات ہے، بالخصوص جب کہ لفظ طلاق ہی کو ”ابغض المباحات“ فرمایا گیا اور اگر کبھی احیاناً کسی صاحب سے تین طلاق صادر ہو گئی تھیں تو دربار نبوت سے سخت قسم کی سرزنش اور سخت غضب نامی کا اظہار بھی فرمایا گیا ہے، جیسا کہ محمود ابن لبید کی روایت وارد ہے:

”قال أخبر رسول الله ﷺ عن رجل طلق امرأته ثلاث تطليقات جميعاً فقام غضبان، ثم قال: أيلعب بكتاب الله وأنا بين أظهركم“ (۲)، حتی قام رجل وقال: يا رسول الله! ألا أقتله (بذل الجہود)۔ ان تو بیخوں اور تہدیدوں کے سننے کے بعد صحابہؓ کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ عام طور سے تین طلاقوں کے دینے میں عجلت یا بے احتیاطی کرتے ہوں گے۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ صحابہ کی مراد ونیت محض ایک طلاق دینے کی رہی ہو، مگر کسی مصلحت کے پیش نظر بہ نیت تائید تین بار لفظ طلاق بول دیں اور کہیں کہ میری نیت محض ایک طلاق کی تھی اور تین بار لفظ طلاق کو محض تائید کی نیت کے لیے کہہ دیا ہے، تو ان کی عدالت و دیانت و تقویٰ و امانت کے پیش نظر تصدیق کر لی جاتی ہے، جیسا کہ حدیث رکاتہ میں جنہوں نے طلاق البتہ دے دی تھی جس سے تین طلاق اور ایک طلاق دونوں کا احتمال تھا یا دونوں مراد لیا جاتا تھا تو سرکارِ دو جہاں نے ان سے حلف لے کر کہ تمہاری مراد کیا تھی ایک کی تھی یا تین کی۔ حضرت رکاتہ نے جواب میں کھلف بیان فرمایا کہ میری مراد صرف ایک طلاق کی تھی تو حضور ﷺ نے ایک ہی طلاق قرار دی اور یہی طلاق رکاتہ قمر ظی نے دی اور ایک طلاق کی نیت نہیں کی تو اس کو ایک طلاق نہیں قرار دیا گیا، بلکہ تین طلاق اور حرمت معلظہ اور موجب حال قرار دیا گیا، اسی طرح عویمر عجلانی نے لعان والے واقعہ میں سرکارِ دو جہاں کے سامنے تین طلاق دیدیں اور حضور ﷺ نے اس کو نافذ فرما دیا۔

۱- ابو داؤد ۲۵۹۲، حدیث ۲۱۹۵، مکتبہ عصر بیروت۔

۲- الدر المنثور ۱/ ۵۰۳، دار الکتب العلمیہ بیروت۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو تین طلاق کو ایک طلاق ماننے والے بڑے زوردار طریقے سے پیش فرماتے ہیں ہرگز اس مقصد کے لئے پیش کرنا صحیح نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ ”الطلاق مرتان“ کی آیت کریمہ کے شان نزول کو بتلاتے ہوئے اس بات کو فرما چکے ہیں کہ تین طلاق دینے کے باوجود جو حق رجعت طلاق دینے والا اپنے لئے سمجھتا تھا وہ اس آیت کریمہ: ”الطلاق مرتان“ کے نزول سے مستنوخ کر دیا گیا اور تین طلاق کو ایک ٹاپت کر نیوالوں کا مقصد اور مدعا یہی ہے کہ تین طلاق دینے والوں کو بھی حق رجعت ملنا چاہیے، کس قدر متضاد بات ہے، ایسی متضاد بات وہ لوگ ہرگز نہیں فرما سکتے، بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ ”الطلاق مرتان“ کے نزول کے بعد لوگ محض ایک طلاق کی نیت سے طلاق دیتے تھے اور محض تاکید کے لئے لفظ طلاق تین بار بول دیتے تھے اور چونکہ اس وقت دیانت کا غلبہ تھا، بہت کم ارتکاب بھی کرتے تھے، اس لئے لفظ طلاق تین بار بولنے کے باوجود ان کے بیان کی تصدیق کر کے دینا نہ ایک طلاق کا حکم دے دیا جاتا تھا، لیکن جب تغیر احوال رونما ہونے لگا اور لوگ اس میں کثرت سے مبتلا ہونے لگے تو حضرت عمر فاروق کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ مبادا کوئی شخص محض ایک طلاق کی نیت کے بغیر یا تین ہی طلاق کی نیت سے تین بار طلاق دے کر محض ایک طلاق کی نیت کا اظہار کر دے اور ہم ایک طلاق تسلیم کر لیں، تو کتنے بڑے حرام کام میں مبتلا ہو جائے گا اور اس اندیشہ کو صحابہ کرامؓ سے ظاہر فرما کر مشورہ لیا اور فرمایا کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دریافت کا معاملہ تو الگ ہے، صاحب معاملہ خود اس کا ذمہ دار ہوگا، لیکن جب یہ معاملہ ہمارے پاس (یعنی عند القضاء) آجائے تو ہم تین طلاق کو ایک طلاق تسلیم نہ کریں، بلکہ تین ہی کا حکم دیں اور جب یہ حکم سب پر ظاہر ہو جائے گا تو لوگ پھر طلاق دینے کا ارتکاب بھی کم کریں گے، اور احتیاط بھی کریں گے، اس مشورہ کے بعد جب لوگوں نے موافقت ظاہر کر دی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تین بار لفظ طلاق بولنے پر قضاء تین ہی طلاق کا حکم دینا شروع فرمادیا اور دیگر صحابہ نے بھی اس فیصلہ کو مان لیا۔

خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی اس کے بعد تین بار لفظ طلاق بولنے کے بعد بھی تین طلاق کے واقع ہونے کا حکم دینا شروع فرمادیا، جیسا کہ ابو داؤد شریف میں صحیح سند کے ساتھ حضرت مجاہد کے طریق سے مروی ہے کہ حضرت مجاہد نے فرمایا، میں حضرت ابن عباس کے پاس موجود تھا:

” (مجاہد) قال: كنت عند ابن عباس فجاء رجل فقال: إنه طلق امرأته ثلاثا فسكت حتى ظننت أنه سيردها إليه فقال: ينطق أحدهم فيركب الحمرة ثم يقول: يا ابن عباس: يا ابن عباس: إن الله قال: الطلاق مرتان إلی قوله فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره۔ الآية عصيت ربك بانك

منک امراتک“ (۱)۔

(ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی ہیں، یہ سن کر ابن عباسؓ کچھ دیر خاموش رہے، یہاں تک کہ ٹھکود خدشہ ہوا کہ وہ اس کی بیوی کو ایک طلاق قرار دے کر اس کے پاس ہی لوٹا دیں گے، لیکن کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا، خود حماقت پر سوار ہوتا ہے، پھر یا ابن عباس یا ابن عباس کرنے لگتا ہے (سن لو) اللہ کا ارشاد مطلق ہے ”الطلاق مرتان..... فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ“ پڑھ کر فرمایا کہ اب تیری بیوی تجھ سے جدا ہوگئی، تیرے نکاح سے نکل گئی) ظاہر ہے کہ یہ حکم صرف ایک طلاق کے وقوع میں نہیں ہوتا، معلوم ہوا کہ تین طلاق ہی مانڈ فرمائیں، چنانچہ حضرت ابن عباس کے تقریباً تمام ارشد و ائمہ ان کا یہی فتویٰ نقل فرماتے ہیں کہ وہ تین طلاق کو تین ہی قرار دیتے تھے، اور تین ہی طلاق واقع ہونے کا حکم فرماتے تھے، بلکہ صاحب ”استدکار“ نے تو بہت صاف لفظوں میں اس کی تصریح کر دی ہے کہ تین طلاق کے ایک طلاق ہونے کی روایت جیسا کہ ابن عباس کی طرف منسوب ہے وہ بالکل غلط اور وہم ہے، کسی عالم محقق نے اس کا اعتبار نہیں کیا ہے (۲)۔

اسی طرح امام مالک نے بھی مؤطا میں فرمایا ہے: ”بلغه (أي مالک) أن رجلاً قال لعبد الله ابن عباس إني طلق امرأتی مائة تطليقة فماذا تری! فقال ابن عباس: طلق منک ثلاثاً وسبع وتسعون اتخذت بها آیات الله هزوا“ (۳)۔

(ایک شخص نے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو مرتبہ طلاق دیدی ہیں آپ میرے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا کہ تیری بیوی تین طلاق سے مطلقہ ہوگئی اور ۹۷ بار مزید لفظ طلاق بول کر تو نے اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا، اور اس کا کھیل بنالیا) یہ سب کو معلوم ہے کہ امام مالک کے بلاغات بھی، خواہ ان کی وہ سند ذکر نہ فرماویں، مگر وہ متصل السند اور صحیح ہوتے ہیں، اس لئے اب ان تصریحات کے بعد کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس اجماع کے منعقد ہو جانے کے بعد بھی حضرت ابن عباس بیک مجلس تین طلاق کو ایک ہی طلاق فرماتے تھے، یہ بات متضاد و متعارض ہو جائے گی، بلکہ اگر اس پر ضد کی جائے تو حضرت ابن عباس پر صریح اہتمام کے مرادف بھی ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اگر زمانہ مشکوٰۃ نبوت سے لے کر ابتدائے زمانہ عمر تک کتاب و سنت کا عام حکم یہی مان لیا جائے کہ

۱- ابوداؤد ۲۶۹-۲۶۱، حدیث ۵: ۲۱۹۷، مکتبہ عصر بیروت۔

۲- الجوامع ۱۱۳۔

۳- أوجز علی الموطأ ۵/۱۰۔

تین طلاق بیک مجلس ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھی، لیکن حضرت عمرؓ نے اسی ایک طلاق کو تین قرار دیا تو غور کیجئے کہ کس قدر خطرناک بات ہوگی؟ حضرت عمرؓ کے دبدبہ و رعب کے باوجود ایک معمولی درجہ کے صحابی بھی اگر کتاب و سنت کے خلاف کوئی بات دیکھتے تھے بر ملا لومۃ لائم کے خوف کے بغیر حضرت عمرؓ کے منہ پر ظاہر فرما دیتے تھے، اس کی بہت سی مثالیں کتابوں میں مذکور ہیں، پھر یہ کیسے عقل باور کر سکتی ہے کہ اتنا بڑا اور حرمت و عزت کا حامل مسئلہ کتاب و سنت کے خلاف اس طرح بر ملا تمام اجل صحابہ کے سامنے طے ہو جائے اور کوئی خلاف نہ کرے، بلکہ انہما را بعد کا مسلک وہی ہو جائے جس پر حضرت عمرؓ نے اجماع منعقد کیا، بلکہ جمہور صحابہ اور جمہور تابعین و جمہور ائمہ کا یہی مذہب ہو جائے کہ ایک مجلس میں تین طلاق بھی تین ہی شمار ہوں گی، ایک طلاق شمار نہ ہوگی، جیسا کہ امام ابن ہمام نے فتح القدیر میں نقل فرمایا ہے:

”ذهب جمهور الصحابة والتابعين ومن بعدهم من ائمة المسلمين الى انه يقع ثلاثاً“ (۱)۔

اسی طرح طبقہ صحابہ کے بعد طبقہ تابعین میں حضرت طاؤسؓ کا نام لیا جاتا ہے کہ وہ بیک مجلس تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیتے تھے، یہ بھی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ علی ابن مدینی کے ارشد تلمیذ حسین ابن علی کراہت کی جانب سے اس کی تردید نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”روى حسين ابن علي ابن الكرابيتي في كتاب أدب القضاء قال: اخبرنا علي ابن عبد الله وهو ابن الصليبي عن عبد الرزاق عن معمر عن طاؤس أنه قال: من حدثك عن طاؤس أنه كان يروي طلاق الثلاث واحداً كذبه“۔

(ہم کو ابن مدینی نے خبر دی اور ابن کوا عبد الرزاق نے خبر دی اور ابن کوا ابن طاؤس نے اور ابن کوا خود طاؤس نے خبر دی اور متنبہ کیا کہ جو تم سے میرے بارے میں یہ کہے کہ وہ تین طلاق ایک طلاق سمجھتے تھے اس کی تکذیب کرنا تسلیم مت کرنا، جھٹا دینا)۔

ابھی ہم جوہر نفی سے صاف استدکار کا فیصلہ نقل کر چکے ہیں کہ بیک مجلس تین طلاق کو ایک طلاق ماننے کی روایت کسی محقق کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہے، بالکل اسی طرح دارقطنی کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ جو شخص بھی اپنی عورت کو تین طلاق مبہم طور پر (خواہ بیک لفظ یا بالفاظ متعدد) دے گا یا تین طلاق کا اقرار، خواہ بیک لفظ یا بالفاظ متعدد کرے گا اس کی عورت اس کے لئے حلال نہ رہے گی، یہاں تک کہ وہ حسب قاعدہ شرعیہ کسی دوسرے شخص سے حلال نہ کر چکی ہو۔

”ایما رجل طلق امرأته ثلاثاً مبہمة أو ثلاثاً عند الإقرار فلا تحل له حتی تنکح زوجاً غیرہ“ (۱)۔
 ان ہی باتوں سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ طہقہ تا بعین کے بعد بھی بعض علماء کی طرف بیک مجلس تین طلاق کے ایک طلاق ہونے کا جوا نسب ہے وہ واقعیت یا حقانیت یا صداقت سے بہت دور ہے، ممکن ہے کہ یہی سب وجوہ و اسباب ہوں کہ جب علامہ ابن قیم نے اپنے استاد ابن تیمیہ کی اتباع میں تین طلاق کو ایک قرار دے کر اس پر دلائل فراہم کئے تو ان کے تلامذہ میں سے ارشد تلامذہ ابن رجب نے اپنے استاذ کے اس دعوے کی نہایت شد و مد کے ساتھ اور بہت زوردار طریقہ پر تردید کی اور ایک مجلس کی تین طلاق کو تین قرار دیا، اس لئے کہنا پڑے گا کہ یا تو کتاب و سنت کا یہ مسئلہ ہی نہیں کہ بیک مجلس تین طلاق ایک طلاق ہو یا اگر تھا تو اس کے نسخ کی کوئی قوی دلیل ان سب کے پاس خود موجود تھی چنانچہ حضرت عبادہ ابن صامت کی روایت بھی اس پر کھلی دلیل ہے کہ سرکارِ دو جہاں نے خود ایک مجلس کی تین طلاق اور تین طلاق سے زائد طلاق کو تین ہی طلاق قرار دیا ہے، حضرت عبادہ ابن صامت کی روایت کو حضرت امام ابن ہمام فتح القدیر میں اس طرح فرماتے ہیں:

”وأسند عبد الرزاق عن عبادہ ابن صامت أن أباه طلق امرأته ألف تطليقة فانطلق عبادة إلى رسول الله فقال رسول الله ﷺ: بانت بثلاث في معصية الله تعالى، وبقيت تسعمائة وسبع وتسعون علواناً وظلماً إن شاء عليه وإن شاء غفر له (۲)۔“

(عبد الرزاق نے اپنی باقاعدہ سند کے ساتھ عبادہ ابن صامت سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبادہ کے والد نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دے دیں تو حضرت عبادہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ نقل کر کے حکم معلوم فرمایا، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان کی بیوی ان کے نکاح سے تین طلاق کے ساتھ خارج ہو گئی اور وہ معصیت خداوندی میں مبتلا ہو گئے اور نو سو ستائیس طلاقیں ظلم اور زیادتی ہو کر صادر ہوئیں، اب اللہ کی مرضی ہے کہ چاہے تو وہ ان کو عذاب دے، چاہے معاف کر دے)۔

صاحب بحر نے بھی اس روایت کی توثیق کی اور قائل استناداً قرار دیکر ایک مجلس کی تین طلاق کو تین طلاق شمار کرنے کے موقع میں پیش کیا ہے فرماتے ہیں: ”روى عبد الرزاق عن عبادہ ابن صامت مرفوعاً انه عليه السلام قال: بانت بثلاث في معصية الله“ (۳)۔

۱- دار الفکر -

۲- فتح القدیر، کتاب الطلاق ۳/ ۵۲۔

۳- البحر الرائق ۳/ ۳۳۔

(عبدالرزاق نے حضرت عبادہ ابن صامت سے مرفوعاً نقل فرمایا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت میں تین طلاق سے جدا ہوگئی)۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ کے شیوع کا عموم نہ ہوا ہو۔ عام طور سے لوگوں کو اس کا علم نہ ہوا ہو اور یہ بھی وجہ اشتباہ بنا ہوا ہو اور انہی وجوہ سے حضرت عمرؓ کو مذکورہ بالا اندیشے پیدا ہوئے ہوں اور انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کا تذکرہ فرمایا ہو اور سب نے ان کی رائے سے اتفاق کر لیا ہو اور پھر اس حکم کی اشاعت ہوگئی ہو۔

اس تقریر کے مطابق نسخ ماننے کی حاجت ہوتی ہے اور نہ اجماع پر مدار ہوتا ہے، بلکہ محض حکم نبوی ﷺ کے اشاعت کا اہتمام نمایاں ہوتا ہے، ساتھ ہی محض ایک مجلس کی تین ہی طلاق نہیں، بلکہ ہم واحد تین طلاق یا تین طلاق سے زائد طلاق کا بھی تین طلاق ہونا واضح ہو گیا اور عبادہ ابن صامت کا لفظ: ”ان اباء طلق امراته الف تطليقات“ صریح دال ہو گیا کہ ہم واحد بھی متعدد طلاقیں متعدد ہوں گی، نہ کہ محض ایک۔

غرض اگر ان باتوں کو تسلیم نہ کیا جائے تو چھوٹے بڑے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شخصیت و دیانت مجروح ہوتی ہے جس سے ان تمام سے یکسر اعتماد غائب ہو جائے گا۔ اور پھر اس کا اثر کتاب و سنت یا پورے دین پر جہاں تک غلط طریقہ سے پہنچے ظاہر ہے۔ اس لئے دفع تضاد کی وہی صورت متعین ہوتی ہے جو احقر نے اوپر تفصیل سے لکھی ہے اور اسی وجہ سے محققین علماء و مشائخ نے لکھا ہے کہ اجماع صحابہ خود حجت قطعیہ کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے متعدد ہو جانے اور ثابت ہو جانے کے بعد ایک مجلس کی تین طلاق کے منکر پر رد کرنے میں مشغول ہونے کی حاجت نہیں ہے، اس لئے یہ قول اجماع اور جہ شرعی کے مخالف ہے، اور اسی وجہ سے اگر کوئی حاکم (یا قاضی یا مفتی) ہم واحد کی تین طلاق کو ایک طلاق قرار دے تو اس کا حکم نافذ ہی نہ ہوگا، اس لئے کہ حجت شرعی (اجماع) کی مخالفت ہے، محض اختلاف نہیں ہے، اس کو اختلاف سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے، اس میں اجتہاد کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

”ولا حاجة أى الاشتغال بالأدلة على رد قول من أنكر وقوع الثلاث جملة، لأنه مخالف للإجماع كما حكاہ فى المعراج ولنا قالوا: لو حكم حاكم بأن الثالث بنفم واحد واحدة لم ينفذ حكمه؛ لأنه لا يسوغ فيه الاجتهاد، لأنه خلاف لا اختلاف“ (۱)۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ فقہی جزئیات اور تفصیلات کو اور ائمہ اربعہ کے اصول استنباط کو جو مجمع علیہ ہیں، پس پشت ڈالنے کا نتیجہ ہے کہ ان کو ناہیوں میں اتلائے ہو گیا، اگر فقہاء کی تفصیلات و بیان کردہ جزئیات اور

اصول استنباط کی اتباع سے قطع نظر کر لیا جائے تو ہم میں سے کوئی اس درجہ پر نہیں ہے کہ کتاب و سنت کو بغیر واسطہ ائمہ کے کما حقہ سمجھ کر اس سے صحیح استنباط کرے، اگر ہم نے ان کے جزئیات کے اصول و ضوابط اور تفصیلات سے قطع نظر کر کے سوچنا اور سمجھنا شروع کر دیا تو بدراہی کے شکار ہو جائیں گے اور دین کو ایک کھلوٹا بنا کر رکھ دیں گے، جس طرح اہم سابقہ اور دیگر مذاہب ساموی کے ماننے والے اور مدعیان بتلا ہو گئے اور یہی وہ مرض مہلک ہے جس کی طرف بہت سی صحیح احادیث اور مسلم ارشاد نبوی میں ارشاد رہے ہیں، بلکہ مستقل اور زبردست وعیدیں اور نکیریں مذکور ہیں۔

پہلا نکتہ: جو ایک لے کے تحت درج ہے:

ایک مجلس کی تین طلاق کے معاملہ ہونے کا مسئلہ اجماعی اور قطعی نہیں ہے، بلکہ اس کی حقیقت بھی ان سابق بیانات سے خود بخود واضح ہو گئی کہ اس کے بارے میں یہ کہنا کہ ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاق معاملہ ہونے میں سلف ہی کے زمانہ سے اختلاف موجود ہے، یا یہ مسئلہ اجماعی اور قطعی نہیں بالکل ناقابل تسلیم و غیر صحیح ہے اور زائد تفصیل آگے آتی ہے کہ اس اختلاف کا نام اختلاف نہیں ہے، بلکہ خلاف اجماع اور خلاف حجت شرعیہ اور خلاف حق ہے اور خلاف حق کا جو درجہ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے، اسی اجماع کے منکر کے بارے میں علامہ بدر الدین عینی شارج بخاری، ائمہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے ذیل کے الفاظ نقل فرماتے ہیں: ”وقال من خالف فيه فهو شاذ مخالف لأهل السنة وإنما تعلق به أهل البدع ومن لا يلتفت إليه لشذوذه من الجماعة التي يجوز عليهم التواطؤ على تحريف الكتاب والسنة“ (۱) اور پھر اسی جلد اور صفحہ میں اس طرح رقم طراز ہیں:

”وذهب جماهير العلماء من التابعين ومن بعدهم منهم: الأوزاعي، والنخعي، والثوري، وأبو حنيفة، وأصحابه، والشافعي، وأصحابه، وأحمد، وأصحابه، وإسحاق، وأبو ثور، وأبو عبيدة وآخرون كثيرون على أن من طلق امرأته ثلاثا وقعن ولكنه يائس“ (۲) اور اسی مسئلہ کو علامہ ابن عابدین نے اپنے ان الفاظ میں نقل کیا ہے اور بعض حنابلہ کی اس توجیہ و قول کو جس کو انہوں نے اس اجماع کے خلاف میں نقل کیا ہے باطل و غلط قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں: ”وأما إمضاء عمر الثلاث عليهم مع عدم مخالفة الصحابة وله وعلمه بأنها كانت واحدة فلا يمكن إلا وقد اطلعوا في الزمان المتأخر على وجود ناسخ أو لعلمهم بانتهاء الحكم

۱- عینی شرح بخاری ۵۲۷/۹۔

۲- عینی شرح بخاری ۵۳۷/۹۔

لذلك لعلمهم باناطته بمعان علموا انتفاءها في الزمن المتأخر وقول بعض الحنابلة: توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم عن مائة الف عين رآته فهل صح لكم عنهم أو عن عشر عشر عشرهم القول بوقوع الثلاث باطل، أما أولا فإجماعهم ظاهر، لأنه لم ينقل عن أحد منهم أنه خالف عمر حين أمضى الثلاث ولا يلزم في نقل الحكم الإجماعي عن مائة الف تسمية كل في مجلد كبير لحكم واحد على أنه إجماع سكوتي، وأما ثانيا فالعبرة في نقل الإجماع نقل ما عن المجتهدين والمائة الف لا يبلغ عدة المجتهدين الفقهاء منهم أكثر من عشرين كالخلفاء والعبادلة وزيد ابن ثابت و معاذ ابن جبل وأنس وأبي هريرة والباقيون يرجعون اليهم ويستفتون منهم وقد ثبت النقل عن أكثرهم صريحا بإيقاع الثلاث ولم يظهر لهم مخالف، فما ذا بعد الحق إلا الضلال، وعن هذا قلنا: لو حكم حاكم بأنها واحدة لم ينفذ حكمه؛ لأنه لا يسوغ الاجتهاد فيه فهو خلاف لا اختلاف، وغاية الأمر فيه أن يصير كبيع أمهات الأولاد أجمع على نفيه، وكن في الزمن الاول يبعن (۱)۔

انہی وجود کی بناء پر حق نے شروع میں کہا تھا کہ اس سمینار کو کل بند سمینار کہنا غلط ہے اور ناقابل تسلیم ہے، لہذا مسلمانوں کو اس سے ہرگز دھوکہ میں نہ آنا چاہیے، ہاں صحیح مسائل کی ترویج اور تین طلاق دینے کی مہفوضیت اور بوقت ضرورت طلاق کے مسنون اور بہتر طریقہ کی تشہیر اور ترویج و تعلیم جس قدر زیادہ اور مؤثر انداز میں ہو پوری قوت سے کرنی ضروری ہے، بلکہ وقت ایسا ہے کہ یہی نہیں اور دیگر عقائد اور اعمال و معاملات کی شرعی تعلیم و ترویج و ترغیب میں بھی انتہک سعی و کوشش کرنی اور انتظام بنانا اور چلانا ضروری ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/ ۱۱/ ۱۳۹۳ھ

ایک مجلس کی تین طلاق:

ایک شخص نے اپنی عورت کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیدی، آیا طلاق حکم اللہ اور حکم رسول سے ہوگئی یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

مدخول بہا کو جب شوہر نے تین طلاقیں دیدیں تو تینوں واقع ہو کر طلاق مغلطہ ہوگئی، خواہ ایک ہی مجلس میں دی ہوں، اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

کما فی العالمگیریہ ۲/۶۷۳ ”وإذا قال لامرأته أنت طالق وطالق وطالق ولم يعلقه بالشروط إن كانت مدخولة طلقت ثلاثاً وإن كانت غير مدخولة طلقت واحدة“ (۱)۔

ہاں اگر عورت غیر مدخول بہا ہے یعنی ان میاں بیوی میں یکجائی نہیں ہوئی ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر ثلاثا یا اس الفاظ طلاق دیا ہے (میں نے تجھ کو تینوں طلاقیں دیں) جب تو تین واقع ہوں گی، ورنہ محض ایک طلاق بائن واقع ہوگی کما ہو ظاہر (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید محمود علی عنہ

گواہوں کے سامنے تین طلاق دی تو کیا حکم ہے؟

مسمی کریم اللہ نے اپنی منکوحہ کو اپنی حقیقی بھانج اور اتبیر خان کے سامنے تین طلاق دیا جسکی وجہ دو مقامی خانگی جھگڑا بی بی اور مردکا ہے اسکی شہرت منکوحہ نے اپنی زبان سے چند آدمیوں سے اپنے موضع میں کیا اس واقعہ کے بعد منکوحہ مرد کے گھر میں ایک ماہ تک ٹھہری رہی مگر مرد یعنی کریم اللہ بی بی سے قطعی طور پر قطع تعلق کر کے الگ رہتا تھا، ایک ماہ بعد کریم اللہ کی بی بی اپنے بچوں کو لے کر اپنے میکہ حبیب پور چلی گئی اور چھ ماہ سے اوپر ہو رہا ہے کہ میکہ میں قیام پذیر ہے، لڑکی یعنی کریم اللہ کی بی بی کے وارثان کی جانب سے پیشتر مہر مانگا گیا اور کہا گیا کہ اپنے بچے کو لیجاؤ، اس کو طے کرنے جب کریم اللہ جاتا ہے تو اب یہ کہا جاتا ہے کہ طلاق نہیں ہوا ہے، بی بی کو منع بچوں کے لیجاؤ، اس لئے عرض ہے کہ بروئے شرع محمدی جو مسئلہ صادق آتا ہو تحریر فرماویں کہ کیا وہ طلاق جائز کہ ناجائز ہے بیٹھا تو حروا۔

۱- الفتاویٰ الہندیہ ۱/ ۵۵، مکتبہ رشیدیہ پاکستان۔

۲- ”إذا طلق الرجل امرأته ثلاثاً قبل المدخول بها ولعن عليها فإن فرق الطلاق بالت بالاولیٰ ولم تقع الغایة والغالۃ“ (الفتاویٰ الہندیہ ۱/ ۳۷۳، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

الجواب وبالله التوفيق:

کریم اللہ نے جب تین طلاقیں دیدیں اور اسکے گواہ بھی موجود ہیں اور خود عورت کو بھی اقرار ہے تو اب بعد میں انکار کسی طرح جائز نہیں، اب تین طلاقیں واقع ہو کر حرمت مغلطہ ہوگئی، اب بغیر حلالہ کے کریم اللہ کے لئے کسی طرح جائز نہیں ہو سکتی اور نہ کریم اللہ اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں، حلالہ یہ ہے کہ کریم اللہ کے طلاق کے بعد عدت (تین حیض) گزرنے پر عورت کا کسی دوسرے مرد سے نکاح ہو اور وہ اس سے ہم صحبت ہونے کے بعد فوت کر جائے یا کسی وجہ سے طلاق دیدے اور وہ عورت اپنی یہ عدت بھی گزارے تو اب کریم اللہ سے جدید نکاح کرنے کے بعد حلال ہو سکتی ہے بغیر اس کے نہیں ہو سکتی (۱)، نفقہ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح محمود علی عمنہ

تین طلاق دینے والے پر مالی جرمانہ اور اس کی تعزیر کا حکم:

موجودہ کورٹ نے مسلم پرسنل لا کے خلاف جو قانون بنایا ہے کہ مطلقہ پوری زندگی یا دوسرے نکاح تک نفقہ کی حقدار ہے، اس قانون سے بہت سی مسلمان خواتین بھی غلط فائدہ اٹھا رہی ہیں چنانچہ ہماری طرف سورت اور احمد آباد کی کورٹ میں اس قسم کے سیکڑوں مقدمے (کیس) داخل کئے گئے ہیں اور کتنی عورتوں کے لئے فیصلہ بھی کر دیا گیا ہے، جب عوام کو مقدمہ اور مسلم وکلاء کو تعاون سے روکا جاتا ہے تو اعتراض کرتے ہیں کہ ان مظلومات کے نفقہ کا کیا ہوگا؟ کیا ان کو بھکارن بنا دی جائے گی؟ جبکہ بعض عورتیں بچوں یا کسی دوسری وجہ سے دوسرے نکاح کے قائل بھی نہیں ہے، اور ان کے اقرباء اس حالت میں نہیں ہوتے کہ ان کا نفقہ برداشت کر سکیں اب ایسی تنگ دستی میں وہ مطلقہ کورٹ سے اپنی داؤد حاصل کرے گی تو کیا کرے گی اگر عدت سے زائد نفقہ حاصل نہیں ہو سکتا تو ایسی مطلقہ کا کیا حل ہے؟ اور نفقہ حاصل کرنے سے وہ مجرم شوہر جو ایک ساتھ بلا وجہ تین طلاق دیتا ہے ان کے لئے سزا بھی ہے اور دوسروں کے لئے سبھرت ہے۔

چنانچہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی کمزوری اور عورتوں کے لئے کوئی قائل اطمینان حل پیش نہ ہونے کی وجہ سے حکومت نے

۱- ”وان كان الطلاق ثلاثا في الحرة او اثنين في الامه لم يحل له حتى تنكح زوجا غيره لئلا يحا صاحبها ويدخل بها ثم يطلقها او يموت عنها“ (قدوری مع المصاب کتاب النکاح ۲/ ۱۸۳، مطبعہ دارالایمان سہارنپور)۔

اب تک اس قانون کو بدلائیں ہے اور بہت سے ماواقف یہ سمجھ کر کہ اب ہمارے لئے دین پر چلنا مشکل ہے اور ہمارے لئے سوائے مقدمہ کے کوئی حل نہیں ہے، اپنے ایمان کو خراب کر رہے ہیں اب ان حالات کے پیش نظر چند امور دریافت ہیں:

(۱) ایسی مطلقہ کے لئے جو بچوں یا کسی دوسری وجہ سے دوسرا نکاح نہیں کر سکتی اور اقرباء کی مالی حالت بھی کمزور ہے، نفقہ اور دیگر دشواریوں کا حل شریعت کے مطابق کیا ہوگا۔

(۲) حضرت عمرؓ نے ایک ساتھ تین طلاق دینے والوں کو سزا فرمائی ہے (مطحاوی شریف جلد ۲) اور جوہر الفقہ (۲/۵۳۳) پر مذکور ہے کہ جو شخص ایک ساتھ تین طلاق دے گا اس پر عدالت کو حسب صواب دید تعزیری سزا جاری کرنے کا اختیار ہوگا۔

تو کیا شرعی تاقضی نہ ہونے کی صورت میں ان تعزیرات پر قیاس کرتے ہوئے ایسے مجرم سے بطور سزا و تنبیہ جماعت یا پنچایت قطع تعلق اور بائیکاٹ کر سکتی ہے۔

(۳) ظاہری روایت کے مطابق مالی جرمانہ جائز نہیں ہے۔

لیکن امام ابو یوسف کی ایک روایت کے مطابق جائز ہے، جیسا کہ بشامی جلد ثالث باب التعزیر میں منقول ہے: ”و عن أبي يوسف يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال“۔

اب سول یہ ہے کہ رسم المفتی میں قول مرجوح کی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان مواقع الضرورة مستثناة اور آگے قول مرجوح پر ضرورت کے وقت گنجائش کی کچھ مثالیں بھی دی ہیں اور انگریز کے دور میں مظلومہ عورتوں کے چھٹکارے کا بظاہر کوئی حل نہیں تھا تو حضرت تھانویؒ نے مذہب مالکیہ پر عمل کرتے ہوئے شرعی پنچایت کا حل نکالا تھا اور علماء نے اس کو قبول بھی کیا تھا تو آج بھی مطلقہ عورتوں کی مشکلات اور محرم کو سزا اور بلا وجہ غلط طلاق کے رواج کا سد باب ان مصالح کے پیش نظر کیا قول مرجوح پر عمل کرتے ہوئے جماعت یا پنچایت بلا وجہ ایک ساتھ تین طلاق دینے والے سے مالی جرمانہ لے سکتی ہے؟ تاکہ اس سے مطلقہ کے نفقہ کا حل ہو سکے اور غلط طلاق کا رواج اور معاشرہ کے بگاڑ کے سد باب کا ذریعہ بھی ہو جائے۔

(۴) دوسری طرف وہ مظلوم مرد جو طلاق دینے پر مجبور ہے، اس قانون سے بچنے کے لئے مطلقہ کے ولی کو عورت کے نفقہ سے زائد روپیہ بطور صلح دے سکتا ہے؟ جیسا کہ آج کل کجرات میں بہت سے بے گناہ مردوں کو بھی مجبوراً طلاق دینے پر پانچ پانچ دس دس ہزار روپے دینے پڑ رہے ہیں، امید ہے کہ موجودہ حالات کے پیش نظر قاضی اطمینان تفصیلی جواب

مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

سولس ہدات، کجرات

الجواب وبالله التوفیق:

نوٹ: اصل جواب معلوم کرنے سے پہلے چند باتوں کا معلوم کر لینا ضروری ہے:

(۱) یہ جتنی خرابیاں نظر آرہی ہیں سب معاشرے کے خرابی کی وجہ سے ہیں، اگر معاشرہ مسلمانوں کا شرعی اور صحیح ہو جائے تو ان خرابیوں میں سے ایک خرابی بھی پیدا نہ ہو۔

(۲) مسلمانوں کی دین و دنیا دونوں کی فلاح و کامیابی کے لئے معیار قرآن و سنہ مشہود لہا بالخیر (۱) (قرن نبوت، قرن صحابہ قرن تابعین) ہیں ان کی مطابقت و موافقت و متابعت فلاح و کامیابی کی ضامن ہیں اور اس کی متابعت و موافقت چھوڑنے میں ہی سب پریشائیاں و دشواریاں لاحق ہوتی ہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ الجھنوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوگا۔

(۳) ان قرآن و سنہ میں نکاح ثانی کوئی عیب نہیں قرار دیا گیا تھا بلکہ از روئے احادیث و آثار فلاح و کامیابی کا ذریعہ تھا اور آج اس کے برعکس اعتقاد بن گیا ہے اور نکاح ثانی کو عیب و بے عزتی قرار دیا گیا ہے، چاہے دنیوی اعتبار سے بھی اس سے بڑے بڑے معائب کا اور خرابیوں کا ارتکاب ہو مگر پھر بھی وہ عیب شمار نہیں ہوتا شریعت مطہرہ کا منشاء تو یہ ہے کہ کوئی مرد بغیر جائز عورت کے ساتھ نہ زندگی نہ گزارے، اسی طرح کوئی عورت بغیر جائز مرد کے مجروح زندگی نہ گزارے، دونوں کی عصمت و آبرو کی حفاظت اس نکاح میں مضمر ہو اور اسی کو آج عیب و بے عزتی قرار دیا گیا ہے، سب خرابیوں کی جڑ یہی ہے (۲)۔

خیال فرمائیے ازواج مطہرات میں سوائے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے کوئی کنواری نہیں تھیں، سب بیوہ یا شادی شدہ تھیں، اسی طرح صحابہ و صحابیات کا عام حال دیکھا جائے، اکثر کئی کئی شوہروں سے بیوہ یا جدا شدہ تھیں، اسی طرح

۱- عن عبد اللہ قال: مثل رسول اللہ ﷺ: أمی الدامس خیر؟ قال: "قرئی، ثم اللین یلو لہم ثم اللین یلو لہم ثم یجینی قوم دیمو شہادۃ أحمدہم حبیبہ و دیمو حبیبہ شہادۃ" (صحیح مسلم ۴/۱۹۶۳ کتاب فضائل الصحابہ حدیث ۲۱۱/۲۵۳۳)۔

۲- عن سعد بن أبی وقاصؓ قال: "رأی رسول اللہ ﷺ علی عثمان بن مظعون السبل ولواذن له لا یتصبأ" (صحیح مسلم ۴/۱۰۲۰ کتاب النکاح حدیث ۶/۱۳۰۲)۔

تاہم عیادت کا بھی حال ہے کہ قطعی نکاح ثانی یا نکاح ثالث وغیرہ کو معیوب نہیں جانتی تھیں۔

(۴) دور صحابہ سے آگے بڑھ کر بھی دیکھتے یہی معمول و عام رواج ملتا ہے، سیر و تاریخ میں جانا نہیں ہے، آپ حضرات خود دیکھ سکتے ہیں صرف دو ایک مثال نقل کر دیتا ہوں حضرت امام شافعی بالکل بچے تھے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ان کی والدہ محترمہ نے حضرت امام محمد رحمۃ اللہ سے عقد نکاح کر لیا (۱)، چنانچہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی بچپن کی کل تعلیم و تربیت حضرت امام محمد رحمۃ اللہ کے پاس ہوئی ممکن ہے اس بنا پر بھی حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ مقولہ مشہور ہو گیا ہو کہ الناس عیال فی الفقہ لأبی حنیفۃ اس وجہ سے ان کے علمی درجہ میں عیال کا ہونا تو ظاہر ہی ہے اسی طرح حضرت اسماعیل دہلوی شہید و حضرت مولانا قاسم رحمہما اللہ کو جب نکاح ثانی کی مردہ سنت کو زندہ کرنے کا خیال پیدا ہوا تو پہلے اپنی انتہائی بوڑھی بہن سے اس نکاح ثانی کی مردہ سنت کے احیاء و زندہ کرنے کی ابتدا فرمائی پھر بے شمار عورتوں کے نکاح ثانی ہوئے اور اس کا تقریباً رواج پڑ گیا تھا اور یہ مردہ سنت زندہ ہو گئی تھی یہ تو غیر مسلموں کا مذہبی طریقہ و رواج تھا کہ عورت بیوہ ہونے کے بعد سستی ہو جائے یا اسی شوہر کے نام پر بیٹھی رہے دوسری شادی کرنے کو مذہبی طور پر نہایت معیوب و بے عزتی قرار دیا جاتا اور سمجھا جاتا تھا اور یہی رواج بڑھ کر بیوہ ہونے کے علاوہ مطلقہ ہونے تک میں چل پڑا اور جب سے مسلمانوں میں اس رواج بدکار رواج ہوا مسلمانوں میں بھی یہی بات چل پڑی اس لئے یہ ساری خوفناک و افسوس ناک حالات اور صورتیں جو پیش آرہی ہیں وہ سب صرف غیر مسلمانہ روش کے اختیار کرنے اور اپنانے سے آرہی ہیں اور اب یہ ایک عام قومی مرض بن کر پورے معاشرہ کو خراب کر رہا ہے۔

(۵) ظاہر ہے کہ مرض کا ازالہ اسی وقت اچھی طرح ہوتا ہے جب سبب مرض کا ازالہ اچھی طرح ہو جائے، لہذا اس ضابطہ عقلیہ کی بنا پر تمام پریشانیوں کا واحد علاج یہی ہے کہ اس کافر اندر رسم کا علاج کر لیا جائے اور ایسی کوشش کی جائے کہ تمام ماؤں و بہنوں کے دماغ سے کم از کم نکاح ثانی کی نفرت ختم ہو جائے اور نکاح ثانی کا رواج عام ہو جائے تو معاشرہ خود صحیح ہو کر شریعت مطہرہ کے عین مطابق ہو کر صلاح و فلاح دارین کا ذریعہ بن سکتا ہے، آج نکاح ثانی کی سنت مردہ ہو گئی ہے جو شخص اس مردہ سنت کو زندہ کرے گایا اس کا بیڑہ اٹھائے گا وہ صحیح حدیث شریف ”من أحیا سنتی عند فساد أمتی فله أجر مائة شہید“ (۲) کے مطابق مجاہد عند اللہ شمار ہوگا اور شہیدوں کے برابر ثواب پائے گا، اسی طرح ایک اور صحیح حدیث شریف ہے:

۱- رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ مقدمہ ۱۳۳، ونزوح بام الشافعی وفوض إلیہ کتبہ و مالہ... الخ۔

۲- عن أبي هريرة ؓ قال قال رسول الله ﷺ: ”من أمسك بسني عند فساد أمتی فله أجر مائة شہید“ (مشكاة المصابيح ۱/۳۰ سلب الاعتصام بالكتاب والسنة، الفصل الثانی)۔

”من أحيا سنة من سنتي قد أمتيت بعدى فإن له من الأجر مثل أجر من عمل بها من الناس لا ينقص من أجور الناس شيئا“ (۱)۔

تمام گفتگوں کا خلاصہ یہ نکلا کہ اس پریشانی کا اصلی علاج شریعت کے قوانین میں رد و بدل کرنا نہیں ہے، بلکہ اصلی علاج معاشرہ کا سدھارنا اور سیدھا کر لینا ہے۔

اب اس تمہید کے بعد ہر سوال کا جواب نمبر وار دیا جاتا ہے۔

(۱) اس نمبر کا حکم یہی ہے کہ اس کو اپنا دوسرا نکاح کسی مناسب جگہ کر لینا چاہیے اور اگر بالفرض کسی شرعی معذوری یا کسی وجہ سے نکاح ثانی نہیں کر سکتی تو اس کا نفقہ مطاقہ کے مصبات کے ذمہ ہوگا، طلاق دینے والا شوہر بھی اگر از خود کچھ تبرع کر دے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، لیکن شوہر کو اس پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس پر شرعاً لازم کیا جاسکتا ہے (۲)۔

(۲) حضرت عمرؓ نے تین طلاق دینے والے کو سزا نہیں دی ہے بلکہ اس کے ”أبغض المباحات عند الله الطلاق“ (۳) کے ارتکاب پر تنبیہ فرمائی اس کا ترمیم خود اس کے تین طلاق کو ختم نہ کرنا بلکہ باقی رکھنا ہے، تنبیہ اور سزائیں ہوں بعید ہے، نیز سزائے جسمانی کا حکم بھی سزائے مالی سے مختلف ہے۔ کما ورد فی الحدیث: ”لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفسه“ او کما قال ﷺ (۴) اور جوہر فقہ کا محمل صرف یہ ہے کہ شوہر نے ظلماً تین طلاقیں دی ہوں ورنہ اس کا بھی کوئی محل نہیں ہے، پس اگر کوئی شخص واقعی محض ظلماً تین طلاق دیدے اور عورت کا کوئی قصور نہ ہو تو شرعی پنچایت اس کی اصلاح تک قطع تعلق کا فیصلہ کر سکتی ہے۔

۱۔ ”إن النبي ﷺ قال لبلال بن الحارث: اعلم، قال ما أعلم يا رسول الله، قال: اعلم يا بلال، قال: ما أعلم يا رسول الله؟ قال: أله من أحيا مدة من مني قد أمتيت بعدى فإن له من الأجر مثل من عمل بها من غير أن ينقص من أجورهم شيئا، ومن أبدع بدعة ضلالة لا يرضى الله ورسوله كان عليه مثل آقام من عمل بها، لا ينقص ذلك من أوزان الناس شيئا“ (سنن الترمذی ۵/۲۵۵، کتاب العلم باب ما جاء فی الأخذ بالسنة وابتعاد البدع ج ۲ ص ۲۶۷)۔

۲۔ ”فالإثبات عليه (يعني على الأب) لفقهن إلى أن يزوجن إذا لم يكن لهن مال، وليس له أن يزوجهن في عمل ولا خدمة وإن كان لهن فدية، وإذا طلقت والقطعت عدها عادت لفقهن على الأب“ (فتح القدیر ۴/۲۱۷، باب الفدية، نیز دیکھئے رد المحتار ۵/۳۳۱)۔

۳۔ عن ابن عمر عن النبي ﷺ قال: ”أبغض الحلال إلى الله تعالى الطلاق“ (سنن ابوداؤد ۲/۵۵۵، کتاب الطلاق، باب فی کرہیۃ الطلاق ج ۲ ص ۲۱۷، نیز سنن ابن ماجہ ۱/۶۵۰، ج ۲ ص ۲۰۸)۔

۴۔ عن أنس بن مالك أن رسول الله ﷺ قال:۔ المجرب (سنن الدارقطني ۳/۲۶۳ ج ۲ ص ۹۱)۔

(۳) حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ جو بوقت ضرورت تعزیر مالی کی اجازت دیتے ہیں تو پھر بعد اصلاح اس کے واپس کر دینے کا حکم بھی دیتے ہیں اور یہ اباحت نفع بخش نہیں اور اگر تعزیر مالی ناگزیر ہو اور واپسی میں اصلاح بھی متوقع نہ ہو تو پھر اس کی اجازت و مرضی سے کسی کار خیر میں صرف کر دینے کی بھی گنجائش ہوگی ورنہ اباحت مطلقہ کا قول معتد نہیں (۱)۔

(۴) الضرورات تبیح المحظورات لیکن مواقع الضرورة مستثناة کا بھی یہ محل نہیں ہے، اس کا محل اس وقت ہو سکے گا جب بچاؤ و بدل کی کوئی صورت نہ ہو اور یہاں موجود ہے، اسی وجہ سے مسئلہ مفقود الخیر یا مسئلہ حیلہ ناجزہ پر بھی قیاس کرنا صحیح نہیں (۲)۔

(۵) مظلوم مرد کی بھی تکالیف کا لحاظ کرنا اور اس سے چھٹکارا لینے کی راہ کا ہموار کرنا مقصود شرعی ہے اور شریعت مطہرہ نے اس کا بھی لحاظ فرمایا ہے، چنانچہ خلع میں مہر کی رقم سے زیادہ رقم کے وصول کرنے کی کراہیت جب مرد کے لئے ہے تو اس سے عورت کے لئے نفقہ عدت سے زیادہ کی رقم لینا مکروہ ظہر کا اور واجب العمل نہ ہوگا (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۸/۱۴۰۲ھ

طلاق دینے پر مالی جرمانہ لینا:

ہماری قوم لوہار نے نکاح اور طلاق کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیکر سو روپیہ سے لیکر پانچ سو روپیہ تک جرمانہ کر دینے ہیں اور جرمانہ پنچایت میں وصول کر کے کسی کے پاس امانت رکھ دیتے ہیں، کیا طلاق دینا پنچوں کے امکان میں ہے یا کہ شوہر کے امکان میں، ایک لڑکے نے اپنی بیوی کو ناراض ہو کر طلاق دیدی ہے تو اس کے شوہر سے طلاق دینے کے جرم میں جرمانہ لینا جائز ہے یا کہ نہیں اور حرام ہے یا کہ حلال ہے اور جو رقم جرمانہ کی لی ہے اس کو واپس دیجائے یا کسی کام میں لایا جائے؟

۱- ”وَأَوْلَادُ فِي الْبِرَازِيَةِ أَنْ الْعَزِيرَ بِأَخْلَدَ الْمَالِ عَلَى الْقَوْلِ بِهِ إِمْسَاكٌ شَيْءٍ مِنْ مَالِهِ عِنْدَ مَدَّةٍ لِيَنْزَجِرَ ثُمَّ يَعْبُدُهُ الْحَاكِمُ إِلَيْهِ... وَفِي الْمَجَنَّبِيِّ لَمْ يَلْزَمْ كَيْفِيَّةَ الْأَخْلَدِ وَأَرَى أَنْ يَأْخُذَ بِمَسْكِهَا فَإِنْ أَيْسَ مِنْ تَوْبَةٍ يَصْرِفُهَا إِلَى مَا يَوْعَدُ الْخِزَارَ عَلَى الدَّرِ الْخِزَارِ ۱۰۶/۱۔“

۲- کیونکہ انتہاء عدت کے بعد اس کا نفقہ اس کے تقیر ہونے کی صورت میں اس کے باپ یا بولا دپر لوٹ آتا ہے اور اگر وہ خود مالدار ہے تو اس کا نفقہ خود اپنے اوپر واجب ہے ”لو استعدت الألفی بنحو خياطة وغزل يجب أن تكون لنفسها في كسبها كما هو ظاهر ولا نقول نجب على الأب مع ذلك إلا إذا كان لا يكفيها فنجب على الأب كفائها بدفع القدر المعجوز عنه“ (رد المحتار علی الدر المختار ۱/۳۳۷)۔

۳- ”وَكُرِهَ نَحْوُ مَا أَخْلَدَ شَيْءٌ أَيْ قَلِيلًا أَوْ كَثِيرًا، وَالْحَقُّ أَنَّ الْأَخْلَدَ إِذَا كَانَ السُّلُوزَ مِمَّا حَرَّمَ قَطْعًا لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ”فَلَا تَأْخُذُوا مِمَّا شَبَّ“ (النساء ۳۰) ”إِلَّا أَنَّهُ إِنْ أَخْلَدَ مَلَكَةً بِسَبَبِ خِيَّتٍ“ (رد المحتار علی الدر المختار ۵/۴۳)۔

الجواب وبالله التوفيق:

طلاق کا حق صرف شوہر کو ہے، شوہر کے طلاق دینے سے پورے خاندان یا کسی اور پر حرم مانہ عائد کرنا ظلم اور حرام ہے، اسکا لینا حلال نہیں ہے، حرم مانہ مال کا صرف حکومت کو حق ہے اور کو نہیں جو رقم حرم مانہ وصول ہوئی ہے اس کو واپس کر دیں (۱)، ہاں اگر مالک خود کہیں، یا کسی مصرف میں خرچ کرنے کی اجازت دیدیں تو خرچ کر سکتے ہیں بلا انکی مرضی کے نہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

طلاق کے بعد دوسری شادی:

زید میں اور زید کی منکوحہ میں بزمان منکوحہ جسمانی نقصانات کی بنا پر اختلافات پیدا ہوئے اور جب زید کو اس کی منکوحہ نے باہمی نقصانات کی جانب زیا دہ توہید دلائی تو اس نے غصہ میں آکر منکوحہ کی والدہ اور اپنے بھائی اور والدہ کے روبرو طلاق دیدی وراپنی والدہ سے کہا کہ آپ لیجائیے، اس وقت اس کو غصہ آ رہا ہے میں اس کو سمجھا دوں گا اور گھر پر ذکر نہ کرنا، منکوحہ کی والدہ اسکو لیکر آگئی یہ واقعہ شادی کے اکیس دن بعد ہی پیش آگیا تھا اس کے بعد سے وہ دوبارہ نہیں گئی اور نہ ہی وہ لڑکا آیا، مگر زید کے دوسرے لواحقین کئی بار آئے مگر منکوحہ گئی نہیں، اس صورت میں قریب ڈھائی سال گزر گئے اور ڈھائی سال بعد زید منکوحہ کے ماموں زاد بھائی کو ملا تو انہوں نے زید سے کہا کہ اگر تم نے طلاق دیدی ہے تو تم دستخط کرو اس پر زید کافی برہم ہوا ہے اور کہا کہ میں دستخط نہیں کروں گا مگر لفظ طلاق سے منکر نہیں ہوا ہے، اب قریب ساڑھے تین سال بعد جبکہ کوئی خرچ وغیرہ نہیں بھیجا اور نہ ہی کوئی واسطے مطلب رکھا ہے تو منکوحہ کی والدہ اور اس کے لواحقین نے عدالت میں درخواست دیدی، اس پر عدالت نے منکوحہ کے بیان پر دوسری شادی کا حکم دے دیا ہے۔

اس بارے میں علماء کرام فرمائیں کہ آیا منکوحہ زید دوسرا نکاح کر سکتی ہے یا کہ نہیں اور اس کے لئے عدت کا کیا حکم ہے اور وہ کس وقت سے ضروری ہے، آیا پہلی طلاق سے یا عدالتی طلاق سے، کیونکہ منکوحہ نے وہاں سے آنے کے بعد باقاعدہ عدت بھی پوری نہیں کی ہے، ایک بات یہ ضروری تحریر کرنی ہے کہ بزمان منکوحہ زید نے رجوع نہیں کیا ہے، آیا اس حالت میں

۱- "لا یأخذ مال فی المملک، بحر و فیہ عن البرازیہ و لیل: یجوز، و معہ ان یمسکہ مدۃ لیزجر ثم یعده له فان ایس من نوبۃ صرفہ الی ما یوی التعزیر فی المجنبی الہ کان فی ابتداء الاسلام ثم نسخ الدر المختار مع الرد ۶/ ۱۰۵-۱۰۶، مکتبہ زکریا دیوبند، والحاصل ان لمدہ ب عدم التعزیر یاخذ لہا، رد المحتار علی الدر ۶/ ۱۰۵-۱۰۶، مکتبہ زکریا دیوبند۔

عدت ہوتی ہے یا کہ نہیں اور جن لوگوں کے سامنے طلاق دی ہے وہ موجود ہیں، ان میں تین مرد مسلم اور ایک ہندو ہے، ضرورت پڑنے پر وہ کوئی دے سکتے ہیں شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

(سوال میں چند امور قابل لحاظ ہیں):

۱۔ زید سے نکاح کے بعد خلوة صحیحہ ضرور ہوئی ہے جیسا کہ سوال کی شروع عبارت سے ظاہر ہے اور خلوة صحیحہ کے بعد وقوع طلاق میں عدت واجب ہوتی ہے۔

۲۔ زید نے غصہ میں آ کر اپنی منکوحہ کی والدہ (امی قولہ) رو بہ و طلاق دیدی، اس عبارت سے اگرچہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کن لفظوں میں ایقاع طلاق کیا ہے لیکن اس سے متصل زید کا جملہ (اسکا سامان دید و الخ) جو سابق ایقاع کی تفسیر اور ترجمان ہو سکتا ہے جس کا ظاہر و متبادر طلاق منی ہے مگر لفظ سامان دید و دھمکی بھی ہو سکتی ہے، اس لئے داخل متیقن محض ایک طلاق رجعی ہوگا۔

۳۔ ڈھائی سال کے بعد جب منکوحہ کا ماموں زاد بھائی زید سے ملا ہے تو زید دستخط (تخریر طلاق) کرنے پر توبہ ہم ہوا ہے مگر لفظ طلاق سے منکر نہیں ہوا ہے۔ یہ قریب ہے کہ زید نے رجوع نہیں کیا ہے۔

۴۔ زید کے اس طلاق دینے پر تین مرد مسلم کو ابھی ہیں جیسا کہ سوال کی آخر میں عبارت سے ظاہر ہے۔

۵۔ سوال کا یہ جملہ کہ وہاں سے آنے کے بعد منکوحہ نے باقاعدہ عدت پوری نہیں کی ہے اسکا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ کسی متعین مکان میں بیوقوف نہیں کی، اگر یہی مفہوم ہے تو اس کا کچھ اثر اتمام عدت پر نہ پڑے گا، کیونکہ عدت حائضہ محض حیض آ جانے کا نام ہے اور متبادر ہے کہ بعد طلاق کے زمانہ طویل (تقریباً چار سال) گزر چکا ہے جس میں عموماً اور عادتاً تین حیض آچکے ہیں اور منکوحہ اس تین حیض آنے پر منکر نہیں ہے۔

۶۔ عدالت کی تفریق شرعی تفریق نہیں ہے کہ کچھ اثر انداز ہو سکے بجز اسکے کہ قانون کی زد سے محفوظ رہے یا تفریق شرعی کی تحصیل آسان ہو جاتی ہے، لہذا صورت مسئلہ میں احقر کے نزدیک فقہ حنفی کی رو سے اسی ایقاع طلاق کی وقت سے طلاق واقع ہوگئی نہ کہ عدالتی طلاق سے (۱) اور پھر اسکے بعد جب تین حیض گزر چکے ہیں تو اس وقت عدت بھی ختم ہوگئی پس

۱۔ ”فالعدة من ولات الطلاق لا من ولات القضاء“ (الدرع الرد ۵/ ۲۰۲)۔

جب سے عدت ختم ہو چکی ہے، اسی وقت سے وہ دوسرا نکاح کرنے کی مجاز ہے، لہذا اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو وہ دوسرا نکاح بعد ختم عدت کر سکتی ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/۷/۱۳۵۸ھ

الجواب صحیح محمود علی عہد

طلاق مکروہ کا حکم:

ریڈ یوکوئیت نے بتلایا کہ اگر کسی شخص سے لڑکی والے یا دیگر اشخاص جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دے کر طلاق لیتے ہیں تو وہ طلاق واقع نہیں ہوتی۔

حافظ مہدی حسن، پوسٹ بکس ۲۲۳ ریاض، سعودی عرب

الجواب وبالله التوفیق:

یہ بات دھوری ہے، پوری بات اس طرح ہے کہ اگر جبر و اکراہ کر کے مثلاً جان سے مار ڈالنے کا خوف دلا کر طلاق کی تحریر لے لی اور زبان سے طلاق نہ دلوائی تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی (۱)۔

اور اگر زبان سے طلاق دلوائی تو اگر جبر و اکراہ دے کر زبان سے کہلوایا ہے، چاہے مار ڈالنے کی دھمکی دے کر کہلوایا ہو ہر حال واقع ہوگی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۲/۱۳۹۹ھ

بیوی سے صرف ایک، دو، تین کہنا:

زید اور ہندہ میں جھگڑا ہوا، زید بحالت غصہ اپنے بستر پر جا کر سو گیا، کچھ رات گزرنے کے بعد ہندہ نے زید کو کسی

۱- ”فلو اکروہ علی أن یکتب طلاق امرأه فکب لا ینطق، لأن الکتابۃ ألبتہ مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا، کذا فی الخایة“ (فتاویٰ ثانی ۲۳/۲ کتاب الطلاق)۔

۲- ”ویقع طلاق کل زوج بالغ، عاقل ولو عبداً أو مکروها فإن طلاقه صحیح، أي طلاق المکروه“ (المر المختار علی هامش الشامی ۳۲، کتاب الطلاق) (مرتب)۔

ضرورت سے بیدار کیا، زید نے غصہ میں اپنی بیوی سے کہا کہ ایک دو تین اور پھر سو گیا ہندہ نے پھر جگایا کہ تم کل صبح دس آدمیوں کے رو پر وٹھکو جواب دو، اس پر زید نے اپنی بیوی ہندہ سے کہا میں چار آدمیوں کے بیچ میں کہوں گا کہ جواب دیدیا ہندہ نے اپنے پڑوس میں اس کا ذکر کیا کہ زید نے مجھے اس طرح کے الفاظ کہا ہے۔

صبح کو ایک شخص نے زید سے پوچھا کہ تم نے اپنی بیوی سے کیا کہا، اس نے کہا کہ صرف ایک دو تین، پھر محلہ کے اکابر نے جمع ہو کر زید سے دریافت کیا کہ تم نے اپنی بیوی کو کیا کہا، اس پر بھی زید نے کہا کہ صرف ایک دو تین کہا ہے، اب زید کا کہنا ہے کہ میں نے یہ لفظ بیوی کو صرف ڈرانے کے لئے کہا ہے، طلاق کی نیت سے نہیں کہا ہے، کیا صورت ہذا میں ہندہ کو طلاق واقع ہوگئی؟

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال ہندہ کا اپنے شوہر کا یہ قول نقل کرنا کہ میں چار آدمیوں کے بیچ میں کہوں گا کہ جواب دیا اول تو شوہر اسکا منکر ہے اور ہندہ کے پاس شاہد نہیں، دوم یہ الفاظ ایقاع طلاق کے نہیں بلکہ کنایہ طلاق کے ہیں اور وہ بھی ایقاع کا نہیں بہت سے بہت یہ سب دھمکی یا وعدہ کے ہو سکتے ہیں جو مفید نہیں، اس لئے صورت مسئلہ میں ہندہ پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عہد

میری طرف سے طلاق ہے اور تازندگی حرام ہے، سے کتنی طلاق پڑی؟

میاں بیوی کے درمیان ابتدائی ملاقات میں ما اتفاقی ہوگئی ہے، عورت نے شوہر سے کہا کہ تم پڑھنا چھوڑو اور جو میں کہوں وہ کام کرو، ورنہ میرا اور تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے، شوہر نے کہا کہ میں پڑھنا کیوں چھوڑوں یہ مجھ سے نہیں ہوگا اور کہا کہ تمہاری بات غلط ہے مجھ سے کام لے، لیکن عورت اپنی ضد پر قائم رہی اور کئی مرتبہ یہی کہا کہ میرا اور تمہارا تازندگی کوئی تعلق نہیں رہے گا، شوہر نے جواب میں کہہ دیا ہے کہ میری طرف سے بھی طلاق ہے اور تو میرے لئے تازندگی حرام ہے، اس بات کو تقریباً تین سال کا عرصہ ہو گیا ہے، شوہر نے رجوع نہیں کیا اور نفاق بدستور ہے اور شوہر کی شرائط پر زوجہ رہنے کو تیار نہیں

ہے اور عورت شوہر کے مکان پر موجود ہے شرعی جواب سے سروفرمائیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال طلاق کے دو جملے ۱۔ میری طرف سے بھی طلاق ۲۔ اور تو میرے لئے تازہ زندگی حرام ہے مذکور ہیں پہلا جملہ طلاق صریح رجعی کا ہے اور دوسرا جملہ طلاق صریح بائن کا اور دوسرا جملہ اول جملہ کی تفسیر ہے، علیحدہ کوئی ایقان جدید نہیں ہے، اس لئے مسئلہ میں صرف طلاق بائن واقع ہوئی اور تعلق زوجیت بالکلیہ منقطع ہو گیا ہے۔

اب دونوں میں تعلق زن و شوئی بغیر نکاح جدید کئے کسی طرح قائم نہیں ہو سکتا اور نہ بغیر نکاح جدید کے ایک دوسرے کے سامنے آ سکتے ہیں۔

نیز سوال کا ابتدائی جملہ (ابتدائی ملاقات الخ) سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں یکجائی و تنہائی (خلوت صحیح ہو چکی ہے)، اس لئے بصورت مذکورہ زمرہ پر اور دینا واجب ہے۔ ہذا ما عندی من الفقہ الحنفی فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۲/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: محمود علی، سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

شوہر طلاق کا منکر ہو اور گواہ طلاق کی گواہی دیں:

ایک کمیٹی چند آدمیوں پر مشتمل لوگوں کے مذہبی معاملات کے فیصلہ کے لئے بنائی گئی ہے، لیکن اس نے اس کے بجائے دین اسلام میں خلل اندازی شروع کر دی ہے اور طریق کار یہ اختیار کیا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ مخالفت ہو جائے تو اس کو نقصان دینا اور اس کی عورت کو بہکا کر یہ دعویٰ کر دینا کہ میرے خاوند نے مجھے طلاق دیدی ہے، اور جو لوگ اس شرارت میں ملوث ہوں انکو گواہ بنا کر طلاق نامہ ثابت کرانا انکا کام ہے، اب انکے سیکریٹری نے ایک عورت کو بہکا کر اور جھوٹے دو گواہ طلاق نامہ کے انکو گواہ مقرر کر کے اس عورت سے شادی کر لی ہے اور خاوند اس عورت کے طلاق دینے سے منکر ہے اور عورت سے جھوٹ کہلو کر اور دو جھوٹے گواہ بنا کر طلاق نامہ اس عورت کا ثابت کرتے ہیں کہ اس کے خاوند نے اس کو طلاق دیدی ہے، کیا ایسی کمیٹی کا فیصلہ قابل قبول ہے، جو یہ خلاف شرع فساد کرتے ہیں اس کا کیا جرم ہے، آیا یہ مذکورہ عورت اس شخص کے لئے نکاح میں رکھنا کیسا ہے جبکہ اس کی شرارت ظاہر ہے اور خاوند منکر طلاق ہے، کیا ایسے لوگ جو اس کمیٹی کے ہر مشورہ میں شریک

ہوتے ہیں اور کمیٹی کو کہتے ہیں کہ ہمیں بھی کوئی عورت اس طرح دیجانی چاہئے انکی کو ہی معتبر ہوگی یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال جب تک گواہ خود رجوع یا اپنے کذب کا اقرار نہ کریں یا دلیل شرعی سے انکا کذب اس معاملہ میں ثابت و متعین نہ ہو جاوے اس وقت تک عدم طلاق کا حکم قضا نہیں ہو سکتا ہے (۱)، البتہ وہ ایسا کرنے کی وجہ سے آخرت میں سخت مجرم اور معذب ہوں گے اور دنیا میں بھی بدترین وبال میں مبتلا ہوں گے، ایسے لوگوں کے دل میں خوف خدا ڈالنا سب سے بڑی تدبیر ہے اور کمیٹی کے لوگ اگر غیر متدین ہوں تو انکو کمیٹی سے نکال دینا چاہئے اور کمیٹی کا کوئی فیصلہ جو اصول وضو اب شرعیہ کے خلاف ہوگا وہ شرعاً ہرگز معتبر و نافذ نہ ہوگا، آبادی کے بڑے لوگوں اور ذمہ دار لوگوں پر ضروری ہے کہ وہ لوگ اس قسم کے جرائم و فسادات کے انسداد کی تدبیریں سوچیں اور حتی المقدور روکیں، ورنہ سب حسب قدرت عند اللہ ما خوذ اور مبتلا ہو بال دنیا و آخرت ہوں گے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۰/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، نائب مفتی دارالعلوم دیوبند، محمود علی عند

شادی نام منظور ہے، طلاق دے دیا کہنے سے طلاق:

زوج کے ایک خط کی نقل منسلک ہے جو اس نے اپنے والدین کو لکھا ہے جسکو پانے کے بعد فوراً اس کے والدین نے اس کو ایک خط دریافت طلب لکھا ہے کہ فوراً جواب دے اور اس پر عمل درآمد کیا جاوے اور یہ بتائے کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی جس پر اس نے اپنی غلطی کی معافی مانگی اور پشیمان ہوا چنانچہ وہ خط نہ تو لڑکے کے والدین کو دیا گیا ہے نہ لڑکی کو نہ زوج کے والدین نے کوئی خط لڑکی کے والدین کو لکھا، اس لئے کہ اس کے خیال سے ضرورت نہیں باقی تھی اس کے بعد زوج رخصت کے وقت مکان آیا تو لڑکی بھی رخصت ہو کر آئی، اس وقت اس کی گود میں ایک سال کا بچہ بھی ہے اتفاق سے وہ خط زوج کی والدہ کے پاس پڑا رہ گیا تھا، جس کو لڑکی نے ایک مدت کے بعد کہیں بکس میں پالیا اور میکے جانے کے بعد اپنے والدین کو

۱- "وما سوى ذلك من الحقوق قبل فيها شهادة رجلين او رجل و امرء بين سواء كان الحق مالا او غير مال مثل النكاح، الطلاق، والوكالة، والوصية ونحو ذلك" (ہدایہ ۳/۱۵۲-۱۵۵، مکتبہ اشرفیہ دیوبند)۔

دکھلایا، اب لڑکی والے کہتے ہیں کہ طلاق ہو گئی اور خط میں یہ لفظ لکھا ہے (مضمون خط) آپ صاف صاف لکھ دیں میں آپ لوگوں سے بہت شرمندہ ہوں اور میرے معظم والد جہاں آپ نے میرے بڑے بڑے قصور معاف فرمائے ہیں ایک یہ بھی معاف فرماویں اور صاف صاف میری طرف سے لکھ دیں کہ انور نے شادی منظور کر دی اور اپنی طرف سے طلاق دے دیا اور اب مجھے ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں ہیں، والدہ کی خدمت میں سلام عرض ہے جمشید کو دعاء، آیا اس تحریر خط سے طلاق پڑی یا کہ نہیں؟

(محمد انور)

الجواب وبالله التوفیق:

انور شوہر کی تحریر دیکھی گئی اس میں انور کے اپنے الفاظ بغرض صرف اتنے ہیں کہ شادی منظور کر دی اور اپنی طرف سے طلاق دے دیا اور اگلا جملہ (اب مجھ سے ان لوگوں کا واسطہ نہیں) اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اپنے والد کو لکھنے کے لئے کہہ رہا ہے کہ وہ لوگ (اہل زوجہ) اسکے والد سے کچھ تعلق و واسطہ نہ رکھیں، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ تحریر واقعی انور ہی کی ہے تو حسب تحریر ایک طلاق رجعی واقع ہو گئی، پس اگر وہ لڑکی جب رخصت ہو کر اپنے زوج کے وہاں آئی اور زوج سے ملاقات ہوئی ہے اس وقت تک اس کو تین حیض نہیں آچکے تھے بایں صورت حسب سابق انور کی زوجہ باقی ہے اور اگر تین حیض آچکے تھے اور عدت ختم ہو چکی تھی تو زوجہ انور کے نکاح سے نکل چکی تھی رخصتی صحیح نہیں ہوئی، لہذا ایسی صورت میں دونوں آپس میں فوراً جدید نکاح کر لیں، ”وینکح مبانة بما دون الثلاث فی العدة وبعملها بالاجماع“ (۱)، اور تجدید نکاح سے قبل قبل ہر گز آپس میں تعلق زن و شوئی قائم نہ رکھیں، ورنہ سخت گناہ گار ہوں گے اور ارتکاب زنا میں مبتلا ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۷/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح: محمود علی عمنہ

مطالبہ طلاق پر دیدی، دیدی، دیدی، کہنا:

دونوں میاں بیوی میں کسی وقت جھگڑا ہو رہا تھا، بیوی نے کہا کہ بھٹک تو طلاق دیدے تو شوہر نے بحالت غصہ کہا کہ میں نے دیدی، دیدی تین بار کہہ دیا، لیکن زبان سے یہ الفاظ نہیں نکالا کہ طلاق دیدی عورت کے کہنے پر یوں ہی کہہ دیا کہ دیدی کیا تین بار اس کی طلاق پڑی یا کہ نہیں؟ عورت اور مردوں جاہل ہیں عورت حاملہ بھی ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

عبارت سول سے معلوم ہوتا ہے کہ یوں ہی بلا نیت طلاق یہ الفاظ کہے ہیں، ایسی صورت میں حکم یہ ہے کہ نیت کے بغیر کہنے سے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ”إمرأة قالت لزوجها طلاق مراده فقال الزوج داده گیر (الی قولہ) ولو قال: داده است أو كرده است يقع نوى أو لم ينو ولا يصدق في ترك النية قضاء“ (۱)۔

لہذا صورت مسئلہ میں تین طلاقیں مغلطہ واقع ہو گئیں ہذا عتدی جواب لکھنے کے بعد تاضیحان کا جزئیہ ملا جو اس پر مثل نص ہے قال لأمرته: ہشتہ ہشتہ حرامی حرامی فقال ما اردت به الطلاق لا يصدق قضاء (الی قولہ) قالوا تطلق ثلاثاً (۲)، وایضاً فی مختصر الخزانة ولو قالت: مرا طلاق کن فقال الزوج: كرده كرده كرده، طلقت ثلاثاً (۳) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۲/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عن سید احمد علی سعید

پنچایت کا نسخ نکاح معتبر ہے یا نہیں؟

زید اور ہندہ میاں بی بی ہیں اور ہندہ کے زید سے بچے بھی ہیں اور زید نہ ہندہ کو اپنے یہاں لیجاتا ہے اور نہ طلاق

۱- فتاویٰ ہندیہ ۱/۳۸۰، مکتبہ رشیدیہ پاکستان۔

۲- ”مثل المبعوسی عن قال لأمرته: ہشتہ ہشتہ حرامی حرامی قال: لا يصدق في أنه لم يرد به الطلاق وطلقت ثلاثاً كذا في الحاوی“ (الفتاویٰ الہندیہ ۱/۳۸۶، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

۳- فتاویٰ مجموع النوازل وشفق دم قلمی ورق ص ۷۰۔

عی دیتا ہے اور نہ مان و نفقہ کا کفیل ہوتا ہے اور نہ پنچائیت کچھ فیصلہ کرتی ہے اور اگر کرتی ہے تو زید پنچائیت کے فیصلہ پر راضی نہیں ہوتا ہے، مثلاً پنچائیت نے فیصلہ کیا ہے کہ نکاح فسخ کر دیا جاتا ہے، تو کیا پنچائیت کے فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہو جائے گا یا کوئی اور صورت ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

زید کو اولاً پنچائیت کی جانب سے جس میں کم از کم ایک عالم بھی ہو مجبور کیا جاوے کہ ہندہ کا کفیل ہو، مان نفقہ وغیرہ دے، اگر نہیں دیتا ہے تو طلاق دینے کے لئے کہا جائے کہ زید پر واجب ہے، اگر دونوں میں سے کسی کو نہیں منظور کرتا ہے تو پنچائیت جس میں جید کو بھی شامل کیا جاوے تفریق کر دے یہ فیصلہ صحیح ہو جائے گا، لیکن زید سے قبل تفریق بتلا دیا جائے کہ اگر دونوں مذکورہ باتوں میں سے کسی کو نہیں مانیں گے تو ہم تفریق کر دیں گے جو شرعاً معتبر ہے (حیلہ ناجزہ)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پور ۲۲/۷/۱۹۸۵ء
الجواب صحیح محمود علی عزم

عدالت کی تفریق کا حکم:

ایک لڑکی کی شادی ما بالقرینت میں لڑکی کے والدین نے ایک مرد جس کی عمر ۴۰ سال ہو چکی تھی کے ساتھ شادی کر دی، لڑکی کی بالغ ہو کر اپنے شوہر کے پاس گئی جبکہ شوہر کی عمر ۴۵ سال ہو چکی تھی قریب ۵-۶ سال لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ رہی، اس درمیان میں روحانی جسمانی تکالیف ہوئی جس سے وہ تنگ آ گئی، چنانچہ اس نے اس معاملہ کو برادری میں پیش کیا مگر برادری نے کوئی پنچائیت نہیں کی ہے اور نہ سماعت معاملہ کیا، لڑکی کے شوہر کو کمرسہ کر رہے ہیں من طلب کیا مگر باوجود تعمیل من پر بھی حاضر عدالت نہیں ہوا ہے، چنانچہ پنچائیت نے بھی تنگ آ کر شوہر کے خلاف عدالت میں دعویٰ کر دیا، عدالت نے لڑکی کے شوہر کو طلب کیا وہ حاضر عدالت نہیں ہوا عدالت نے تنگ آ کر ایک طرفہ فیصلہ لڑکی کے موافق دیدیا ہے، لڑکی نے فیصلہ کے ۱۳ ماہ ۱۳ دن بعد اپنا عقد ایک ہم عمر جوان کے ساتھ کر لیا ہے، کیا یہ فیصلہ عدالت جائز ہے یا کہ ناجائز ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال صورت مسئلہ عدالت کی یہ تفریق اگر مسلمان حاکم نے تمام کاروائی مقدمہ حسب قانون شرعی

مرتب کر کے کیا ہے تو یہ فیصلہ شرعی ہوا اور یہ عقد جو ہم عمر جوان سے ہوا ہے اگر تین حیض (عدت) گزار کر ہوا ہے تو صحیح ہوا اور نہ نہیں، اس صورت میں کہ فیصلہ شرعی نہ ہوا ہو زوجین پر واجب ہے کہ فوراً دونوں علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور منجانب لڑکی جماعت مسلمین یعنی کم از کم تین دیندار باوقار، معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت بنا کر اس کے سامنے لڑکی اپنا واقعہ رکھ کر تفریق کی درخواست کرے اور وہ جماعت حسب قاعدہ شرعیہ بیان و شہادت و ثبوت وغیرہ جملہ کاروائی مقدمہ مرتب کر کے اپنی صواب دید کے مطابق تفریق کر دے تو اب یہ تفریق شرعی ہو جائے گی اور پھر عدت تین حیض گزار کر لڑکی اس ہم عمر جوان سے دوبارہ اپنا نکاح پڑھا کر اس کے ساتھ رہے۔

(تنبیہ) اس جماعت مسلمین میں ایک معتبر و متدین عالم بھی شامل کر لیں جو مسائل فقہ سے واقف ہو تو اچھا ہے، ورنہ وہ جماعت ہر موڑ پر کسی معتبر واقف مسائل عالم سے پوچھ کر عمل کر کے اور حیلہ ما جزہ مصنفہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ خود بھی مطالعہ میں رکھے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند بہار پور ۲۱/۷/۱۴۰۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عند

طلاق نامہ پر صرف دستخط کرنے سے طلاق پڑی یا نہیں؟

محترمی جناب مفتی صاحب مندرجہ ذیل ایک طلاق نامہ نقل پیش کیا جا رہا ہے عبدالحفیظ نے اپنی زبان سے طلاق نہیں دیا ہے لیکن انہوں نے اسی طلاق نامہ پر دستخط کیا ہے، بتلایا جاوے کہ یہ طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں بیٹو اتوجروا۔

نقل طلاق نامہ یکم نومبر ۶۵ میں بشرن بی بی مقام شولانا تالاب تھانہ مردوان ضلع مردوان کی رہنے والی ہوں، آج میں اپنے شوہر سے طلاق لے رہی ہوں، بیچ کے سامنے آئندہ ہم سے اور ان سے کوئی واسطہ نہیں اور لڑکے سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے اگر لڑکا ہمارے پاس جائے تو اس کا باپ عبدالحفیظ لاسکتا ہے، اگر ہم روکیں تو کہیں قانونی کاروائی کر سکتا ہے اور ہم نے دین ہر معاف بھی کر دیا ہے، ساتھ گواہ کے اور خوشی سے طلاق لیا شوہر کا نام عبدالحفیظ ہے اور راستہ گھاٹ میں ملاقات ہونے پر گالی گلوں نہیں کر سکتا ہے ایک بچہ بھی اگر گواہ دے تو انجام برا ہوگا۔ دستخط گواہ۔ ۱ عبد الرحمن ۲۔ محمد اور لیس ۳۔ محمد مقصود عالم ۴۔ شفیق احمد ۵۔ فضل کریم (عبدالحفیظ شوہر بشرن بی بی)۔

الجواب وبالله التوفیق:

عبدالحنیظ نے اس طلاق نامہ کی عبارت سن کر زبانی قبول کر لیا ہے اور تصدیق کر دی ہے جب بھی طلاق واقع ہوگئی اور دین مہر معاف ہو گیا ہے، خواہ لفظ طلاق زبان سے بولا ہو یا نہ بولا ہو (۱)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۷/۱۴۰۵ھ
الجواب صحیح: محمود عینی عنہ، سید احمد علی سعیدنا، مفتی دارالعلوم دیوبند

نان و نفقہ اور حق زوجیت ادا نہ کرنے کی وجہ سے نکاح فسخ کرانا:

زید نے عرصہ بارہ سال سے اپنی بیوی ہندہ کی کوئی خبر نہیں لیا ہے، ہندہ اپنے میکے میں ہے اور ہندہ کے زید کے نطفے سے دو لڑکیاں ہیں وہ بھی ہندہ کے ساتھ ہیں، ایک لڑکی کی عمر ۱۶ سال اور دوسری کی عمر ۱۳ سال ہے، آٹھ سال پہلے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ کلکتہ میں رہتا ہے اور شادی کر لیا ہے، دو بچے بھی ہیں لڑکی کی عمر ۲۰ سال ہے، لڑکی کا بھائی اسکولانے کلکتہ گیا لیکن وہ نہیں ملا زید کے والدین اس کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے یہاں پر ایک مسلمان کے یہاں پرورش پائی ہے اسے ہی شادی کر دیا تھا جو ان ہونے پر سسرال میں دو لڑکیاں پیدا ہونے تک رہا اور اس کے بعد گیا تو آج تک خبر نہیں لیا ہے اور نہ کوئی پتہ دیا ہے کہ میں کہاں ہوں، ایک لڑکی کی شادی نانپال میں والدہ نے کر دیا ہے، دوسری کی شادی بھی طے پا چکی ہے، ابھی ہوئی نہیں ہے، ہندہ کے والدین بہت کمزور ہو چکے ہیں، اس لئے ہندہ چاہتی ہے کہ میں بھی کہیں دوسری شادی کر کے اپنا گذر اوقات کرے عندالشرع کیا حکم ہے فرمایا جاوے۔

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال صورت مسئلہ کا حکم یہ ہے کہ اگر ہندہ کو اپنی آئندہ زندگی بلا دوسری شادی کئے ہوئے باعصمت طور پر گذارنی دشوار اور مستعذر معلوم ہوتی ہے تو اولاً پہلے شوہر کی تلاش کی جاوے اور اس سے کہا جائے کہ یا تو اس کو بیجائے یا طلاق دیدے، اگر شوہر نہ ملے یا طلاق نہ دے اور ہر طرح مجبوری ہو جائے تو جماعت مسلمین بنا کر (یعنی شرعی پنچائیت بنا کر) جو کم از کم تین دیندار با وقار معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت ہو عورت اس کے سامنے اپنا معاملہ اور مجبوری رکھ کر درخواست کرے کہ تفریق شرعی واقع کر کے مجھے دوسرا نکاح کر نیکی اجازت دیجائے اور وہ جماعت حیلہ ناجزہ مصنفہ حضرت تھانوی

۱۔ ”کل کتاب لم یکنہ بخطہ ولم یملہ بنفسہ لا یقع الطلاق ما لم یقر الہ کتابہ“ (فتاویٰ ۵۸۹/۲، ج ۲، ۵۸۹)۔

سامنے رکھ کر قواعد شرعیہ فقہیہ کے مطابق بیان و شہادت و ثبوت جملہ کارروائی مرتب کرے اور تفریق واقع کر دے تو عدت گزار کر عورت کو اپنا دوسرا نکاح کرنا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

(متنبیہ) جماعت مسلمین میں ایک متدین عالم کو جو مسائل متعلقہ سے واقفیت رکھتا ہو شریک کر لیں تو زیادہ اچھا ہے، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود علی عنہ

والد کے اصرار پر طلاق نامہ پر دستخط کرنے سے طلاق کا حکم:

جو احسن نامی ایک شخص ہے جس کی ہمشیرہ خلیق النساء سے میرا عقد ہوا تھا، اس کے بعد کچھ ایسی بات اتفاق ہوئی جس کی بناء پر تحریری طلاق نامہ دوسرے شخص نے لکھا ہے اور مجھ پر میرے والد اور لوگوں کا زور پڑا اور میرے والد نے کہا کہ اگر طلاق نامہ پر دستخط نہ کرو گے تو میں تمہارا حق ختم کر دوں گا، میں نے طلاق نامہ پڑھ کر دستخط کر دیا، ایسی صورت میں طلاق واقع ہوئی یا نہیں اور میرا اول ارادہ طلاق کا قطعی نہ تھا، لڑکی نے قریب ایک سال تک نکاح نہیں کیا ہے، اس کے بعد ماہ شوال ۱۴۰۷ھ کو نکاح ہو گیا ہے، ایسی صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے:

الجواب وبالله التوفیق:

سعید الدین نے جب طلاق نامہ پڑھا اور اس کا مفہوم بھی یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کی تصدیق سے طلاق واقع ہو جائے گی (جیسا کہ سیاق و سباق سول سے معلوم ہوتا ہے) دستخط کر دیا اور انکار نہیں کیا گوا اپنے والد محترم کے دباؤ سے ہی ایسا کیا یہ اگر اہ نہیں ہے، لہذا تصدیق طلاق نامہ ہو کر طلاق واقع ہو گئی، چاہے سعید الدین کا دلی ارادہ طلاق دینے کا رہا ہو یا نہ رہا ہو، ”السکوت فی معرض البیان بیان“ (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود علی عنہ

۱- ”ولو استکذب من آخر کتابا بطلانها وقرأه علی الزوج فاحلله الزوج وختمه وعبوله وبعث به إليها فاداهما وقع ان الفروج الہ کتابہ“ (رد المحتار علی الدر ۳/۵۶۳، مکتبہ ذکریا)۔

بیوی کا میکہ میں رہنا طلاق کی دلیل نہیں:

ایک مرد نے چار شادی کی پہلی بیوی اسکی زندگی میں مرگئی اور اس کے کوئی بچہ نہیں ہیں اور دوسری بیوی بھی اسکی زندگی میں مرگئی اور ان کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں اور تیسری بیوی سے ایک لڑکا ہے اس کے بعد تیسری بیوی کی موجودگی میں چوتھی شادی کر لی تیسری چوتھی بیوی کے اختلاف کی وجہ سے تیسری بیوی اپنے والد کی موجودگی میں بغیر رضامندی اپنے میکہ چلی گئی اور تقریباً ۲۹ سال سے اب تک میکہ ہی میں رہ رہی ہے، مرد کا انتقال دسمبر ۶۵ء میں ہو گیا ان ایام میں مرد نے کوئی خرچ بیوی کو نہیں دیا اور نہ کبھی ملاقات ہوئی باوجودیکہ میکہ صرف قریب ۴ میل دوری پر ہے، پتہ چلا کہ مرد کو اس طرح میکہ جانے پر سخت خفگی ہوئی اور انہوں نے اپنے بڑے بھائی کے ذریعہ ایک طلاق نامہ تیسری بیوی کے نام روانہ کیا جو گاؤں کے ایک معتبر دیندار آدمی کو دیا گیا جس کو انہوں نے ان تک پہنچا دیا وہ شخص موجود ہیں اور یاد دہانی کے مطابق اس عذر کا اعتراف کرتے ہیں ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس خط کے اندر کیا لکھا تھا مجھے علم نہیں، مرد کے بڑے بھائی کی بیوی موجود ہیں اور کہتی ہیں کہ ان کے شوہر طلاق نامہ لے کر گئے تھے اس کے برعکس تیسری بیوی یہ کہتی ہے کہ میرا طلاق نہیں ہوا اور موجودہ چوتھی بیوی بھی کہتی ہے کہ طلاق ہو چکا ہے، مرد کی کچھ جائیداد کے سلسلے میں بات کرتے ہوئے تیسری بیوی کے لڑکے نے دوسری بیوی کے لڑکوں سے اظہار کیا کہ ہاں طلاق تو ہو چکا ہے اس وجہ سے ماں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا ہے لیکن اب طلاق سے انکار کرتا ہے، دوسری بیوی کے بالغ بچوں کے سامنے بھی والد کی موجودگی میں طلاق کی بات ہوئی تھی کہ میری بیوی کو طلاق ہو چکا ہے اس کے بعد مرد نے تقریباً ۳۴ یا ۳۵ سال بعد جب تیسری بیوی کا بچہ کچھ بڑا ہو گیا جو اپنی ماں کے ساتھ میکہ میں رہ رہا تھا اس بات کی کوشش کی کہ وہ لڑکا بھی والد اور بڑے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ رہے، لیکن اس کی ماں نے بچہ کو اپنے گھر آنے سے روک دیا جس کی وجہ سے اب تک وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنے مانی ہال میں ہی ہے، تیسری بیوی کبھی بھی کسی خوشی ورنج کے موقع پر شریک نہ رہی اور مرد کی آخری دو سال کی سخت علالت و انتقال میں بھی شریک نہ رہی اب آیا طلاق واقع ہوا یا نہیں؟

شیم احمد ۱۹۰، اے پہاڑیوں اعظم گڑھ

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئلہ کا شرعی حکم یہ ہے کہ نکاح ہوا یقینی اور منکوحہ ہوا بھی یقینی اور منکوحہ کا وارث شرعی از نص قرآنی یقینی،

اس لئے جب تک اسی درجہ میں طلاق دینا بھی یقینی نہ ہو شرعاً وراثت منصوصہ سے محروم نہیں کی جاسکتی (۱)، اور صورت مسئولہ میں طلاق نامہ کا خط کون لے گیا یا کس طرح بھیجا گیا معلوم نہیں، گاؤں کے جس معتبر آدمی کو دینا بیان کیا ہے اس کو معلوم نہیں کہ اس خط میں کیا لکھا تھا۔ بڑے بھائی کی بیوی کا یہ کہنا کہ شوہر طلاق نامہ لے کر گئے تھے اور یہ جملہ سوال کے سابق جملہ (ک) طلاق نامہ روانہ کیا تھا کے متخالف ہے، دوسرے برہمیل تسلیم مفید شہادت نہیں بالخصوص جب تیسری بیوی اپنے طلاق سے منکر ہے، اسی طرح چوتھی موجودہ بیوی کا یہ کہنا ہے کہ طلاق ہو چکا ہے، اسی طرح تیسری بیوی کے لڑکے کا دوسری بیوی کے لڑکوں سے اظہار کرنا کہ طلاق ہو چکا ہے، اسی طرح دوسری بیوی کے بالغ بچوں کے سامنے والد کی موجودگی میں طلاق کی جو بات ہوئی یہ سب ان میں سے کوئی بھی ایقان طلاق کی شہادت نہیں ہے بلکہ محض خبر ہے نہ معلوم اس خبر کی بنیاد کیا ہے، اس لئے یہ جملے بھی مفید اثبات طلاق نہیں ہو سکتے ہیں، اسی طرح تیسری بیوی کا رنج و خوشی میں شریک نہ ہونا یا تیمارداری یا انتقال کے موقع پر شریک نہ ہونا یہ سب کوئی بھی ایقان طلاق یا وقوع طلاق کا ثابت کرنے والا نہیں، نیز بغیر مرضی و اجازت شوہر چلے جانے سے محض نفقہ ساقط ہوتا ہے حق وراثت یا مہر ساقط نہیں ہوتی، پس خلاصہ کلام یہ نکالا کہ شوہر کے انتقال کے پندرہ سال بعد یہ نزاع اٹھی اور انہیں ثبوت طلاق کے معتبر اور یقینی دو شاہد پیش نہ ہو سکے جو ثبوت طلاق ہوتے اور عورت خود طلاق سے منکر ہے پس اس صورت میں عورت کے حلف پر شرعاً عائد ہوگا، اگر عورت تاضی کے سامنے کھلف کہہ دے کہ مجھے طلاق نہیں ہوئی تھی تو وہ وراثت شرعی اور حق شوہری کی مستحق ہوگی ورنہ مستحق نہ ہوگی، یہی حکم مہر کے بارے میں بھی ہوگا کہ اگر ثبوت شرعی سے ادائیگی یا معافی ثابت نہ ہو تو تقسیم ہرگز سے قبل مہر کی بھی مستحق ہوگی (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۲/۱۳۰۱ھ

بحالت حمل تین طلاق کا حکم:

شوہر نے بحالت بیماری جب کہ بیوی حمل سے تھی تین طلاق دیدیا ہے عرصہ آٹھ ماہ کا ہو گیا ہے، پھر اس بیوی کو دوبارہ نکاح میں لانا چاہتا ہے۔ یہ جائز ہے یا کہ نہیں؟

۱- "ما ثبت بالیقین لا یرفع إلا بیقین، والمراد به غالب الظن" (الاشباہ والنظائر طبعہ کراچی ص ۹۰)۔

۲- عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن النبي ﷺ قال في خطبه: "البينة على المدعى واليمين على المدعى عليه" (سنن الترمذی کتاب الاحکام ۳/۶۱۷ حدیث ۱۳۲۱)۔

الجواب وبالله التوفیق:

جب تین طلاق دیدیا تو اب بغیر حاملہ کے شوہر اول کے لئے کسی طرح حلال نہیں ہو سکتی۔ طلاق حمل میں بھی واقع ہو جاتی ہے، حاملہ یہ ہے کہ عورت اس طلاق کی عدت (وضع حمل) گزار کر دوسرے شخص سے نکاح کر کے اس کے ساتھ رہیں، بستر ہو اور پھر وہ شوہر ثانی مرجاوے یا طلاق دیدے تو اس کی عدت گزارنے پر شوہر اول کے لئے حلال ہوگی (۱)، بغیر اس کے نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۱۴۱۰ھ

طلاق کے بعد عدت واجب ہے:

زید کے گھر میں ایک عورت عرصہ ڈیڑھ سال سے بلا طلاق آگئی تھی کیوں کہ اس کا شوہر کسی وجہ سے اس کو نہیں رکھتا تھا اور نہ طلاق ہی دیتا تھا، اس لئے عورت کو والدین نے زید کے یہاں بلا طلاق بھیج دی تھی، زید سے اس عورت کی ایک لڑکی بھی پیدا ہوگئی ہے جو کہ انتقال کرگئی ہے، اب ۱۷ نومبر کو مذکورہ عورت کے شوہر نے کچھ روپیہ لے کر طلاق دیدی ہے عورت کو تین ماہ سے زید کا حمل بھی ہے جو زید ہی کے نطفہ سے ہے، دریافت طلب یہ امر ہے کہ عورت مذکورہ کے لئے ابھی عدت بھی ضروری ہے یا کہ نہیں یا فوری اس حالت میں زید سے نکاح پڑھا دینا ضروری ہے یا کہ نہیں جبکہ نطفہ زید سے ہی ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

عورت مذکورہ کے لئے اب بھی عدت گزارنی ضروری ہے اور صورت مذکورہ کا حکم یہ ہے کہ وہ اور عورت دونوں فوراً الگ الگ ہو جائیں ہرگز ایک دوسرے کے سامنے نہ آئیں اور اگر آپس میں نکاح کرنا یا تعلق زن و شوئی قائم کرنا چاہتے ہیں تو چونکہ عورت حاملہ ہے اس لئے اس کی عدت وضع حمل ہے (۲) اس لئے بچہ پیدا ہونے کے بعد دونوں آپس میں نکاح پڑھا کر تعلقات زن و شوئی قائم کریں، اس کے خلاف ہرگز نہ کریں ورنہ سخت عذاب اور گناہ میں مبتلا ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود علی عطاء مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ”فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره“ (سورۃ البقرہ ۲ رکوع ۱۳)، ”واولات الاحمال اجلهن ان يضعن حملهن“ (سورۃ الطلاق ۲۸/۳)۔

۲- ”واولات الاحمال اجلهن ان يضعن حملهن“ (سورۃ الطلاق آیت ۲۸/۳)۔

والدین کا طلاق دینے پر اصرار:

زید کے چھ بچے ہیں، لڑکے اور لڑکیاں ان میں سے ایک لڑکے نے خلاف شرع ایک لڑکی سے تعلقات کر رکھے تھے جس وقت اس کے والدین کو علم ہوا لڑکے کو سمجھایا اور روکا گیا، جب اس بات کا لڑکی اور اس کی ماں کو علم ہوا تو زید کے لڑکے کو انہوں نے بہکا سکھا کر باپ کا روپیہ مال چوری کر کر اس کو گھر سے فرار کرنے پر آمادہ کیا اور یہ حرکت لڑکے سے کر اگر لڑکی ماں اور بھائی نے مل کر زید کے لڑکے سے نکاح کر دیا اور اس نکاح میں لڑکی کا باپ بھی ناراضگی کی وجہ سے شریک نہیں ہوا اور لڑکے کے والدین بھی دونوں باتوں کی وجہ سے ناراض ہیں، ایک تو باپ کا مال چوری کر کے یہ کام کیا لڑکی کا والد کافی عرصہ سے بدنام ہے، خلاف شرع اور خلاف قانون باتوں کی وجہ سے، اس لئے لڑکے کے والدین کا اصرار ہے کہ یہ رشتہ ختم کر کے اگر لڑکا معافی مانگ کر گھر آنا چاہے تو اس کو اجازت ہے، ایسی حالت میں زید کو سمجھایا گیا ہے کہ اب نکاح ہو چکا ہے کسی کے گھر کو توڑنا اچھا نہیں ہے اور خلاف شرع ہے لڑکے کا باپ ابراہیم علیہ السلام اور اسمعیل کی مثال پیش کرتا ہے اور کہتا ہے اگر لڑکے نے ایسا نہ کیا تو میں اس کو تمام قسم کی اپنی املاک سے محروم کر دوں، ایسی حالت میں شریعت کیا کہتی ہے۔ بیٹو! تو حیر و

الجواب وبالله التوفیق:

جب دونوں میں نکاح اور مناسبت دونوں باتیں ہو چکیں اور لڑکی کا باپ بدنام بھی ہو چکا ہے جس کا اعتراف زید کو بھی ہے اور اس پر ترس بھی کھارہا ہے اور رشتہ منقطع کرانے میں نہ تو چوری کا مال واپس آ سکتا ہے اور نہ لڑکی کے والدین کی بے آمد وئی دور ہو سکتی ہے، بلکہ رشتہ منقطع کرانے میں لڑکے کے اور شراب اور آوارہ ہونے کا بھی خطرہ قوی ہے جس کی حفاظت بھی باپ پر ہے اور برعکس اس کے رشتہ منقطع نہ کرنے میں با امید خدا ظن غالب یہ ہے کہ انشاء اللہ لڑکے کی اصلاح ہو جائے گی اور راہ راست پر آجائے گا اور اپنے کئے پر نادم ہو کر بدرگاہ رب اعزت تو بہ و استغفار بھی کرے گا اور ایسی صورت میں زید کا سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی مثال پیش کرنا بے موقع ہے، اس لئے زید کے لئے بہتر یہ ہے کہ اب دونوں کا نکاح باقی رکھتے ہوئے لڑکے کو آنے کی اجازت دے دے اور کسی اللہ والے عالم دین سے تعلق اصلاح قائم کرادے کہ وہ اس کو علم دین اور دینداری سکھاتا رہے اور اصلاح کرتا رہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود علی عمنہ

بیوی کے لئے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنا:

میری (محمد مسلم) شادی عرصہ پچاس سال ہوتا ہے ہوئی اور آج سے دو برس قبل تک میری ازدواجی زندگی نہایت ہی اطمینان بخش رہی، میں صاحب جائیداد ہوں، اپنی بیوی (عشرت النساء) کے اصرار پر اور چند مصالحتوں کی بناء پر اپنی کل جائیداد اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیا، چونکہ میں نوکری پیشہ تھا اور کوئی اولاد نہ بنی بھی نہیں تھی، اب جائیداد حاصل کرنے کے بعد میری گریہ سستی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے اور میرے ساتھ رہنا سہنا چھوڑ کر اس گاؤں میں دوسری جگہ دوکان کر کے اپنی زندگی بسر کر رہی ہے اور میں جسمانی طور سے مجبور ہونے کی وجہ سے ان دنوں درپردہ کی ٹھوکر کھا رہا ہوں۔

میری بیوی کی طرف سے طلاق کی مانگ ہے، مگر میں اس وقت تک طلاق نہ دینے کے حق میں ہوں جب تک وہ میری جائیداد میرے حوالہ نہ کر دے اور وہ چونکہ جائیداد کا بیعنامہ کر چکی ہے، اس لئے وہ مجھ کو واپس نہیں مل سکتی ہے عنداشرع میرے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

اگر واقعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو عشرت النساء سخت غلطی کر رہی ہے، اپنے لئے غضب خداوندی کا سامان کر رہی ہے، ایسی عورت جو اپنے شوہر کو بلاوجہ شرعی ماریش رکھے اس پر اللہ رب العزت کا غضب ہوتا ہے، صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ملائکہ اس پر لعنت بھیجتے ہیں، عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ: "إذا دعی الرجل امرأته إلى فراشه فأبت فبات غضبان لعنتها الملائكة حتی تصبح" متفق علیہ (۱)، اس عورت کی دنیا کیساتھ آخرت بھی خراب ہو جاتی ہے خسر الدنیا والاخرہ اللہ ہر مسلمان کو اس سے بچائے، عشرت النساء پر لازم ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے اور اس کو راضی اور خوش رکھنے کی انتہائی سعی و کوشش کرے اور شیطانی نرغہ میں نہ پڑے، عورت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ حد شرع میں رہتے ہوئے اپنے شوہر کو خوش رکھے، شوہر کو خوش رکھنے سے جنت ملتی ہے اور محمد مسلم پر لازم ہے کہ اگر اس کی عورت اپنے انفعال اور بدتاؤ سے تائب ہو جائے اور اطاعت کرنے اور خوش رکھنے لگے تو اس کے قصور کو معاف کرے اور ادائیگی حقوق میں انتہائی سعی کرے اور اگر عشرت النساء اس کے باوجود سرکشی و نافرمانی سے باز نہ آئے تو مسلم کو جائز ہے کہ وہ

طلاق دیدے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پورا ۸/۸۵۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید محمود علی عہد

زبردستی طلاق نامہ پر دستخط کرانے سے طلاق پڑتی ہے یا نہیں؟

محمد شریف ولد محمد مصطفیٰ عرف مرتضیٰ ساکن شیوپور، بنارس اپنی بیوی سرمن بی بی ولد بنی ساکن رسیدین پور تھانہ جال پور ضلع جو پور کو ویدائی کی غرض سے اپنے سرال گیا اور اپنے سرمنی مذکور سے اپنی بیوی سرمن مذکورہ کی ویدائی کو کہا تو نبی نے صاف انکار کر دیا اور گالیاں دیں اور لکھے ہوئے کاغذ پر دستخط کر دو اور مار کر ہڈیاں توڑنے کی دھمکیاں دیں، پھر اس کاغذ پر محمد شریف سے زبردستی دستخط بھی کر لیا اس کاغذ کا مضمون یہ ہے کہ محمد شریف مقرر ہے اور سرمن بی بی مقرر ہے باہمی تنازع و جھگڑے کی وجہ سے نکاح کو ختم کر کے ایک دوسرے کو طلاق دے دیا ہے اور اب کسی فریق کا کوئی مطالبہ کسی دوسرے کے ذمہ باقی نہیں رہا، اس کاغذ پر محمد شریف اور سرمن بی بی کے دستخط کے ساتھ کاغذ بند و اور گواہوں کے دستخط ہیں، محمد شریف نے دستخط کے وقت بھی یہی کہا کہ میں طلاق نہیں دیتا ہوں، زبردستی دستخط کر رہے ہو یہ ٹھیک نہیں ہے، اس کاغذ پر محمد شریف اور سرمن بی بی کے بھی دستخط ہیں، سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ محمد شریف سے زبردستی دستخط لیا گیا ہے، شرعاً سرمن بی بی پر طلاق پڑی یا نہیں اور اگر پڑی تو کس قسم کی رجعی یا بائن۔

(نوٹ) ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی ہے، ایک دوسرے مولوی صاحب کہتے ہیں کہ مکمل ایک طلاق رجعی ہوئی، ایک تیسرے مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ طلاق بائن پڑ گئی مکمل۔

الجواب وبالله التوفیق:

اگر واقعہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے اور محمد شریف نے دستخط کرتے وقت بھی یہی کہا ہے کہ میں طلاق نہیں دیتا ہوں زبردستی دستخط کر رہے ہو یہ ٹھیک نہیں ہے تو چونکہ محمد شریف نے نہ زبان سے طلاق دی اور نہ طلاق نامہ ہی کی تصدیق کی بلکہ اس نے طلاق نامہ کی تردید کی اور بلا تصدیق ایک لکھے ہوئے کاغذ پر محض دستخط کرنا کوئی شئی نہیں ہے۔ کما ہوا اظہار علی من لہ ادنی فہم، اس لئے صورت مسئلہ میں زوجہ محمد شریف پہ کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ہے جن لوگوں نے وقوع

طلاق کا حکم دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود علی عمنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

کیا حالت حیض میں وطی کرنے سے عورت پر طلاق واقع ہو جاتی ہے؟

مسماة عائشہ خاتون بنت احمد حسن کا نکاح محمد عبدالقدوس سے تقریباً تین سال قبل ہوا ہے فی الحال وہ بیان کرتی ہے کہ میری شادی ہونے کے بعد ہی سے میرا شوہر مذکور حالت حیض میں بھی مجھ سے جماع کرتا رہا میں نے منع کیا اور کہا کہ عالم سے سنا ہے کہ حیض کی حالت میں وطی کرنا حرام ہے وہ نہیں مانتا ہے بلکہ غصہ ہو کر کہا کہ میرے لئے یہ سب کچھ نہیں ہے، ایسی باتیں مت بولو، آخر مجبور ہو کر اپنے سر اور ساس سے بیان کیا، اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہونے کی غرض سے پڑوں کی عورتوں سے بھی بیان کیا، لیکن کسی طرح سے وہ رکتا نہیں ہے اور میرا شوہر نماز بھی نہیں پڑھتا ہے، ایسے شوہر کے یہاں میں نہیں رہوں گی خودکشی کر لوں گی وہ عورت میکہ چلی گئی ہے اور واضح ہو کہ علماء اور پبلک میں دلفریق ہو گئے ہیں، ایک فریق کہتا ہے کہ اس کا شوہر جبکہ قصد حیض کی حالت میں باوجود بارہا منع کرنے کے بھی بے پردہ حرمت قطعہ پر اصرار کرتا رہا تو گویا وہ حال سمجھ کر ہی حالت حیض میں وطی کرتا رہا ہے بایں وجہ وہ شخص کافر ہو گیا ہے اور اس کی بیوی مذکورہ پر طلاق بائن واقع ہو چکی ہے، اب عورت کو اختیار ہے کہ دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی چنانچہ شرح فقہ اکبر (ص ۱۸۵) میں ہے: ”الاستہانۃ بھا کفر بان یعلما ہنیئۃ سہلۃ و یرتکبھا من غیر مبالاۃ بھا ویجریھا مجری المباحات فی ارتکابھا“ اور صاحب البحر الرائق نے الفاظ کفریہ میں تحقیر الذنب لفظ کو شامل کر کے آخر میں ”یکون کفرا“ کہا ہے اور شرع عقائد نسبی میں ”الاستہانۃ بھا کفر“ ہے، اور ”مالا بدمنہ“ اور خلاصہ الفتاویٰ اور فتاویٰ رشیدیہ وغیرہ میں بھی اس کی تائید کی ہے اور چونکہ اس واقع میں عورت کا قول شرعاً مقبول ہے، اس وجہ سے کہ یہ ”مملہ“ ”مالا یطلع علیہ الرجال“ کے ہے وغیرہ۔

اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ اس کے شوہر کو صرف استغفار اور کچھ صدقہ لازم ہے اور کچھ نہیں ہے فقط اب علماء کرام سے دریافت طلب یہ امر ہے کہ صورت مذکورۃ الصدر میں کس فرقہ کا قول شرعاً مقبول ہے اور کس کا نہیں ہے اور عورت کا قول شرعاً

۱- ”وفی البحر أن المراد الإكراه علی التلفظ بالطلاق فلو أكره علی أن یکسب طلاق امرء وہ فکسب لا یطلق لأن الکتابۃ ألبست مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا کلاماً فی الخابیة“ (رد المحتار علی الدر ۴۰۳، ۴۰۴، مکتبہ زکریا)۔

مقبول ہوگا یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

کسی مسلمان کو کافر قرار دینا امر عظیم ہے، کسی کے قول میں جب تک سو میں ایک احتمال بھی مومن رہنے کا ہوگا اس کو کافر کہنا جائز نہ ہوگا احتیاط کرنا واجب ہے، اگر کسی نے احتیاط نہ کی اور کافر کہنے میں عجلت کر دیا اور حقیقتہً وہ عند اللہ مومن تھا تو وہ کفر لوٹ کر اسی کافر کہنے والے پر آجاتا ہے (والعیاذ باللہ منہ) (۱) صورت مسئلہ میں حسب تحریر سوال عبدالقدوس جذبات کا شکار ہے اور اس کا یہ قول کہ میرے لئے یہ سب کچھ نہیں ایسی باتیں مت بولو، اول تو اس کی کہنے والی محض عورت ہے اور کوئی کواہ اس پر نہیں ہے، دوسرے اگر صحیح بھی تسلیم کر لیں تو یہ جملہ مستلزم کفر کو نہیں ہے جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ”وقیل لا یکفر فی المسئلۃین وهو الصحیح خلاصۃً وعلیہ الموعول لانه حرام لغيره لما فی المرتدانه لا یفتی بتکفیر مسلم کان فی کفره خلاف ولو رواۃ ضعیفۃ“ (رد المحتار علی ہاشم الثانی ج ۱/ ۲۳۷ وکھبرا محمد فی الثانی فی باب الخلع) (۲)۔ ”وفی الطحطاوی علی السراقی ۷ بعد بحث طویل: فعلی هذا لا یفتی بکفر مستحلہ (ای الوطی فی الحيض ناقل) لانه حرام لغيره وهو الاذی“ (۳)۔

لہذا صورت مسئلہ میں عبدالقدوس کو کافر نہ کہیں گے اور نہ اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگی، البتہ اگر اس کی بیوی کو نجر بہ اور حالات سے ظن غالب ہے کہ وہ پھر اس حرام میں مبتلا کرے گا تو اس کے پاس نہ جائے تا آنکہ اس کو اپنی حفاظت کا اطمینان شوہر کے حالات سے نہ ہو جائے اور اس درمیان کے مان و نفقہ و جملہ حقوق واجبہ کی وہ مستحق رہے گی، ہاں اگر شوہر کے سدھار سے بالکل مایوسی ہو جائے یا الگ اپنی زندگی با عصمت گزارنی دشوار دیکھتی ہو تو اس کو یہ بھی حق ہے اور اختیار ہے کہ اس سے طلاق حاصل کر لے یا خلع کر لے اگر شوہر اس پر بھی تیار نہ ہو تو جماعت مسلمین شرعی پنچائیت کے یعنی کم از کم دیندار با وقار معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت بنا کر جو شرعاً فاضل شرعی کے قائم مقام ہوتی ہے اور اس قسم کے معاملات میں فیصلہ کا حق رکھتی ہے، معاملہ اس کے سامنے رکھ دے تا کہ معاملہ اسکے سامنے طے ہو جائے اور درخواست تفریق کرے وہ

۱- قال رسول اللہ ﷺ: ”ایما امرئ قال لایخبر کافر فقد باء بها احدهما ان کان کما قالت والا رجعت علیہ“ (مسلم شریف ۱/ ۵۷، مطبع جمعہ دیوبند)۔

۲- رد المحتار علی الدرار ۳۹۳، باب الخلع مکتبہ زکریا۔

۳- ”ویستلواک عن المحض قل هو اذی فاعزلوا النساء فی المحض ذلہ لبترة آیت ۲۲۲)۔

جماعت مسلمین حسب قواعد شرعیہ جملہ کاروائی بیان وثبوت وشہادت وغیرہ مرتب کر کے تفریق واقع کر دے یہ تفریق بھی درست ہوگی اور اس کے بعد عورت تین حیض گزار کر اپنا دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔

(تنبیہ) عبدالقدوس پر اس فعل سے باز آ جانا اور خدا کے دربار میں توبہ اور استغفار کرنا اور آئندہ ایسا نہ کرنا بہر حال واجب ہے خواہ اس عورت سے پھر تعلق ہو یا نہ ہو۔

(تنبیہ) اس جماعت مسلمین کو چاہئے کہ الحیلۃ الناجزۃ بھی سامنے رکھ کر تمام کارروائیاں اور فیصلہ مرتب کرے اور اس میں کوئی متدین واقف بالمسائل عالم بھی شریک ہو۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود علی عزم دارالعلوم دیوبند

مبالغہ کی طلاق کا حکم:

میرے لڑکے کا نکاح ہوا تھا مگر لڑکا اور لڑکی دونوں مبالغہ تھے، دونوں کے والدین میں ما اتفاق پیدا ہوگئی اور تحریری طلاق آئی اور طلاق پر لڑکے کا انگوٹھا لگا ہے اور اس کے بعد جس لڑکی سے نکاح ہوا تھا اسکے والدین نے دوسری جگہ نکاح کر دیا ہے مگر وہاں لڑکی جانا نہیں چاہتی ہے، اس وقت لڑکی مبالغہ ہے اور وہ لڑکی وہیں آگئی ہے جہاں سے طلاق آئی تھی جہاں لڑکی کا نکاح ہوا وہ قطعی رضامند نہیں ہے، اس لئے عریضہ ہذا آپ کی خدمت میں تحریر ہے کہ دوبارہ نکاح کیا جاوے یا کہ نہیں چونکہ پہلی طلاق مبالغہیت میں آئی تھی۔

الجواب وبالله التوفیق:

مبالغہ لڑکے کا نکاح پر بھانے کا حق تو والد کو ہے مگر اس کے طلاق دینے کا حق کسی کو نہیں ہے نہ والد کو نہ خود مبالغہ لڑکے کو جب تک ببالغ ہو کر لڑکا خود طلاق نہ دے، لہذا مبالغہی میں جو تحریری طلاق نامہ مبالغہ لڑکے کے انگوٹھے کا نشان لگا کر آیا ہے وہ صحیح نہیں ہے، اس سے کوئی طلاق نہیں پڑی ہے (۱)، اور لڑکی کا نکاح جو اس کے باپ نے دوسری جگہ کیا ہے وہ بھی صحیح

۱- کما فی شرح الصویر: "واہلہ زوج عاقل بالغ مسبقظ وفي الشاہ، وقولہ واهلہ زوج عاقل الخ) احتوز بالزوج عن مبد العبد ووالد الصغیر وبالبالغ عن الصبی" (رد المحتار علی الدرر ۳/۳۱۸، مکتبہ زکریا دیوبند) "یقع طلاق کل زوج اذا کان بالغا عاقلا سواء کان حوا او عبدا طائعا او مکوها" (کذا فی الجہم المیرۃ، الفتاویٰ الہندیہ ۱/۳۵۳، مکتبہ دارالکتاب دیوبند) "ولا یقع طلاق

نہیں ہوا ہے بلکہ لڑکی علیٰ حالہ اپنے شوہر کی بیوی باقی رہی اور ہے، لہذا لڑکی کا بایع ہونے کے بعد اپنے پہلے شوہر ہی کے پاس آجانا صحیح و درست رہا و با رہ نکاح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علیٰ عنہ

تم کو طلاق دیئے چھوڑ دیئے کہنے سے کتنی طلاق پڑی؟

میاں اور بیوی آپس میں جھگڑا اور تکرار کرتے ہوئے میاں نے بیوی سے غصہ میں کہا تم کو طلاق دیدیئے ایک مرتبہ طلاق کا نام لیا ہے اور دو مرتبہ کہا تم کو چھوڑ دینے تم کو چھوڑ دینے، بیوی حاملہ ہے اور اسی تاریخ سے بیوی میاں سے الگ رہتی ہے۔

لہذا دریافت طلب یہ ہے کہ مندرجہ بالا الفاظ سے کونسی طلاق واقع ہوئی ہے، اب شوہر کی خواہش ہے کہ بیوی عقد میں رہے لہذا اب عقد میں لانے کے لئے شوہر کو کیا کرنا پڑے گا، کیا بیوی سے عقد ٹانی پڑھانا پڑے گا یا اور کوئی صورت ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

تم کو چھوڑ دینے کا لفظ بھی طلاق صریح ہے، لہذا صورت مسئلہ میں تینوں طلاق پڑ کر حرمت مغلطہ ہوگئی، اب بغیر حاملہ کے کوئی صورت عقد میں لانے کی نہیں اور حالہ یہ ہے کہ اس طلاق مغلطہ کی عدت (وضع حمل ہے) گزر کر یعنی جب عورت کے بچے پیدا ہو چکے اس کے بعد عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس سے ہم صحبت ہو اور پھر وہ فوت ہو جائے یا طلاق دیدے اور اس کے بعد اس کی عدت (تین حیض) اور اگر حاملہ ہو تو وضع حمل ہو جائے جب اس شوہر اول کے عقد میں آسکتی ہے بغیر اس کے نہیں آسکتی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علیٰ عنہ

الصبی وان کان یعقل“ (ہندیہ ۱/۳۵۳، دارالکتاب دیوبند)۔

۱- ”واولات الاحمال اجلهن ان یضعن حملهن“ (سورة الطلاق: ۴۰)، ”فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره“ (سورة البقرہ آیت ۲۳۰)۔

بذریعہ تحریر وقوع طلاق کے لئے کیا گواہ کا ہونا ضروری ہے؟

طلاق نامہ کی تحریر سے طلاق کا ثبوت ملتا ہے لیکن اس پر گواہ نہیں ہے، ایسی صورت میں جبکہ طلاق نامہ غیر ملک سے یہاں آیا ہو بغیر گواہ کے طلاق قطعی ہوگئی ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے جبکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس کو زوج نے خود لکھا ہے، یا اس کے حکم سے لکھا گیا ہے: ”إن أرسل الطلاق بأن كتب أما بعد فانت طالق فكما كتب هذا يقع الطلاق“ (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔
ہندہ محمد سکندر علی ۲۳ پرگنوی معظم دارالعلوم دیوبند ۱۳۸۵ھ

اگر نشان تحریر سے نیز گزشتہ حالات و واقعات سے یہ یقین ہو جائے کہ یہ خط اسی کا ہے یا اسی کے حکم سے لکھا گیا ہے جب تو یہ حکم مذکور ہوگا۔ اور قرآن سے شبہ ہو جائے کہ شاید خط جعلی ہو تو اس کے پاس پھر خط لکھ کر تحقیق کر کے حکم لگایا جائے جلدی نہ کی جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۱۳۸۰ھ

ما جائز تعلق کے شبہ کی وجہ سے طلاق دینے اور بچہ کے نسب و پرورش سے متعلق:

زید کی بیوی جس کا فرضی نام مریم ہے، کچھ عرصہ قبل اپنے خاندان والوں سے مریم کا جھگڑا ہوا، مریم نے زید کی بیوی پر الزام لگایا کہ وہ کسی غیر مذہب کے آدمی سے ما جائز تعلق رکھتی ہے اور اس کا حمل بھی تو اراپا گیا ہے زید کو اس کا علم نہیں تھا۔ کیونکہ وہ بمبئی میں ملازم تھا چھ ماہ کے بعد زید بمبئی سے گھر واپس آیا، ماہ اپریل میں دو ہفتہ اپنی بیوی کے پاس رہا جب زید کو اپنے رشتہ داروں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مریم جو زید کی بیوی ہے اس کو کسی غیر مذہب والے شخص سے ما جائز تعلق ہو گیا ہے اور حمل سے بھی ہے، زید نے اپنی بیوی سے اسی وقت علیحدگی اختیار کر لی، چنانچہ زید اپنی بیوی پر الزام لگاتا ہے اور زید اس کو قطعی طلاق دینا چاہتا ہے، لیکن بچوں نے فیصلہ وضع حمل تک روک رکھا تھا ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو بچہ پیدا ہو گیا ہے اور زید بمبئی

۱۔ فتاویٰ مانگیری علی الحائمی ۱/ ۳۷۸، مطبع رشیدیہ پاکستان۔

سے ۷ اپریل ۱۹۶۱ء اپنے مکان آیا ہے، اس لحاظ سے حمل اور پیدائش کے درمیان ۶ ماہ اور ۹ دن ہوتے ہیں عام طور پر بچہ نو ماہ میں پیدا ہوتا ہے زید ان حالات کی وجہ سے طلاق دینا چاہتا ہے۔

- (۱) ان وجوہات و واقعات کی بنا پر زید کا الزام زنا لگانا درست ہے یا کہ نہیں؟
- (۲) اگر جرم عائد ہو جائے تو موجودہ زمانہ میں جب کہ ہمارے لئے شرعی عدالت میں کسی قسم کی سزا نہیں دی جاتی ہے۔ اب کیا سزا دی جائے۔

(۳) مریم کی موجودہ اولاد کی پرورش کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

(۴) اب مریم کو حیرل سکتا ہے یا نہیں؟

(۵) اگر اسی طرح کا جرم ثابت ہو جائے تو کیا شوہر کے ذمہ مہر واجب الادا ہو سکتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) جب زید کے آنے کے بعد ۶ ماہ سے زائد پر بچہ پیدا ہوا تو زنا کی تہمت بلا دلیل شرعی لگانا جائز نہیں ہے، بچہ حالی کہلائے گا اور زید کی طرف منسوب ہوگا اور زید کے مال سے وراثت پائے گا (۱)، رہا طلاق تو مریم کے چال چلن کا اندازہ لگائے اگر وہ محتاط طریقہ سے رہتی ہے اور الزام بلا کسی حجت شرعی کے لگے ہیں تو الزام کی پرواہ نہ کرنا چاہئے اور طلاق نہ دینا چاہئے، کیونکہ طلاق بلا وجہ شرعی کے شریعت میں بڑی سخت چیز ہے خداوند قدوس کے غضب کا سبب ہے۔

(۲) سیاق و سباق سول سے ظاہر تو یہی ہے کہ یہ الزام بلا حجت شرعی محض جھگڑے کی بناء پر ہے، لیکن اگر شرعاً ثابت بھی ہو جائے تو کسی جسمانی یا مالی سزا کا اختیار صرف حکومت کو ہوتا ہے کسی اور کو نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں مریم پر خود واجب ہے کہ وہ نہایت عاجزی اور ندامت کے ساتھ اللہ رب العزت کے دربار میں رور و کر اپنے گناہوں کی معافی مانگے، توبہ و استغفار کرے اور کہے کہ اے اللہ اب ایسا نہیں ہوگا معاف کر دیجئے اور واقعی آئندہ نہ کرنے کا دل سے عہد بھی کر لے۔

(۳ و ۴ و ۵) اگر مریم کو طلاق نہ دیا جب تو حکم ظاہر ہی ہے کہ جیسے اور ماں باپ کا حکم ہے ویسے ہی اس کا بھی۔ اور اگر طلاق دیدے تو مدت ضمانت کم و بیش ۷ برس تک یعنی جب تک بچہ خود قضاے حاجت اپنی طہارت و لباس پوشی نہ کرنے

۱۔ ”وَأَلْفَها مئة ألفھو إجماعاً (فیہیت نسب) والدہ“ (الدر المختار علی الرد ۵/۲۳۰، مکتبہ زکریا، جامع صفیر ۶۰، مطبع یوسفیہ لکھنؤ، ہدایہ ۴/۳۰۸، کتاب الطلاق مطبع یوسفیہ لکھنؤ، بدائع الصنائع ۳/۳۸۰، مکتبہ زکریا، فتاویٰ خانہ علی البندیہ ۱/۵۵۸، فتاویٰ ہندیہ ۱/۵۳۶، دار الکتاب دیوبند)۔

لگے تربیت و پرورش کا حق ماں کو ہے (۱)، اور اس کا خرچہ باپ کے ذمہ ہے جب تک کہ ماں اپنی شادی بچے کے کسی غیر ذی رحم سے نہ کرے (۲)، اور مہر بھی زید کے ذمہ ہر حال میں واجب الاداء ہے جب تک مریم خود معاف نہ کر دے (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بحالت غصہ طلاق چند بار کہنے کا حکم:

ایک شخص نے بحالت غصہ اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اور دوسرے لواحقین اس بات کے گواہ بھی ہیں۔ طلاق میں تکرار بھی ہوئی ہے یعنی تین مرتبہ اس شخص نے طلاق کے الفاظ دھرائے ہیں مگر اب غصہ اترنے پر وہ نہایت شرمندہ اور پریشان ہے قریب کے مدرسہ جامعہ حسینیہ سے فتویٰ منگایا تو اس میں لکھا تھا کہ طلاق مغلظہ واقع ہو چکی ہے اب دوبارہ نکاح بغیر حائل کے جائز نہیں ہے۔ دوسرے ایک مولوی جو اہل حدیث میں سے ہے ان کا فتویٰ یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی ہے، چاہے کوئی انسان سو مرتبہ یہ کہہ دے کہ طلاق دیدی۔ اب حکم شرع کیا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں حسب تحریر سوال تین طلاق واقع ہو کر حرمت مغلظہ ہو گئی، اب دوبارہ نکاح بغیر حائل کے ہوئے جائز نہیں ہے، حائل یہ ہے کہ وہ عورت بالکل اجنبی ہو گئی اس شوہر سے امید ختم کر دے اور اس طلاق کی عدت (اگر حاملہ ہو تو وضع حمل ورنہ تین حیض) گزرا کر کسی دوسرے شخص سے اپنا نکاح کر لے اور اس کے ساتھ رہے اس سے ہم صحبت ہو پھر وہ دوسرا شخص اگر بتقاضا الہی فوت ہو جاوے یا کبھی طلاق دیدے اور یہ عورت اس طلاق کی عدت بھی (حسب طریق

- ۱- ”وإذا وقعت الفلوة بين الزوجين فالام احق بالولد لما روى ان امرأة الخ“ (ہدایہ ۲/۳۱۳ کتاب الطلاق، مطبع یوسفیہ ککسؤ)، ”والام والجدة احق بالعلام حتی یا کل وحده ویسرب وحده ویلبس وحده لان لمام الاستعلاء بالقدرۃ علی الاستعلاء“ (ہدایہ ۲/۳۱۳، مطبع یوسفی ککسؤ، علی ہودہ ۱۳۱۳ اعتبار الغالب لجن ان الصبی فی الغالب اذا بلغ سبع سنین یتعفی عن الحضائۃ..... عنایت)۔
- ۲- ”والنفقة علی الأب علی ما لذكر، ولا تجبر الام علیه لانیها عست تعجز عن الحضائۃ“ (فتاویٰ ولادہ تارک علی الاب لا یثار ذکر فیہا احد) (ہدایہ ۲/۳۱۳، ۳۲۳) ”وجب النفقة بالوائعها علی الحر (لطفہ) یعم الانثی والجمع“ (رد المحتار علی الدرر ۵/۳۳۶، مکتبہ ذکریہ)۔

- ۳- ”المہر یتأكد باحد معان ثلاث: المدخول والخلوة الصحیحہ وموت احد الزوجین“ (ہند یہ ۱/۳۰۳، دارالکتاب)۔

مذکورہ سابق (گز ار لے اس کے بعد جا کر شوہر اول کے نکاح میں آسکتی ہے بغیر اس کے نہیں آسکتی، جس اہل حدیث مولوی نے فتویٰ دیا ہے کہ غصہ کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی ہے غلط ہے، صحیح نہیں ہے طلاق تو عموماً غصہ ہی کی حالت میں انسان دیتا ہے اور رضا و خوشی میں تو بہت ہی کم اس کا صدور ہوتا ہے۔ مدہوش کی طلاق البتہ واقع نہیں ہوتی ہے، اور صورت مسئلہ میں یہ شخص مدہوش نہیں ہے نیز بہت سے نصوص میں بحالت غصہ طلاق واقع ہونے کی تصریح ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

غصہ میں اگر کوئی طلاق دے تو بلاشبہ واقع ہو جاتی ہے علامہ ثامی نے ابن قیم کے رسالہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ طلاق نضبان کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ غصہ ایسا ہو کہ عقل متغیر نہ ہو اپنے ارادے اور قول کا علم ہو ایسے غصہ میں اگر طلاق دیدے تو تفریق واقع ہو جائے گی اور عورت اس کے نکاح سے آزاد ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ غصہ کا اس قدر غلبہ ہو کہ عقل مغلوب ہو جائے اپنے اقوال و افعال کی خبر نہ ہو تو یہ طلاق واقع نہ ہوگی (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شوہر کا ”تجھ کو طلاق دے دیا“ تین بار کہنا:

صامدہ کا نکاح تو حید خان کے ساتھ عرصہ پانچ سال کا ہوتا ہے ہوا تھا، اس درمیان میں کئی بار لڑکی اپنی سرال گئی، لیکن اس کا شوہر اس کے ساتھ بہت سخت برتاؤ مار پیٹ کرتا ہے۔ ایک بار یہ کہہ کر کہ جائیں نے تجھ کو طلاق دیدیا ہے یہ الفاظ اس نے تین بار کہے اور مار کر گھر سے نکال دیا ہے، اس وقت سے صامدہ ماں باپ کے یہاں ہے اور اس عرصہ میں اس کا شوہر نہ تو لینے آیا ہے اور نہ تو صامدہ کے پاس اس کے شوہر کا کوئی اثاثہ ہے جس سے وہ اپنی زندگی بسر کرے، عورت جو ان عمر ہے اندیشہ رسوائی کا ہے اگرچہ وہ طلاق بھی دے چکا ہے لیکن صامدہ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، شوہر سے کہا جاتا ہے کہ تم طلاق دیدو چار آدمیوں کے سامنے تو وہ اس سے بھی انکار کرتا ہے لہذا ایسے شوہر سے نجات کی کیا شکل ہے؟

۱- ”قلت وللحافظ ابن القيم الحبلی رسالة في طلاق العصبان قال فيها: انه على ثلاثة أقسام: أحدها ان يحصل له مبادى العصب بحيث لا يتغير عقله ويعلم ما يقول ويقصده وهذا لا اشكال فيه، الثاني ان يبلغ النهاية فلا يعلم ما يقول ولا يريده فهذا لا يوجب له لا يفسد شي من قوله الخ“ (رد المحتار على الدرر ۵۲، ۵۳، مکتبہ زکریا)۔

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں اگر صابرہ نے خود اپنے کان سے تین بار شوہر کا یہ جملہ سنا ہے کہ (میں نے تجھ کو طلاق دیا) تو اب صابرہ کے لئے جائز نہیں ہے کہ تو حید خان کو کسی طرح بھی اپنے اوپر قابو پانے دے، بلکہ صابرہ پر واجب و لازم ہے کہ وہ شوہر سے الگ ہی رہے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس سے چھٹکارا کرائے اور عیناً بھی طلاق حاصل کرے، اگر ایسے طلاق نہ دے تو اپنا مہر وغیرہ معاف کر کے خلع کرائے یا بالاکراہ طلاق حاصل کرے۔ اگر تو حید خان سے کسی طرح بھی طلاق حاصل نہ کر سکے تو بلا تعلق ازدواجی قائم کئے اسی طرح پڑی رہے اور صبر کرے لیکن اگر بلا تعلق ازدواجی قائم کئے با عصمت زعمی گزاری نہ ہو تو صابرہ کو اختیار ہے کہ اپنا دوسرا نکاح کسی دوسرے شخص سے کر لے (۱)۔

”وكذلك ان سمعت انه طلقها ثلاثا و جحد الزوج ذلك وحلف فردها عليه القاضي لم

يسعها المقام معه“ (۲)۔

اور اگر تو حید خان کی جانب سے قانون حکومت کے گزند و پریشانی کا خطرہ ہو تو پہلے عدالت مجاز سے اپنا دوسرا نکاح کر لینے کی اجازت حاصل کر لے پھر دوسرا نکاح کرے۔ اور ظاہر ہے کہ چار سال سے اپنے باپ کے پاس میکہ میں بیٹھی ہوئی ہے اور اتنی طویل مدت میں تین حیض آچکے ہوں گے، اس لئے اب مزید عدت گزارنے کی حاجت نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پتہ: ۱۸/۸/۹۰ ۱۳۰ھ

دوسرے طلاق دینے کے بعد منہ بند کر دینے سے کتنی طلاق پڑی؟

حبیب نے اپنی عورت سے لڑائی کیا اور غصہ میں آ کر انہوں نے اپنی عورت کو دوبار طلاق دیدیا تیسری بار زبان سے کچھ نکلنے نہیں پایا تھا کہ ایک آدمی نے اس کا منہ بند کر دیا ہے، پھر اس کی زبان سے صرف یہ لفظ نکلا کہ جاؤ میں تم کو ہر عدت

۱۔ کافی الحائگیری ص ۳۱۳ ج ۵ کتاب النکاح۔

۲۔ ”إذا سمعت المرأة الطلاق ولم تسمع الاستثناء لا يسعها ان تمككه من الوطى والزواج يدعى الاستثناء وفي فوائد خمس الاسلام لا يقبل قوله وفي الفصول وهو الصحيح“ (الی قولہ) قال خمس الائمة السرخسی: ”ما ذكر اليها اذا هربت ليس لها ان تعدو لنزوح بزواج آخر جواب القضاء اما فيما بينه وبين الله تعالى فلها ان تنزوح بزواج آخر بعد ما اعتدت كلما في المحیط لثانی قدیم ۲/ ۷۳، مطبع عثمانیہ)۔

میں تینوں لڑکیوں کو دیدیا ہے، پھر تین آدمی اس وقت موجود تھے ایک مولوی عثمان نے بتلایا کہ جا کر اپنی عورت کو رجوع کرلو۔ تو آیا عندالشرع اس عورت پہ کیسی طلاق واقع ہوئی۔

اور یہاں کے مولوی یہ بھی کہتے کہ طلاق واقع ہوگئی ہے دریافت ہے کہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں حسب تحریر سوال محض دو طلاق رجعی واقع ہوئی تھیں جس سے رجوع کرنے کا حق شوہر کو رہتا ہے (۱)، چنانچہ جناب مولانا عثمان صاحب نے فوراً رجعت کرا دی صحیح کیا اس رجعت سے پھر نکاح قائم ہو گیا۔ حالہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے، ہاں اب اگر آئندہ خدانخواستہ ایک بار بھی طلاق دے گا تو حرمت مغلطہ ہو جائے گی اور بغیر حالہ کے میاں بیوی نہیں ہو سکیں گے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بیوی نے طلاق نامہ نہیں لیا جب بھی طلاق پڑ گئی:

میاں بیوی کا آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ہے وہ مارض ہو کر اپنے میکہ چلی گئی، اس کے شوہر نے پذیرِ یح ذاک طلاق نامہ کا کاغذ بھیج دیا ہے اور وہ کاغذ اس کی بیوی نے لیا نہیں ہے۔ اس صورت میں طلاق ہوگئی ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں بیوی نے اگرچہ طلاق نامہ کا وہ کاغذ نہیں لیا ہے لیکن حسب تحریر طلاق نامہ طلاق واقع ہوگئی (۳)،

۱- "فاذا طلق الزوج زوجته رجعا حل له العود إليها في العدة بالرجعة دون عقد جديد فاذا مضت العدة عاد إليها بعقد جديد فقط" (الموسوعة الفقهية ۲۹/۲۹۹ وزارة الاوقاف والشؤون الإسلامية)۔

۲- "الطلاق مردان فامساك بمعروف أو تسريح بإحسان" (سورة البقرة آیت: ۲۲۹) "فإن طلقها فلا حل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره" (سورة البقرة ۲۳۰)۔

۳- "تم المرمومة لا تخلو أما إن أرسل الطلاق بأن كتب أما بعد فالت طالق فكما كتب هذا يقع الطلاق وتلزمها العدة من وقت الكتابة" (نکاحی ۵۸۹/۲، مطبعة عثمانیہ)۔

پس طلاق نامہ دیکھنا چاہئے اس میں جیسی طلاق اور جتنی طلاق لکھی ہوں اتنی ہی اور ویسی ہی طلاق واقع ہوگئی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

طلاق نامہ وصول نہ کرنے یا واپس آ جانے کے باوجود طلاق پڑ جاتی ہے:

پندرہ سالہ شادی شدہ بالغ زید نے کچھ گھریلو جھگڑے کی بناء پر اپنی منکوحہ بیوی کو جس کے بطن سے چار اولادیں ہیں کسی کے دباؤ میں آ کر بغیر کسی گواہ کے جو کہ دل سے نہیں چاہتا تھا بذریعہ رجسٹری طلاق نامہ روانہ کر دیا ہے اور وہ طلاق نامہ دس پیسہ والے لفافہ پر تھا اب وہ گھر پر موجود نہیں ہے۔ اس پر ڈاکیہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا واپس آ گیا ہے لفافہ بھینچ کر ویسے ہی بند تھا جیسے کہ اس نے روانہ کیا تھا کہیں کھولنے کا شبہ بھی ظاہر نہیں ہوا ہے، زید نے اس کے پیشتر رخصتی کے لئے دونوں بھی روانہ کئے تھے جو کہ وصول ہو گئے تھے زید کو طلاق نامہ روانہ کرنے کا بے حد افسوس ہے کیا یہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

عبارت طلاق نامہ یہ ہے:

بذریعہ نوٹس ہذا آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ ہم نوٹس دہندہ نے آپ کو طلاق دیدیا، طلاق دیدیا، طلاق دیدیا اور آپ کو اپنی زوجیت سے خارج کر دیا ہے۔ ان کے لئے عندالشرع کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

طلاق نامہ کی عبارت دیکھی، اس عبارت کے مطابق تین طلاقیں واقع ہو کر حرمت مغلطہ ہوگئی، خواہ عورت کو اس کی اطلاع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، ڈاک وصول کی یا واپس کی، ان باتوں کا کوئی اثر اس طلاق پر نہیں پڑے گا (۱)۔

”ثم المرسومة لا تخلوا إما إن أرسل الطلاق بأن كتب أما بعد فأنت طالق فكما كتب هذا يقع الطلاق وتلزمها العدة من وقت الكتابة الخ“ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ”وان كانت مرسومة يقع الطلاق لوئى او لم يوصل“ (نکاحی ۵۸۹/۲، مطبوعہ عثمانیہ)۔

شوہر کا طلاق دے چکا ہوں لکھنا:

بندہ گڑھی پختہ میں عرصہ پندرہ روز سے اجازت شوہر کے دہلی سے آگئی ہے، اس کے بعد دہلی سے بذریعہ ڈاک ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ میں طلاق دے چکا ہوں۔ دونوں فریق سامنے ہونے پر کہتے ہیں کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے، اس کے بارے میں علماء دین شرع کا کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال اگر واقعی شوہر نے یہ خط لکھا ہے تو طلاق واقع ہوگئی (۱)، اگر تین طلاق اس میں نہیں لکھا ہے جیسا کہ خط سے ظاہر ہے بلکہ محض یہ لکھا ہے کہ میں طلاق دے چکا ہوں تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی اور دونوں نے جب یکجائی کر لی تو رجعت بھی ہوگئی ہے اور حسب سابق دونوں میاں بیوی باقی رہ گئے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پتہ ۱۹/۸/۱۳۱۰ھ

دوسرے سے طلاق لکھوانے سے بھی طلاق پڑ جاتی ہے:

میرے داماد نے مجھے طلاق نامہ دیا ہے، میں ان کا خسر ہوں طلاق نامہ میں تحریر کیا ہے کہ میں اپنی رقیہ بی بی کو تین طلاق دیتا ہوں ”فاروق علی علوی“ دستخط انگریزی میں اس طلاق نامہ کے پیچھے مولوی حافظ ابراہیم سورت، تحریر کیا ہے۔ جب طلاق نامہ میرے ہاتھ میں دیا تب میں نے چند سوالات کئے کہ معاملہ کیا ہے، بات کیا ہوئی، طلاق دینے کا سبب کیا ہے، خلاصہ پوچھا کہ طلاق نامہ جب ہوا تو کون کون شہد تھے، انہوں نے زبانی جواب دیا کہ دو تین آدمی تھے، مگر طلاق نامہ پر کسی شہد کا دستخط نہیں ہے، یہ طلاق نامہ مجھے دیا اس وقت اس کی عورت بھی حاضر تھی، اس کو بھی یہ کہا نہیں کہ میں تجھے تین طلاق دیتا ہوں۔ آیا اس مسئلہ میں واقعی یہ طلاق نامہ صحیح اور شرعاً ہے یا کہ نہیں۔

(نوٹ) طلاق نامہ اگلے دن دیا گیا اس کے دوسرے روز اس کی مانی لڑکی کو لینے آئی ہے تب ہم نے اوپر کا خلاصہ کیا

۱- ”کم المرمومة لا دخلوا اما ان ارسل الطلاق فان كسب اما بعد فالت طالق فكما كسب هذا يقع الطلاق“ (ہندیہ ۸/۳، الفصل السادس فی الطلاق، کتابتہ، مطلب رشیدیہ پاکستان)، ”وہو كالت طالق و مطلقة و طلقك تقع واحدة رجعية“ (ہندیہ ۸/۳۵۳، رشیدیہ پاکستان)۔

تھا کہ طلاق قائمہ تحریر کرتے وقت وہاں دو تین شاہد موجود تھے اور اس نے مانی کو کہا تھا کہ وہاں کوئی موجود نہ تھا اور میں نے تین طلاق نہیں دی تھی، لڑکے کی عادت ہے کہ وہ پہلے دستخط کرتا ہے، اسی طرح اس نے پہلے دستخط کئے اس کے بعد طلاق قائمہ جناب مولوی صاحب نے تحریر کیا لڑکا قسم کھا کر کہتا ہے کہ مجھے کسی قسم کا علم نہیں۔ اردو لکھنا پڑھنا بھی جانتا نہیں، عندئذ شرع کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق

تحریر سوال سے اتنی بات تو یقینی ہے کہ لڑکا اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا ہے، اس لئے مولوی صاحب سے لکھوایا ہے۔
(۱) اور لڑکے نے خود تحریر اپنے خسر کو دیا یہ قرینہ ہے کہ اس لڑکے کو اس تحریر کے طلاق قائمہ ہونے کا علم تھا۔
(۲) یہ بھی ظاہر اور متبادر ہے کہ لڑکے نے جو کہا ہے وہی مولوی صاحب موصوف نے لکھا ہے ورنہ لڑکا وہ تحریر لا کر اپنے خسر کو نہ دیتا، ہاں یہ محتمل ہے کہ لڑکے نے صرف طلاق قائمہ لکھنے کے لئے کہا ہو اور مولوی صاحب موصوف نے تین طلاقیں لکھ دی ہوں اور لڑکے کو اس تین طلاق کا علم نہ ہو۔

تحریر سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خسر کو دیتے وقت بیوی اگر چہ موجود تھی مگر طلاق قائمہ لکھتے لکھاتے وقت بیوی وہاں موجود نہ تھی، یا تو دوسرے دو تین آدمی تھے یا کوئی دوسرا شخص سوائے مولوی صاحب (کاتب) کے موجود نہ تھا اور ایسی صورت میں لڑکے پر حلف دے کر پوچھا جائے کہ تین طلاق لکھے جانے کا علم لڑکے کو تھا یا نہیں، اگر نہیں تھا تو فقط ایک طلاق رجعی واقع ہوئی اور عورت سے عدت تین حیض کے اندر رجعت بھی کر سکتا ہے اور بعد عدت محض تجدید نکاح سے بلا حائل کے بھی تعلق زن و شوئی قائم کر سکتا ہے اور اگر تینوں طلاقوں کے علم نہ ہونے پر قسم نہ کھائے تو تینوں طلاقیں ہو کر حرمت مغلطہ ہوگئی، اب بغیر حائل کوئی صورت دونوں میں زن و شوئی کے تعلقات کے جواز کی نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۸/۱۴۱۰ھ

طلاق نامہ پر جبراً لکھوٹھا نشان لینے سے طلاق نہیں پڑی:

ایک شخص نے اپنی لڑکی کی شادی کر کے ایک دوسرے سے روانہ کر کے پھر اس نے روک لیا اور کہا کہ طلاق دیدے، لڑکے کے دل میں اس کا خیال نہیں تھا، لیکن لڑکی کے والد نے گھر بند کر کے طلاق قائمہ پر لکھوٹھا لکھوایا ہے اور اس کو یہ معلوم نہ تھا

کہ کس چیز پر انگوٹھ لگوا رہے ہیں، اس وقت اس کی نیت طلاق دینے کی نہیں تھی، کیا عنداشرع طلاق واقع ہوگئی ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

اگر زبان سے الفاظ طلاق نہیں کہلوایا ہے، محض انگوٹھے کا نشان زبردستی لگوا لیا ہے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پتہ ۲۲/۸/۱۰۳۱ھ

ختم کیا چند بار کہنے سے طلاق پڑی یا نہیں؟

کسی منکوحہ کا شوہر جو عرصہ آٹھ سال سے اپنی بیوی بچی کے مان و نفقہ سے بے نیاز ہو، اور اسے اپنے یہاں آباد نہ کرتا ہو۔

اس کی بیوی بچی کے ساتھ اپنے والدین کے یہاں رہتی ہو۔ مانا، مانی اپنی لڑکی اور تو اسی کے مان و نفقہ میں کفیل ہوں تو ایسے شوہر کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ نیز منکوحہ کے شوہر سے آٹھ سال کے مان و نفقہ کا تقاضا بردار جاری ہے، مگر شوہر کو مطلق احساس نہیں ہے۔ مزید برآں شوہر اپنی سرال میں آکر اپنی منکوحہ بیوی سے باوازی بلند مخاطب ہو کر یوں کہے کہ میں نے ختم کیا، ختم کیا۔ تین بار مسلسل یہی الفاظ کہے، جبکہ شوہر کا نظریہ بھی یہ ہو کہ اب اس کو آباد نہ کرے گا۔

تو کیا شوہر کی زبان سے بیوی کے سننے ہوئے الفاظ طلاق کے مترادف ہو گئے، شوہر سے پردہ لازم ہو گیا، اور یہ الفاظ سننے والوں میں سرال میں سے گھر کا دوسرا آدمی بھی ہو، برادر کرم اس کے متعلق آپ فرمائیں کہ شرعی احکام کیا ہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

شوہر کا یہ جملہ ”میں نے ختم کیا، ختم کیا“ اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سے قبل خواہ عورت سے یا سرال والوں سے کوئی سلسلہ کلام ضرور تھا، لہذا جب تک وہ بھی سامنے نہ ہو، محض اس لفظ ”میں نے ختم کیا“ پر اور محض شوہر کے نظریہ کی بنیاد پر

۱- ”رجل أکثره بالضرب علی أن یکب طلاق امرأه فلائذ بدت فلان بن فلان فکب امرأه فلائذ بدت فلان وفلان طالق لا ینطق امرأه کلاماً فی فتاویٰ قاضی خان“ (ہندیہ ۹/۳۷۷، رشیدیہ پاکستان)۔

کوئی حکم نہیں لکھا جاسکتا، البتہ آٹھ سال سے حقوق زوجیت ادا نہ کرنا، مان و نفقہ نہ دینا، لاپرواہی برتنایا ایسی حالت میں عورت کا بغیر شوہر رہنا اور باعصمت رہنا، اس کے لئے زندگی گزارنا دشوار ہو، تو عورت کو اختیار ہے کہ اگر مسلمان حاکم موجود ہو تو اس کی عدالت میں درخواست دے کر شوہر کی لاپرواہی اور حقوق زوجیت کی اور مان و نفقہ کی عدم ادائیگی یا اپنا بغیر شوہر باعصمت زندگی گزارنا دشوار ہونا بتلا کر فسخ نکاح کی درخواست کرے، پھر وہ حاکم شوہر کو مطلع کر کے اس کو طلب کرے اور دعویٰ عورت کا صحیح ثابت ہو جائے تو شرعی اصول و ضوابط کے مطابق پوری تفتیش و تحقیق واقعہ کر کے فسخ نکاح کا فیصلہ دے دے۔ پھر عدت گزار کر دوسرا نکاح کر لیا عورت کو جائز رہے گا۔ اور اگر ایسا مسلمان حاکم موجود نہ ہو تو یہ کام شرعی کمیٹی (جماعت مسلمین جو شرعاً تافضی کے قائم مقام ہوتی ہے) اس سے رجوع کرے اور سارے حالات اس کے سامنے رکھے، شرعی کمیٹی شوہر کو طلب کر کے اس سے یہ کہے کہ یا تو تم قاعدہ سے اسے آزاد کر دیا طلاق دے کر آزاد کرو۔ اگر تم نے ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں کی تو کمیٹی تمہاری طرف سے طلاق قرار دے گی، اور ان دونوں باتوں پر عمل کے لئے ایک مناسب مدت مذکور گزار جائے اور عورت اس مقررہ مدت کے گزار جانے کے بعد شرعی کمیٹی سے پھر تفریق واقع کرنے اور طلاق قرار دینے کی درخواست کرے اور شرعی کمیٹی تفریق واقع کر دے اور طلاق قرار دیدے تو شرعاً طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور عدت گزار کر دوسرا نکاح کر لیا عورت کو جائز ہو جائیگا۔ مگر ایسی صورت میں وقتی قانون حکومت کی زد سے بچنے کے لئے عورت کو عدالت مجاز سے حق خود مختاری حاصل بھی کر لیا چاہئے۔ عدالت مجاز سے اور شرعی کمیٹی سے تفریق شرعی اور فسخ نکاح حاصل کرنے کے اصول و ضوابط مفصل طور پر رسالہ ”حلیما جزہ“ میں مذکور ہیں، اس کو سامنے رکھ کر عمل کیا جاوے، بوقت عمل دارالافتاء سے معلوم کیا جاوے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

تو آزاد ہے، آزاد ہے، تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق کہنے کا حکم:

ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا کہ مجھ کو ایک مکان الگ دیدیجئے۔ شوہر نے کہا کہ میرے پاس الگ مکان کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ابھی میں کما کر کھلا سکتا ہوں، اس پر عورت نے کہا کہ میں خود کما کر کھالوں گی، پھر اس عورت نے یہ لفظ کہا کہ میں تمہاری جھوٹی کی سچی کردوں گی (یعنی کہ تم اپنے لڑکے کی بیوی سے غلط کام کرتے ہو) پھر شوہر نے اس عورت کو ماں کی گالی دی، اس پر عورت نے بھی شوہر کو گالی دی، پھر شوہر نے اس کے حقے کی نے اس پر دے ماری، اس نے شوہر کو دھکا

دے دیا۔ پھر شوہر نے کہا کہ میرے سے تو آزاد ہے۔ آزاد ہے تین مرتبہ کہہ دیا، لیکن دل میں طلاق کا ارادہ بالکل نہیں تھا، پھر اس کے بعد دوسرے مرتبہ کہا کہ تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے اور کہتے ہیں کہ مجھے دوسری مرتبہ یاد ہے، واللہ اعلم

الجواب وبالله التوفیق :

طلاق دینے کے موقع میں بیوی کو یہ جملہ (تو آزاد ہے) کہنا عرف عام میں طلاق صریح دینے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور طلاق صریح بلا نیت سے بھی واقع ہو جاتی ہے، لہذا صورت مسئلہ میں تین طلاق واقع ہو کر حرمت مغلطہ ہو گئی اور عورت نکاح سے بالکل نکل گئی۔ اور عورت کو حق ہو گیا کہ وہ عدت (تین ماہواری) گزار کر جس دوسرے مرد سے چاہے اپنا نکاح کر سکتی ہے۔ پھر یہ دوسرا مرد اس عورت سے ہمبستری کر لینے کے بعد طلاق دیدے یا مر جائے اور اس عورت کی عدت جو اس دوسرے مرد سے لازم ہوئی تھی ختم ہو جائے، اس کے بعد پھر یہ عورت اگر چاہے تو اس سابق مرد سے جس نے تین طلاق دیدی ہیں اپنا نکاح کر کے رہے بغیر اس حال کے اور کوئی صورت ان دونوں میں ازدواجی زندگی کی گنجائش نہیں رہی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/۱۲/۱۴۱۰ھ

شوہر کا کہنا فارغ خطی لے جاؤ سے طلاق کا حکم:

میں اپنی لڑکی کو اس کی سسرال سے رضامندی کے ساتھ لے آیا، جس کو عرصہ ڈیڑھ سال ہو گیا ہے اور انہوں نے چیز کے بارے میں مجبوری دکھائی کہ چیزیں یعنی زیور زمین کے اندر دفن کر دیا ہے کہ ہم آٹھ روز میں وہیں چیزیں پہنچا دیں گے، میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں، لڑکی کو میرے ساتھ رضامندی سے بھیج دیا، میں لے کر گھر کو چلا آیا ہوں، اس کے آٹھ روز بعد لڑکے نے اپنی والدہ سے پیغمبر بھیج دی کہ ہم لینے نہیں آئیں گے، ایک مہینے تک انتظار کیا اسکے بعد خبر دی کہ اپنی بیوی کو لے جائے تو انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ ہم دوسری شادی کریں گے اس کو نہیں لائیں گے، پھر ہم نے دوسرا آدمی بھیجا تو اس کو کہا کہ ہم سے فارغ خطی لے جاؤ ہم نہیں لائیں گے اور دوسری شادی کریں گے جس کو عرصہ چھ مہینے کا ہو گیا ہے، دوسری شادی بھی کر لی۔

۱- "وَإِنْ كَانَ الطَّلَاقُ ثَلَاثًا فِي الْحَرَةِ..... لَمْ يَحُلْ لَهُ مِنْ بَعْدِ حَتَّى يَنْكَحَ زَوْجًا غَيْرَهُ لِكَأَحَا صَحْبًا وَيَدْخُلَ بِهَا ثُمَّ يَطْلُقُهَا أَوْ يَمُوتَ عَلَيْهَا كَلِمًا فِي الْهَدَايَةِ" (الفتاویٰ الہندیہ ۱/۷۳۷)۔

ہم نے اس سے کہا کہ تم لڑکی آزاد کرو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم تو آزاد کر چکے ہیں، لاؤ ہم اس کا کاغذ لکھیں اور فارغی لے لے لو، ہم لے جانا نہیں چاہتے ہیں، ایسی حالت میں طلاق ہوئی یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

آپ کی تحریر سے صاف طور سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ (ہم آزاد کر چکے ہیں الخ) کس نے کہا ہے، شوہر نے خود کہے ہیں یا اس کے گھر والوں نے کہے ہیں، اگر یہ جملہ خود شوہر نے کہا ہے تو لڑکی پر طلاق واقع ہوگئی اور لڑکی آزاد ہوگئی اور اگر یہ جملہ خود شوہر نے نہیں کہا ہے تو عورت پر کوئی طلاق نہیں پڑی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۳/۷/۱۳۸۵ھ

میں تم کو رکھوں تو ماں کو رکھوں یا بیٹی کو رکھوں کہنے سے طلاق نہیں پڑی:

زید نے اپنی بیوی بوندہ کو اپنے گھر دو تین آدمیوں کے سامنے یہ کہا کہ اگر میں تم کو رکھوں تو اپنی ماں کو رکھوں صرف دو مرتبہ یہ لفظ کہہ کر بیوی سے جدا ہو کر دوسری جگہ رہنے لگا ہے، لیکن ایک ہفتہ کے بعد جب بوندہ زید کو بلانے آئی تو پھر زید نے کہا کہ جا اگر تم کو رکھوں تو اپنی بیٹی کو رکھوں اگر تم کو میں رکھوں تو اپنی بیٹی کو رکھوں، اس کا قرا زید اور بوندہ دونوں کو ہے اس موقع پر کوئی کواد نہیں تھا۔ بیٹو او تو حیرہ۔

الجواب وبالله التوفیق:

زید کا یہ جملہ (اگر تم کو رکھوں تو اپنی ماں کو رکھوں) نیز یہ جملہ (اگر تم کو رکھوں تو اپنی بیٹی کو رکھوں) یہ دونوں جملہ لغو اور بیہودہ کلام ہے، ایسا کہنا جائز نہیں باعث گناہ ہے، اس لفظ سے نہ تو ظہار ہوتا ہے، کیونکہ ظہار کے لئے تشبیہ شرط ہے (۱) کما صرح بہ فی رد المحتار ج ۲ باب الظہار، اور نہ یہ لفظ طلاق صریح یا کنایہ کے الفاظ میں سے شمار کیا ہے کما ہو ظاہر، اس لئے ان جملوں سے نہ طلاق واقع ہوئی اور نہ ظہار ہوا، عالمگیری میں ہے: "لو قال ان وطئتک وطئت امی لا شئی علیہ"

۱- "وشرعاً (تشبیہ المسلم) فلا ظہار للمعی عبدلاً (زوجہ) ولو کتابیة أو صغیرة أو مجنونة (أو) تشبیہ ما یعتبر به علیہا من أعضائها، أو تشبیہ (جزء) شائع منها بمحرّم علیہ نابذاً" (الدر المختار علی الرد المحتار ۴/۷۰۷)۔

کذا فی غایۃ المسروری (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمود علی عزم، سید احمد علی سعید

صحت حلالہ کے لئے شوہر ثانی کا وطی کرنا ضروری ہے؟

حامد علی نے اپنی بیوی حمیدہ کو ۳ طلاق دیا، عدت کے بعد اسی حمیدہ سے حامد علی کے پیچھے بھائی جابر علی نے بغرض حلالہ نکاح کیا، لیکن حمیدہ اور جابر علی کے مابین اس نکاح کے بعد کبھی خلوت نہیں ہوئی ہے، اس کے چند ماہ بعد جابر علی نے پھر حمیدہ کو ۳ طلاق دیا ہے، عدت کے گزرنے کے بعد حمیدہ نے اپنے زوج اول حامد علی سے دوبارہ نکاح کر لیا، واضح رہے کہ یہ صورت حلالہ کی حامد علی کے ایماء پر تھی، طلاق دینے کے بعد ایک دوسرے سے پھر سے دل خوش کر لیا تھا اور پھر سے وابستگی چاہتے تھے، اس لئے یہ حیلہ بنایا تھا، اب دریافت طلب یہ امور ہیں کہ یہ صورت حلالہ کی صحیح ہوئی یا کہ نہیں ہوئی ہے جبکہ جابر علی نے حمیدہ سے وطی نہیں کیا ہے اور نہ ہی خلوت ہوئی ہے، اب اگر وہ حمیدہ کسی اور سے نکاح کرنا چاہے تو کیا اس کو بھی طلاق کی ضرورت اور احتیاج ہے، فی الحال حمیدہ کے لئے احکام شرع کیا ہیں اور اس کی اس اولاد کے لئے جو اس حلالہ کے بعد پیدا ہوئی ہے کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

حلالہ میں شوہر ثانی کا صحبت کرنا شرط ہے، لہذا یہ حلالہ جو جابر علی نے کیا ہے حسب تحریر سوال صحیح نہیں ہوا ہے، حمیدہ پر واجب ہے کہ وہ حامد علی سے فوراً علیحدہ ہو جاوے اور عدت طلاق گزار کر کسی دوسرے شخص سے اپنا نکاح کر کے اس کے پاس رہے اور اس سے ہم صحبت ہو پھر اگر وہ دوسرا شخص فوت ہو جاتا ہے یا طلاق دیدے تو اب اس کے بعد عدت گزار کر حامد علی سے نکاح کرنا درست ہوگا۔

حامد علی سے اس دوران میں جو اولاد ہوئی ہے وہ ثابت النسب قرار پائے گی، اس لئے کہ ممکن ہے کہ حامد علی کو اس مسئلہ کا علم نہ ہو کہ حلالہ میں وطی شرط ہے، اس لئے یہ نکاح فاسد اور وطی باہبہ ہوئی ہے اور وطی باہبہ میں نسب ثابت ہوتا

ہے (۱)، نیز حامد علی پر واجب ہے کہ وہ فوراً حمیدہ سے متارکت کر کے الگ ہو جاوے اور زبان سے کہہ دے کہ میں نے تم سے متارکت کر لی یا کہہ دے کہ میں نے تمکو چھوڑ دیا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عن سید احمد علی سعید

شوہر کا جہاں تمہاری مرضی ہو اپنی لڑکی کا نکاح کر دو کہنا:

ایک لڑکی کی شادی ہوئی تھی یعنی انکی لڑکی ہمارے یہاں آئی اور ہماری لڑکی انکے یہاں گئی، غرض ایک لڑکی کے تبادلہ میں روپیہ بھی دیا، زیور اور کپڑا بھی دیا اور لڑکی دی بعد شادی کے وہ اپنی لڑکی کو لے گئے اور ہماری لڑکی بھیجنے کو انکار کر دیا ہے، معلوم ہونے پر ہم وہاں گئے اور ان سے کہا تو یہ جواب دیا کہ تم بھی جہاں تمہاری مرضی ہو اپنی لڑکی کا نکاح کر دو نہ ہم لائیں گے اور نہ ہمکو لڑکی کی ضرورت ہے جس کو عرصہ کافی ہو گیا ہے، اب ہماری لڑکی پر طلاق ہوئی یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

سوال میں تحریر کردہ جملہ کہ تم بھی جہاں تمہاری مرضی ہو اپنی لڑکی کا نکاح کر دو نہ ہم لائیں گے اور نہ ہمکو تمہاری لڑکی کی ضرورت ہے اگر خود لڑکی کے شوہر نے کہے ہیں تو لڑکی پر طلاق واقع ہوگئی (بشرطیکہ اس جملہ سے شوہر کی نیت طلاق کی ہو) ”وَمَا يَنْبَغِي لِالْزَّوْجِ تَقَعُّ وَاحِدَةً بِلَائِنِ اِنْ فَوَّاهَا“ (۴)، عدت تین حیض گذار کر جہاں چاہے اپنا نکاح کر سکتی ہے اور اگر شوہر نے خود یہ جملہ نہیں کہیں ہیں محض اس کے گھر والوں نے کہا ہے تو لڑکی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۷/۱۳۸۵ھ

۱- ”بِخِلَافِ الْمَاسِدِ فَالَهُ وَطَنٌ بِشَيْهَةِ لُبَّتْ بِهِ الْمَسْبُ“ (مطابق ۶۸۷/۳، مکتبہ فیض القرآن)۔

۲- الفتاویٰ الہندیہ ۱/۵۷۳۔

حلالہ کا طریقہ:

زید اپنی بیوی کو طلاق (تین طلاق) دے دیتا ہے اور اسی عورت کو ایک سال کے بعد اپنے نکاح میں لاتا ہے وہ پھر طلاق دے دیتا ہے اور یہ فعل بار بار دہراتا رہتا ہے، ایسی حالت میں نکاح مع حلالہ کے جائز ہے یا نہیں؟ نکاح اور حلالہ کے بارے میں تفصیل سے تحریر فرمائیں، اور حلالہ رشتہ دار یا غیر رشتہ دار سے جائز ہے یا نہیں؟ اور حلالہ کیسا ہے؟
عبداللہ (مینٹر ملنگ آدم ملنگ، پیلان بھوپال)

الجواب وبالله التوفیق:

تین طلاق کے بعد اگر عورت عدت طلاق گزار کر دوسرے مرد سے نکاح و ہمستری کر کے پھر اس سے طلاق واقع ہونے کے بعد عدت طلاق گزار کر یا اس دوسرے شوہر سے بیوہ ہو کر عدت وفات گزار کر اس پہلے تین طلاق دینے والے شخص سے حسب قاعدہ و شرع گواہوں کے سامنے نکاح کرے تو اس کے لئے شرعاً حلال و جائز ہوگی، ورنہ اگر اس میں ذرا بھی فرق ہو تو حلال نہ ہوگی حرام ہی رہے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ایک دو تین کہتے ہیں، جواب دے دیا سے کون سی طلاق پڑی؟

زید کی بیوی ہندہ کسی رنجش کی وجہ سے زید کے گھر سے چلی گئی ہے، ہندہ کے ماموں کا گھر وہیں ہے جہاں زید کا گھر ہے۔ زید کو شک ہوا تو زید اپنی والدہ کو لے کر ہندہ کے ماموں کے گھر گیا، دریافت کرنے پر ہندہ کے ماموں نے لاشعری ظاہر کیا، زید کو غصہ آیا زید نے بحالت غصہ اپنی والدہ سے کہا گھر چلو ہم ایک دو تین کہتے ہیں، جواب دیدیا ہے، کون ہم سے دین مہر لیتا ہے یہ کہتا ہوا گھر آیا، پھر بھی زید ہندہ کی تلاش میں رہا قریب چار ماہ بعد ہندہ اپنے ماموں کے یہاں آئی ہے، زید کو معلوم ہوا زید ہندہ کے ماموں کے یہاں گیا کہ ہندہ کو رخصت کر دو، ہندہ کے ماموں نے کہا کہ تم نے طلاق دیدیا ہے، زید نے کہا کہ ہم نے فقط طلاق استعمال نہیں کیا تھا، بلکہ فقط جواب کہا تھا ہندہ کے ماموں نے کہا ہاں فقط جواب کہنے سے بھی طلاق ہو گیا، عندا شرع طلاق ہوئی یا کہ نہیں ہندہ کا ماموں کہتا ہے کہ طلاق ہو گئی ہم دوسری جگہ نکاح کر دیں گے۔

الجواب وبالله التوفیق:

سوال کی اس عبارت میں ہم ایک دو تین کہتے ہیں جواب دیدیا کون ہم سے دین مہر لینا ہے۔ لفظ جواب دیدیا طلاق کنائی کے الفاظ میں سے ہے، بحالت غضب یا انیت کے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے (کافی الدر المختار ص ۸۷۷) (۱) اور یہاں تو قرآن موجود ہیں

لہذا صورت مسئلہ میں ایک طلاق بائن واقع ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ عورت نکاح سے بالکل نکل گئی، اگر عورت پھر اپنی مرضی اور خوشی سے اسی شوہر کے ساتھ تعلق ازدواجی قائم کرنا چاہے تو صرف نکاح جدید کے ساتھ کر سکتی ہے۔ اور اگر عورت اس شوہر کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو جب سے لفظ جواب دیدیا کہا ہے اس وقت سے عدت تین حیض اور اگر حاملہ ہو تو وضع حمل گزارنے کے بعد اپنا دوسری جگہ جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ سابق شوہر کا اب اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شوہر کا کہنا ہے آزاد کروں گا کہا، گواہان آزاد کر دیا بیان کرتے ہیں تو کیا حکم ہے؟

زید اپنی سسرال میں گیا وہاں جا کر زید اور زید کے سالے میں کچھ گفتگو ہوئی جس کی وجہ سے زید کو کافی تکلیف پہنچی، زید نے وہاں سے آکر کسی اور آدمی کے سامنے کہہ دیا کہ اگر میرے سالے کی یہی حرکت رہی اور وہ میرے ساتھ اس طرح سے لڑتا رہا تو میں اس کی بہن کو آزاد کروں گا وہاں پر دو آدمی تھے، زید حلیہ بیان دے رہا ہے کہ میں نے فقط ایک دفعہ یہ جملہ کہا ہے کہ آزاد کروں گا اور کچھ نہیں کہا ہے وہ دو آدمی جن کے سامنے یہ بات ہوئی وہ کہہ رہے ہیں کہ زید نے یہ کہا ہے کہ میں نے اپنے سالے کی بہن کو آزاد کر دیا۔ آزاد کر دیا (وہ شاید یہ کہتے ہیں) اور زید اوپر والا جملہ کہہ رہا ہے تو اس صورت میں شاہدوں کے کہنے سے طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟

۱۔ ”الکنايات لا تطلق بها قضاء (الابية او دلالة الحال) وهي حالة مداكرة الطلاق أو الغضب“ (ثماني ۲/ ۶۳۵ تا ۶۳۷، مطبع عثمانیہ)۔

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں حسب تحریر سوال جب دو شاہد یہ کہہ رہے ہیں کہ زید نے آزاد کر دیا کا جملہ دوبار کہا ہے تو اگرچہ زید اس کا انکار کرتا ہے مگر وہ طلاق رجعی واقع ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ زید عدت (تین حیض) کے اندر اندر رجعت کرے، یعنی اپنی طلاقیں واپس لے لے تو زید کی بیوی حسب سابق زید کی بیوی رہ جائے گی، البتہ آئندہ اب زید محض ایک ہی طلاق کا مالک رہ جائے گا، جس کا اثر یہ ہوگا کہ اگر خدا نخواستہ پھر کبھی زید ایک دفعہ بھی طلاق دیدے گا تو تینوں طلاقیں پر کر حرمت معطل ہو جائے گی، ابھی تک حرمت معطل نہیں ہوئی ہے، رجعت سے بیوی رہ جائے گی (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شوہر کا زن و شوئی کے تعلقات نہ رکھنا کہنا:

زید کے تعلقات اپنی بیوی سے ٹھیک نہیں رہتے تھے۔ جس کی بناء پر اس نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ اب اپنے تعلقات اس عورت سے زن و شوئی نہیں رکھے گا۔ اس نیت کا اظہار زید نے اپنے احباب سے وقتاً فوقتاً کیا، ایسی نیت کئے اس کو آٹھ ماہ ہو گئے ہیں اور زید نے اپنی نیت کی پابندی بھی کی ہے اور بیوی سے نہیں ملا ہے اور بود و باش بھی علیحدہ اختیار کر لیا ہے، اب اس کے احباب اس کو مجبور کر رہے ہیں کہ زید اپنی بیوی سے مل کر لے اور زن و شوہر کے تعلقات قائم کرے۔ اس نیت کا اظہار زید نے اپنی بیوی سے نہیں کیا ہے، بلکہ اس کا پختہ ارادہ دل میں قائم کر لیا ہے، اس صورت میں شرعی کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

زید نے اگر اپنی زبان سے بھی قطعیت کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ اپنی زوجہ کے پاس نہیں جائے گا یا اس مضمون پر قسم کھالیا ہے تو اگرچہ بیوی کو اس کا علم نہ ہو ایذا ہو گیا ہے، اس کی وجہ سے چار ماہ سے زائد گزرنے پر ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور تعلق زن قائم کرنے کے لئے بغیر حالہ کے محض پھر سے نکاح پر مباح تعلق زن قائم کرنا جائز ہوگا۔

۱- "الطلاق مردان فامساک بمعروف أو تسریح باحسان" (سورہ بقرہ ۲۳۹)، "فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجاً غيره" (سورہ بقرہ ۲۳۰)۔

اور اگر یہ حملہ کہ تعلق زن قائم نہیں کرے گا، اس پر قسم نہیں کھائی تھی اور یحییٰ نہیں بنایا تھا بلکہ محض دل ہی دل میں تہیہ اور ارادہ کیا تھا تو ابھی اس کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ہے، بلا کسی جدید نکاح کے بھی اس کو اپنے ساتھ لاسکتا ہے اور تعلق زن و شوئی بھی قائم کر سکتا ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۸/۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

زوجین میں نا اتفاقی کی وجہ سے طلاق نہیں پڑی:

زید کی بیوی زینب اپنے گھر میں تھی، زید پردیس سے آ کر اپنی بیوی کو لانے گیا، اہلیہ نے آنے سے انکار کیا کہ میں تمہارے باپ کے گھر نہیں جاسکتی ہوں، مٹھکو وہاں تکلیف ہوتی ہے، زید نے بہت سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پر رہی، زید خود اپنی اہلیہ کو پکڑ لایا چونکہ زید اور اس کی زوجہ کی ولدہ کا گھر متصل ہے، زینب گھر بھاگ گئی اب وہاں رہتی ہے، زید کی والدہ اور زید کی بیوی میں اتفاق نہیں ہے۔ اب اس حالت میں زید کا نکاح زینب کے ساتھ رہا یا کہ نہیں؟ بیٹو اتوجروا۔

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں زید کی بیوی زینب پر کوئی طلاق نہیں واقع ہوئی، نکاح میں باقی ہے، البتہ چونکہ بھاگ کر بلا اجازت گئی ہے اس لئے مان نفقہ کی مستحق نہیں ہے (۲)، لیکن زید پر بھی واجب ہے کہ اپنی بیوی کو الگ کمرہ دے، چاہے بقیہ گھر مشترک رکھے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۸/۱۴۱۰ھ

۱- ”قوله هو لغة البمين، قوله: وشرعا الحلف ولهذا قال في الفتح: وفي الشرع هو البمين على ترك قربان الزوجة أربعة أشهر فصاعدا بالله تعالى“ (شکائی ۲/۴۹۷، مطبوعہ عثمانیہ)۔

۲- ”قال الشامي تحت قوله (وركده لفظ مخصوص) هو ما جعل دلالة على معنى الطلاق من صريح أو كناية (لا خارجة من بينه بغير حق) وهي الناشئة حتى نعود“ (شکائی ۲/۸۹۰ مکتبہ عثمانیہ) ”النفقة واجبة للزوجة على زوجها مسلمة كانت أو كافرة إذا سلمت نفسها إلى منزله فعليه لفقنها وكنونها ومكناها“ (ہدایہ ۲/۲۳۷)۔

عدالت سے خود مختاری حاصل کرنا:

ایک عورت نے بہت ہی مجبوری اور تکلیف سے مجبور ہو کر اپنے شوہر سے جس نے کئی مرتبہ طلاق دی تھی، وہ عورت کے قابل نہ تھا، علیحدہ ہو کر درخواست خود مختاری عدالت سے دے کر خود مختاری حاصل کر لی ہے کہ جس سے چاہے نکاح کرے۔

(۱) کیا اس عورت سے بغیر عدت نکاح درست ہے؟

(۲) اگر عدت ہے تو اخراجات کس کے ذمہ ہیں؟

(۳) طلاق اس کے شوہر نے ایک سال دو مہینے قبل دیدی تھی۔ بیٹو اتو جروا

الجواب وبالله التوفیق:

اگر حاکم عدالت غیر مسلم ہو یا مسلم ہی ہو لیکن شرعی قاعدہ کے مطابق فسخ نکاح نہ کرے تو یہ اجازت خود مختاری شرعی نہیں ہوگی اور نہ معتبر ہوگی، بلکہ ایسی صورت میں قاضی شرعی کے قائم مقام جماعت مسلمین سے بھی تفریق شرعی حاصل کرنی ضروری ہے البتہ سوال کا یہ جملہ (اپنے شوہر جس نے کئی مرتبہ طلاق دی تھی) اگر شوہر نے تین بار طلاق دیدی تھی تو اس طلاق کی عدت (تین حیض) گزارنے پر جہاں چاہے دوسرا نکاح کر سکتی ہے اور اگر تین طلاق سے کم دی تھی تو سوال نمبر ۳ کے مطابق جب طلاق دینے کے بعد جس کو ایک سال دو ماہ ہوا اور بعد طلاق ۶ ماہ وہیں رہی، میاں بیوی کی طرح رہی تو رجعت بھی ہوگئی، اب آٹھ ماہ سے علیحدہ ہے مگر نکاح قائم ہے اور عدالت سے خود مختاری شرعی نہیں ہے بلکہ جماعت مسلمین کے ذریعہ تفریق کرا لے اور پھر حکم تفریق کے بعد سے عدت گزار کر دوسرا نکاح کر سکتی ہے اور اس عدت کا اثر چھ شوہر پر عائد ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۸/۱۴۱۰ھ

میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے کہنے سے طلاق:

زید نو مسلم ہے اور اس کی بیوی بھی نو مسلمہ ہے، ۱۹۵۵ء میں شادی ماں باپ کے رسم و رواج سے بلا مہر کے ہوئی تھی، بالغ ہونے پر دونوں مشرف باسلام ہوئے، زید ایک لڑکی کے باپ ہونے کے بعد زید کی بیوی کی مافرمانیوں سے تنگ

آکر اور سخت پریشان کرنے پر چھوڑنے کی نیت سے یہ الفاظ کہا کہ میں تجھے رکھنا نہیں چاہتا ہوں، میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے، پچاسیت میں فیصلہ ہوا کہ دوسروں پر پھیر دے کر علیحدہ کر دو، زید اس فیصلہ پر راضی ہو گیا ہے، لیکن زید کی بیوی علیحدہ ہونے سے ناراض ہے، وہ گز زید اور بیٹی سے جدا ہونا نہیں چاہتی اور وہ علیحدہ ہوگی تو مرتد ہونے کا امکان اور علیحدہ ہونے پر بہت بڑا فتنہ پہنچنے کا اندیشہ ہے، زید کی بیوی معافی چاہتی ہے کہ آئندہ مافرمائی نہیں کروں گی، زید پریشان ہے کہ اگر وہ مرتد ہو جائے تو زید بھی گنہگار ہوگا اگر رجوع نہ کرنا چاہے، اگر طلاق ہوئی تو کوئی طلاق ہوئی، آیا شرعی احکام سے جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں حسب تحریر سوال فقط ایک طلاق بائن واقع ہوئی (۱)، اگر دونوں پھر زن و شوئی کے تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں تو دونوں میں پھر سے جدید نکاح پر رضا دیا جائے۔ ان دونوں کے درمیان نکاح پر رضائے کے لئے عدت گزرنی بھی شرط نہیں ہے جب چاہے آپس میں نکاح کر سکتے ہیں (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۴/۱۰/۱۳۸۵ھ

بیوی کو میں نے تم کو چھوڑ دی تو میرے کام کی نہیں کہنا:

اگر زید نے اپنی عورت محبوبہ کو تازع اور جھگڑا ہونے کے وقت مار پیٹ کر کے بولا ہوگا جاؤ تو مجھے بکار نہیں ہے یا کہ فارسی میں کہا ہے تو بکار زن نیست یا بکارنی تو نیست یا میں نے تجھ کو چھوڑ دی یا میں تجھ کو چھوڑ بولتا ہوں اور کشمیری میں کہتے ہیں مینہ تراؤک ژء (لفظ غروا صبح تھا اس کی تعیین مفتی مذہب کشمیری سے مراجعہ کے بعد کی گئی جس کا ترجمہ انہوں نے یہ کیا: میں نے یہ کہا: میں نے چھوڑ دیا تجھ کو) یعنی مرے گھر سے نکل جاؤ کیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوتی ہے، مولانا مرحوم مولوی عبدالکبیر صاحب دیوبندی نے اپنے ایک فتویٰ میں لکھا ہے کہ ان الفاظ سے طلاق واقع ہوتی ہے اور دو کتاب کا حوالہ لکھا عالمگیری اور میزازیہ، لیکن ایک مولوی صاحب

۱- "الکلیات لا یقع بها الطلاق إلا بالیة أو بملالة الحال، لأنها غیر موضوعة للطلاق بل لحمله و غیره فلا بد من

الصعب" (ہدایہ ۲/۵۳، مطبع یونی کسٹو) "لا یقع الطلاق بشئ من الکلیات إلا بالیة" (قاضی خاں علی الہندیہ ۱/۴۶، دارالکتب دیوبند)۔

۲- "إذا کان الطلاق باننا دون الغالث فله أن ینزوجها فی العدة وبعد القضاءها" (مالگیری مع خانہ ۱/۴۷۲-۴۷۳،

دارالکتب دیوبند)۔

نے فرمایا ہے کہ عالمگیری میں یہ الفاظ بولنے سے طلاق نہیں ہوتی ہے (۱)، پھر رہا یزید وہ کتاب میرے پاس نہیں لیکن عبدالمکیر صاحب نے کوئی مسئلہ نہیں لکھا ہے لیکن اپنے جواب میں دونوں کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔

مذہب احمد (متصل زیارت حضرت سیدنا محمدان مقام اہل صلح چلہ والد، کشمیر)

الجواب وبالله التوفیق:

ان الفاظ میں سے بعض لفظ جیسے میں نے تھکو چھوڑ دی یا چھوڑ دیتا ہوں طلاق صریح کے حکم میں ہے اور انکو بغیر نیت طلاق کہنے سے بھی طلاق واقع ہو جائے گی، اور بعض الفاظ طلاق کنائی کے ہیں، جیسے تو میرے کام کی نہیں ہے، یا تو میرے گھر سے نکل جا، ان الفاظ سے بغیر نیت طلاق کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی یہ جزئیات عالمگیری (۲)، مزازیہ، خانیہ ہر کتاب میں مذکور ہیں، یہ طریقہ استفتاء کا نہیں ہے بلکہ جو لفظ جس موقع میں بولا ہو اس کو بعینہ مع موقع کلام کے لکھ کر استفتاء کرنا چاہئے، لہذا لفظ جس موقع میں بولا ہو حکم اس کے مطابق ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہارپور ۶/۲/۱۴۰۰ھ

کیا جذام کی وجہ سے حق حضانت ساقط ہونا چاہئے؟

میری ایک لڑکی ہے جس کی ماں کو جذام ہو گیا ہے، میں نے اس کو طلاق بائن دیدیا ہے، پچائیت نے اس طلاق سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ چونکہ مدت رضاعت تک بچی کو ماں کے پاس رہنا چاہیے اور بچی کی ماں مرض جذام میں مبتلا ہے، اس لئے حق حضانت ماں کے بعد مانی کو ہوتا ہے، اس لئے بچی مانی کے پاس رہے گی اور میر الدین بچی کو بیس روپیہ ماہانہ ادا کریں، بچی اپنی ماں اور بھائیوں کے شریک ہے، مجھے شبہ ہے کہ اس ماں کا اثر بچی پہ ہوگا، اس لئے بچی کو بیس اپنی پرورش میں رکھنا چاہتا ہوں کیا رہ سکتی ہے؟

۱- ”رجل لال لامرأه: مرابکار بسی ولوی به الطلاق لا یقع“ (فتاویٰ عالمگیری ۳۸۰/۱)۔

۲- ”والأصل المدی علیہ الفسوی فی زماننا هذا فی الطلاق بالفارسیة إله إذا كان فیها لفظ لا یستعمل إلا فی الطلاق للملک اللفظ صریح یقع به الطلاق من غیر لیه إذا أضیف إلی المرأة، وما كان بالفارسیة من الألفاظ ما یستعمل فی الطلاق ولی غیره فیهو من کدایات الفارسیة لیکون حکمه حکم کدایات العربیة فی جمیع الأحکام، کذا فی البدائع“ (فتاویٰ عالمگیری ۳۷۹/۱)۔

الجواب وبالله التوفيق:

حسب تحریر سوال محض آپ کے بیان کردہ شبہ کے بناء پر حق ضمانت سوخت نہیں ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب
کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ”وَإِذَا وَلَّيْتُمُ الْفِرَاقَةَ بَيْنَ الزَّوْجَيْنِ فَلَا لِمَ أَحَقُّ بِالْوَلَدِ إِلَى قَوْلِهِ : فَإِنْ لَمْ تَكُنْ لَهُ أُمٌّ فَلَأُمُّ الْأُمِّ أُولَى مِنْ أُمِّ الْآبِ وَإِنْ بَعْدَتْ“
(ہدایہ ۲/۲۳۷)۔

باب تعلیق الطلاق

شوہر کا ایک نہیں تین طلاق، طلاق، طلاق لکھنا:

زید خنی المذہب بالغ اور خواندہ ہے، لیکن مسائل دینی سے بہت کم واقف ہے، غلط فہمی سے اس کی اہلیہ جو خنی المذہب خواندہ ہے، کسی رشتہ دار میکہ والوں کے پاس بلا اجازت و رضامندی مہمان گئی ہے، غصہ سے پدر بندہ اور اس کے متعلقین کو ڈرانے کے لئے ہنام خسر خط لکھا کہ آپ لوگوں کی مہربانی ہو تو آپ کی لڑکی کو طلاق دیدیا ہوں۔ ایک نہیں تین، طلاق، طلاق، طلاق تو اب غصہ کی حالت طلاق واقع ہو جاتی ہے یا کہ نہیں اگر زید رکھنا چاہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال جب زید نے اپنے خسر کو یہ الفاظ لکھ کر بھیج دیئے کہ میں آپ کی بیٹی کو طلاق دے رہا ہوں ایک نہیں تین، طلاق طلاق طلاق تو بلاشبہ زید کی بیوی پر خنی مذہب کے مطابق تین طلاق پر کر حرمت مغلطہ ہوگئی، اب بغیر حالہ کے کسی طرح وہ عورت زید کے لئے جائز و حلال نہیں ہو سکتی چاہے، کسی نیت اور جھمکی کی غرض سے لکھا ہو ہر حال میں یہی حکم ہے۔ اور حالہ یہ ہے کہ اس طلاق کے بعد بندہ کو تین حیض آکر اور اگر حاملہ ہو تو وضع حمل ہو کر عدت ختم ہو لے اور اس کے بعد بندہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس کے ساتھ ہم صحبت ہو لے پھر وہ دوسرا شوہر مر جائے یا طلاق دیدے۔ اور پھر اس موت یا طلاق کی عدت گزر جائے۔ اب اس کے بعد بندہ زید سے دوبارہ نکاح کر کے اس کے پاس آ سکتی ہے بغیر اس کے نہیں، ”وإن كان الطلاق ثلاثاً في الحرة..... لم تحل له حتى تنكح زوجاً غيره نكاحاً صحيحاً ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها كذا في الهندية“ (۱)، فقط والله أعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ہمارے پور ۲۳/۹/۱۳۸۵ھ

شوہر کا ایک دو تین طلاق ہو مجھ پر اگر بیوی میرے گھر آئے کہنا:
زید نے یہ الفاظ کہے ایک، دو، تین طلاق ہو مجھ پر اپنی بیوی منکوحہ زینب سے، اگر وہ میرے گھر واپس آگئی، لیکن
آدھ گھنٹے کے بعد زینب گھر آگئی آیا یہ طلاق مغلطہ ہوئی؟

الجواب وباللہ التوفیق :

اس میں حرمت مغلطہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ”لأنه عند الطلاق أولا وعد الطلاق ليس بطلاق فبقی
لفظ الصریح وهو یوجب الرجعة“ كما فی الشامی، فقط واللہ اعلم بالصواب

منشی محمد فرید علی عند

اس جواب پر سوال:

۱۔ اس میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا کیا مدہ ہے؟ نیز یہ عبارت شامی صفحہ مذکورہ میں نہیں ہے، شرط مقدم اور مؤخر
ہونے میں مسئلہ یہی ہے۔

الجواب:

جناب ایک دو تین نہ صریح ہے نہ کنایہ ہے، صرف عد و طلاق ہے۔ نیز اس میں حکم بھی نہیں ہے اور خبر یہ مجملہ کی بناء پر
ایسے عد سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اس میں عد کا مجھ پر طلاق ہونے سے کوئی تعلق ظرفیت یا مصدریت کا نہیں ہے، پس
صرف ایک طلاق مجھ پر طلاق ہونے کی بناء پر واقع ہوگا۔ اس میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا کا یکساں حکم ہے۔

الجواب:

یہ جملہ (ایک دو تین) مختلف محاوروں کے مطابق بولا جاتا ہے، لہذا اس خط میں اس خط کے محاورہ کے مطابق حکم
ہوگا۔ بتقاضائے آیت کریمہ: ”وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ“ (۱)۔

پس جس خطہ و دیار میں عرف عام و مشہور ہو کہ مذکورہ جملہ محض اپنی مستعدی ظاہر کرنے کے لئے اور مخاطب کو اپنے
ارادہ سے آگاہ کرنے کے لئے بولتے ہیں اور اس کا تعلق اس کے بعد کے لفظ سے نہیں ہوتا تو اس خطہ میں اس سوال میں اس

ذکر کردہ جملہ سے فقط ایک طلاق واقع ہونے کا حکم ہوگا۔

اور جس خطہ و دیار میں یہ عرف عام و مشہور ہو کہ یہ مذکورہ جملہ معدود ہوگا، اور مفہوم یہ ہوگا (ایک طلاق دو طلاق تین طلاق) پس اس خطہ و دیار میں اس سوا میں مذکورہ جملہ سے تین طلاق واقع ہو کر حرمت مغلطہ ہو جائے گی۔ اور جس خطہ و دیار میں ان دونوں عرف میں سے کوئی عرف نہ ہو وہاں شوہر کے قول کا اعتبار ہوگا۔ جس کو وہ تکلف بیان کرے گا، لہذا یہ دونوں مذکورہ جواب ادھورے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۵/۱۳۹۹ھ

تعلیق طلاق سے رجوع صحیح نہیں ہے:

زید نے اپنی منکوحہ ہندہ کو دو طلاق دیدی اور ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر بکر کے گھر گئی تو تیسری بھی، (۲) بکر خاص رشتہ دار ہے بعض مرتبہ جانا بھی ضروری ہو جاتا ہے، جواب طلب امر یہ ہے اس کے بعد دونوں میں مصالحت ہو گئی ہے اور پھر زید نے اپنی شرط بکر کے گھر جانے کی واپس لے لی ہے کہ اب میں بکر کے گھر جانے سے منع نہیں کروں گا تو ہندہ بکر کے گھر پر جاسکتی ہے یا نہیں اگر گئی تو کیا تیسری طلاق واقع ہو جائے گی؟

ایک صاحب نے یہ بتلایا ہے کہ زندگی بھر بکر کے گھر نہیں جاسکتی ہاں اگر وہ گھر بدلے تو پھر جاسکتی ہے کیا صحیح ہے؟

محمد صالح عبدالحمد سامانی (بہمنی)

الجواب وبالله التوفیق:

شوہر کا یہ جملہ (اگر بکر کے گھر پر گئی تو تیسری بھی) مطلق ہے، شوہر نے اس تعلیق کو اپنی اجازت سے مقید نہیں کیا ہے، اس لئے اب اجازت دینے سے وہ شرط اور اس شرط کا حکم ختم نہ ہوگا بلکہ جب بھی بکر کے گھر جائے گی تو تیسری طلاق بھی واقع ہو کر حرمت مغلطہ ہو جائے گی اور پھر بغیر حلالہ کے کوئی مثل جائز ہونے کی باقی نہ رہے گی، اور چونکہ اس لفظ (بکر کے گھر) سے عرف میں دار بکر کا دار سکونت ہے یعنی جس گھر میں بکر سکونت پذیر ہو وہ مراد ہے خواہ وہ گھر آبائی ہو یا بکر کا خرید کردہ ہو یا کرایہ پر لیا ہو، پس گھر بدل کر دینے میں یہ تفصیل ہوگی کہ جس گھر کو بدل کر اس میں جائے گا، اگر وہ سکونت کے لئے اختیار کیا ہوگا، خواہ کرایہ پر لے کر ہو تو اس میں بھی جانے سے قسم ٹوٹے گی اور تیسری طلاق پڑ جائے گی، ہاں اگر کہیں

مہمانی میں بکر گیا یا کوئی گھر محض چند دن قیام کے لئے لیا، خواہ عاریت پر یا کرایہ پر مگر اس گھر میں سکونت کرنے کا ارادہ نہیں ہے بلکہ محض عارضی طور پر چند دن کے لئے چلا گیا ہے اور وہاں زید کی منکوحہ بندہ چلی جائے تو کوئی طلاق نہ پڑے گی، اسی طرح اگر بندہ کے جانے کے بجائے خود بکر بندہ کے گھر ملاقات کے لئے آجایا کرے تو اس سے کوئی طلاق نہیں پڑے گی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، ۱۰/۱/۱۴۰۱ھ

مارنے پر طلاق کو معلق کرنا:

زید اور عمر دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں، کئی بار زید نے عمر کو مارا (بہت زیادہ پٹائی کی) ایک بار پٹائی میں زید نے جوش میں آکر پیٹنے کے بعد کہا کہ اگر میں آئندہ ماروں تو میری بیوی کو طلاق اور مارنے سے مطلب پٹائی کرنا تھا جیسا کہ پچھلے کئی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ زید نے غصہ میں آکر عمر کو چھوڑے چھوڑے واقعات پر خوب مارا، طلاق معلق کرنے کے بعد ایک دن عمر لیٹا ہوا تھا خانہ اوڑھ کر اور اس نے رتخ خارج کر دیا زید نے بلا کسی ارادہ اور غصہ کے مذاق میں پیر مار دیا اتنی زور سے کہ جیسے عام طور سے ہاتھ پیر لگرا جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے اس وقت نہ تو غصہ تھا اور نہ ہی مارنے کا ارادہ تھا، اس کے بعد زید کو شک ہو گیا کہ یہ مارنا اس مارنے کے اندر تو شامل نہیں ہے جس پر طلاق معلق ہے تو اس کی کیا صورت ہوگی؟

عبدالحمید (ساکن کٹہرہ، مظفر نگر)

۱- "رجل قال لامرأته: إن دخلت دار أخي فأنت طالق، فسكن أخو الحالف داراً أخرى، ودخلت المرأة الدار الجديدة، قال بعضهم: إن كانت يمينه بفظ الحقد من ذلك الدار الأولى لا يحدث في يمينه، وإن كانت يمينه لأجل الأخ حدث في يمينه وإن لم تكن له لبة حدث في قول أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى، وإن دخلت المرأة الدار التي كانت لأخيه وقت اليمين، إن كانت الدار في ملك الأخ إلا أنه لا يسكن فيها حدث في يمينه، وإن خرجت تلك الدار عن ملك الأخ بعد اليمين بيع أو هبة أو غير ذلك لا يحدث كلما في فتاوى قاض خان" (فتاویٰ عالمگیری، ۱/۳۳۳، فتاویٰ قاضی محمد علی ہاشمی عالمگیری، ۱/۳۸۳)۔

الجواب وبالله التوفیق:

اگر واقعہ ایسا ہی ہے اور اسی طرح ہے تو اس سے قسم نہیں ٹوٹی اور طلاق نہیں پڑی، باقی آئندہ احتیاط رکھنا چاہئے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۳/۱۴۰۲ھ

قرآن نامہ کی خلاف ورزی سے کون سی طلاق پڑے گی؟

چاند بیگ نے اپنی زوجہ رابعہ کو کافی ناجائز تکلیف پہنچائی ہے گالی گلوں مار پیٹ ماک کاٹنے کے لئے چھوڑے نکال کر حملہ آور ہوا ہے، آخر حد تک نا اتفاقی دونوں میاں بیوی میں ہو گئی ہے، دارالافتاء میں اس پر فیصلہ ہوا کہ چاند بیگ نے قرآن نامہ تحریر کیا اور یہ لکھ دیا کہ آئندہ کسی قسم کی تکلیف دوں یا رابعہ کے ماں باپ کے یہاں ان کے لئے آنے پر رکوں تو قاضی صاحب جو فیصلہ کریں گے منظور کروں گا اور رابعہ کو اختیار ہوگا کہ بذریعہ دارالتضامین تفریق کر دیں اور قرآن نامہ کے خلاف کروں تو بھی طلاق سمجھی جائے۔ اپنے قرآن کرنے کے بعد دو آدمیوں کے سامنے جو قریب کے رشتہ دار ہوتے ہیں یہ الفاظ چاند بیگ نے کہے کہ رابعہ بی کو میکہ لے جاؤ میں اس کو نہیں رکھتا میں نے اس کو طلاق دیدی ہے تین بار اسی طرح کہا، رابعہ بی نے دارالافتاء میں فیصلہ چاہا تو چاند بیگ نے بذریعہ رجسٹری تحریر کیا کہ میں (دارالافتاء) دارالتضامین میں کوئی جواب ہی نہیں کرنا چاہتا ہوں عدالتی کارروائی کر ڈالو۔

اب رابعہ بی یہ چاہتی ہیں کہ از روئے شرع جواب تحریر کریں کہ آیا میرا مہر بدمہ شوہر واجب ہے یا کہ نہیں، اور تین بچے بھی اس کے ہوئے جن سے ایک لڑکی حیات ہے۔ رابعہ کے والد لینے آئے انہوں نے نہیں پہنچایا جو قرآن نامہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے اب حکم شرع سے مطلع فرمایا جائے؟

۱- اس لئے کہ ضرب ان امور ثلاثہ میں سے نہیں ہے جن کا نازل بھی حد شمار ہو، اور اس لئے کہ عرفاً اس پر مار کا اطلاق نہیں ہوتا، ”والاصل ان الايمان مبينة و عندنا على العرف“، اس کے تحت ثانی میں ہے ”لأن المصكلم إنما يصكلم بالكلام العرفي، أعني الالفاظ التي يرواد بها معاليها التي وضعت لها في العرف“ (رد المحتار علی الدر المختار ۵/۵۲۷)۔

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال جب اتر نامہ طلاق کے بعد کئی مرتبہ اتر نامہ کی خلاف ورزی کی ہے اگر تین بار طلاق دینے کے پہلے یہ خلاف ورزی کی ہے تو ایسی خلاف ورزی سے جو پہلی بار کی ہے رابعہ پر ایک طلاق بائن پڑ گئی اور رابعہ بی چاند بیگ کے نکاح سے نکل گئی۔ اور بعد میں تین طلاق لغو اور بے اثر رہیں اور طلاق بائن کا یہ اثر ہے کہ رابعہ بی اگر اپنی مرضی و خوشی سے پھر چاند بیگ کی زوجیت میں جانا چاہے تو پھر سے جدید نکاح کر کے جاسکتی ہے، (۱)۔ چاند بیگ زبردستی یا رجعت نہیں کر سکتا ہے اور اگر اتر نامہ کی خلاف ورزی سے پہلے تین بار یہ کہہ دیا ہے کہ میں نے اس کو (رابعہ کو) طلاق دی تو اب تین طلاقیں واقع ہو کر حرمت مغلطہ ہو گئی، اب رابعہ بی اس شوہر کے لئے بجز حلالہ کے کسی طرح حلال اور جائز نہیں ہو سکتی ہے اور حلالہ یہ ہے کہ اس مغلطہ طلاق کی عدت تین حیض گزرنے پر رابعہ دوسرے مرد سے نکاح کرے اور وہ اس کے ساتھ رہے ہم بستر ہو پھر اگر وہ فوت ہو جائے یا طلاق دیدے اور رابعہ کی یہ عدت وفات اور طلاق بھی گزر جائے، اس کے بعد شوہر اول چاند بیگ کا دارالتصناء میں نہ جانا یا قانون جوئی کرنا سب غلط ہے، اب اس کو اگر یہ واقعات مذکورہ فی السوال صحیح ہیں ان باتوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ رابعہ بی چاند بیگ کی زوجیت سے بالکل نکل گئی اور رابعہ بی کا مہربانہ چاند بیگ واجب الاداء ہے، چاند بیگ کو چاہیے کہ رابعہ کا مہر دے کر خاموش ہو جاوے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/۸/۱۳۸۵ھ

۱- زمانہ حال میں لگائی ہوئی شرط کو ماضی پر محمول کرنے کا حکم:

باب الطلاق میں زمانہ حال میں لگائی ہوئی شرط کا زمانہ ماضی پر محمول کرنا جائز ہے یا کہ نہیں۔ مثلاً یوں کہے کہ اگر تو پانی پیتی ہے تو تجھ کو طلاق اور عورت نے پانی پیا زمانہ ماضی میں یہ الفاظ کہنے سے ۱۰ پانچ منٹ پہلے پانی پیتی ہے، یہ جملہ حالیہ ہے اور اس نے پانی پیا زمانہ ماضی میں۔ تو جملہ حالیہ میں لگائی ہوئی شرط کا زمانہ ماضی میں اعتبار ہو گا یا کہ نہیں ہو گا؟

۲- شوہر کا ”اگر تو میرے اور اللہ کے درمیان حجاب بنتی ہے تو تجھ کو طلاق“ کہنا:

زید نماز پڑھ رہا ہے۔ درمیان نماز اس کو اپنی بیوی مریم کا خیال آیا ہے، زید نے اپنا خیال فوراً اللہ عز و جل کی طرف

۱- ”فاذا طلق زوجة بانه واحدة او اثنين جاز له العود اليها في العدة وبعدها ولكن ليس بالرجعة واما بعد جمعة“ (الموسوعة الفقهية ۲۹/۲۹)، ”وينكح مائة بمادون الثلاث في العدة وبعدها (بالاجماع)“ (الدر المختار علی الرد ۳۰/۳۰، مکتبہ زکریا)۔

متوجہ کیا اور اپنے نفس کو اس پر ملامت کی اور نماز پوری کی، اس کے بعد زید نے یوں کہا کہ اگر تو میرے اور اللہ کے درمیان حجاب بنتی ہے تو تجھ کو طلاق ہے، اور مریم زید کے پاس موجود نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو اپنے والدین کے یہاں زید سے چالیس میل کے فاصلہ دوری پر ہے اور ابھی مریم کی رخصتی بھی نہیں ہوئی ہے، تو طلاق واقع ہوئی یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

- ۱- شرط لگانے سے پہلے خواہ ۱۰-۵۵ ہی منٹ پہلے پانی پیا ہو۔ اس بعد کی شرط سے کوئی طلاق واقع نہ ہوگی (۱)۔
- ۲- یہ خطاب تو دلی اور مجازی خطاب ہے جو عرفاً رائج ہے، اس لئے لغو نہ ہوگا، لیکن یہ جملہ (کہ اگر تو میرے اور اللہ کے درمیان حجاب بنتی ہے تو تجھ کو طلاق) تعلیق کا ہے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ اگر آئندہ مریم اپنے ظاہری عمل اور قول سے روکاؤٹ ڈالے گی تو ایک طلاق پڑ جائے گی۔ ابھی کوئی طلاق نہیں واقع ہوئی اور یہ حکم اس صورت کا ہے کہ یہ جملہ اپنی زبان سے زید نے کہا ہو۔ اور جیسا کہ سیاق و سباق سوال سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر زبان سے نہ کہا ہو بلکہ محض دل ہی دل میں سوچا ہو تو اس کا کوئی اثر نہ ہوگا نہ اب نہ آئندہ (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اگر عیدین میں مصافحہ و معانقہ بدعت ہو تو بیوی پر تین طلاق:

- ۱- زید قسم کھا کر کہتا ہے کہ عیدین میں مصافحہ اور معانقہ کرنا اگر بدعت ہو تو ہماری بیوی پر تین طلاق، لہذا دریافت ہے کہ زید کی قسم باقی ہے یا کہ نہیں ایسا ہی ان کی بیوی مطلقہ ہے یا کہ نہیں؟
- ۲- بعض لوگ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ فتاویٰ رشیدیہ کے اندر ص ۱۰۲ اور ص ۱۲۶ اور اندو الفتاویٰ کے جلد چہارم میں ص ۷۹ پر عیدین کا معانقہ اور مصافحہ بدعت فرمایا یہ بالکل غلط بلکہ بدعت حسہ اور ثواب ہے اور بالکل جائز ہے حدیث شریف میں منع نہیں ہے، لہذا یہ بھی کہنا صحیح ہے اور قسم باقی ہے۔ بیٹو اتوجروا۔

۱- "التعلیق اصطلاحاً (ربط حصول مضمون جملة بحصول مضمون جملة اخرى) فهو خاص بالمعنى والمراد بالجملة الاولى في كلامه جملة الجزاء وبالغالبية جملة الشرط وبالمضمون ما تضمنه الجملة من المعنى فهو في مثل ان دخلت الدار فالت طالق ربط حصول طلاقها بحصول دخولها الدار" (مٹا ۲/۶۷۷، مطبع عثمانیہ)۔

۲- "في القهستاني من ازالة النكاح او نقصان حله يلفظ مخصوص" (مٹا ۲/۵۷۱، مطبع عثمانیہ)۔

الجواب وبالله التوفيق:

محض عیدین کے نماز کی وجہ سے عید گاہ میں جو مصافحہ کا رواج لازمی ہو گیا ہے یہ قطعاً بدعت (۱) ہے، اور امداد الفتاویٰ اور فتاویٰ رشیدیہ کا فتویٰ بالکل صحیح ہے، لہذا اگر ایسے مصافحہ پر طلاق کی قسم کھائی ہے جو سوال میں درج ہے تو بلاشبہ اس کی بیوی پر طلاق پر گئی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ”وَقُلْ فِي بَيْنِ الْمُحَارِمِ عَنِ الْمُتَلَقِّ إِنَّهُ ذَكَرَهُ الْمُصَافِحَةُ بَعْدَ إِدَاءِ الصَّلَاةِ لِكُلِّ حَالٍ لِأَنَّ الصَّحَابَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ صَافِحُوا بَعْدَ إِدَاءِ الصَّلَاةِ وَلَا لَهَا مِنْ مَنِّ الرِّوَاغِضِ إِيَّاهُمْ قُلٌّ عَنْ ابْنِ حَجَرٍ مِنَ الشَّافِعِيَّةِ لَهَا بِدْعَةٌ مَكْرُوهَةٌ لَا أَصْلَ لَهَا فِي الشَّرْعِ وَالْهَيْبَةُ فَاعْلَمْهَا أَوْلَا وَيَعِزُّرُ ثَابِتٌ قَالُ قَالَ وَقَالَ ابْنُ الْحَجَّاجِ مِنَ الْمَالِكِيَّةِ فِي الْمُدْخَلِ لَهَا مِنَ الْبِدْعِ وَمَوْضِعُ الْمُصَافِحَةِ فِي الشَّرْعِ الْمَا هُوَ عِنْدَ لِقَاءِ الْمُسْلِمِ لِأَخِيهِ لَا فِي أَدْبَارِ الصَّلَاةِ فَحَيْثُ وَضَعَهَا الشَّرْعُ يَضَعُهَا فَيُبْهَى عَنْ ذَلِكَ وَيُزَجَّرُ فَاعْلَمْ لَهَا إِيَّاهُ مِنْ خِلَافِ السُّنَّةِ“ (نہجہ ۵/۳۳۶، مطبوعہ عثمانیہ)۔

۲- ”اِذَا اِضْأَفَهُ اِلَى شَرْطٍ وَقَعَ عَقِبَ الشَّرْطِ مِثْلُ اَنْ يَقُولَ لَا مَرْءَ دَهْ اَنْ دَخَلْتَ الدَّارَ قَالَتْ طَالِقٌ“ (ہدایہ ۲/۳۸۵، باب الاِیْرَانِ فِی الطَّرَاقِ، مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

باب الخلع

خلع میں زوجین کی رضامندی ضروری ہے:

زید کی شادی ہندہ سے ۱۰ نومبر ۶۳ء کو ہوئی قریب چھ ماہ تعلقات تو کچھ بہتر تھے، مگر اس کے بعد زید کی طرف سے ہندہ کو براہ خورد و نوش، لباس و پوشاک تک کی تکلیف دینی شروع ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے ہندہ اپنے والد کے سمجھانے سے نباہتی رہی مگر زید کی یہ حرکت داگی ہو گئی، اب ہندہ کے والدین نے اپنی لڑکی کا بوجھ اپنے سر دیکھ کر پنچائت بلایا ہے اور کل احوال سنایا ہے جس کا اثر یہ ہوا کہ زید نے ایک شرائط نامہ لکھ کر پنچائت کے رو برو یہ یقین دلایا کہ اب میں ہر طرح کی شکایت دور کرنے کی حتی المقدور کوشش کروں گا، تمام معززین حضرات زید کی بات پر یقین کر کے ہندہ کو پھر زید کے ساتھ پنچائت کے رو برو روانہ کر دیا ہے مگر ابھی چند گز وہ پنچائت نہیں گئے ہوں گے کہ ہندہ کے رونے کی آواز آئی تمام حضرات وہاں پہنچ کر ہندہ کو بیپوش دیکھا، اب جب ہوش میں آئی تو زید کے ساتھ زندگی گزارنے سے ماراض ہے اور کہا اگر ہمارے والد ہم کو وہاں روانہ کریں گے تو خودکشی کر لوں گی۔ اس پر پنچائت نے اس کے والد کے حوالے کر دیا جس کو دو سال ہو گئے ہیں کہ زید نے پھر لیجانے کی کوشش کی نہ لیجانے آیا ہے نہ نان و نفقہ کا انتظام کیا ہے، اب ہندہ اپنے ظالم شوہر سے خلع چاہتی ہے اور دین مہر اور سامان جہیز اور زیور کو چھوڑنے پر تیار ہے، ہندہ کے باپ نے زید کی ۶ کٹھ زمین خرید لیا ہے جو کہ ہندہ کے نام ہے چھوڑنا نہیں چاہتی، اب زید کہتا ہے کہ جو زمین تم نے ہم سے رجسٹری کرائی ہے اس کو بھی واپس کر دو تو طلاق دوں گا، اب شرعی جواب سے مطلع کریں۔

الجواب وبالله التوفیق:

اگر سوال میں مذکورہ واقعات صحیح ہیں تو ہندہ کو خلع کرنا درست ہے، مگر خلع شوہر کی رضامندی سے ہوتا ہے، زبردستی نہیں ہوتا ہے، لہذا جب شوہر بغیر اس آراضی کو حاصل کئے خلع پر تیار نہیں ہے اور ہندہ کو خلع کی ضرورت ہے تو جس طرح اور

سب چیزیں ہر وغیرہ چھوڑی ہیں اس آراضی کو بھی واپس کرادے، ہندہ کو اختیار ہے اور اپنی مصلحت دیکھ لے یہ حکم اس صورت کا ہے جب ہندہ خود خلع کر لینا چاہتی ہے ورنہ تحریر سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادتی شوہر کی جانب سے ہے اور وہ ظالم ہے، اسکو اس خلع میں کچھ بھی لینا جائز نہیں ہے حرام ہے (۱)، اس کو چاہئے کہ کچھ نہ لے اور طلاق دیدے ورنہ عند اللہ سخت عذاب میں مبتلا ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی محمود علی عنہ

بیوی کا خلع نامہ تحریر کرنا:

خلع نامہ اہلیہ تحریر کر کے روانہ کر دے تو خلع ہو گیا یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

اگر زوج اس خلع کو منظور کرے گا تو درست ہو جائے گا (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خون میں عارضہ کی وجہ سے خلع لینا:

زید کو فساد خون کے عارضہ کی شروعات دس ۱۰ سال قبل ہوئی، پانچ سال قبل شادی ہوئی، شادی کے وقت خون میں حدت کم تھی شادی کے دو ۲ سال بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جو کہ اب تین سال کی ہے، زید کی بیوی بظاہر زید سے خوش ہے اور آپسی تعلقات اچھے ہیں خون کی حدت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، علاج و پرہیز میں زید لا پرواہی برتا ہے، کیا ایسی حالت

۱- "ان كان البشور من قبل الزوج فلا يحل له اخذ شيء من العوض على الخلع وهذا في حكم العيالة" (الفتاویٰ الہندیہ ۴۸۸/۱، دارالکتاب دیوبند) "الجملة الكلام فيه ان البشور فان كان من قبل الزوج فلا يحل له اخذ شيء من العوض على الخلع لقوله تعالى: وان اودتم استبدال زوج مكان زوج وآتيم احداهن فبطارا فلا تأخذوا منه شيئا" (سورة النساء آیت ۴۰، بروايع اصناف ۵/۳، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۲- "لحديث ابن ماجه قوله: الطلاق لمن اخذ بالساق، كناية عن ملك المنة" (مثنیٰ ۵۸۵/۳، مطبوعہ عثمانیہ)۔

میں زید کی بیوی زید سے خلع لینے کی حق دار ہے؟

جمیل احمد (ریٹائر پولیس آفیسر، ڈی، محلہ کوٹلا، گلگتھم پور پولی)

الجواب وبالله التوفیق:

اگر نسا دھون کی وجہ سے جسم کی شکل و صورت اس طرح نہیں بگڑ گئی ہے، جس سے وحشت و نفرت ہوتی ہو یا اس کو ازدواجی زندگی حاصل نہ ہوتی ہو تو عورت کو خلع لینے کا اختیار نہ ہوگا وہ اس کی حق دار نہ ہوگی، ہاں اگر جسم کی شکل و صورت اس طرح بگڑ گئی ہو کہ وحشت و نفرت ہوتی ہو یا وہ ازدواجی زندگی کے لائق نہ رہ گیا ہو تو اس وقت شرعی کمیٹی میں سب حال رکھے تب جا کر تفریق شرعی حاصل کرنے کی درخواست کرنے کا حق ہو جائے گا اور پھر شرعی کمیٹی اپنی تحقیق و تفتیش کے بعد شرعی ضابطہ کے مطابق جو حکم دے گی اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- "فی الكنز: (ولم یخیر أحدهما بعیب) قال شارحه: أطلق العیب فشمّل الجذام والبصر والجنون والوق والقون وخالف الشافعی ومالك وأحمد في هذه الخمسة، وخالف محمد في الثلاثة الأول إذا كانت بالزوج فخير المرأة بخلاف ما إذا كانت بها فلا يخير لقدمه على دفع الضرر عن نفسه بالطلاق دولها،..... وقد كتبنا في القواعد الفقهية في مذهب الحنفية أن القاضي لو قضى برد أحد الزوجين بعيب لفسد قضائه" (المحرر الرائق شرح كتر الدقائق كتاب الطلاق باب التحريم وغيره ۴/ ۱۳-۱۴، مکتبہ زکریا، وقال في منحة الخالق على المحرر الرائق "أى القاضي المجتهد أو المقلد لمن يقول بملك كما لا يخفى ۴/ ۱۳)۔

باب اللعان

لعان کے لئے دارالاسلام شرط ہے:

شخص الدین تحصیل راجوری نے اپنے ماموں کی لڑکی کے ساتھ شادی کی اور وہ بطور متبنہ کے ماموں کے ساتھ رہنا شروع کیا، شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں دو تین سال کے بعد جب لڑکی بیگمات زوجہ کو مدت حمل ظاہر ہوئی تو اس کے خاوند نے شکایت کی کہ یہ حمل جو کہ مسماۃ کو ہے اس کے خاوند کا نہیں ہے، بلکہ اس کے راجوری کوچر کے ساتھ ناجائز تعلق ہے اور یہ حمل بھی اسی کا ہے جب لڑکی کو حمل وضع ہوا تو لڑکی پیدا ہوتی ہے جس کی عمر دو سال کی ہو چکی ہے، اب دوسرے شخص کے ساتھ تہمت لگانا ہے اگر ثبوت کے لئے کہا گیا ہے تو ثبوت پیش نہیں کرنا ہے بلا ثبوت ہے۔ دریافت ہے کہ اس صورت سے دونوں میاں بیوی کے تعلقات میں کوئی خلل تو نہیں آیا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ایسی صورت میں شوہر اپنی بیوی سے پیدا شدہ بچہ کا اپنی اولاد کہنے سے انکار کرے یا اپنی بیوی کو زنا کی تہمت لگائے اور شرعی گواہ زنا کا پیش نہ کر سکے تو شرعاً لعان واجب ہوتا ہے مگر بھارت میں شرعی حکومت نہیں ہے کہ لعان جاری کیا جاسکے۔ لعان جاری کرنے کا حق محض حکومت اسلامی کو ہوتا ہے اور کسی کو نہیں ہوتا ہے، ”وَأَهْلُهُ مِنْ هُوَ أَهْلٌ لِلشَّهَادَةِ عَلَى الْمُسْلِمِ فَمَنْ قَذَفَ بِصُرِيحِ الزَّوْنِ فِي دَارِ الْإِسْلَامِ“ (۱)، ”قوله في دار الإسلام أخرج دار الحرب لانقطاع الولاية“ (۲)۔ پس ایسی صورت میں اگر شوہر کے نزدیک زنا کا واقعہ صحیح ہے اور عورت اس کے قابو کی نہیں ہے تو شوہر اس کو طلاق دے کر آزاد کر سکتا ہے اور اگر واقعہ صحیح نہیں ہے تو عورت کی برائت کرے اور اس کا حق ادا کرے اور آئندہ ایسی کوئی بات نہ

۱- الدر المختار۔

۲- رد المختار ۵/ ۱۵۱۔

کرے جس سے عورت کی آبرو پر دھبہ آئے۔ اور عورت پر بھی واجب ہے کہ وہ اپنے شوہر کی مرضی کے مطابق رہے، خالہ
زاہ، ماموں زاد بھائیوں سے اور ہر اجنبی مرد سے پردہ شرعاً واجب ہے یہ سب شرابی پردہ شرعی نہ کرنے کی وجہ سے ہے عزت
بھی جارہی ہے آبرو بھی رخصت ہو رہی ہے، خلاصہ یہ نکال کہ شوہر یا تو تہمت بازی ختم کر کے انسانیت کے ساتھ بیوی کے ساتھ
رہے یا طلاق دے کر علیحدگی اختیار کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

باب ثبوت النسب والنفقة

زنا سے پیدا شدہ بچی کا نسب:

مسماۃ شہر بانو سے محمد سلیمان نے زنا کیا اور اس زنا سے شہر بانو کے حمل رہ گیا ہے، جب چند مہینے کے بعد یہ بات پنچایت کے لوگوں نے جمع ہو کر سلیمان اور شہر بانو کو بلا کر دریافت کیا تو دونوں نے زنا اور حمل کا اقرار کیا تب پنچایت نے سلیمان پر حد شرعی جاری کیا اور وضع حمل بعد شہر بانو پر بھی حد شرعی جاری کیا اور اس سلیمان کے ساتھ شہر بانو کا نکاح کر دیا ہے، اب اس متولدہ بچی جو سلیمان کے زنا کے نطفہ سے پیدا ہوئی ہے اس کو حرامی کہنا درست ہے یا کہ نہیں اور بچی کا نسب ٹھیک ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

بچہ کا نسب تو ٹھیک نہیں ہے البتہ قصور زانی اور زانیہ کا ہے بچے کو کوئی ایسا لفظ نہیں کہنا چاہیے جس سے اس کو تکلیف یا اس کی توہین ہو اور اس کہنے سے اس کو تکلیف ہوگی نہیں کہنا چاہیے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۸/۱۴۱۰ھ
الجواب صحیح محمود عندہ

نفقہ مطلقہ کے بارے میں حکم شرعی:

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ اجلاس منعقدہ ایسٹرن کورٹ نئی دہلی مورخہ ۶ دسمبر ۱۹۸۱ء میں یہ طے

۱- ”عن المعروف قال لقبت اباذر بالربلة وعليه حلة وعلي غلامه حلة فسنكه عن ذالك فقال إلی ما بیت رجلا فعبره بامه فقال لی البی نالعلیا اباذر أعبره بامه الک امرؤ فیک جاهلیة الخ“ (بخاری شریف ۹/۱)۔

کیا گیا ہے کہ سپریم کورٹ میں نفقہ مطلقہ (متعلق دفعہ ۱۲۵ ۱۲۷ سی، آر، پی، سی) کے متعلق جو اپیل زیر سماعت ہے، اس میں بورڈ بھی فریق کی حیثیت سے مداخلت کرے اور اپنے وکلاء کے ذریعہ سپریم کورٹ کے سامنے معاملہ کی قانونی اور فقہی حیثیت کی وضاحت کرے۔

نفقہ مطلقہ کا پس منظر یہ ہے کہ چند سال قبل پارلیامنٹ میں ایک بل پیش ہوا تھا۔ جس کا مفاد یہ تھا کہ اگر کسی شوہر نے بیوی کو طلاق دے دی تو بیوی کو اس وقت تک نفقہ دینا ہوگا جب تک کہ اس کا دوسرا نکاح نہ ہو جائے، یا پھر اس کا انتقال نہ ہو جائے، مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس سلسلہ میں حکومت کے ذمہ داران سے گفت و شنید کی اور قانون میں بڑی حد تک ترمیم کرائی گئی، اس ترمیم کے بعد قانون کا یہ مفاد رہا کہ اگر شوہر دین مہر، واجبات عدت ادا کرے تو پھر بیوی کو کچھ اور دینا نہیں ہوگا۔

لیکن مختلف کورٹس کے فیصلوں نے پارلیامنٹ کے طے کئے ہوئے قانونی منشاء کو متاثر کر دیا اور خاص طور پر مسٹر جسٹس کرشنا ایر کے فیصلے نے قانون کی شکل ہی بدل دی، ان کے فیصلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ شوہر اگر طلاق دے دے تو بیوی کو تا حیات نفقہ دینا ہوگا۔ ہاں اگر بیوی دوسرا نکاح کر لے تو نکاح ثانی کے بعد طلاق دینے والے کو نفقہ نہیں دینا پڑے گا۔

یہ فیصلہ فقہ اسلامی کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی میٹنگوں میں علماء کرام نے اسے واضح طور پر شریعت مطہرہ کے خلاف قرار دیا ہے، لیکن سپریم کورٹ کے فیصلے نے پورے ملک کی فضا کو متاثر کر دیا ہے اور زیریں عدالتیں سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی پابند ہو چکی ہیں، اب سپریم کورٹ کی نل بیج کے سامنے ایک مقدمہ درپیش ہے جس میں مسلم پرسنل لا بورڈ نے بھی فریق کی حیثیت سے مداخلت کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اس اہم کام کی دو جہتیں ہیں: ایک قانونی چارہ جوئی، دوسرے فقہی موافقہ اہم کرنا، دونوں کاموں کے لئے علیحدہ علیحدہ کمیٹی بنائی گئی ہیں، فقہی مواد فراہم کرنے والی کمیٹی کارکن بورڈ نے آپ کو بنایا ہے، مجھے امید ہے کہ آپ اس کمیٹی کا رکن بننا اور اس کے ساتھ تعاون کرنا پسند کریں گے اور اپنی منظوری سے مجھے مطلع فرمائیں گے۔

مداہم کرم آپ پہلی فرصت میں مسئلہ کے پہلوؤں کا جائزہ لیں اور قرآن و حدیث کے حوالوں سے ایسا موافقہ اہم کریں جس سے یہ بات ثابت ہو کہ مطلقہ کے نفقہ کی ذمہ داری طلاق دینے والے پر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی مدت کیا ہے اور اس مخصوص مدت کے خاتمہ کے بعد نفقہ کی ذمہ داری شوہر سے کیوں ختم کر دی گئی ہے، مجھے امید ہے کہ جلد ہی ایک مدلل تحریر مرتب کر کے آپ مذکورہ فقہی کمیٹی کے کنوینر، جناب مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی، قاضی امارت شرعیہ پھلواری

شریف پٹنہ کے پتہ پر ارسال فرمائیں گے۔ والسلام

منت اللہ (جنرل سکرٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ۸/ دسمبر ۱۹۸۱ء)

الجواب وبالله التوفیق:

پیش نظر مسئلہ کی وضاحت کے لئے پہلے چند باتوں کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے: پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام انسانوں کی عزت و آبرو اور نفس و عظمت کی حفاظت بے حد پسند و مطلوب ہے، اس بنا پر شرع و شارع علیہ السلام کا منشاء یہ ہے کہ کوئی عاقل بالغ مرد و عورت بغیر شرعی وجہ کے بغیر نکاح کے نہ رہے، یا اثراجات بہت بڑھ جانے کے خطرے کے سبب عموماً انسان غربت و تنگدستی کی وجہ سے نکاح سے گریز کرتا ہے، حالانکہ نکاح صحیح سے رزق بڑھتا ہے۔ رزق میں برکت ہوتی ہے، چنانچہ حدیث پاک میں نکاح کی ترغیب کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے: ”اطلبوا الرزق من الباع“ (۱) اور اسی غلط خیال کو رد کرنے کے لئے نکاح سے رزق میں تنگی ہوگی۔ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے: ”وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم ان یكونوا فقراء یغنہم اللہ من فضلہ“ (۲) اور اسی سے بہت سے مسائل متفرع ہیں۔ مثلاً:

- اولاد (لڑکا و لڑکی) جب بالغ ہو جائیں تو جلد سے جلد کسی مناسب جگہ ان کا نکاح کر دینا چاہئے، تاکہ بے نکاح کے نہ رہیں۔
- جب تفریق یا طلاق واقع ہو جائے یا عورت بیوہ ہو جائے تو بغیر وجہ شرعی کے دوسرے نکاح میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔
- جب بغیر نکاح بحر زندگی گزارنے سے مرد کو زنا کا خطرہ ہو یا عورت کو اپنی عصمت دری کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں نکاح کر لینا شرعاً واجب ہو جاتا ہے۔
- نکاح کی وجہ سے چونکہ عورت اپنے نفس و عزت کو شوہر کے حوالہ کر دیتی ہے، اس کے شوہر پر عورت کا نان و نفقہ و سکنی سب حسب حیثیت واجب و ضروری ہو جاتا ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ”لینفق ذو سعة من سعته“ (۳) اور

۱- کنز العمال۔

۲- سورہ نساء: ۳۲۔

۳- سورہ غلاقہ: ۷۔

ایک مقام پر ارشاد ہے: ”و علی الموسع قدره و علی المقتر قدره“ (۱)، اسی طرح کی اور بہت سی احادیث بھی ہیں جن میں صراحت ہے کہ نکاح کی وجہ سے عورت کا نفقہ مرد پر شرعاً واجب ہو جاتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر کے امر مقصود میں مجبوس ہو جاتی ہے اور عقلی قاعدہ بھی یہی ہے کہ جو شخص اپنے غیر کے حق مقصود میں مجبوس ہو تو اس کا نفقہ اسی شخص کے ذمہ ہو جاتا ہے، چنانچہ ہدایہ میں ہے: ”لأن النفقة جزاء الاحتباس، و كل من كان محبوساً بحق مقصود لغيره كانت نفقته عليه“ (۲)۔

لیکن بطریق امر قیدی و عبادات کے کمائی الہدایہ فی باب النفقة مطلقہ جب نابالغہ مشہبہ ہو، یا آنکسہ ہو یا حاملہ ہو، یا غیر حاملہ وعدت گزارا واجب ہوتا ہے: لقولہ تعالیٰ: ”و المطلقات یتربصن بانفسھن ثلاثۃ قروء“ (۳) و لقولہ تعالیٰ: ”و النبی یتسن من المسحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتھن ثلاثۃ أشهر و النبی لم یحصن، و اولات الاحمال أجلھن أن یضعن حملھن“ (۴) و لقولہ تعالیٰ: ”وان کن اولات حمل فأنفقوا علیھن حتی یضعن حملھن“ (۵) اور چونکہ زمانہ عدت میں ممکن ہے کہ رحم مطلقہ شوہر کے حمل سے مشغول ہو اور اس صورت میں صیائہ نسب اور اختیاطاً سے حفاظت کی خاطر مطلقہ کا احتباس ملحق الزوج ہونا ظاہر ہے، اس لئے احتباس کی وجہ سے ان مطلقات کا نفقہ بھی زمانہ عدت کا شوہر پر واجب رہتا ہے۔ اور بعد ختم عدت یہ تعلق احتباس بھی بالکلیہ ختم ہو جاتا ہے، اس لئے وجوب نفقہ بھی بالکلیہ ختم ہو کر اصلی حکم کہ بس بالغ مرد یا عورت کو بغیر عذر شرعی کے بلا تعلق نکاح نہ رہنا چاہئے، نہ کہ نفقہ کا وجوب بذمہ شوہر تا نکاح ثانی مطلقہ یا تا حیات مطلقہ باقی رہے گا۔

یہ حکم سر اسر منشاء شرع و شارع علیہ السلام کے خلاف اور متضاد ہوگا۔ جو شرعاً کسی طرح جائز و درست نہ ہوگا۔ اور آیت کریمہ: ”و للمطلقات متاع بالمعروف حقاً علی المتقین“ (۶) سے مدعا مذکور کہ مطلقہ کو تا حیات یا تا نکاح ثانی نفقہ کا وجوب ہونا بہت نہیں کر سکتے، اس لئے کہ ”متاع بالمعروف قرآن پاک میں متعدد جگہ وارد ہوا ہے۔ ان سب

۱- سورہ بقرہ ۲۳۶۔

۲- ہدایہ ۳/۲۵۵ کتاب الطلاق۔

۳- سورہ بقرہ ۲۲۸۔

۴- سورہ خلاق ۴۔

۵- سورہ خلاق ۶۔

۶- سورہ بقرہ ۲۳۱۔

پر اور ان کے متعلق روایت مرویہ پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ متاع بالمعروف سے مراد ضابطہ شرعیہ کے مطابق ایک متعین و معلوم المقدار مال کا دیدینا ہے۔

جو کبھی متعہ کے نام سے موسوم ہوتا ہے اور کبھی مہر مسمیٰ سے اور کبھی نصف مہر مسمیٰ سے اور کبھی مہر مثل سے اور کبھی عدت کے اندر نفقہ متوسطہ سے مراد ہوتا ہے اور بس، ان مرادوں سے تجاوز کرنا یا ان کے علاوہ مراد لینا تفسیر بالرائے کے حکم میں ہو کر ممنوع و ناجائز ہوگا، اس لئے کہ تفسیر بالرائے ناجائز ہے اور گمراہی کا دروازہ کھولتا ہے اور اس پر مفسرین اور محققین سلف و خلف کا اجماع ہے۔

چنانچہ احکام القرآن للجصاص میں آیت کریمہ: ”وَالَّذِينَ يَتُوفُونَ مِنْكُمْ وَيُذَرُونَ اَزْوَاجًا“ کے تحت مذکور ہے: ”وَمِمَّا يَدُلُّ عَلَى اَنَّ الْمَتْعَةَ غَيْرُ وَاجِبَةٍ مَعَ الْمَهْرِ اتَّفَاقُ الْجَمِيعِ عَلَى اَنَّهُ لَيْسَ لَهَا الْمَطَالِبَةُ بِهَا قَبْلَ الطَّلَاقِ، فَلَوْ كَانَتِ الْمَتْعَةُ تَجِبُ مَعَ الْمَهْرِ بَعْدَ الطَّلَاقِ لَوْ جَبَتْ قَبْلَ الطَّلَاقِ وَفِي ذَلِكَ دَلِيلٌ عَلَى امْتِنَاعِ وَجُوبِ الْمَتْعَةِ وَالْمَهْرِ (ای معا)“ (۱)۔

اور اس کی تائید فتح القدیر شرح ہدایہ کی اس عبارت: ”الْمَتْعَةُ اَرْبَعَةُ اَقْسَامٍ (الی قولہ) لیست بواجب ولا سنة ولا مستحب وهي التي طلقها قبل الدخول بها وقد سمي لها مهرا، لأن نصف المهر ثابت لها فيقوم مقام المتعة“ (۲) سے بھی ہوتی ہے۔

غرض نفقہ مطلقہ کو تا حیات یا تا نکاح ثانی واجب قرار دے دینا قطعاً جائز نہ ہوگا بلکہ صریح مداخلت فی الدین ہوگی اور کھلا ہوا ظلم ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/ ۳/ ۱۴۰۳ھ

مطلقہ کو نفقہ کب تک ملے گا:

سوال: وهذا معلوم لكل واحد من أبناء الهند ان الحكومة الهندية قد جاءت بقرار يلزم فيه رجال المسلمين الذين طلقوا نساءهم على نفقتهن حتى تزوجهن رجال آخرون أوتو فهن الله تعالى، فإن

۱- احکام القرآن للجصاص ۱/ ۳۳۲

۲- فتح القدیر ۱/ ۳۳۸

من القضاة في أنحاء البلاد قد حكموا على الرجال الذين طلقوهن على نفقتهن حتى تزوجهن الآخرون، وإن أصواتكم أيها الأستاذ الفاضل واستنكاراتكم قد سمعنا ها بأذاننا العارية، ولكن أذن الحكومة مازالت مما حتى هذه اللحظة الأخيرة، وبعض الرجال الذين حكم عليهم بنفقة المطلقات قد رفعوا الاستئناف إلى المحكمة العالية مدعين أن هذا الحكم مخالف لأحكام شريعة الإسلام وحتى لدستور الهند، وهم يجتهدون كل الاجتهاد على حصول من المحكمة العالية ضد هملهم القراء ويعتنون غاية الاعناء بجمع الفتاوى من مختلف أنحاء العالم الاسلام فنرجوا فضيلتكم ان ترسلون فتوى على هذه القضية (في اللغة الانكليزية) نرفعها أمام محكمة العالية. ومن الأسف أن بعض محامين المسلمين بالهندي يدعون أن القرآن الكريم لا يخالف هذا القرار مستنلين إلى الآية الواردة في سورة البقرة: "وعلى المطلقات متاع بالمعروف حقا على المتقين" وهذه فرصة ذهبية لرفع اصواتنا واستنكار اتنا ضد هذا القرار الضال، فإن الانتخاب إلى مجالس النواب والبرلمان قد قرب، فإننا نرفع أصواتنا من كل أنحاء البلد في هذه الفرصة، فتفوضوا بلا إقرار. والسلام

الجواب وبالله التوفيق :

یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جس شخص نے اس کی اصطلاحات سے جس شخص کو پوری واقفیت نہ ہو اور اس نے اس شخص کو اور اس کی اصطلاحات کو اس شخص کے جاننے والوں سے اور اساتذہ سے باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو، اس کو اس شخص میں بحث کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ اگر بحث کرے گا تو فقط یہی نہیں کہ وہ بحث غیر مفید و غیر معتبر ہوگی، بلکہ بسا اوقات اس شخص پر افترا اور اس کی تخریب میں سعی کے مترادف ہوگا اور طرح طرح کے فساد کا سبب بن جائے گا۔

مثلاً لاء (تانون) اور اس کی اصطلاحات کو جس شخص نے قانون (لاء) کے ماہرین اساتذہ سے باقاعدہ سمجھ کر پوری مناسبت و استعداد حاصل نہ کی ہوں کو قانون کی کسی دفعہ پر نقد و تبصرہ کرنے کا اور قانونی بحث کرنے کا حق و اختیار نہ ہوگا، ورنہ مقصد قانون ہی فوت ہو جائے گا، بلکہ بسا اوقات نہایت خراب اور مہلک نتائج نکل آئیں گے۔ بالکل اسی طرح شریعت ایک مکمل قانون ہے اور اس کی بہت سی اصطلاحات ہیں اور اس کے خاص اصطلاحی معنی و مفہوم ہیں جس شخص نے ان قوانین و اصطلاحات اور اصطلاحی معانی و مفہوم کو ان قوانین کے اور اصطلاحات کے جاننے والے اساتذہ و ماہرین و عالمین سے

باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو، ان سے پوری مناسبت واستعداد نہ پیدا کر لی ہو، اس کو قوائین شریعت اور اس کی اصطلاحات میں بحث کرنے کا حق نہ ہوگا، اگر کرے گا تو وہ بسا اوقات شریعت مقدسہ پر افترا کرنے کے مترادف ہوگا اور طرح طرح کے فساد رونما کرنے کا سبب بن کر پوری امت کی بلاکت و تباهی کا بھی سبب ہو سکے گا، مسئلہ زیر بحث بھی اسی نوع کا ہے، آیت کریمہ ”وللمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المستقین“ (۱) کا تعلق اس حکم سے بالکل نہیں ہے کہ مطلقہ کو اس کی تاحیات یا تانکاح ثانی منجانب طلاق دہندہ نفقہ دیا جائے، اگر ایسا کیا گیا تو دین الہی پر افترا ہوگا اور نہایت مہذب طریقہ سے اور نہایت ہوشیاری سے دین حنیف میں اور دین الہی میں تخریب کاری کی سعی کے مترادف ہوگا۔

اس لئے کہ نصوص کی روشنی میں اور نصوص کی مدد سے ”المطلقات“ میں الف لام عہد کا ہے اور اس سے وہ مطلقہ عورتیں مراد ہیں جن کے مہر مقرر نہ ہوئے ہوں اور ان کے شوہروں نے تعلق زن و شوئی سے قبل ہی طلاق دیدی ہو، نہ کہ ہماری مطلقہ عورتیں مراد ہوں۔ اور ”متاع“ سے ایسی ہی عورتوں کے مہر مثل سے نصف کے اندر کی مقدار مراد ہے۔ یہ عورت کے حسب حال بشکل نقد یا بشکل سامان ہو، نہ کہ ان کی تاحیات یا تانکاح ثانی کا پورا خرچ مراد ہو اور اگر ”المطلقات“ میں ”الف لام“ عام رکھا جائے، عہد کا نہ لیا جائے تو ”متاع“ سے مراد محض عدت مقررہ متعینہ کا نفقہ ہے، نہ کہ ان کی تاحیات یا تانکاح ثانی کا نفقہ۔ ہکذا يؤخذ من الروح (۲/۴۳) اور قرآن پاک میں ہے: ”اسکنوہن من حیث سکنتم من وجہ کم ولا تضاروہن لتضیقوا علیہن، وإن کن أولات حمل فأنفقوا علیہن حتی یضعن حملہن“ (۲) حاملہ عورت کی عدت، خواہ وہ مطلقہ کیوں نہ ہو وضع حمل مخصوص ہے۔ اور جنین کا جز و شوہر ہونا ظاہر ہے اور اسی وجہ سے پیدا ہونے کے بعد اس کا نفقہ حضانت بھی بذمہ مولود لہ ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود آیت نے اس مطلقہ کو محض زمانہ عدت حمل تک کا ہی نفقہ دیا ہے، یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ جب حاملہ کو بھی زمانہ عدت ہی تک کے نفقہ کا استحقاق ہے تو غیر حاملہ کو بدرجہ اولیٰ زمانہ عدت کے بعد کے نفقہ کا استحقاق نہ ہوگا۔ پھر ان تمام تصریحات و تعینات شرعیہ کے خلاف متاع مطلقہ کے دوسرے معنی و مصداق کو ظاہر کر کے محض اس کو حکم شرعی قرار دینا ظاہر ہے کہ ناجائز ہے گا۔ اور دیدہ و دانستہ ایسا کرنا یا تو تخریب فی الدین کی سعی کے مترادف ہوگا یا افتراء علی اعلیٰ اشرع ہوگا۔

اس لئے صورت مسئولہ کے مطابق فیصلہ کرنا عورت کے نکاح ثانی یا تاحیات نفقہ کے لازم کرنے کا قانون بنانا

۱- سورہ بقرہ ۲۳۱۔

۲- سورہ خلاق ۶۔

بلاشبہ ناجائز اور مداخلت فی الدین ہوگا، اور کسی طرح جائز نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳/۳/۱۳۹۵ھ

منکوحہ کا بچہ اس کے شوہر کا ہوگا:

کوثر کو جب کہ بائو بہت چھوٹی تھی طلاق ہو گئی تھی اور بتایا تو یہ جاتا ہے کہ کوثر کے خاوند کے کسی طوائف سے نکاح کر لینے کے باعث کوثر کی پھوپھی فاطمہ نے کوثر کو طلاق دلو کر اپنے پاس رکھ کر پالا اور سہارا دیا ہے، مگر زید کو شک ہے کہ معاملہ اس طرح نہیں، بلکہ دوسرا ہے وہ یہ کہ زید کے ماموں راشد نے اپنے کسی ہندو دوست کے لڑکے موہن کی بیچن سے پرورش کی ہے اور موہن کوثر ہم عمر ہونے کے ماٹے ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہے اور موہن نے ۸ سال کی عمر ہو جانے کے باوجود نہ تو ابھی تک شادی کی ہے، نہ وہ اپنے ماں باپ بھائی بہن سے ملنے جاتا ہے اور اپنی تمام کمائی کوثر اور اس کی لڑکی بانو اور راشد کے اوپر خرچ کرتا ہے۔ آج اس دور میں ہر کسی لالچ یہ سب کرنا ناممکن ہے۔ لہذا زید کو شک ہے کہ موہن کے کوثر سے ناجائز تعلقات ہیں اور بانو ان کی ناجائز اولاد ہے، اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ زید نے موہن اور کوثر کی باہمی گفتگو کے دوران ایک دوسرے کو بہن یا بھائی کے القاب سے مخاطب ہوتے سنا ہے۔

اگر زید کا شک واقعی درست ہے اور بانو حقیقت میں کوثر اور موہن کی ناجائز اولاد ہے تو ایسی صورت میں زید کا بانو سے نکاح درست ہے کہ نہیں؟ کوثر ایک مسلمان کے موہن ایک ہندو سے ناجائز تعلقات کی بناء پر حرام اولاد سے نکاح کرنے کی صورت میں اس بانو کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد پر شریعت کا کیا حکم ہوتا ہے؟ کیا آگے چل کر بانو کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد بھی ناجائز ہوگی، مفصل حوالہ کے ساتھ جواب عنایت ہو۔

الجواب وبالله التوفیق:

اگر ان مذکورہ باتوں اور الزامات کو تسلیم بھی کر لیا جائے، بلکہ اگر واقعی ایسا ہو بھی گیا ہو تو جب بھی یہ نکاح ناجائز یا مکروہ نہ کہا جائے گا اور جب کوثر کو طلاق ہونے سے قبل ہی بانو پیدا ہو چکی تھی تو بانو کو کسی حال میں حرامی وغیرہ کہنا یا سمجھنا بھی ناجائز اور حرام اور سخت گناہ ہوگا۔ البتہ کوثر کا موہن کے سامنے بے پردہ ہونا اور اسی طرح بے تکلف رہنا شرعاً حرام اور ناجائز ہے، کوثر کی ماں اور کنبہ و خاندان کے سارے ہی افراد حسب استطاعت اس عمل سے نہ روکنے پر عند اللہ مأخوذ ہوں گے، اور

ان سب پر شرعاً حسب استطاعت لازم ہے کہ پردہ کرائیں یا پھر شرعی جواز کی صورت سوچیں، فقط واللہ اعلم بالصواب
کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۸/۱۳۹۸ھ

جنات کا سلسلہ نسب:

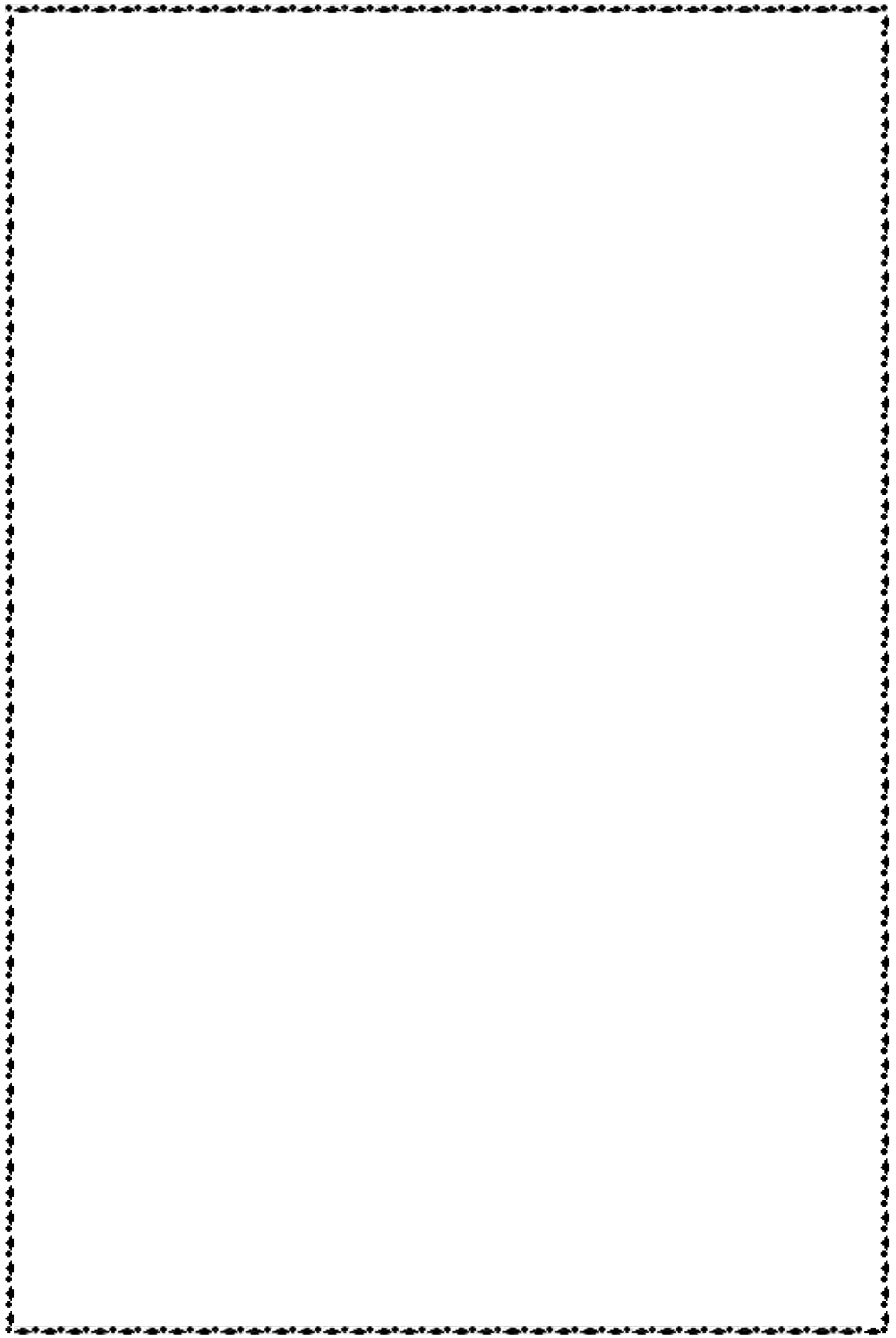
انسانوں کا سلسلہ آدم و حوا سے شروع ہوا، جنات کا شجرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ جنات کس قسم کے گناہ کرتے ہیں؟ ہمارے رسول ﷺ کے علاوہ جنوں کے اور کتنے رسول ہوئے ہیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

جنات کا شجرہ ابوالجئن سے شروع ہے، اس میں اگرچہ اختلاف ہے کہ وہ ابوالجئن کون ہے؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابلیس ہی ہے اور مسئلہ چونکہ موقوف علیہ نجات نہیں ہے اور نہ عقیدہ ضروریہ سے متعلق ہے، اس لئے یہ اختلاف معتبر نہیں۔ گناہ نام ہے حکم خداوندی کی نافرمانی کا، اور یہ مفہوم حکم کے خلاف کرنے سے آجائے گا، لہذا یہ سوال بے محل ہے، ہمارے رسول ﷺ کے علاوہ کتنے رسول ان میں اور ہوئے اس کی تحدید منقول و مصرح نہیں۔ اور موقوف علیہ نجات نہ ہونے کی وجہ سے ان کا بتلانا اور جاننا بھی ضروری نہیں، بلکہ اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول ان کی ہدایت کے لئے مناسب قرار دیئے بھیجے، ان میں ہمارے رسول ﷺ ضرور شامل ہیں اور سب سے افضل ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

كتاب الوقف



کتاب الوقف

موقوفہ جائداد علی الاولاد کے وقف کو ختم کر کے تقسیم کرنا درست نہیں ہے:

ہندہ مرحومہ نے ایک جائداد وقف علی الاولاد مندرجہ ذیل شجرہ اولاد پر وقف کی، اس کی تقسیم از روئے شرع کس طرح ہونی چاہئے؟ وقف کردہ جائداد کا وقف ختم کر کے تقسیم ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر تقسیم ہو سکتی ہے تو مندرجہ ذیل شجرہ پر تقسیم سے از روئے شرع مطلع فرمائیں!

ہندہ خاتون

میت

ابن	ابن	ابن	بنت
محمد جان	محمد اور لیس	محمد نساء	رحمت بی
۱- محمد نساء کا انتقال ہو جاتا ہے اور وہ لا ولد انتقال کر گئی۔			

۲- محمد اور لیس کا بھی انتقال ہو جاتا ہے اور وہ بھی لا ولد انتقال کر گئے، ان دونوں بھائی بہن کا حصہ بروئے شرع کس کو پہنچتا ہے؟

۳- رحمت بی کو وقف کردہ جائداد سے بروئے شرع کس قدر حصہ پہنچتا ہے؟

محیب الرحمن منصور پوری (فرخانا دہلی)

الجواب وبالله التوفیق:

جائداد وقف کرنے کے بعد اس کو تقسیم کرنا درست نہیں (۱)، البتہ وقف کردہ جائداد کی آمدنی موقوف علیہم پر واقع

۱- ”وعدیہما ہو حبسہا علی حکم ملک اللہ تعالیٰ، وصرف مشعہا علی من أحب ولو غبا فیلزم، فلا یجوز لہ

الجواب وبالله التوفیق:

اگر واقف نے مضمین کر دیا ہو کہ میرے روپے سے فلاں ہی شخص اس مدرسہ کو چلائے گا تو جب تک وہ فلاں شخص زندہ رہے گا اور اس سے مالی خیانت نہ ہوگی، اس وقت تک وہی شخص اس روپے سے مدرسہ چلانے کا حقدار رہے گا۔ البتہ جب وہ شخص انتقال کر جائے گا یا اس سے مالی خیانت ثابت ہوگی تو واقف کی اجازت سے دوسرے شخص کو مدرسہ چلانے کا حق ہو جائے گا۔ اور اگر واقف مر چکا ہو تو وقف کی حفاظت اور اس کو باقی رکھنے کی غرض سے شرائط کے مطابق دوسرے دین دار اور مناسب شخص کو یہ حق ہو جائے گا (۱)۔

اس سوال کا کہ وقف علی الاولاد کی کیا نوعیت ہے؟ کیا اس میں سے لڑکا اور لڑکی کو یکساں حصہ ملے گا یا کچھ فرق ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں فقہاء میں اختلاف ہے، بعض فقہاء مثل بیہ کے مساوات کے قائل ہیں اور بعض فقہاء بخلاف بیہ کے وقف میں للذکر مثل حظ الانثیین کے قائل ہیں۔

علامہ ثنائی نے ”مطلب مراعاة غرض الواقفین واجبة، والعرف یصلح مخصصاً“ کے تحت ایک طویل تفسیر بحث کی ہے۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر واقف خود زندہ ہو تو اسی سے دریافت کر لیا جائے اور جیسا وہ کہے اسی کے مطابق عمل کیا جائے (۲)۔

اور اگر اس کا کوئی معمول بھی متعین اور واضح نہ ملے تو للذکر مثل حظ الانثیین کے قاعدے کے مطابق ہر لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر دیا جائے گا اور اسی قول کو رائج قرار دیا ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں: ”فإذا أطلقها الواقف انصرف إليهما، إلى قوله، وفي جامع الفصولین: مطلق الكلام فيما بين الناس ينصرف إلى المتعارف“ (۳)۔

۱- ”لأن شرط الواقف كنص الشارع“ (الدر المختار علی الثانی، ص ۳۱۶ کتاب الوقف)، ”ولأن شرط الواقف معبرة إذ الم يخالف الشرع“ (الدر المختار علی الثانی، ص ۳۱۶ ج ۲ کتاب الوقف)، ”ولأن مراعاة غرض الواقفین واجبة والعرف یصلح مخصصاً“ (علی حاشی الثانی، ص ۲۲۳ ج ۲ کتاب الوقف)۔

۲- ”وقسم بينهم بالسوية إن لم يردب البطون وإن قال: للمذكر مثل حظ الانثیین فكما قال (الدر المختار علی الثانی ۳/۳۳۸ کتاب الوقف)۔

۳- فتاویٰ ثنائی ۳/۲۲۳ کتاب الوقف۔

اس بحث کو شامی میں اور تنقیح فتاویٰ حامد یہ میں اور فتاویٰ خیر یہ میں، ص ۱۵۰ جلد اول پر بہت تفصیل سے نقل کیا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۶/۱۴۰۱ھ

بھوپال کے بعض اوقاف کا شرعی حکم:

سابقہ ریاست بھوپال میں جو بیگمات کے زیر حکومت تھی فرماں روائے وقت سرکار شاہجہاں بیگم صاحبہ نے ایک پروانہ تاریخ ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۳۵ھ جاری فرمایا، جس کی رو سے کچھ باغات ریاست کو وقف فرمائے تھے، پروانہ کی نقل شامل ہذا ہے، اس وقت ریاست کی جو رپورٹ سالانہ شائع ہوتی تھی اس کی دفعہ ۳۵ میں بھی اس کا روائی کی تصدیق کی گئی تھی، رپورٹ مذکور کا اقتباس متعلقہ بھی شامل ہے، اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس وقت کے نظام حکومت کے اعتبار سے۔

۱۔ فرماں روائے وقت مختار کل اور ریاست کی جملہ املاک کا مالک کامل ہوتا ہے!

۲۔ ریاست کے اندر جو اوقاف واقع تھے، ان کے متعلق قوانین و احکام وقف میں مرقوم تھا کہ تمام اوقاف شاعی (فراد خانہ ان شاعی کے قائم کردہ اوقاف) کی اور اوقاف عامہ دیگر اشخاص کے قائم کردہ اوقاف میں سے ان اوقاف کی جن کا کوئی متولی نہ ہو ریاست متولی ہوگی۔

۳۔ سرکار شاہجہاں بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد ان کی چائشیں سرکار سلطان جہاں بیگم صاحبہ ہوئیں اور انہوں نے ان میں سے ایک باغ موسومہ عیش باغ کو اپنے صاحب زادے نواب نصر اللہ خاں صاحب کو معافی دے دیا، اور ان کے بعد دوسرے صاحب زادے نواب حمید اللہ خاں صاحب کو دے دیا، نواب صاحب موصوف نے جو بعد میں خود فرماں روا ہو گئے تھے اپنے حکم سے اپنے نام کرا لیا، چنانچہ بعد میں کاغذات وہی میں یہ باغ نواب حمید اللہ خاں صاحب کے نام درج ہوا اور ابھی ان کی صاحب زادی کے نام درج ہے۔

ازراہ کرام مندرجہ ذیل امور کے متعلق روشنی ڈالی جائے گی:

- ۱۔ کیا ان دستاویزات کی رو سے جن کی نقول شامل ہذا ہیں، باغات مذکورہ بشمول عیش باغ دو اوقاف ہو گئے تھے؟
- ۲۔ اس پروانہ (مورخہ ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۳۵ھ) میں جس کی نقل شامل ہے نیابت وقف کیا جانا مذکور ہے کیا اس

عبارت سے دائمی وقف میں کوئی نقص واقع ہو گیا ہے؟

۳۔ کیا فرماں روایان مابعد کے عمل سے جس کی تفصیل پیرا گراف ۳ مندرجہ بالا میں دی گئی ہے، وقف متاثر اور زائل ہو گیا ہے۔

الجواب وبالله التوفیق :

جب فرماں روایان حکومت بھوپال حملہ املاک ریاست کے مالک تھے، تو ان کے کسی وقف نامہ میں محض لفظ نیابتہ واقع ہو جانے سے کسی وقف میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا، بلکہ نیابتہ لکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح نواب سکندر جہاں نیگم صاحب مرحومہ نے ۱۲۸۰ھ کو فرحت باغ کو وقف کیا ہے، اسی طرح ان ہی کے نقش قدم نیابتہ میں سرکار شاہ جہاں نیگم صاحب نے بھی ۱۳۰۲ھ میں نور باغ کو نواب جہانگیر محمد خاں صاحب مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے وقف کیا، اور عیش باغ کو نواب قدسیہ نیگم صاحبہ مرحومہ کے ایصال ثواب کے لیے وقف کیا۔

صرف فرق اتنا ہے کہ نواب سکندر جہاں نیگم صاحبہ نے بذریعہ وصیت ۱۲۸۰ھ میں اس وقف کا اظہار کیا ہے اور سرکار شاہ جہاں مرحومہ نے بذریعہ پروانہ سرکاری حکم نامہ بابت ۱۳۰۲ھ میں وقف کیا ہے۔

لہذا سب صحیح و مانڈ ہیں اور اس لفظ نیابتہ سے کوئی وقف زائل نہ ہوگا اور پھر سرکار سلطان جہاں نیگم صاحبہ نے جو عیش باغ کو اپنے صاحبزادے نواب نصر اللہ خاں صاحب کو یا ان کے بھائی نواب حمید اللہ خاں صاحب کو دے دیا یا جناب نواب حمید اللہ خاں صاحب نے اپنے دو فرماں روائی میں اپنی صاحبزادی کو دے دیا اگرچہ بنام معافی دیا ہے، مگر چونکہ حسب تصریح پروانہ ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ بشمولہ مثل ۵۱ مد مال دفتر ۱۔ باقاعدہ وقف مکمل و مانڈ ہو چکا ہے، اس لیے اس لفظ معافی سے مراد تملیک یا بیعہ نہ ہوگا، بلکہ حسب ضابطہ شرعیہ کلیہ کسی عاقل بالغ کا قول مہما اکمل احسن پر محمول کرنا ضروری ہوتا ہے، شرح میر کبیر للسرحدی۔

لہذا اس کی یہ توجیہ ہوگی کہ ان فرماں روایان وقف جناب سرکار سلطان جہاں نیگم و جناب نواب حمید اللہ خاں صاحب نے محض اپنا حق تولیت ان کے سپرد کیا ہے اور اپنا حق تولیت ان کے حق میں معاف کیا ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نواب سلطان جہاں نیگم نے پہلے یہ حق جناب نصر اللہ خاں صاحب کو دیا، پھر ان سے لے کر یا ان کے بعد اسی حق

کو جناب حمید اللہ خاں صاحب کو دیا ہے، پس اگر اسی طرح دینے کو تملیک سمجھایا اپنے کو عیش باغ کا مالک سمجھایا اپنی صاحبزادی کو بطور تملیک و بیہ دیا تو یہ ان کی سمجھ کی غلطی تھی، مگر اس غلطی سے عیش باغ کا وقف ختم نہ ہوگا اور نہ اس میں فتور واقع ہوگا اور اگر ایسا نہیں ہے تو یہ ان کی غلطی بھی نہیں ہے۔

بہر حال اس صورت میں یہ وقف عیش باغ کا وقف قائم و صحیح رہے گا، صاحبزادی صاحبہ بھی متولیہ ہی شمار ہوں گی اور حقوق ذرائع تولیت ان پر بھی حسب شرائط وقف متوجہ ہوں گی اور بس!

اور ان فرما مارویان وقف کا یہ دینا قریب ایسا ہی ہوا کہ جیسا باغ فدک جو پہلے سے وقف تھا اور حضرت عمرؓ نے اس کو حضرت علیؓ کو دیا اور پھر حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ کو دیا اور یہ دینا تملیک و بیہ شمار نہ ہوا بلکہ بطریق تفویض و تولیت تھا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہارپور ۱۷/۵/۱۳۹۳ھ

ٹونک کے ایک وقف کا شرعی حکم:

ایک مسلمان نے اپنی غیر منقولہ جائیداد وقف کر کے واضح طور پر اپنی نیت ظاہر کر دی اور بتلادیا کہ اس موقوفہ جائیداد کی آمدنی سے میری تعمیر کردہ مسجد کے مصارف چائے جائیں، کچھ حصہ دینی تعلیم پر صرف کیا جائے وغیرہ وغیرہ اور شروع سے اب تک اسی طرح صرف بھی ہو رہے ہیں!

۱۔ تو کیا کبھی اس جائیداد کی آمدنی کو کسی اور کام پر بھی صرف کیا جاسکتا ہے، جو وقف کی نیت کے خلاف ہو؟
۲۔ جائیداد موقوفہ جس کا حوالہ سوال ۱ میں دیا گیا ہے، وقف ہونے کے بعد اعلیٰ چیز میں تبدیل کر دی گئی ہے، یا اس وقف کی پس انداز رقم سے نئی جائیداد خرید لی گئی ہے، تو اس زائد آمدنی سے کوئی ایسا مصرف کیا جاسکتا ہے جس کا وقف مطلق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۳۔ ایک غیر منقولہ جائیداد وقف ہے، لیکن وقف نامہ نہیں ہے اور شروع سے اس جائیداد کی آمدنی سے اس مسجد کے مصارف پورے کیے جا رہے ہیں جو وقف جائیداد کے نام سے مشہور ہے۔

لیکن کیا ایسی جائیداد کی آمدنی اس کام پر صرف ہو سکتی ہے جس پر اب تک کبھی کوئی مصرف نہ کیا گیا ہو؟
۴۔ شہر ٹونک کی آبادی سے ملحقہ کھیت اور گورستان ہے، کسی گورستان کے قریب زرعی آراضی ہے، تو مالک کھیت

کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دھیرے دھیرے گورستان کا تھوڑا تھوڑا حصہ اپنے ملکیت میں شامل کر لے، اور اگر گورستان کے قریب مکانات تعمیر ہو گئے ہیں تو مکانات گورستان کو اپنے استعمال میں لا رہے ہیں اور ایک شریک شدہ طبقہ ایسا ہی ہے جو گورستان کو دیکھنا ہی نہیں چاہتا اور مٹانے کی فکر میں ہے۔

اس لیے سوال یہ ہے کہ گورستان کی حفاظت کس طرح ہو، قوم کی اس طرف توجہ نہیں ہے اور مقدمہ بازی کرنے کے لیے روپے نہیں ہیں، اگر کسی مسلمان وکیل کے پاس جائیں تو وہ پوری اجرت لیتا ہے اور اگر کسی امور کوٹا نہ پ کر انہیں بھی تو پوری فیس دینی پڑتی ہے۔

غرضیکہ بغیر معاوضہ کوئی مسلمان کوئی کام نہیں کرنا تو شرعاً گورستان کی حفاظت کی ذمہ داری کس کی ہو سکتی ہے؟

مرزا مصطفیٰ بیگ (ریٹائرڈ عظم مال ٹونک اسٹیٹ محلہ تالہرا جھٹھان)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- واقف نے جن جن مصارف کے لیے وقف کیا ہے جب تک ان مصارف کے لیے ضرورت باقی ہے یا آئندہ ضرورت متوقع ہے کسی دوسرے مصرف میں صرف کرنا درست نہیں۔

ہاں جو آمدنی اس سے بھی زائد ہو اور رکھی رہنے میں ضائع ہونے کا قوی اندیشہ ہونے لگے تو مسلم ذمہ داروں کے مشورہ سے دوسرے اہم کار خیر میں صرف کر سکتے ہیں۔

۲- اگر وہ اعلیٰ چیز و اعلیٰ مصرف واقف کے منشاء کے خلاف نہیں ہے تو یہ تبدیلی درست ہے ورنہ درست نہیں، اس وقف کی پس انداز رقم اگر ایسی زائد رقم ہے کہ جس کی ضرورت نہ تو اس وقت وقف مذکور میں ہے اور نہ آئندہ اس کی ضرورت متوقع ہے، تو اس زائد رقم سے کوئی جائیداد خرید کر کسی دوسرے کار خیر میں وقف کی جاسکتی ہے، یا جواب ۱ کے مانند صرف کیا جا سکتا ہے جو عمل بھی مسلم ذمہ داروں کے مشورہ سے ہو۔

۳- وقف کے متحقق کے لیے وقف نامہ بھی تحریر کرنا ضروری نہیں ہے، وقف زبانی بھی متحقق صحیح ہو جاتا ہے، پس واقف نے مسجد کے لیے وقف کر دیا اور اس موقوفہ پر خرچ بھی کرنے لگا تو وقف متحقق ہو گیا اور اب اس کے خلاف دوسری جگہ پر خرچ کرنا درست نہیں ہو سکتا، منشاء واقف کی رعایت واجب ہوتی ہے۔

۴- جواب ۱ و ۲ میں ذکر کردہ ضابطہ کے مطابق اوقاف کی فاضل آمدنی سے گورستان کی حفاظت و مرمت کی

جاسکتی ہے، نیز جو قبرستان مدفین سے متروک ہو چکے ہوں یا قانوناً دن سے روک دیے گئے ہوں اور ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس میں دینی ضرورت کے مطابق مسجد یا دینی مدرسہ قائم کر کے یا اس کو کسی ایسے کار خیر میں استعمال کر کے جس سے مسلم عوام اور بچوں کی مذہبی و اقتصادی تربیت و ترقی کا ایسا کام کیا جائے کہ اصل و انفعین کو ثواب پہنچتا رہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مال حرام سے خریدی ہوئی اشیاء کا وقف کرنا:

مالیر کوئلہ میں حسینہ نام کی ایک عورت کا مورخہ ۹ جون کو انتقال ہو گیا، یہ پہلے طوائف تھی پھر توفیق الہی تاب ہو گئی اور محمد شریف نامی ایک شخص سے نکاح کر کے باقی زندگی پاکیزگی کے ساتھ گزاری، محمد شریف کا چند دن پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ مسماۃ حسینہ نے اس زمانے میں جب وہ طائفہ تھی ایک مکان خرید لیا تھا اور اسی میں اس کی رہائش تھی، انتقال سے قبل اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنا مکان وغیرہ کار خیر یا مسجد کے لیے وقف کرنا چاہتی ہے۔

مسماۃ حسینہ کا وارث پہلے خاوند سے اس کا ایک لڑکا شبیر عرف پیر و میرٹھ میں موجود ہے وہ اپنی خالہ کے پاس رہتا ہے، اس کی خالہ اور شبیر کی مرضی بھی یہی ہے کہ مسماۃ حسینہ مرحومہ کی خواہش کے مطابق کیا جائے، امام ابوحنیفہ کا مشہور مسلک ہے کہ جو مال زانیہ اپنے کسب سے معاملہ طے کر کے حاصل کرے وہ حلال ہے اگرچہ عقد حرام تھا اور صاحبین کے نزدیک حاصل کردہ مال بھی حرام ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں مفتی بقول کیا ہے؟

۲- مسماۃ مذکورہ کا وارث اس کا لڑکا اگر وقف کرے تو کیا یہ وقف صحیح ہو جائے گا؟ درمختار کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مورث کا مال وارث کے لیے بھی حرام رہے گا: ”لکن فی المجتبیٰ: مات و کسبہ حرام فالامیراث حلال، ثم قال: لاناخذ بهذه الروایة، وهو حرام مطلقاً علی الورثة فتنبه، کرہمائی فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

منع فضیل الرحمن ہلال عثمانی (دارالافتاء مالیر کوئلہ پنجاب)

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئلہ میں اصل جواب سمجھنے کے لیے ان باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے:

۱- یہ کہ مکان مذکورہ اس کو کسی زانی نے بسلسلہ زنا نہیں دیا ہے، بلکہ مزنہ نے زنا کے پیسہ سے یا کسی اور طرح سے اس کو خریدا ہے۔

اگر مال حرام یا کسب زنا سے خریدا ہو تو یہ مال حرام ہے، اور اگر خریدا نے کی تیسری یا چوتھی صورت ہے تو اس کا حکم خود مزنہ کے حق میں یہ ہے کہ مفتی بقول میں واجب التصدق نہیں ہے کما دل علیہ ہذہ العبارة:

۱- ”أما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أو لا ثم اشترى منه بها“۔

۲- ”أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها“۔

۳- ”أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها“۔

۴- ”أو اشترى مطلقا ودفع تلك الدراهم“۔

۵- ”أو اشترى بدراهم آخر ودفع تلك الدراهم ثم قال بعد بحث طويل: وقال الكرخي في

الوجه الأول والثاني: لا يطيب، وفي الثالث الأخير: يطيب إلى قوله والفتوى على قول الكرخي“ (۱)۔

بلکہ مفتی بقول کے اس جملہ ”وفي الثالث الأخير يطيب الخ“ سے مملوک حلال اور جائز الاستعمال معلوم ہوتا ہے اور جب مورث کے لیے مملوک حلال اور جائز الاستعمال ہوگا تو وارثین کے لیے بدرجہ اولیٰ مملوک حلال اور جائز الاستعمال رہے گا۔

۲- یہ مکان خود وارثین کا مکسوب حرام نہیں ہے بلکہ وراثت میں نام ہے اور مورث کا بھی بعینہ مکسوب حرام نہیں ہے، بلکہ بیش از بیش مکسوب حرام کے ذریعہ سے خریدا ہوا ہے اور بعینہ مکسوب حرام وہ قیمتیں ہیں جو اس کی خرید میں دی گئیں اور ان قیمتوں کے مالک کا علم نہیں اور ایسی صورت کا حکم ثامی (۳/۱۳۰) میں یہ لکھا ہوا ہے:

”قوله: إلا في حق الوارث الخ فإنه إذا علم أن كسب مورثه حرام يحل له، لكن إذا علم

المالك بعينه فلا شك في حرمة ووجوب رده عليه“۔

پس جب یہ صورت ہے تو مملوک یا وراثت ہونے میں اور اس کے وقف کر دینے کی صورت میں کوئی کلام نہیں

ہوگا۔

اور یہ بات الگ ہوگی کہ وارث اگر تقویٰ برتے اور تعزہ کی خاطر صدقہ کر دے تو یہ انتہائی تقویٰ اور تعزہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۷/۱۳۹۸ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

وقف کے لیے تحریر ضروری نہیں، وقف زبانی بھی ہو جاتا ہے:

زید نے اپنی صحرائی زمین اور باغات اور مکان اور نقد روپیہ چار معتبر دین دار آدمیوں کے سامنے وقف کیا اور کہا کہ چونکہ وقف نامہ رجسٹرڈ کرانے میں ڈیڑھ دو لاکھ کا خرچہ ہے، اس لیے یہ جائیداد مذکورہ ہے تو وقف ہی، لیکن خرچ سے بچنے کے لیے میں وصیت نامہ لکھوا کر اس طرح رجسٹرڈ کرواؤں گا کہ وقف نامہ ہی سمجھا جائیگا۔

چنانچہ زید نے وصیت نامہ لکھوا کر رجسٹرڈ کرادیا۔ پھر اچانک زید کا انتقال ہو گیا، یہ وقف صحت اور ہوش و حواس کی حالت میں کیا تھا اور انتقال وقف کے تقریباً دس گیارہ ماہ بعد کیا، دل کا دورہ پڑنے سے اچانک انتقال ہوا۔ چند امور دریافت طلب ہیں:

● کیا زبانی وقف چار معتبر دین دار آدمیوں کے سامنے شرعاً صحیح ہو گیا یا نہیں؟

مشتہد کہ جائیداد کا وقف:

● اگر اس موقوفہ جائیداد میں کوئی دوسرا شخص بھی شریک ہو اور تقسیم کیے بغیر زید نے اپنا مہم حصہ وقف کر دیا ہو تو یہ وقف صحیح ہو گیا یا نہیں؟

● روپیہ کا وقف کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

زبانی وقف کے بعد خرچ سے بچنے کے لئے وصیت نامہ لکھنا:

● اگر زبانی وقف چار کو اہوں کے سامنے کرے، پھر وصیت نامہ خرچ سے بچنے کے لئے لکھا، تو کیا متولی وقف کو یہ حق ہے کہ وہ وقف سے نظر انداز کر کے وصیت نامہ کی رو سے دو ٹکٹ ورٹا لکھ دے۔

الجواب وبالله التوفیق:

● وقف صحیح ہونے کے لیے تحریر کرنا یا رجسٹرڈ کرنا لازم نہیں ہے، بلکہ وقف زبانی کرنے سے بھی ہو جاتا ہے،

کیونکہ زبانی ہی اصل ہے، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ”و محله المال المستقوم و ركنه الألفاظ الخاصة“ (۱)، البتہ سول سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس چیز پر وقف کیا ہے اور صرف منفعت کی جہت مؤبدہ ہے یا نہیں۔ جب تک صرف منفعت کی جہت بھی واضح نہ ہو جائے۔ حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول مفتی بہ کے مطابق کوئی بھی منقطع حکم نہیں لگ سکتا، لہذا یہ تنگی دور ہونے کے بعد ہی کوئی حکم لگ سکے گا۔

● اگر اس جائیداد موقوفہ میں صرف منفعت کی جہت مؤبدہ ہے تو دوسرے شخص کے شریک ہونے کے باوجود، جب کہ وہ جائیداد قائل تقسیم ہو حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق جو کہ مفتی بہ ہے، یہ وقف جائیداد صحیح شمار ہوگا کما دلت علیہ هذه العبارة: ”فلا يجوز وقف مشاع يقسم خلافاً للثاني (الی أن قال) واختلف الترجيح والأخذ بقول الثاني أحوط وأسهل۔ بحر۔ وفي الدرر: وقال صدر الشہید: وبه یفتی وأقر المصنف، وفي الشامی النعمانی: ان قول أبي يوسف أوجه عند المحققين (۲)، خلاصہ یہ ہے کہ جب تک اس جائیداد کا قائل تقسیم ہوا، نیز اس پر جہت مؤبدہ میں صرف منفعت کا ظم نہ ہو جائے، کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

● جائز ہے۔ اول تو اس لیے کہ اشیاء منقولہ کے تابع ہو کر ہے اور ضمن میں ہے، دوسرے یہ کہ اس کے رواج پر تعامل جاری ہے کما صرح بہ فی الشامی العممائیہ (۳/۳۷۴)۔

● اگر اس جائیداد موقوفہ میں صرف منفعت جہت غیر مؤبدہ میں ہے اور یہ عقد وقف مرض الموت سے قبل حالت صحت میں ہوا ہے تو یہ وقف مکمل و تام ہو چکا ہے اور وقف مکمل ہو چکنے کے بعد و اقف کو بھی کسی تغیر و تبدل کا حق نہیں رہتا، لہذا اس وصیت نامہ کے رجسٹرڈ کر دینے سے بھی اس وقف کے لازم و صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ کما دلت علیہ هذه العبارة ”فاذا تم ولزم فلا يملك ولا يعار ولا يرهن“ (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۵/۱۴۱۱ھ

موقوفہ زمین کی خرید و فروخت جائز نہیں:

عرض ہے کہ ایک زمین موقوفہ علی المسجد، بنائی پر ایک کاشت کار کے قبضہ میں تھی، آزادی کے بعد جب ٹینٹسی

۱- درختہ کتاب الوقف۔

۲- درختہ ریح رد المحتار کتاب الوقف ۶/۵۳۲ والکتب العلمیہ بیروت۔

۳- درختہ علی الشامی ۳/۳۷۴۔

(Tenancy) ایکٹ مانند ہوا، جس کی رو سے کاشتکار کو یہ حق حاصل ہوا کہ کاشت کار زمین پر اپنے قبضہ کو نیز زمین کے اندر اپنے کاشت کرنے کو ثابت کر کے گورنمنٹ کے ذریعہ اس زمین کا مالک بن جائے، اور گورنمنٹ، مالک زمین کی رضامندی کے بغیر، مارکیٹ ویلو سے بہت ہی کم نفع پر وہ زمین کاشتکار کے ہاتھ فروخت کر کے اپنی مقررہ قیمت مالک زمین کو دلاتی ہے۔ چنانچہ اسی قانون کے تحت کاشت کار نے مذکورہ زمین موقوفہ علی المسجد پر قبضہ کر کے لے لیا چاہا، لہذا قیم و متولی مسجد نے یہ زمین موقوفہ علی المسجد، زید (مشتري اول) کے ہاتھ فروخت کر دی، زید نے یہ بھیتی کی زمین خرید کر اس پر ہاوسنگ سوسائٹی بنانے کی غرض سے اس زمین کے مختلف پلاٹ بنا دیئے اور اس میں سے ایک پلاٹ (قطعہ ارض) پر کچھ نقد رقم وغیرہ اس کاشت کار کو (جس کے قبضہ اور کاشت میں اب تک یہ زمین تھی بطور رشوت) دے کر اس کو قبضہ چھوڑنے اور ٹیننسی ایکٹ کا فائدہ اٹھانے کے حق سے دستبردار ہونے پر رضامند کر لیا اور وہ دست بردار بھی ہو گیا۔

اس کے بعد زید (مشتري اول) نے مذکورہ زمین کے مختلف پلاٹ ایک ایک کر کے مختلف لوگوں کے ہاتھ فروخت کرنا شروع کئے، چنانچہ زید سے بکر، (مشتري ثانی) نے بھی ایک پلاٹ، مارکیٹ کے دام سے خرید، بکر (مشتري ثانی) کو خریداری کے وقت یہ علم نہ تھا کہ اصل میں یہ زمین موقوفہ علی المسجد تھی، بکر (مشتري ثانی) نے اپنی رہائش کے لئے مکان تعمیر کرنے کی غرض سے یہ زمین (پلاٹ) خریدی تھی، چنانچہ خریدنے کے بعد اس نے مذکورہ زمین پر مکان کی تعمیر شروع کر دی، اب تک کچھ تعمیر ہوئی ہے، اور کام جاری ہے، اسی دوران تعمیر اس کے علم میں یہ بات آئی کہ دراصل یہ زمین موقوفہ علی المسجد تھی، زید (مشتري اول) کو خریدتے وقت نیز بکر (مشتري ثانی) کے ہاتھ یہ زمین (پلاٹ) فروخت کرنے سے پہلے درحقیقت اس زمین کا موقوفہ علی المسجد ہونا بتایا نہیں، بکر کو اس کی خبر نہیں ہے۔

اب دریافت یہ ہے کہ مذکورہ بالا حالات میں قیم و متولی مسجد کی زید (مشتري اول) کے ہاتھ زمین موقوفہ علی المسجد کی یہ بیع شرعاً صحیح ہے یا باطل؟

۱۔ اگر صحیح ہے تو وقف غیر منقول کی بیع کن اعذار و اسباب کی بناء پر صحیح ہوتی ہے، اور اس سلسلہ میں کلی طور پر فقہی ضابطہ کیا ہے؟

۲۔ اگر فقہی نقطہ نظر سے یہ بیع باطل اور کالعدم ہے، تو اب بکر (مشتري ثانی) کیا کرے؟ ایسی کوئی گنجائش اور اجازت ہے کہ اس زمین پر مکان تعمیر کر کے بکر، اس میں قیام کر سکتا ہے، اور یہ تعمیر جائز ہو؟

۳۔ شرعی حیثیت سے اس زمین پر تعمیر شدہ مکان میں رہائش شرعاً جائز نہ ہو تو بکر، زمین کی قیمت اور تعمیر مکان میں

اب تک جتنا خرچ ہو چکا ہے، اس کا حرجانہ اور نقصان زید (مشتري اول) سے وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ آپ کے ذہن میں اس زمین پر تعمیر مکان کی کوئی جائز صورت ہو تو ضرور تحریر فرمائیں۔

محمد ضیف (یہودہ، کجرات)

الجواب وبالله التوفيق:

- (۱) ”فإذا تم (آی الوقف) ولزم لا يملك ولا يملك ولا يعار ولا يرهن“ (۱)۔
- (۲) ”تحت قوله: وجاز شرط الاستبدال الخ، أعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه والثاني: أن لا يشترطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية (إلى قوله) جائز الخ“ (۲)۔
- (۳) ”وصرف نقضه إلى عمارته إن احتاج، وإلا حفظه لاحتاج إلا إذا خاف ضياعه فيبيعه“ (۳)۔
- (۴) ”ولا سيما في زماننا (إلى قوله) قال: نعم، لأن الواقف غرضه انتفاع المارة ويحصل ذلك بالثاني“ (۴)۔

(۵) ”وهكذا في البحر (۵) وغير ذلك في كتب الفتاوى أيضا“۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ وقف تام اور مکمل ہو جانے کے بعد اس کا بیچنا، خریدنا، ہبہ کرنا، رهن رکھنا وغیرہ کچھ

۱۔ الدر المختار علی ہاشم رد المحتار مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ ۳۶۷/۳ میں اسی طرح ہے ”لا يملك ولا يملك“ جبکہ مکتبہ زکریا کے مطبوعہ نسخہ (۵۳۹/۶) میں صرف ”لا يملك“ ہے مگر علامہ مٹائی کی تشریح ”لا يملك أي لا يكون مملوكاً لصاحبه ولا يملك أي لا يملك المملك لغيره بالبيع والحوه“ سے واضح ہو جاتا ہے کہ مکتبہ زکریا کے نسخہ میں طباعت کی غلطی ہے (متن الدر علی ہاشم ۵۰۷/۳)۔

۲۔ رد المحتار علی الدر المختار ۵۸۳/۶۔

۳۔ الدر المختار مع رد المحتار ۵۷۳/۶، پوری عبارت اس طرح ہے ”(وصرف) الحاكم أو المولى، حاوی (لقضه) أو ثمنه إن نعد إعادة عبده (إلى عمارته إن احتاج وإلا حفظه لاحتاج) إلا إذا خاف ضياعه، فيبيعه ويمسك ثمنه لاحتاج“ (فی متن الدر علی ہاشم ۳۸۴/۳)۔

۴۔ رد المحتار علی الدر المختار ۵۵۰/۶، ۵۵۱۔

۵۔ البحر الرائق ۵/۳۲۱، ۳۲۲۔

بھی جائز نہیں ہوتا، ہاں اگر ضائع ہو جانے کا ظن غالب ہو جائے، یا بالکل ہی ناقابل انتفاع ہو جائے تو اس کو فروخت کر کے اس کے بدلے میں اسی موقوفہ کے متوازی و مماثل دوسری چیزیں خرید کر وقف کر دی جائیں۔

پس صورت مسئلہ میں جب خریدار اول کو اس زمین کے قبضہ قابض سے تخلیہ کرانے میں بطور رشوت کے اس زمین کا ایک پلاٹ اور ایک رقم دینی پڑی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قابض کا قبضہ اگرچہ غیر شرعی تھا مگر اتنا مستحکم اور مضبوط تھا کہ بغیر ان ایثارات کے تخلیہ دشوار تھا، لہذا اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس موقوفہ کے ضیاع کا قوی خطرہ ہو چکا تھا، ایسی حالت میں اس زمین کا وقف کی حفاظت کی خاطر فروخت کر دینا درست تھا اور جب خریدار اول کے لئے اس کا خریدنا ان مذکورہ بالا عبارتوں کے ذریعہ درست تھا تو خریدار اول کو بطور خود مالک ہو جانے کے بعد خریدار ثانی کے ہاتھ فروخت کرنا بھی درست و جائز ہو گیا اور خریدار ثانی کو بھی جائز ہو گیا کہ وہ اب جس طرح جائز کاموں میں چاہے استعمال کر لے۔

البتہ ٹرسٹ و اراکین وقف کے ذمہ لازم ہے کہ اس زمین کی رقم سے اس زمین کے متوازی و متبادل کوئی جائیداد حاصل کر کے جلد از جلد منشاء واقف کے مطابق وقف کر دیں، ورنہ یہ لوگ سخت گنہگار اور عند اللہ مجرم ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۷/۱۴۰۰ھ

مرض الموت کا وقف وصیت کے حکم میں ہے:

اپنی وفات سے چارپانچ گھنٹے قبل زید نے اپنی کل مقبوضہ جائیداد (رہائشی مکان و کھلی خشک زمین) اس پوری جائیداد کی تخمینہ مالیت ۱۲ ہزار روپے ہوتے ہیں، جس میں زید کی اپنی کسی جائیداد چار ہزار روپے اور موروثی منقسمہ غیر منقسمہ ۸ ہزار مالیتی دونوں شامل ہیں ان میں سے ایک ملکیت جس کی تخمینہ قیمت دو ہزار ہوتی ہے مسجد کو وقف کرنے کے لئے وقف مامہ لکھا تھا، جس پر خود زید اور عادل گواہوں کے علاوہ ان کے حقیقی ورثاء (ایک بیٹا دو بیٹیاں شادی شدہ) کی دستخطیں موجود ہیں، اب جب کہ وقف مامہ پر عمل آوری کے لئے مسجد کمیٹی کی جانب سے اقدام کیا جانے لگا تو درج ذیل اختلاف مانع اقدام بن رہا ہے۔

۱- زید کا بیٹا وارث حقیقی معذور، اپانچ اور ناقابل کسب معاش ہے جس کی گزر بسر بود و باش کا کوئی انتظام نہیں۔

۲- گواہوں نے شہادت دی ہے کہ زید کے بیٹے نے وقف مامہ پر ہر ضا و رغبت ہوش و حواس میں دستخط کئے تھے

مگر اس وقت وہ مذکورہ شہادت سے منحرف ہے۔

۳- وقف نامہ مرض الموت میں لکھا گیا ہے جو نا قابل قبول سمجھا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ زید اپنی جائداد کا کچھ حصہ وقف کر کے صدقہ جاریہ کا ثواب حاصل کرنا چاہتا تھا جبکہ خود ان کا بیٹا ایسی کمپرسی کی حالت میں ہے کہ بیٹے کو اس حال میں چھوڑ کر وقف کے ذریعہ ثواب حاصل کرنا کو یا فرض کو چھوڑ کر مستحب کے اہتمام کرنے کے مترادف ہے۔

مگر گواہوں (عادل) کا کہنا یہ ہے کہ زید کا بیٹا لاچار ضرور ہے، مگر وقف شدہ جائداد کے بغیر گز رہے ممکن ہے۔

نیز زید کا بیٹا وقف نامہ کے مضمون سے پوری طرح آگاہی کے بعد ہی پوری رضا کے ساتھ اس پر دستخط ثبت کیا تھا جس میں کوئی جبر واکراہ نہیں۔

وقف نامہ اگرچہ مرض الموت میں لکھا گیا لیکن مرحوم نے مرض الموت سے قبل ثبات ہوش وحواس کئی بار (عادل) گواہوں کے سامنے مذکورہ جائداد (وقف) کرنے کا ارادہ اور اس کا اظہار کیا تھا اور مستند بات یہ بھی ہے کہ تحریری شکل میں لینے کے بعد دستخط کرتے وقت مرحوم مکمل ہوش وحواس میں تھے، یہ غلط ہے کہ وہ اپنا ہوش وحواس کھو چکے تھے، آپ برادر کرم اس نزاع کا تحقیقی مطالعہ کے بعد فیصلہ شرعی قلمبند فرما کر مشکور فرمائیں۔

۱- آیا یہ وقف نامہ من و عن درست ہے یا سرے سے درست ہی نہیں۔

۲- کیا کسی قسم کی ترمیم کے ساتھ اس کو برقرار رکھا جاسکتا ہے، مثلاً زید کے بیٹے کو اس کی لاچاری کی بناء پر اس وقف شدہ ملکیت سے صرف ماحیات استفادہ کا حق دیا جائے۔ جواب باصواب اور قول فیصل عنایت فرمائیں تاکہ ارتقاع نزاع باہمی آسانی سے ممکن ہو سکے۔

عبداللطیف (جلنگاؤں، ورنگل، اے پی)

الجواب وبالله التوفیق :

مرض الموت کا وقف اگرچہ وصیت کے حکم میں ہوتا ہے اور وراثہ کو محتاج چھوڑ کر کل وقف کر دینا اگرچہ مذموم فعل ہے، ان تمام باتوں کے باوجود کل ترکہ میں سے تجنیز و تکفین کا خرچ اور میت پر جو ترخصہ ہوا اس کو ادا کرنے کے بعد باقی ترکہ کے ایک تہائی حصہ میں وصیت جاری ہوتی ہے اور اس ایک تہائی حصہ میں نافذ ہونے کے لئے وراثہ کی رضامندی بھی شرط نہیں ہوتی، ہاں ایک تہائی حصہ سے زائد میں وراثہ کی رضامندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے مسئلہ۔ ”کما فی عامۃ

المکتب المعتمدة للفتاویٰ“ (۱)۔

پس جب حسب تحریر سوال وقف کا کل ترکہ ۲ ہزار کی مالیت کا ہے اور اس میں سے صرف دو ہزار مالیت کی ایک دوکان مسجد کے لئے وقف کیا ہے، تو ظاہر ہے کہ میت کی تجخیز و تکفین قرض کی ادائیگی کے بعد بھی دو ہزار کی مالیت تہائی ترکہ کے اندر ہی رہے گی۔

پس اگر یہ مالیت (۲ ہزار مالیت کی) بعد خرچ تجخیز و تکفین و بعد ادا قرض اگر قرض ہو تہائی ترکہ کے اندر ہے تو بلاشبہ یہ وقف صحیح و درست ہے۔ بیٹا راضی ہو یا راضی نہ ہو۔

اگر تجخیز و تکفین اور بذمہ میت قرض میں چھ ہزار بھی خرچ ہو جاتے ہوں جب بھی ۲ ہزار ۶ ہزار کا تہائی رہے گا اور وقف صحیح رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۰۱/۶/۳۰ھ

موقوفہ زمین بیچ کر اس کی قیمت سے دوسری زمین خریدنا:

۱۔ کسی آدمی نے کچھ زمین مسجد کے لئے وقف کیا اور پھر کسی وجہ سے اس وقف شدہ زمین کو فروخت کر کے دوسری جگہ زمین خرید کر کے اسی مسجد کے نام پر دیدیا کیا یہ جائز ہے؟

۲۔ کسی آدمی نے اپنی خاص زمینوں میں سے ایک پاؤ زمین کسی مسجد کے لئے زبانی طور پر بغیر رجسٹرڈ کئے وقف کر دی اس کے بعد اس وقف شدہ زمین کو دوسرے آدمی کو فروخت کر کے اپنی دوسری جگہ سے ایک پاؤ زمین اسی مسجد کے نام پر دیدینا از روئے شرع کیا حکم رکھتا ہے؟

مشترکہ زمین سے بلا اجازت شریک زمین وقف کرنا:

۳۔ ایک آدمی دس لڑکے لڑکی کو چھوڑ کر انتقال کر گیا ان میں سے کچھ بالغ اور کچھ نابالغ ہیں، اس میں سے بڑے لڑکے نے کہا کہ میں نے ایک بیگم زمین مسجد کے لئے وقف کر دیا اور کہا کہ چھوٹے بھائیوں کو میں اپنے حصے سے ان کا حصہ دے دوں گا، تو یہ مشترکہ زمین سے وقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ ورثاء میں بالغ و نابالغ دونوں موجود ہے اور اس جگہ کو مسجد میں تبدیل کرنا اور اس میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

محمد رفیق احمد

۱۔ ”أو بالموت إذا علق به أي بموته كإذا مات فقد وفقت داري على كذا فالصحيح أنه كوصية تلزم من الفلت بالموت لا قبله“ (الدر المختار ج ۱، ۵۳۹، ۵۳۰)۔

الجواب وبالله التوفيق:

- ۱- اگر وقف نے وقف کرتے وقت استبدال کی شرط نہیں لگائی تھی تو وقف نام ہو جانے کے بعد اس عبارت ”وَأَمَّا الاستبدال ولو للمساكين آل بدون الشرط فلا يملكه إلا القاضی“ (۱) کی رو سے یہ استبدال جائز نہیں ہوگا، لہذا اگر بغیر شرط استبدال کے یہ استبدال ہو گیا ہے تو وقف اس بدلے میں گنہگار ہوا جس پر توبہ کرنا ضروری ہے، باقی دوسری زمین جو خرید کر وقف کی ہے وہ زمین بھی وقف ہو گئی اور اب اس میں بھی کوئی تبدیلی جائز نہیں ہے۔
- ۲- اس نمبر کا جواب بھی بالکل وہی ہے جو نمبر ایک کا ہے، رجسٹرڈ کرنے یا نہ کرنے سے اس حکم میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔

۳- جب ورثاء میں نابالغ بھی ہوں جن کی اجازت بھی شرعاً معتبر نہیں تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف مشاع کے جائز ہونے کے باوجود اس طرح وقف کرنا جائز نہیں تھا، وہ شخص اس میں گنہگار ہوا جس پر اس کو توبہ کرنا چاہیے (۲)۔ اور اس وقف کا حکم شرعی یہ ہوا کہ اگر ابھی تک اس زمین پر مسجد تعمیر نہیں ہوئی ہے تو اس کو تقسیم کر کے نابالغوں کا حصہ الگ کر کے محفوظ کر لیا جائے اور وقف کردہ رقبہ کی کمی کو وقف کرنے والے کے حصے سے پورا کر لیا جائے، پھر اس کو مسجد کے لئے وقف تسلیم کیا جائے اور اگر اس پر مسجد تعمیر ہو چکی ہو تو مسجد کو مسمار نہ کریں گے، بلکہ ان نابالغین کے حصے کے بقدر وقف کے حصے میں سے لے کر نابالغین کے لئے محفوظ کر لیں گے اور اس وقف کرنے والے سے اس کی اجازت لینی چاہیے اور وقف کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ نابالغین کا حصہ دے کر اس مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دیدے، اگر اجازت نہ دے گا تو مزید گنہگار ہوگا اور اس میں نماز پڑھنا درست رہے گا (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۶/۶/۱۴۰۲ھ

موقوفہ اراضی کو ہبہ کرنا جائز نہیں ہے:

عرض خدمت یہ ہے کہ موضع بابا پور تعلقہ بنگل ضلع نظام آباد (آندھرا پردیش) میں ایک درگاہ شریف موسومہ

۱- الدر المختار مع رد المحتار ۵/۵۸۵۔

۲- ”يعزذ“ فلا يجوز وقف مشاع يقسم خلافاً للقاضی (الدر المختار مع رد المحتار ۶/۵۳۳)۔

۳- ”ويزول ملكه عن المسجد والمصلی بالفعل وبقوله جعلته مسجداً عند القاضی و شرط محمد والإمام الصلوة فيه“ (الدر المختار مع رد المحتار ۶/۵۳۳)۔

- حضرت بابا مظہر شاہ ابدالؒ موجود ہے۔ اس درگاہ شریف کے حسب ذیل مختلف خدمت گزار ہیں:
- ۱۔ متولی۔ ان کے ذمہ درگاہ کی مسجد کی امامت کے علاوہ تمام خدمت گزاروں پر نگرانی کرنا ہے۔
 - ۲۔ آبدار۔ ان کا کام پانی مہیا کرنا ہے۔
 - ۳۔ مورچہ چل۔ ان بردار ان کا کام عرس شریف میں پکھا جھلنا ہے۔
 - ۴۔ فتمی۔ ان کا کام فاتحہ خوانی ہے۔
 - ۵۔ چہ اندار۔ ان کا کام درگاہ شریف میں روشنی کا انتظام کرنا ہے۔

مذکورہ بالا تمام خدمت گزار نسل در نسل اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان تمام خدمت گزاروں کے لئے سابق دور میں ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ اراضیات بطور انعام شروط خدمت حکومت کی طرف سے دیئے گئے۔

ایک ہی خاندان کے چہ اغ دار ابتداً ہی سے اپنے اپنے دور میں خدمت چہ انداری انجام دیتے ہوئے اراضیات شروط الخدمت سے مستفید ہوتے رہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ خاندان چہ انداری کے مسمی عبدالحق اپنی زندگی میں چہ اغ داری کی خدمت انجام دیتے ہوئے اراضیات شروط الخدمت سے مستفید ہوتے رہے۔ ان کو صرف ایک لڑکا شیخ محی الدین اور تین لڑکیاں مسماۃ مریم بی صاحبہ، حلیمہ بی صاحبہ، آمنہ بی صاحبہ تھیں۔ عبدالحق صاحب کے انتقال کے بعد ان کے اکلوتے لڑکے شیخ محی الدین صاحب خدمت چہ انداری انجام دیتے ہوئے مشروط الخدمت سے مستفید ہوتے رہے، ان کی خدمت کے مد نظر جانداد مشروط الخدمت موصوف کے نام حکومت کی جانب سے منتقل ہوئی۔ شیخ محی الدین صاحب کا اپنی زندگی میں اپنی تینوں بہنوں (مریم بی صاحبہ، فاطمہ بی صاحبہ، آمنہ صاحبہ) کے ساتھ بہت بہتر سلوک رہا۔ اس وقت اراضیات کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی، چنانچہ اپنے بھائی کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر ان تینوں بہنوں نے اپنے بھائی شیخ محی الدین صاحب کے حق میں جانداد مشروط الخدمت سے دستبرداری کی تحریر کر چکی ہیں جو محفوظ ہے۔

شیخ محی الدین صاحب کو زینہ اولاد نہیں ہے، صرف ایک لڑکی طاہرہ بیگم ہے، موصوف نے اپنی زندگی میں اپنی بیٹی طاہرہ بیگم کے نام اپنی کل جانداد مشمول اراضیات مشروط الخدمت بیہ کر دیا جو محفوظ ہے۔ شیخ محی الدین صاحب کو انتقال کے ۱۲ سال کا عرصہ ہو رہا ہے، حسب بیہ نامہ ان کی لڑکی طاہرہ بیگم اور ان کی زوجہ علیم النساء بیگم صاحبہ دونوں ماں اور بیٹی بلا شکایت درگاہ شریف کی خدمت چہ اغ داری انجام دیتے ہوئے تمام جانداد سے مستفید ہو رہی ہیں، ان کی بلا شکایت کے خدمت گزاری کی تصدیق متولی صاحب و گرام پنچایت محفوظ ہے، حکومت نے ان دونوں کی خدمات کے مد نظر کچھ مشروط

الخدمت اراضیات کو ان دونوں کے نام پہنہ کر دیا ہے جس کو دس سال کا عرصہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ ہر سال یہ دونوں اپنے پہنہ کی اراضیات کی مالکداری ادا کرتے آرہے ہیں۔ رسائل محفوظ ہیں۔

اب چالیس سال کے بعد جب کہ عبدالحق صاحب کا انتقال ہو گیا اور ان کے لڑکے شیخ محی الدین صاحب کا انتقال ہو گیا اور عبدالحق صاحب مرحوم کی مذکورہ تینوں لڑکیوں میں مسماۃ مریم بی صاحبہ اور حلیمہ بی صاحبہ کا انتقال ہو گیا جس کو ۲۰ سال کا عرصہ ہو رہا ہے، زمینات کی قیمت بڑھ جانے سے مندرجہ ذیل ورثاء کا ادعا یہ ہے کہ شروط الخدمت اراضیات کو متروک دے کر اس کی تقسیم عمل میں لائی جائے۔

دعویدارہ۔ ۱۔ مریم بی۔ عبدالحق صاحب۔ مرحوم کی بیٹی اور شیخ محی الدین صاحب کی بہن، لیکن انہوں نے اپنے بھائی شیخ محی الدین صاحب کے حق میں جائیداد سے دستبرداری کی تحریر کر چکی ہیں، ان کو انتقال ہوئے ۲۰ سال ہو رہے ہیں۔

۲۔ حلیمہ بی صاحبہ۔ عبدالحق مرحوم کی بیٹی اور شیخ محی الدین صاحب مرحوم کی بہن لیکن ان کو انتقال کئے ۱۲ سال ہو رہے ہیں۔

۳۔ آمنہ صاحبہ۔ عبدالحق صاحب مرحوم کی بیٹی اور شیخ محی الدین صاحب مرحوم کی بہن موصوفہ زندہ ہیں، لیکن اپنی دونوں بہنوں کی طرح اپنے بھائی شیخ محی الدین صاحب کے حق میں جائیداد مشروط الخدمت وغیرہ سے دستبرداری کی تحریر کر چکی ہیں جو محفوظ ہے۔

۴۔ محمودہ بی یہ دعوی دار نمبر ۲ حلیمہ بی کی لڑکی ہے شادی شدہ ہے عمر ۵۰ سال ہے۔

۵۔ گوری بی ان کی عمر ۴۵ سال ہے

۶۔ صغریٰ بیگم ان کی عمر ۴۲ سال ہے

۷۔ کبریٰ بیگم ان کی عمر ۴۰ سال ہے

۸۔ عبد الغفار۔ یہ دعوی دار (۱) مریم بی صاحبہ کا بیٹا ہے، اپنی ماں مرحومہ کی جائیداد مشروط الخدمت کا دعوی دار

ہے۔

۹۔ سکندرہ۔ یہ دعوی دار (۸) عبد الغفار کا بیٹا ہے دادی مرحومہ کی مشروط الخدمت اراضیات کا دعوی دار ہے۔

۱۰۔ صبیحہ بیگم۔ یہ دعوی دار (۶) صغریٰ بیگم کی بیٹی ہے، اپنی مائی حلیمہ بی صاحبہ مرحومہ کی جائیداد مشروط الخدمت

اراضیات کی دعویٰ ہے۔

۱۱۔ مختارہ۔ یہ دعویٰ (۱۰) صبیحہ بیگم کا شوہر ہے، اپنی بیوی کی مافی حلیہ بی صاحبہ مرحومہ کی جائیداد و شرط الخدمت اراضیات درگاہ شریف جوشی محی الدین صاحب مرحوم کو وراثتاً سرکاری حیثیت سے ۱۹۵۴ء میں باضابطہ منظور ہوئی ہیں تقریباً ۳۰ سال کا عرصہ گزر رہا ہے، اب مندرجہ بالا اشخاص جائیداد و شرط الخدمت اراضیات درگاہ شریف کے دعویٰ ہیں جب کہ اب تک انھوں نے کسی قسم کی خدمت انجام نہیں دی۔ اس صورتحال میں علمائے کرام و مفتیان عظام سے استدعا ہے کہ براہ کرم شرع شریف کی روشنی میں ان دعویٰ داروں کا دعویٰ کس حد تک حق بجانب ہے؟

محمد رفیع (مکان نمبر ۲۸-۱۱-۱ محلہ پھولانگ نظام آباد)

الجواب وباللہ التوفیق:

چہ اقدار کی اراضیات بھی مشروط الخدمت وقف ہیں موقوفہ کا بہرہ وغیرہ کرنا درست نہیں ہے (۱)، بلکہ جب خاندان چہ اقدار پر وقف ہے تو جب تک چہ اقدار اولاد میں کوئی شخص رہے اور خدمات مشروطہ ادا کرتا رہے وہ اس وقف کا حقدار ہوگا اور جب اولاد کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو اولاد نامت میں زیادہ تر مہی ہوگا وہ اسی شرط خدمت کے ساتھ حقدار ہوگا۔ اس قاعدہ کے مطابق صورت مسئولہ میں موقوف علیہ کا تر مہی رشتہ دار جو زندہ ہو وہ حقدار متصور ہوگا اور صورت مسئولہ میں زیادہ تر مہی رشتہ دار صرف آمنہ بی زندہ ہیں، لہذا صرف وہی اس مشروطہ خدمت کے ساتھ حقدار متصور ہوں گی بشرطیکہ خدمت مشروطہ خود یا اپنے کسی وکیل کے ذریعہ کرائیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شرائط واقف کے خلاف عمل:

۱۔ کسی موقوفہ یتیم خانے یا علمی ادارے کا شرائط واقف کے خلاف اس کے موجود کارکنان کی کاروائی درست ہے یا نہیں؟

۱۔ ”وعدہما حبس العین علی حکم ملک اللہ تعالیٰ فیقول ملک الواقف عدہ الی اللہ تعالیٰ علی وجہ نعوذ منفعہ الی العباد فیلزم ولا یوہب ولا یورث“ (ہدایہ ۲/۶۱۲، کتاب الوقف، مطبع پوسٹی لکھنؤ، بدائع الصنائع ۵/۳۶، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

الجواب وبالله التوفیق:

۱۔ شرائط واقف مثل نص شارع کے واجب الحمل ہوتے ہیں، اس کے خلاف کرنا جائز اور درست نہیں ہوتا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خائن کی تعریف اور اس کا حکم:

خائن کس کو کہا جاتا ہے اور اس کے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

خیانت کا ثبوت جب تک شرعی دلائل سے نہ ہو جائے اس وقت تک کسی کو خائن کہنا جائز نہیں (۲) اور دلیل شرعی سے ثبوت خیانت کے بعد خائن کو عزول کر دینا ضروری ہے (۳) اعانت جائز نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۹/۹۷ھ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عہد

شب قدر میں شیرینی کی تقسیم اور اس پر اوقاف کی آمدنی صرف کرنا:

یہاں دہرہ دون میں ایک انجمن ہے جس کے سپرد مختلف اوقاف کا انتظام ہے، اس انجمن کا ہر تیسرے سال انتخاب عمل میں آتا ہے جس میں ہر بالغ سنی حنفی المذہب ووٹر ہوتا ہے جس کے لئے باقاعدہ ممبر سازی ہوتی ہے۔

ہر سال شب قدر پر شیرینی تقسیم ہوتی ہے۔ مگر سال گذشتہ انجمن نے اپنی مینٹگ میں پاس کر کے کہ مٹھائی تقسیم نہ ہو مٹھائی بند کر دی ہے، اب نمازیوں نے اپنے طریقہ سے چندہ کر کے مٹھائی کا انتظام کیا تھا، اب شب قدر قریب ہے سو مٹھائی کا

۱۔ ”شرائط الوقف کنص الشارع إلى قوله: في المفهوم والدلالة ووجوب العمل به“ (الدر المختار علی الرد ۳/۵۷۵، مطبعہ عثمانیہ)۔

۲۔ ”لا یعزله القاضي بمجرد الطعن فی امانه بل بخباله ظاهر قریب“ (بثای ۳/۵۳۲، عثمانیہ)۔

۳۔ ”وإن عزله واجب علی کل مسلم یستطیع فانه من قیل الظار المنکر“ (تقریرات الرافعی علی جامعہ ابن ماجہ ۶/۸۳، مکتبہ زکریا)۔

سوال پھر ہو رہا ہے، انجمن کی اکثریت تو یہی کہتی ہے کہ مٹھائی انجمن نہیں دے گی، مگر چند ممبران انجمن اس پر یقین ہیں کہ حسب دستور سابق انجمن کو مٹھائی کا انتظام کرنا چاہئے، اوقاف کی پانچسو کی آمدنی ہے، آپ شرع کی روشنی میں بتلاویں کہ شب قدر میں شیرینی کی تقسیم کی مذہبی نوعیت ہے یا صرف رواج ہو گیا ہے، اب انجمن کو مٹھائی تقسیم کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

شب قدر میں شیرینی کی تقسیم شرعی نقطہ نظر سے بالکل بے اصل اور خلاف شرع ہے محض بے بنیاد رسم پر گئی ہے، اوقاف کی آمدنی سے یہ شیرینی تقسیم کرنا جائز نہیں ہے، اگر وقف کی آمدنی سے کوئی شیرینی تقسیم کرے گا تو اس پر شرعاً ضمان عائد ہوگا (۱)، پہلے جو شیرینیاں وقف کے مال سے تقسیم کی گئی ہوں گی انکا بھی یہی حکم ہے، ہاں اگر لوگوں نے اپنے ذاتی مال سے تقسیم کیا ہو تو کوئی ضمان نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۹/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد علی صاحبنا رب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسلم اوقاف بورڈ کی آمدنی عید گاہ پر خرچ کرنا:

اگر مسلم اوقاف بورڈ سے روپیہ حاصل کر کے عید گاہ کی تعمیر اور اسکے مصرف میں لگایا جائے تو جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب وبالله التوفیق:

اگر مسلم اوقاف بورڈ میں اس مدکارو پیہ ہوتا ہے اور پھر دیتے ہیں تو جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود علی صاحبنا رب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ”والواجب ان يبدأ بصرف الفروع الى مصالح الوقف من عمارته وإصلاح ماوهي من بنائه وماتر مؤلده التي لا بد منها“ (بدائع الصالح ۵/۳۳۰، مکتبہ زکریا)۔

معذور کا متولی رہنا:

ایک ہمسایہ مسجد کا متولی ہے، دو ڈھائی سال سے اپنا بیچ ہے، کرسی پر بیٹھے پڑے رہتے ہیں، نقل و حرکت بالکل نہیں کر سکتا، دوسرے آدمیوں کی امداد کے بغیر پیشاب پاخانہ مشکل، لٹاف وغیرہ خود بخود استعمال نہیں کر سکتا، نماز وغیرہ اسی وجہ سے خانگی رہتی ہے۔ مسجد جانے کی ضرورت ہو تو تین چار آدمی کرسی پر اٹھا کر لاتے ہیں۔ ایسی حالت پر ہمسایہ کے لوگ متولی رہنے پر ناراض ہیں، کیونکہ اس سے کما حقہ ہر کام چلتا نہیں، بلکہ وہ زبردستی متولی رہنا چاہتا ہے، کچھ تعصبات اس کی طرف داری کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں ایسے شخص کو مسجد کا متولی باقی رکھنے میں شرعاً کوئی قباحت ہے یا نہیں؟ اطمینان بخش جواب مطلوب ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

انتظام مسجد درست رکھنے کے لیے متولی کا مسجد میں آنا ہر وقت ضروری نہیں ہے، اگر یہ متولی پہلے سے مقرر ہے اور صحیح کام انجام دیتا تھا اور اب بھی غبن وغیرہ شرمزدہ وقف میں نہیں کرتا تو محض اس کی معذوریوں کی وجہ سے اس کو معزول نہ کیا جائے گا، ایسا کرنا درست نہ ہوگا، ”لا يجوز للقاضي عزل الناظر لمشروط له النظر بلا خيانة“ (۱)، فقط والله أعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۷/۱۳۹۱ھ

باب ما يتعلق بأحكام المساجد

مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے گم شدہ چیزوں کا اعلان کیسا ہے؟

مسجد کے مینارہ پر لاؤڈ اسپیکر کا ہارن رکھا ہوا ہے، باقی سامان یعنی ایمپلیفائر اور مائک وغیرہ مسجد کے اندر رکھے ہوئے ہیں، جس میں اذان کے علاوہ خرید و فروخت اور گم شدہ چیزوں کا اعلان پیسے لے کر کیا جاتا ہے، از روئے شرع یہ اعلان کرنا چاہیے یا نہیں؟

فتیٰ احمد (مسجد انصارین اسوۃ قاری آباد)

الجواب وبالله التوفیق:

اگر یہ لاؤڈ اسپیکر مسجد کے پیسے سے خرید آگیا ہے جب تو اس کا مینارہ پر رہنا درست رہے گا، باقی خرید و فروخت یا گم شدہ کا اعلان وغیرہ کوئی دنیوی کام کرایہ لے کر بھی کرنا درست نہ ہوگا (۱)۔

اور اگر چندہ کے پیسے سے خرید آگیا ہے اور چندہ دینے والوں نے ان سب کاموں میں استعمال کی نیت سے چندہ دیا ہے تو ان مذکورہ سب کاموں میں کرایہ لے کر بھی استعمال کرنا درست رہے گا، باقی اس صورت میں جس طرح مشین وغیرہ متصل اور الگ رکھی ہے، اسی طرح ہارن بھی مینارہ سے الگ رکھنا ضروری ہے، ہاں مینارہ سے الگ اور متصل رکھ سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۶/۱۴۰۱ھ

۱- ”ویحرم فیہ السؤال ویکرہ الإعطاء مطلقاً وقیل، ان یخطی وإنشاد ضالۃ“ (الدر المختار علی حاشی ۳۳۳ ج ۱)۔

”عن أبی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ: من سمع رجلاً ینشد ضالۃ فی المسجد فلیقل لاردها اللہ علیک فإن المساجد لم ین لہما“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ شریف ۶۸ مرتب)۔

امام کو مسجد کی آمدنی سے ایام رخصت کی تنخواہ دینا کیسا ہے؟
کیا جائداد اور مسجد کی آمدنی سے امام کو ایام رخصت کی تنخواہ دینا جائز ہے؟

شفیق احمد (مسجد انصاری اسوۂ غازی آباد)

الجواب وبالله التوفیق:

اگر شروع ملازمت میں امام نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ایام رخصت کی تنخواہ بھی لوں گا، یا کمپنی مسجد نے طے کر رکھا ہے تو بلا تکلف و بلا خدشہ ایام رخصت کی تنخواہ لینا دینا جائز رہے گا (۱)، اور اگر یہ سب باتیں نہ ہوں تو عرف عام میں جتنے دنوں کی رخصت میں تنخواہ دینے کا دستور ہو تو صرف اتنے ایام کی تنخواہ دینا درست رہے گا اور اس سے زیادہ اراکین مسجد کی صواب دید پر موقوف رہے گا (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۱۱/۱۳۹۵ھ

صدقہ، زکوٰۃ، چڑھاوے، چراغاں وغیرہ کی رقم مسجد میں لگانا اور لگ جائے تو کیا حکم ہے؟

۱- زید کا صدقہ، خیرات، زکوٰۃ، چڑھاوے اور چراغاں کا پیسہ بینک میں جمع تھا اور وہ کسی مسجد میں مؤذن تھا، پھر اچانک اس کا انتقال ہو گیا، درنحالیکہ اس کا کوئی وارث بھی نہیں اور نہ ہی اس نے کوئی پیسہ کے بارے میں وصیت فرمائی تو کیا ایک شخص یا مسجد کے ممبران اس کو بینک سے کسی طرح نکال کر مسجد میں لگا سکتے ہیں اور انہوں نے اس رقم سے مسجد کے اندر اگر پنکھا وغیرہ لگائی دیا تو کیا حکم ہے؟

۲- محکمہ اوقاف سارے ہندوستان میں جاری ہے، یہ مساجد و مقامات اور ان سے متعلق جائداد کی حفاظت کرتا ہے،

۱- "فإن كانت مشروطة لم يسقط من المعلوم شئ" (الاشباه والنظائر مع شرح الحموی، ۱۱۸)۔

۲- "المقاضي يستحق الكفاية من بيت المال في يوم البطالة في الأصح فبعضی أن يكون في المدارس، لأن يوم البطالة للاسراحة، وفي الحقيقة تكون للمطالعة والتحرير عند ذوی الهممة، الاشباه والنظائر مع شرح الحموی ۱۱۸ فبحث كات البطالة معروفة في يوم الغلاء والجمعة وفي رمضان والعیدین يحل الأخذ وكذا لو بطل في يوم غير معاد لتحرير دروس إلا إذا نص الواقف على تقييد الدفع باليوم الذي يدرس فيه كما قلنا وفي الفصل الثامن عشر من التارخاية قال الفقيه أبو الليث: ومن يأخذ الأجر من طلبة العلم في يوم لا درس فيه أرجو أن يكون جائزاً" (فتاویٰ ثانی، ۳۸۰/۳ کتاب الوقف مرتب)۔

اس کے لیے انتظامیہ سے چھ ہزار ایک سو پچاس فیصد کے حساب سے چندہ نگراں وصول کرتا ہے۔
اس بارے میں سوال یہ ہے کہ کسی مسجد کی دکانوں اور مکانوں کی آمدنی مناسب ہے اور اخراجات پورے ہو جاتے ہیں اور کمپنی کل آمدنی اوقاف کو نہیں بتلاتی، بعض بتلاتی ہے بعض چھپاتی ہے، تا کہ چندہ نگراں کو زیادہ نہ دینا پڑے، یہ چوری ہے یا خیانت ہے؟ اس طرح عمل کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اس طرح کا بچا ہوا روپیہ مسجد کی تعمیر اور دیگر مسجد کے کاموں میں خرچ کر سکتے ہیں؟ نیز ان مذکورہ بالا افعال کی مرتکب انتظامیہ کا کیا حکم ہے؟

عبدالحمید (مفتی شیخ مسیحہ، امین ایم، پی)

الجواب وبالله التوفیق:

۱- جو پیسہ اس کے مرنے کے بعد برآمد ہوا ہے، اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ پہلے اس کے نزدیک کے پھر دور کے خاندان کے لوگوں کو تلاش کر کے ان کو معلوم کیا جائے اور حسب قاعدہ وراثت ان کو دیا جائے، جب کوئی نہ ملے تو اس وقت مستحقین صدقہ پر صدقہ کر دیا جائے، دینی تعلیم کے ادارے اور دینی علم کی خدمت کرنیوالے اداروں کو دینا مقدم کیا جائے اور پھر دوسرے غرباء و مساکین کو دیا جائے۔
اس رقم کو مسجد میں نہیں لگا سکتے، اگر غلطی سے کچھ پیسہ مسجد میں لگ گیا ہو تو جتنا پیسہ لگ گیا ہے اتنا پیسہ خرچ کرنے والے لوگ اپنے پاس سے صدقہ کر دیں۔

۲- ایسا پیسہ مسجد کی تعمیر میں اور دیگر کاموں میں صرف کرنا شرعاً مباح ہے، باقی چونکہ یہ قانوناً چوری ہے جس سے بچنا واجب ہے، اس لیے مباح کی وجہ سے واجب کو تو نہیں چھوڑا جائے گا اور ایسا کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی، فقط واللہ
علم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پتہ: ۱۰/۳/۷۱۳۰ھ

الجواب صحیح حبیب الرحمن خیر آبادی

جگہ کی قلت کی بنا پر خارج از مسجد اقتداء کرنے کا حکم شرعی:

دہلی کے ایک مخصوص علاقہ میں ایک شاہی مسجد واقع ہے، جو کہ کافی وسیع اور کھلی ہوئی ہے اور گنجان آبادی کے علاقہ

میں آباو ہے، جس کی حدود اربعہ اور شان و شوکت جامع مسجد سے کافی حد تک مشابہ ہے، مذکورہ مسجد کا صحن بھی اچھا خاصا وسیع ہے، جس کے تینوں جانب وضو خانہ واقع ہے، مذکورہ مسجد میں صدر دروازہ کی جانب مشرق میں سیڑھیاں ہیں اور سیڑھیوں کے دونوں جانب وسیع وضو خانے تعمیر شدہ ہیں، وضو خانہ اور سیڑھیوں کے قریب پندرہ بیس فٹ چوڑا راستہ اور دونوں جانب سبزہ زار واقع ہیں، جن کے بعد ایک سبز خطہ ہے جس میں گھاس لگی ہوئی ہے اور جس کے چاروں جانب خاردار چھاڑیوں کی باڑھ ہے، اس خطہ میں اکثر نماز جنازہ ہی ہوتی ہے، ساتھ ہی جمعہ کے دن عوام کی زیادتی کے سبب اس مذکورہ خطہ میں جہاں نماز جنازہ ہو جاتی ہے، جمعہ کے دن نمازی اپنی نماز اس جگہ بھی ادا کر لیتے ہیں، جیسا کہ نقشہ سے ظاہر ہے۔

تاہم چند افراد کا خیال ہے کہ اس خطہ میں نماز جمعہ ادا نہیں کی جاسکتی اور اس کو شرعی اعتبار سے غلط بھی قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ تسلسل نماز باجماعت برقرار نہیں رہتا، اس لیے یہاں شرعی اعتبار سے نماز جائز نہیں ہے۔

اسلم قادری (کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی)

الجواب وبالله التوفیق:

مسجد کے اندرونی صحن بھر جانے کے بعد جہاں سیڑھیوں کے دونوں طرف وضو خانے ہیں، اگر وہاں بھی دو، دو، تین، تین نمازیوں کی صف بنا کر نماز ادا کی جاسکتی ہو، اسی طرح سیڑھیوں کے دونوں طرف جو سبزہ زار ہیں، اگر وہاں بھی دو تین کی صف بنا کر نماز ادا کی جاسکتی ہو، تو وہاں بھی زائد نمازی کھڑے ہو جائیں۔

اسی طرح سیڑھیوں کے نیچے جو راستہ ہے وہاں بھی زائد نمازی صف باندھ کر نماز ادا کرتے ہوں تو صفوں کا تسلسل ختم نہ ہوگا اور اس صورت میں نچلے سبزہ زار میں جہاں نماز ادا کی جاتی ہے وہاں بھی زائد نمازی نماز ادا کر لیں تو بلاشبہ سب کی اقتداء اور نماز درست ہو جائے گی، اسی طرح وضو خانوں اور راستے میں یا سیڑھیوں کے دونوں طرف سبزہ زاروں میں صف بنا کر نماز ادا کرنے کی جگہ نہ رہنے کی وجہ سے نماز نہ پڑھی جاسکے جب بھی اس مجبوری کی وجہ سے انقطاع صفوف کا حکم نہ ہوگا اور سبزہ زار جنازہ گاہ میں زائد مقتدیوں کا یعنی ایسے مقتدیوں کا اقتداء کرنا جو اندرون مسجد کے بھر جانے کی وجہ سے وہاں اقتداء کر کے نماز ادا کریں تو اقتداء صحیح اور نماز درست ہو جائے گی۔

ہاں آگے کے حصہ میں صف قائم ہو سکے اور پھر اس کو اتنا خالی چھوڑ کر جس میں سہ صفیں ہو سکتی ہوں وہاں صف قائم نہ کی جائے اور صرف سیڑھی کی جگہوں میں نماز ادا کی جائے تو انقطاع صفوف ہونے کی وجہ سے وہاں اقتداء صحیح نہ ہوگی اور نماز

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۱/ ۶/ ۱۳۰۶ھ

الجواب صحیح حبیب الرحمن خیر آبادی

سو دینے، جائدار کی تصویر بنانے اور بلیک مارکیٹنگ کریں والوں کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگانا کیسا ہے؟

۱- زید سودی لین دین کرتا ہے جس کو عام طور پر لوگ جانتے ہیں اور اکبر ایسی ساڑیاں تیار کرتا تھا جن پر جائداروں کی تصویریں بنائی جاتی ہیں، کیا ایسے لوگوں کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگایا جاسکتا ہے؟

۲- ایک شخص نے اپنی زمین پر کسی کے ہاتھ فروخت کر دی اور چند روپے بیعانہ کے طور پر لے لیے اور کہہ دیا کہ جیسے جیسے مجھ کو ضرورت ہوگی روپے لینا رہوں گا، اس درمیان مسجد کے ذمہ داروں نے اس شخص پر زبردستی دباؤ ڈال کر مسجد کے لیے وہ زمین حاصل کر لی، زمین خریدنے والے سے اس معاملہ پر کوئی گفتگو نہیں کی اور نہ اس کو راضی کیا اور نہ آج تک وہ راضی ہے۔

اس طرح سے حاصل کی ہوئی زمین پر مسجد کی تعمیر ہو سکتی ہے؟

۳- چند لوگوں نے گاؤں کے عوام سے دستخط کرا کے گورنمنٹ سے راشن دکان کا لائسنس حاصل کیا کہ اس کے ذریعے سے مٹی کا تیل، شکر اور سیمنٹ وغیرہ حاصل کر کے راشن کارڈ پر عوام میں تقسیم کی جائیں گی، جو لوگ راشن کارڈ حاصل کرنے جاتے ہیں ان کے کارڈ پر جتنا لکھا جاتا ہے اس کا نصف ان کو دیا جاتا ہے، ان کا بقیہ نصف اور اس کے علاوہ تمام کا تمام بلیک کر دیا جاتا ہے۔

کیا بلیک مارکیٹنگ کرنے والوں کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگایا جاسکتا ہے؟

نوٹ: اگر مسجد کے ذمہ داروں نے جان بوجھ کر ایسا کر دیا ہے اور شریعت کی نگاہ میں یہ صحیح نہیں ہے تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ بیٹو! تو حیرا۔

ابو اسلم (المصنف اعظم رحمہ)

۱- "ویمع من الافداء نجرى فيه السفن أو خلاء في الصحراء أو في مسجد كبير جداً، كمسجد قدمي مع صفيں فأكثر إلا إذا انصلت الصفوف فصيح مطلقاً، كأن قام في الطريق ثلاثة، وكذا اثنان عند الغالي لا واحد اتفاقاً قال الشامي نحت قوله مع صفيں: نعت لقوله خلاء والتقييد بالصفيں صرح به في الخلاصة، والقبض والمبغى وفي الواقع الحساب، وخزاة الفتاوى: وبه يفتى به" (فتاویٰ ثانی ۱/ ۳۹۳، باب الامتہ)۔

الجواب وبالله التوفیق:

۱- سود کاروپہ اور جانور کی تصویر بنانے کی مزدوری کاروپہ حرام ہوتا ہے، حدیث میں سود خور وغیرہ پر لعنت کی گئی ہے، لہذا سود کے روپیہ کا حرام ہونا ظاہر و بین ہے (۱)، اس کا مسجد میں لگانا جائز نہیں، اگر ایسی ساڑیاں وغیرہ وغیرہ مسلمانوں سے تیار کرائیں تو تیار کرنے والا گنہگار ہوگا جس سے اس کو باز آنا اور توبہ کرنا ضروری ہے، باقی وہ ساڑیاں یا ان کی قیمت حرام شمار نہیں ہوگی۔

غرض حرام پیشہ کرنے والا جب مسجد کے لیے روپیہ دے تو اس سے کہا جائے کہ حلال پیسہ مسجد کے لیے دو، حرام در حرام مشتبہ مت دو، پھر وہ شخص کہے کہ میں حلال ہی پیسہ دے رہا ہوں تو چوں کہ وہ مسلمان ہے، آخرت سے ڈرتا ہے قرض لے کر بھی دے سکتا ہے، اس لیے اس کی بات تسلیم کر لیں گے اور جب تک دلیل شرعی سے یہ بات ثابت نہ ہو جائے کہ واقعی حرام ہی پیسہ دیا ہے، اس کا پیسہ لے سکتے ہیں اور مسجد میں لگا بھی سکتے ہیں۔

۲- جب بیعانہ کے طور پر صرف چند روپے لیے تو بیع تمام نہیں ہوئی اور نہ واقع ہوئی بلکہ صرف وعدہ بیع ہو اندک ایقاع، ایسی حالت میں اس وعدہ شدہ زمین کو اگر دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے تو یہ بیع منعقد و نافذ ہوگی اور اس پر مسجد تعمیر کرنا بھی درست ہو جائے گا، البتہ اس وعدہ خلافی کا گناہ بیعانہ لینے والوں کو ہوگا اور بیعانہ کا پیسہ واپس کر دینا لازم ہوگا۔

۳- بلیک کرنا قانونی چوری ہے جس کی بغیر وجہ شرعی اجازت نہیں اور اس رقم کو مسجد میں لگانا درست نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۰/۴/۱۴۰۷ھ

مسجد کا مکان ایسے قصاب کو کرایہ پر دینا جو خنزیر وغیرہ کاٹے:

۱- مسجد کے پاس ایک مکان ہے، اس مکان کو قصاب کو کرایہ دینا جبکہ وہ اس میں خنزیر اور گائے وغیرہ ہر قسم کا حرام

۱- "عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لعن اللہ اکل الربوا و موكله و كاتبه و شاهده" (رواہ مسلم وغیرہ)، "وفي التوضیح قال اصحابنا وغیرہم تصویر صورة الحيوان حرام أشد التحريم، وهو من الكبائر وسواء صنع له ما يمتنع أو لغيره فحرام بكل حال، لأن فيه مضاهات بخلق الله إلى قوله وبمعناه قال جماعة العلماء مالک و سفیان وأبو حنيفة وغیرہم الصبی" (عمدة القاری ۲/۷۰)۔

گوشت کاٹ کر فروخت کرنا ہے جائز ہے یا نہیں؟

عبدالمہدی کجرائی (گلوسٹر لندن)

الجواب وبالله التوفیق:

فی متن الدر علی هامش الشامی: ”وجاز إجارة بیت بسواد الکوفۃ لا بغيرها علی الأصح، لیتخذ بیت نار، أو کنیسة أو بیعة، أو یباع فیہ الخمر، وقالوا: لا ینبغی ذالک، لأنه إغانة علی المعصیة، وبه قالت الثلاثة“ ”وقال الشامی: هذا عنده أيضاً، لأن الإجارة علی منفعة البیت، ولهذا یجب الأجر بمجرد التسليم ولا معصیة فیہ وإنما المعصیة بفعل المستاجر وهو مختار فینقطع نسبتہ عنه، فصار کبیع الجاریة ممن لا یستبرئها أو یأتیها من ذبر، وبيع الغلام من لوطی، والدلیل علیہ أنه لو آجره للمسکینی جاز وهو لا بد له من عبادته فیہ“ (۱)۔

”وفی الدر علی هامش الشامی (۵۰/۵): وجاز بیع عصیر عنب ممن یعلم أنه یتخذ خمرأً إلى قوله أن قوله ممن أي من کافر، أما بیعه من المسلم فیکره، ومثله فی الجوهرة“۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ کرایہ پر لینے والا تصاب اگر مسلمان ہو تو جانتے ہوئے کہ وہ اس میں حرام گوشت وغیرہ فروخت کرنے کا کام کرے گا تو اس کو نہ دینا چاہیے، بلکہ اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ایسا پیشہ ہی نہ کرے، بلکہ جائز کام کرے اور اگر وہ غیر مسلم ہو تو اس صورت میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ مکان مسجد سے بالکل متصل ہو کہ خنازیر کا شور و شغب وغیرہ مسجد میں آئے گا یا اس کا دروازہ بالکل مسجد کے سامنے ہو کہ تمام مصلی اسی راستے سے نماز کے لیے آتے ہوں اور آتے ہوئے یا نماز پڑھتے ہوئے اس کے اس فعل سے ان کو کراہت واذیت ہوتی ہے، یا ایسا ہو کہ جس سے مسجد کی تلویح کا خطرہ ہو تو چوں کہ مسجد شعائر اللہ میں سے ہے اور اس کی صفائی، سقرائی اور تعظیم و تکریم واجبات شرعیہ میں سے اور مقاصد شرعیہ میں سے ہے: کما قال تعالیٰ: ”ومن یعظم شعائر اللہ فإنها من تقوی القلوب“ (۲) وفی الخبر: ”تحریم الحرمات واجب“ مہر وہ چیز جس سے مصلیوں کی نماز میں خلل واقع ہو احتیاط واجب ہے (۳)۔

۱- فتاویٰ ۱۵۱/۵۲۵ فصل فی البیع۔

۲- سورہ حج: ۳۲۔

۳- ”وکلما یکره نطوع عدد إقامة صلوة مکتوبة إلى قوله وکلما کل ما یشغل باله عن أفعالها ویخل بخشوعها کاناً“

اور اگر وہ مکان مسجد سے متصل نہ ہو اور نہ اس کا دروازہ مسجد کے سامنے ہو تو لندن جیسے ملک و شہر میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کرایہ پر دینا جانتے ہو جھتے بھی جائز ہے، مگر چونکہ صاحبین رحمہما اللہ کے یہاں جانتے ہو جھتے دینے میں اعانت علی المعصیۃ کے ایہام کی وجہ سے دینا اچھا نہیں، اس لیے اگرچہ مفتی بقول ابوحنیفہؒ کا ہوگا مگر احتیاط نہ دینے میں ہوگی، اور اگر علم نہ ہو کہ وہ ایسا کام کرے گا تو باتفاق دینا جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۶/۱۳۹۸ھ

اگر مسجد کی زمین پر کسی نے غلطی سے گھر تعمیر کر لیا تو کیا حکم ہے؟

گاؤں کے پردھان نے غلطی سے صرف گاؤں سماج کی سمجھ کر وہ زمین ایک غریب مسلمان کو دے دی بعد میں معلوم ہوا کہ زمین تملیہ کی ہے، اس سے پہلے اس مسلمان نے اس پر تعمیر کر لی، معلوم ہونے پر اس سے کہا گیا جبکہ اس نے اس پر تعمیر کر لی۔ کیا وہ تملیہ کی اس زمین کا حق دار ہو سکتا ہے یا وہ اس کا کچھ معاوضہ دے کر اس کو رکھ سکتا ہے، جب کہ اس نے اس کا معاوضہ پردھان کو دے دیا تھا، اس کے بارے میں شریعت کی رو سے کیا حکم ہے؟

سعید احمد (مقام کھیرا افغان سہارنپور)

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال وہ زمین مسجد ہی کی شمار ہوگی، اگر پردھان کی غلطی سے اس زمین پر کسی مسلمان کا گھر بن گیا ہے تو اب اس گھر کو گرانے کا حکم نہیں دیا جائے گا، بلکہ شرعاً پردھان کے ذمہ ہے کہ ایسی ہی کوئی زمین جو سماج کی ہو مسجد کے لیے دیدے اور جب اس زمین کے عوض دوسری زمین مسجد کو مل جائے گی تو اب وہ زمین مسجد کی شمار ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۱۳/۱۳۸۷ھ

مسجد میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا کیسا ہے؟

میں شیرکوٹ کسی کام سے گیا، سوچا کہ نماز ادا کر لوں وضوء کر کے سنتیں ادا کیں، کچھ وقت جماعت میں باقی تھا، باہر سے ایک شخص آیا اور آکر سلام کیا، مولوی صاحب نے جو کہ امام صاحب تھے، ایک دم اس شخص سے کہا کہ مسجد میں سلام کرنا منع

ہے، کیونکہ میں بھی مسجد میں جاتا ہوں تو سلام کرتا ہوں، کیا واقعاً مسجد میں سلام کرنا منع ہے؟

شمس الدین (پیر، مگرہ مرچنٹ بھنور)

الجواب وبالله التوفیق:

مسجد میں سلام کرنا مطلقاً منع نہیں ہے، بلکہ اس صورت میں منع ہے جب ان لوگوں کو مخاطب بنا کر سلام کیا جائے جو کہ قرآن کی تلاوت اور تسبیح میں مشغول ہیں یا نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں: ”والذین جلسوا فی المسجد للقراءة والتسبیح أو لانتظار الصلوة ما جلسوا فیہ لدخول الزائرين علیہم، فلیس هذا أو ان السلام فلا یسلم علیہم“ (۱)، ہاں البتہ داخلہ کے لیے جو سلام ہوتا ہے اس کے مندرجہ ذیل الفاظ ہیں: ”السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین، وإذا دخل الرجل فی بیتہ یسلم علیہم علی أهل بیتہ، وإن لم یکن فی البیت أحد، یقول: السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین“ (۲)، جب اپنے گھر میں سلام کرنے کا حکم ہے تو مسجد میں بطریق اولیٰ ہوگا، کیونکہ مسجد میں فرشتوں کا ہونا ظاہر وغالب ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۲/۱۴۰۱ھ

کسی کا مکان وغیرہ توڑ کر جبراً مسجد تعمیر کرنا:

میرے پاس ایک مکان تھا جس کا مالک میں تھا اور دو یتیم بچوں کے نام کر دیا تھا، مگر محلہ کے چند لوگوں نے اس مکان کو توڑ کر مسجد بنا ڈالی ہے، کیا اس صورت میں مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟

مذیر احمد (ہیوا تھ مظفرنگر)

الجواب وبالله التوفیق:

کسی کا مکان اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر توڑ کر مسجد بنالیا جائز نہیں ہے اور اگر واقعہ صحیح ہے تو جن لوگوں نے

ماکان“ (الدر المختار علی اشائی، ۱/۲۵۳، کتاب الصلوة)۔

۱- فتاویٰ ماٹگیری ۳۲۵/۵۔

۲- فتاویٰ ماٹگیری ۳۲۵/۵۔

ایسا کیا ہے ان پر لازم ہے کہ مالک مکان کو راضی کر کے اس سے اجازت لے لیں اور راضی کرنا اگرچہ قیمت دے کر ہو جب بھی قیمت دے کر راضی کرنا لازم رہے گا، ورنہ سب لوگ عاصی و گنہگار ہوں گے اور نماز بکراہت ادا ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۰۰ھ

غیر مسلم کی رقم مسجد میں لگانا:

اگر کوئی غیر مسلم بطور امداد کے مسجد میں کچھ دے تو مسجد میں استعمال کرنا جائز ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

اگر غیر مسلم مسجد کی امداد کو اپنے عقیدے میں اچھا اور نیک کام قرار دیکر کرتا ہے اور اس سے لینے کی وجہ سے خطرہ نہیں ہے کہ یہ آئندہ مسلمانوں سے پوچھا جاوے گا یا کسی دنیوی غلط کام میں مسلمانوں کو استعمال کرے گا تو اس کی امداد لے لینا بلاشبہ جائز و درست ہوگی، ورنہ کسی لطیف حیلہ سے بتلادیا جائے کہ بد اخلاقی اور بد نمائی بھی نہ ہو اور کام بن جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۰۲ھ

کافر کا روپیہ مسجد میں لگانا اور اس کو ایصالِ ثواب کرنا:

اگر کوئی غیر مسلم کسی مسجد میں پکھلایا کوئی اور چیز اس طرح کی ایصالِ ثواب کے لیے دے دے اور اس پر اپنا نام بھی درج کرادے تو کیا یہ جائز ہے، نیز مسجد میں بھی ایصالِ ثواب کے لیے دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

حافظ عبدالغفار (سورج ٹریڈر دھرم پور)

الجواب وبالله التوفیق:

یہ مسئلہ اس طرح ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم مسجد کی تعمیر کے لیے یا اس کے کسی کام کے لیے کوئی چیز دینے کو اپنے عقیدہ

میں نیک کام سمجھ کر دے اور اس سے یہ خطرہ نہ ہو کہ وہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کو غلط استعمال کرے گا یا ان پر احسان جتانے کا تو اس کا مسجد کے لیے دینا جائز رہے گا اور مسجد کے کام میں استعمال کرنا بھی صحیح رہے گا (۱)، باقی غیر مسلم کو مرنے کے بعد ایصالِ ثواب کرنا درست نہیں ہے (۲)، اس لیے ایصالِ ثواب کرنے کے لیے درست نہ ہوگا، اسی طرح اپنے نام کا کتبہ وغیرہ لگانے کی شرط لگانا ہے تو اس صورت میں بھی لیما درست نہ ہوگا۔

مسجد میں جو چیز دی جاتی ہے اس کا ثواب ملتا ہے، اب ایصالِ ثواب پر دینے کا کیا مفہوم ہے، واضح ہونے کے بعد جواب ہو سکے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۲/۱/۱۴۰۸ھ
الجواب صحیح: محمد ظہیر الدین مفتاحی

مسجد کی چھت پر امام کے لیے کمرہ بنانا جائز نہیں:

ایک مسجد ہے، اس کے دائیں اور بائیں دونوں جانب سڑکیں ہیں اور چاروں طرف کے آگے مسجد کی کوئی زمین نہیں ہے، ایک صاحب اس میں امامت کرتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ مسجد کی چھت پر امام صاحب کے لیے کمرہ تعمیر کر لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟
محمد ثناء الدین (حلی گڑھ)

۱- حنفیہ کے نزدیک کافر کے وقف کے صحیح ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ ان کے نزدیک قریب ہو، ظاہر ہے کہ مسجد میں خرچ کرنا جیسے مسلمانوں کے نزدیک قریب ہے کفار و ہنود جو کچھ مسجدوں میں دیتے ہیں وہ بھی اعتقاداً اس کو قریب سمجھتے ہیں اور ہندوستان کے کفار و ہنود بھی مسجدوں میں خرچ کرنے کو قریب اور قابلِ ثواب جانتے ہیں۔

”قوله: وأن يكون قربة في ذاته الخ قال الشامي: فعين أن هذا شرط في وقف المسلم فقط، بخلاف الممي لما في البحر وغيره: أن شرط وقف الممي أن يكون قربة عدداً وعدمهم كالوقف على الفقراء أو على مسجد القدس، بخلاف الوقف على بيعة فإنه قربة عدمهم فقط، أو على حج أو عمرة فإنه قربة عدداً فقط، فأفاد أن هذا شرط لوقف الممي فقط، لأن وقف المسلم لا يشرط كونه قربة عدمهم بل عدداً كوقفنا على حج وعمرة، بخلافه على بيعة فإنه غير قربة عدداً بل عدمهم“ (فتاویٰ شامی ۳۶۸ کتاب الوقف)، عبارت مذکورہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے نیز معلوم ہو اگر جس طرح اہل کتاب کے نزدیک بیت المقدس میں صرف کرنا کا ثواب ہے اسی طرح ہندوستان کے کفار کے نزدیک بھی مسجد میں خرچ کرنا قریب ہے اسی وجہ سے سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ نے کفار و ہنود کے روپیہ کو مسجد میں صرف کرنا جائز لکھا ہے کما فی فتاویٰ گنگوہی (مرتب)۔

۲- مشکوٰۃ شریف میں وارد ہوا ہے کہ ایک غصص کافر نے سوغلام آزاد کرنے کی وصیت کی تھی، اس کے بیٹے نے حضور سے پوچھا: ”قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: إله لو كان مسلماً فأعقمت عده أو نصدتهم أو حججتم عده بلغه ذلک“، (رواہ ابو داؤد) یعنی آپ نے فرمایا کہ اگر وہ مسلمان ہوتا تو اس کو اعتاق و صدقہ و حج کا ثواب ملتا اور جب کافر کو ثواب نہیں ملے گا تو ایصالِ ثواب کرنا بھی درست نہ ہوگا۔

الجواب وبالله التوفیق:

مسجد کی چھت پر امام صاحب کے لیے کمرہ بنانا جائز نہیں ہے (۱)، درمختار وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے، ہاں غسل خانہ، وضو خانہ، استنجا خانہ وغیرہ جو فناء مسجد کے درجہ کی عمارت ہو، اس کی چھت پر امام صاحب کے لیے کمرہ بنایا جاسکتا ہے، اس لیے کہ جو جگہ ایک مرتبہ عین مسجد ہو جاتی ہے، یعنی محض نماز و ذکر وغیرہ عبادات خالصہ حصہ کے لیے وہ قیامت تک کے لیے تحت اثر ثلثی سے لے کر عنانِ سماء تک مسجد ہو جاتی ہے، کمافی کتب الفقہ، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پتہ پر ۱۳/ ۶/ ۱۴۰۶ھ

مسجد یا مدرسہ کی رقم شیئرز میں لگانا از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟

کیا کسی مدرسہ یا مسجد کی رقم اس بازار ڈاک کے شیئر ”حصص“ میں لگا کر اس میں سے مدارس اور مسجد کے لیے نفع حاصل کرنا جائز ہوگا؟

محمد خیر الاسلام (دارالافتاء دارالحدیث ٹوگاؤں آسام)

الجواب وبالله التوفیق:

کسی مسجد یا مدرسہ کے پیسے سے بازار ڈاک ”حصص“ خریدنا پیچند و جود درست نہیں، ایک وجہ تو یہ ہے کہ دینے والے کی منشا عموماً یہ ہوتی ہے کہ اس کا پیسہ بعینہم اس کار خیر میں صرف ہو اور یہ چیز اس کی منشا کے خلاف ہوگی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کبھی نقصان ہوگا تو ان لگانے والوں پر ضمان واجب الادا ہوگا جو، جھگڑے اور نزاع کا سبب ہوگا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں پر ڈاک میں جو چیز ”سوداً“ بیع بنتی ہے وہ نہ تو موجود ہوتی ہے نہ مملوک و مقبوض یا معلوم

۱- ”لو بیئ فوقہ بیئاً للإمام لا یضر، لآلہ من المصالح، أما لو تمت المسجد بیدہ ثم أراد الباء مبع، ولو قال: عبت ذالک لم یصدق نادار خالب“ (الدر المختار ۳/ ۳۷۱) ”وکرہ تحریم الوطء فوقہ والبول، والنطوط، لآلہ مسجد إلی عیان السماء، قال الشامی تحت قوله إلی عیان السماء: بفتح العين وكذا إلی تحت الفری کما فی البیوی عن الامبیجانی“ (فتاویٰ ثنائی، ۱/ ۳۴۱، مطلب فی احکام المساجد)۔

كتاب الوقف (باب ما يتعلق بأحكام المباحدين)

مساجد میں تمثیل وغیرہ لگانا شرعی نقطہ نظر سے درست ہے یا نہیں؟

آج کل مساجد میں قہقہوں اور دیگرا رائش کی چیزوں کا لگایا جانا بکثرت جاری ہے، شرعی نقطہ نظر سے ان چیزوں کا مساجد میں لگانا کیسا ہے؟

مسجدوں میں ضرورت سے زیادہ قیمتی لگانا اسراف کے حکم میں ہے اور ضرورت کے مطابق لگانا جائز رہے گا (۲)۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

کتابخانه محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہزارنپور

زیادہ مستحکم بنانے کے لئے مسجد کو شہید کرنا:

بينوا القول المفتى به في مذهب الاحناف لاثنتان أسئلة آتية:

(١) "هل يجوز هدم المسجد الذي لم يبل للإعادة ثانياً".

مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنا:

(٢) "هل يجوز نقل المسجد من موضع الى موضع آخر".

عبدالغفور مولوی (سکویال، گجرات، کیرالہ)

١- "ويؤيده ما في الهداية: ولا يجوز بيع السمك قبل أن يسطا، لأنه باع مالا يملكه ولا في حظيرة إذا كان لا يؤخذ إلا بصيده، لأنه غير مقدور التسليم، ولا يبيع الطير في الهواء، لأنه غير مملوك قبل الإخلاء (المصالح مع الدرية، ٣٣٣ ج ١ باب البيع القاسد).

٢- "ويكفره التكلف بدقائق القشوش ولجوها" (قانوني ٢٢٢/٢٣٢، مطلب في احكام المساجد).

الجواب وبالله التوفيق:

- ١- لا يجوز هذا الغير الباني كما في الدر المختار: أراد أهل المحلة نقض المسجد وبنائه أحكم من الأول أن الباني من أهل المحلة لهم ذلك وإلا لا، وفي رد المحتار عن الهندية: "مسجد مبنی أراد رجل أن ينقضه ويمنيه أحكم، ليس له ذلك، لأنه لا ولاية له، إلا أن يخاف أن ينهدم إن لم يهدم" (١)۔
- ٢- "لا يجوز هذا، لأن المسجد يبقى مسجداً عند الإمام والثاني: (أبي يوسف) أبداً إلى قيام الساعة وبه يفتى هذا في الدر من كتاب الوقف" (٢)، فقط والله أعلم بالصواب

كتبه محمد نظام الدين اعظمي، مفتي دارالعلوم ديوبند سهارنپور

شہید شدہ مسجد کے ملبوں کو فروخت کرنا؟

- ١- انهدم المسجد أو هدم ولم يكن بناء المسجد الجديد في طراز جديد، هل يجوز في هذه الحالة بيع أشياء المسجد المنهدم من اللبن والحجر والباب وغيرها؟
- عبد الفتوح سولوي (إلى كها، كيرالہ)

الجواب وبالله التوفيق:

- لا يباع في هذه الحالة أشياء المسجد المنهدم من اللبن والحجر والباب وغيرها بل ينقل إلى مسجد آخر يحتاج إليها بعد المشورة من أهل المحلة وأراكين المسجد.
- نعم إن لم يكن هناك مسجد محتاج ويضيع تلك الأشياء إن لم يبع، فيباع بعد مشورة الأراكين وأهل المحلة بقيمة مناسبة، وتحفظ تلك القيمة إن أمكن بناء المسجد الجديد وإلا يرسل إلى مسجد آخر يحتاج إلى ذلك، وهذا يؤخذ من الدرر الرد وغيرها من كتب الفتاوى المعتبرة

١- شاي ٣٤٠٣ كتاب الوقف۔

٢- "ولو خرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجد أ عبد الإمام والثاني أبداً إلى قيام الساعة وبه يفتى" حواي القدسي " (الدر المختار على الشاي ٣٤٠٣ كتاب الوقف) (مرتب)۔

عند الأحناف (۱)، فقط والله أعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، رپورہ ۲۲/۳/۱۳۰۱ھ

احکام المساجد سے متعلق اہم مفصل فتویٰ:

ہمارے بڑا وہ شہر کے بالکل وسط میں ایسا علاقہ ہے جس کے چاروں طرف بازار ہے، سامنے عمارات بنائے معدوم کی شاندار پر شکوہ عمارت ہے اور اطراف سے شہر میں آنے والی بسوں کا اسٹینڈ بھی اس کے قریب ہے، بس اور ٹرافک سے ایسے بھرپور علاقہ میں کھجوری نامی مسجد تاریخی واقع ہے، مذکورہ مسجد کے چاروں طرف مسجد کی مملوک زمین پر دکانیں ہیں جو سالہا سال سے کرایہ پر دی ہوئی ہیں، حکومت کے ضابطہ قانون کی رو سے مسجد کی توسیع کے لیے ان دکانوں کا قبائلی مسجد کو حاصل ہونا دشوار بلکہ ناممکن ہے، جائے وقوع کی درج بالا خصوصیات کی وجہ سے نمازیوں کی کثرت تعداد کی بنا پر موجودہ مسجد بالکل ناکافی ہونے اور آج سے بیس سال قبل کے فرقہ وارانہ فساد میں اس کو کافی نقصان پہنچنے نیز اس کی عمارت نہایت بوسیدہ ہونے کی وجہ سے مسجد عرصہ دراز سے از سر نو تعمیر طلب تھی، قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے اس کی تعمیر نو مؤخر ہوتی رہی اور اب اس کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے، موجودہ مسجد نمازیوں کی تعداد کی نسبت نہایت تنگ ہے اور اس میں ہوا، روشنی وغیرہ کارائستہ نہ ہونے کی وجہ سے کافی جھس رہتا ہے اور تاریکی بھی رہتی ہے، دکانوں سمیت مسجد کی مملوک زمین کا مجموعی ایریا (علاقہ) پانچ

۱- "ومفله حبش المسجد وحصره مع الاستعداد عنهما، وكذا الرباط والبنو إذا لم ينفع بهما فبصرف وقف المسجد والرباط والبنو والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بنو أو حوض" (الدر المختار علی حاشی الثانی، ۳۷۱ ج ۳ کتاب الوقف) (مرتب)۔

"قال الشامي تحت قوله ومفله حبش المسجد: أي الحبش الذي يفرش بديل الحصر كما يفعل في بعض البلاد، قال الزيلعي: وعلى هذا حصر المسجد وحبشه إذا استغنى عنها يرجع إلى مالكة عدد محمد وعدد أبي يوسف ينقل إلى مسجد آخر وعلى هذا الخلاف الرباط والبنو إذا لم ينفع بهما وصرح في الخالية بأن الفتوى على قول محمد، قال في البحر: وبه علم أن الفتوى على قول محمد في آلات المسجد وعلى قول أبي يوسف في تأييد المسجد والمراد بالآلات المسجد لحو القديس والحصر، بخلاف القاضيه لما قدمنا عده قريباً من أن الفتوى على أن المسجد لا يعود ميراثاً ولا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر" (فتاویٰ ثانی ۳۷۱ ج ۳ کتاب الوقف)۔

"والذي ينبغي متابعة المشايخ المدكورين في جواز النقل بلا فرق بين مسجد أو حوض، كما أئني به الإمام أبو شجاع ولا سيما في زماننا فإن المسجد أو غيره من رباط أو حوض إذا لم ينقل يكتله القاضيه اللصوص والمتغلبون كما هو مشاهد، وكذا الك أو قافه ياكلها البطار أو غيرهم" (فتاویٰ ثانی ۳۷۲ ج ۳ کتاب الوقف) (مرتب)۔

ہزار اسکوئر فٹ ہے، جس میں سے بارہ سو اسکوئر فٹ علاقہ پر مسجد واقع ہے اور باقی اڑتیس سو اسکوئر فٹ علاقہ پردکانیں ہیں جن پر کرایہ دار قابض ہیں، نمازیوں کی تعداد کے اعتبار سے موجود مسجد کی چارگتی توسیع اشد ضروری ہے۔

مسجد کی دکانیں مسجد کی ملکیت ہونے کے باوجود ممکن الحصول ہونے کی وجہ سے تحتانی مسجد کی توسیع بالکل ناممکن ہے، اب توسیع کی صرف ایک صورت یہ ہے کہ مذکورہ مسجد کے اوپر ایک منزل تعمیر کر لی جائے اور مسجد سے ملحقہ دکانوں کی چھت والا حصہ فوتانی مسجد میں شامل اور داخل مسجد کر لیا جائے۔

بایں طور کہ تحتانی مسجد کے بجائے فوتانی مسجد کی توسیع بقدر کفایت و ضرورت ممکن ہے، پھر فوتانی مسجد کی یہ توسیع صرف جانب مشرق میں ممکن نہیں بلکہ جانب غرب ”سمت قبلہ“ ہی میں ممکن ہے، نیز کما حقہ دائیں بائیں جانب بھی ممکن نہیں، اب مسجد کی انتظامیہ کمیٹی نے جانب غرب ہی میں فوتانی مسجد کی تعمیر کا نقشہ تیار کیا ہے تعمیر مکمل ہونے کے بعد مسجد کی تحتانی اور فوتانی دونوں منزلیں بیچ گانہ نماز باجماعت میں امام کے تحتانی مسجد میں امامت کے لیے کھڑے رہنے کی صورت میں فوتانی مسجد کی جانب غرب توسیع شدہ حصہ میں واقع صفوف کا تقدم علی الامام لازم آتا ہے جو کہ جائز نہیں، علاوہ ازیں توسیع کا اصل مقصد ہی فوت ہو جانا ہے۔ لہذا درج ذیل امور دریافت طلب ہیں:

۱- جانب غرب دکانوں کی چھت پر واقع فوتانی مسجد کا توسیع شدہ حصہ صحت اعتکاف وغیرہ دیگر احکام مسجد کے اعتبار سے مسجد شرعی ہے یا نہیں؟ کیوں کہ بعض حضرات کو درج ذیل عبارت: ”وحاصله أن شرط کونه مسجداً أن یکون سفله وعلوه مسجد الینقطع حق العبد منه لقوله تعالیٰ: و أن المساجد لله، بخلاف ما إذا کان السرداب أو العلوم قوفاً لمصالح المسجد، فهو کسرداب بیت المقدس هذا هو ظاهر الرواية وهناك روايات ضعيفة مذکورة فی الہدایة والبحر الرائق (ج ۵ کتاب الوقف باب احکام المساجد) رد المختار ج ۶ مطبوعہ نعمانیہ دیوبند احکام المساجد ۶۷۰) کی وجہ سے مذکورہ فوتانی مسجد کی دکانوں پر توسیع شدہ حصہ کو عدم انقطاع حق عباد کی وجہ سے مسجد شرعی قرار دینے میں تامل ہے۔

۲- اگر مسجد فوتانی کا مذکورہ توسیع شدہ حصہ مسجد شرعی نہ ہو تو اشکال یہ ہے کہ بناء ابتدائی اولین تعمیر کے وقت شروط مذکور فی کتب الفقہ کی رعایت کے ساتھ تحتانی حصہ مسجد میں کرایہ کی دکانیں وغیرہ بنانا جائز ہے اور فوتانی حصہ مسجد شرعی ہوگا، حالانکہ یہاں بھی تو دکانوں والے تحتانی حصہ کے ساتھ بالکلیہ انقطاع حق عباد نہیں ہے، لہذا بناء ابتدائی اور بناء ثانی کی توسیع مسجد فوتانی میں وجہ فرق کیا ہے؟

۳- اگر مسجد فوتانی کا مذکور توسیع شدہ حصہ مسجد شرعی ہو تو مذکورہ بالا حالت میں مفتی اعظم ہند حضرت العلامة مفتی کفایت اللہ صاحب کے درج ذیل فتویٰ کی بنیاد پر امام کو تختانی مسجد کے بجائے فوتانی مسجد کی جانب غرب توسیع شدہ حصہ کے اندر فرض نماز باجماعت میں کھڑا ہونا جائز ہے یا نہیں؟
نقل فتویٰ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب:

سوال: مسجد کی چھت پر نماز باجماعت جائز ہے یا نہیں؟

جواب: مسجد کی چھت پر نماز کی جماعت جائز ہے اور اگر گرمی وغیرہ کے عذر کی وجہ سے ہو تو کسی قسم کی کراہت بھی نہیں ہے، لہذا بلا عذر ہو تو اس بنا پر کہ جماعت کی اصلی جگہ نیچے کا درجہ اور خراب ہے اور جماعت کرنا خلاف اولیٰ ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ

جواب: از حبیب المسلمین نائب مفتی:

تشریح اس کی یہ ہے کہ گرمی کی ایسی شدت ہو کہ خشوع و خضوع قائم نہ رہے تو مسجد کی چھت پر نماز باجماعت وسنن و نوافل پڑھے تو مکروہ نہ ہوں گے اور اگر اس قسم کی شدت نہ ہو تو مسجد کی چھت پر نماز باجماعت وغیرہ مکروہ ہوگی، فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ”الصعود علی کل سطح مسجد مکروہ، وهذا إذا اشتدت الحر بکرة أن یصلوا بالجماعة فوقه إلا إذا ضاق المسجد فحينئذ لا یکره الصعود علی سطحه للضرورة“ (کذا فی الغرائب ۳۵۶/۵)۔ فقط والسلام

حبیب المسلمین (نائب مفتی مدرسہ اسلامیہ دہلی، کفایت المفتی، ۳۵۵/۳)
المستفتی: سکریٹری (مسجد سجاد شہر بڑوہ انڈیا جامع مسجد بنگ بڑوہ)

الجواب وبالله التوفیق:

تحریر سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ دکانوں کی عمارت وزمین سب موقوفہ علی المسجد ہیں اور مسجد سے بالکل متصل ہیں اور مسجد کی توسیع کی اشد ضرورت ہے اور منع ان مکانوں کے توسیع مسجد گزیر ہے، مگر دکان دار دکان خالی نہیں کر رہے ہیں اور قدیم مسجد اتنی چھوٹی ہے کہ اس پر و منزلہ عمارت بنا کر بھی ضرورت توسیع پوری نہ ہوگی۔

ایسی صورت میں دکان خالی نہ کرنے والے شرعاً غاصب اور گنہگار ہیں گے، پھر اس میں محض اوپر مسجد بنائی جائے

تو یہ حصہ مسجد شرعی نہ ہوگا کیونکہ مسجد شرعی ہونے کے واسطے شرط ہے کہ مسجد کے نیچے اور اوپر سب کا سب مسجد ہو کما فی البحر (۵/۲۷۱): ”و حاصلہ ان شرط کونہ مسجد اَن یكون سفله و علوه مسجداً لينقطع حق العبد“ اور یہاں ایسا نہ ہوگا، کیونکہ ان دکانوں میں بیچ و شراب بھی ہوگا اور ان میں حائضہ، نساء اور جنبی کا آنا جانا بھی ہوگا اور ان میں بول و براز وغیرہ سارے ہی اعمال جو مسجد میں ممنوع ہیں، ہو سکیں گے، لہذا اتخلاص نہ ہوگا اور ذمہ داران مسجد کے تخلیک سے عاجز ہونے کی وجہ سے ان تمام معاصی کا بدترین وبال آخرت میں عذاب ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی دکان نہ خالی کرنے والوں پر عذاب میں پڑ جانے کا قوی اندیشہ ہے اور عجب نہیں کہ آیت کریمہ: ”انما یعمرو مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر“ (۱) کے خلاف کرنے پر علاوہ عذاب آخرت کے دنیا میں کسی شدید ترین وبال میں ابتلاء نہ ہو جائے۔

نیز چوں کہ ذمہ داران مسجد تخلیک سے عاجز ہوں گے، اس عجز کی وجہ سے اور توسیع شرعاً ہونے کی وجہ سے ان دکانوں پر مسجد بنانے کی بنا پر یہ ذمہ داران عند اللہ ”لا یکلف اللہ نفساً الا وسعها“ (۲)، ”ولا تزدوا ذرۃ و ذرۃ اخری“ (۳) کے مطابق ماخوذ و گنہگار نہ ہوں گے۔

البتہ یہ مسجد تحت اثر ملی تک شرعی مسجد شمار ہوگی اور اس پر نماز باجماعت ادا کرنا درست رہے گا اور انشاء اللہ سب کو شرعی مسجد میں نماز ادا کرنے کا ثواب ملے گا اور جو کچھ وبال ہوگا وہ سب دکان خالی نہ کرنے والوں پر شرعاً ہوگا۔ اتنی تمہید کے بعد استفتاء میں مذکورہ تینوں نمبروں کا حکم خود بخود نکل آیا، کیوں کہ اس تمہید سے اس نوعیت مسجد کا مسجد شرعی ہونا واضح ہو گیا اور تینوں نمبروں کا اشکال اس نوعیت مسجد کے مسجد شرعی نہ ہونے کا یقین یا اس میں شک واقع ہونے پر تھا اور وجہ اشکال تو خود بخود ختم ہو گئی، پس امام اگر جانب غرب میں دکان کے اوپر کھڑا ہو اور مقتدی خود نوعیت حصہ پر رہیں یا قدیم مسجد کے حصہ پر سب کی نمازیں بلا کر اہت ادا ہوں گی، اسی طرح نوعیت حصہ میں اعتکاف وغیرہ جملہ امور صحیح ہوں گے۔

هذا ما عندی من الشرع الشریف فان کان صواباً فمن اللہ وإن کان خطاً فمن نفسی
فنتبرأ منه فحیث یرجعون الی غیری، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پور ۱۲/۹/۱۴۰۹ھ

۱- سورۃ توبہ: ۱۸۔

۲- سورۃ بقرہ: ۲۸۶۔

۳- سورۃ اسراء: ۱۵۔

مسجد میں پینٹ کا استعمال کرنا شرعاً کیسا ہے؟

آج کل مساجد میں پینٹ کا استعمال بکثرت جاری ہے، شرعی نقطہ نظر سے اس کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

مسجد میں ایسا پینٹ استعمال کرنا جس میں بدبو ہوتی ہو ممنوع ہے، اگر بدبو زیادہ دیر پا ہو تو ناجائز اور استعمال مکروہ تحریمی ہوگا جس سے اجتناب لازم ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

محراب سے مراد کیا ہے؟

محراب سے مراد کیا ہے؟ مسجد کے ہر در میں جو محراب خانہ کنار ہوتا ہے جس میں لوگ آتے جاتے ہیں، محراب کی تعریف میں آتا ہے، یا چھٹی دیوار کے درمیان ممبر کے قریب جو محراب بنی رہتی ہے صرف وہی محراب ہے، وضاحت فرمائیں! اور یہ بھی واضح کریں کہ ممبر کے قریب کی محراب کے علاوہ مسجد کے دوسرے در میں اگر امام کھڑے ہو کر نماز پڑھا رہا ہو اور اس کے صحن میں مقتدی کھڑے ہوں تو اس میں شرعاً کوئی ممانعت تو نہیں ہے؟

خادم مشتاق احمد (محمد پون صد اعظم گڑھ)

الجواب وبالله التوفیق:

قبلہ کی دیوار میں بالکل درمیان میں جو محراب نما بنایا جاتا ہے وہ مراد ہے، تاکہ امام کے درمیان دونوں طرف صفوں کی مقدار برابر رہے۔ پس اس محراب کو چھوڑ کر اور جگہ یا کسی اور در میں کھڑے ہونے سے اگر امام کے دونوں جانب کی صفیں

۱- "وَأَكَلُ لَحْوِثَةٍ، وَيَمْسَعُ مَدَّةً، وَكَلَّمَ كُلَّ مَوْذُوٍّ لَوْ بِلِسَانِهِ، قَالَ الشَّامِيُّ نَحْتُ قَوْلَهُ "وَأَكَلُ لَحْوِثَةٍ": أَيْ كَبَّضَ وَلَحْوُهُ مِمَّا لَهُ رَانِحَةٌ كَرَبِيعَةٍ لِلْحَدِيثِ الصَّحِيحِ فِي النَّهْيِ عَنْ قُرْبَانِ أَكْلِ الْغُومِ وَالْبَصْلِ الْمَسْجِدِ إِلَى قَوْلِهِ: وَيُلْحَقُ بِمَا لَصَّ عَلَيْهِ فِي الْحَدِيثِ كُلُّ مَالِهِ رَانِحَةٌ كَرَبِيعَةٍ مَا كُوِلَا أَوْ غَيْرُهُ، وَإِلْمَا خَصَّ الْغُومَ هُنَا بِالْمَذْكُورِ" (فتاویٰ ثنائی، ۱/ ۳۳۳)، مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ ممبر بودار چیز کھا کر بدبو جانے سے قبل مسجد میں جانا مکروہ ہے اور علت بدبو ہے لہذا بودار پینٹ کا استعمال مکروہ ہے چونکہ عبارات میں ماکولہ کے ساتھ اَوْ غَيْرُهُ کی بھی تید ہے (مرتب)۔

مرد نہ رہیں، کم و بیش ہو جائیں، تو کراہت تحریمی کا ارتکاب لازم آئے گا۔

اسی طرح اگر کسی درمحراب نما کے اندر امام کھڑا ہو اور سب مقتدی باہر صحن میں کھڑے ہوں تو اگرچہ تعادلِ طرفین حاصل ہو مگر اسأت ہوگی اور کراہت ہوگی ورنہ کوئی حرج نہ ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۳/۱۴۰۱ھ

غیر مسلم کا چندہ مسجد میں لگانے کا حکم:

کافر غیر مسلم کا روپیہ چندہ لے کر مسجد میں خرچ کرنا جائز ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

کافر اگر اپنے عقیدہ کے مطابق ثواب سمجھتا ہے اور بدلہ لینے یا احسان وغیرہ رکھنے کا احتمال نہ ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں ہے (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۱۰/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عہد

بحالت کفر کمایا ہو ا پیسہ اور اس کو مسجد و مدرسہ میں صرف کرنا کیسا ہے؟

ایک نو مسلم کفر و شرک کی حالت میں تھے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو اپنی دولت بھی ساتھ لیتے آئے، ان کے اس مال و دولت کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ اگر وہ اس دولت کو اسلامی نیک کاموں مثلاً مسجد یا مدرسہ میں خیرات کریں تو کیا حکم ہے؟ اور مدرسہ و مسجد والوں کو ایسی رقم لینا چاہیے کہ نہیں، اگر لے لیا ہو تو کیا کریں؟

محمد براہیم باوا (لندن)

۱- "السدة أن يقوم في المحراب لعندل الطرفان، ولو قام في إحدى جانبي المسجد يكو فتاویٰ ثانی، ۱/۳۸۲، باب (الامت)۔

۲- "وأن یكون قربة فی ذاته إن شرط وقف الممی أن یكون قربة عدداً و عددهم" (ثانی ۳/۹۷، مکتبہ عثمانیہ)۔

الجواب وبالله التوفیق:

بعض پیسے ایسے ہوتے ہیں کہ جو کسی مذہب میں حلال و جائز نہیں ہوتے اور ان پر کسی مذہب میں ملکیت صحیحہ قائم نہیں ہوتی، جیسے چوری کا پیسہ، ڈاک اور غصب کا پیسہ۔

ایسا پیسہ بحالت کفر بھی کمایا ہوا اگر کوئی نو مسلم اپنے ساتھ لائے تو اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو اصل مالک کی ملک میں کسی مناسب انداز سے پہنچا دیں (۱)۔ اگر یہ ممکن نہ ہو اور مالک ثواب پانے کا اہل ہو مثلاً ”مسلمان ہو“ تو اس کو ثواب پہنچانے کی نیت سے صدقہ کر دے اور اگر اس کا علم نہ ہو سکے کہ مالک مسلم ہے یا کافر تو ایسی صورت میں اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے صدقہ کر کے جلد از جلد اپنی ملک سے نکال دے (۲)۔

بعض پیسے ایسے ہوتے ہیں کہ مسلمان کے لیے شرعاً حلال و جائز نہیں ہوتے اور غیر مسلم کے لیے حلال و جائز ہوتے ہیں اور غیر مسلم اس کا مالک بملک صحیح ہو جاتا ہے، جیسے شراب کے کاروبار کا پیسہ، خنزیر کے کاروبار کا پیسہ، ایسا پیسہ ان کے لیے حلال و جائز ہوتا ہے (۳)، اور اس پر مالک بملک صحیح ہو جاتے ہیں۔

اگر کفر کی حالت کا پیسہ لے کر مسلمان ہو جاویں تو اس کے صحیح مالک ہو گئے ہیں اور جس نیک کام میں چاہیں صرف کر سکتے ہیں، مسجد میں، مدرسہ میں ہر جگہ خرچ کر سکتے ہیں، یہی حکم ان کے گانے بجانے کے پیسہ کا بھی ہے، اس لیے کہ وہ اس کے صحیح مالک ہو گئے تھے اور وہ ان کے لیے حلال و جائز تھا اور مسلمان ہونے کے بعد قدیم مسلمان بھی وہ پیسہ ان سے لے سکتا ہے اور انہیں نیک کاموں میں خرچ کر سکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۱۲/۱۴۰۰ھ

۱- ”ویردولہا ای: الأموال الخیفة إلى أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها، لأن سبیل الکسب الخیث التصدق إذا نذر الو دعلی صاحبه“ (فتاویٰ ثنائی، ۵/۲۳۷)۔

۲- ”وإذا كان عند رجل مال خبیث فإما إن ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا یمكنه أن یرده إلى مالکة ویرید أن یدفع مظلمته عن نفسه فلیس له حيلة إلا أن یدفعه إلى الفقراء“ ”إلی قوله“ ولكن لا یرید بدالک الأجور والقبول، ولكن یرید دفع المعصبة عن نفسه ویدل علیه مسائل اللقطة“ (بذل الخیر فی حل الی دارالار ۳۷ کتاب الطهارة)۔

۳- ”لا لا أمرنا بر کھم وما یعتقدون“ (الدر المختار مع الثنائی ۲/۳۸ باب نکاح الکافر)۔

غیر مسلم کا روپیہ مسجد میں لگانا:

کافر کا روپیہ مسجد کی تعمیرات میں لگنے کی کیا صورتیں ہیں جائز ہے یا کہ نہیں؟

مفتی حسن انصاری (مقام گندھی سلیم پور مراد آباد)

الجواب وبالله التوفیق:

غیر مسلم اگر مسجد میں روپیہ وغیرہ دینا اپنے عقیدہ میں نیک کام سمجھتا ہے اور اے لینے میں یہ خطرہ نہ ہو کہ آئندہ وہ اپنے پوجا پاٹ کے لئے امداد طلب کرے گا یا اس کے دباؤ سے مسلمانوں کو غلط استعمال کرے گا تو اس کا روپیہ لینا اور مسجد کے کام میں استعمال کرنا جائز ہے ورنہ احتیاط واجتناب لازمی ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۸/۱۴۰۰ھ

خادم مسجد کے لئے موقوفہ زمین کی آمدنی امام و معلم پر صرف کرنا:

۱- میر مرحوم جناب خورشید صاحب نے بوقت تعمیر چودہ بنگلہ میں دھلائی بازار مسجد بنوانے کے لئے اطراف کے لوگوں سے روپیہ و زمین چندہ میں جمع کیا، مسجد اور اس کے متعلقات کاموں سے فارغ ہو کر سات کدہار چار جسٹی زمین چندہ جمع کیا مسجد اور اس کے متعلقات کے لئے خرید کیا اور وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ مذکورہ زمین کی آمدنی مسجد کا خادم استعمال کرے، اس وقت اس مسجد کے اطراف میں کوئی مسلم مقیم نہیں تھا صرف غیر مسلم کا جہوم تھا اب کچھ مسلمان مقیم ہو گئے ہیں، ان کے لئے امام اور بچوں کی تعلیم کی ضرورت ہے، نیز ان کے لئے مستقل تعلیم کا انتظام کرنا ممکن ہے، لہذا اس علاقہ کے اصحاب کی صلاح و مشورہ سے ان کی آمدنی کو امام اور معلم دونوں پر تقسیم کرنا جائز ہے یا کہ نہیں یا ایسے امام متعین کر لے کہ دونوں کام انجام دے سکے اور بچوں کی تعلیم بھی انجام دے سکے۔

مسجد کی زمین غیر مسلم کے ہاتھ فروخت کرنا:

۲- مذکورہ مسجد صرف بازاری لوگوں کے لئے بنوائی گئی تھی، اس وقت بازار دوسری جگہ ہونے کا اندیشہ ہو رہا ہے اگر

۱- "وأما الإسلام فلبس من شرطه فصيح وقف المسمى بشرط كونه قربة عندنا وعدمهم" (البحر الرائق ۵/۳۱۶ مطبوعہ مکتبہ زکریا، نیز دیکھئے فتاویٰ مالگیریہ ۳/۵۲، ۳۵۳ تا ۶/۵۲۳)۔

دوسری جگہ ہو جاوے تو کوئی مسلم یہاں نہیں رہیں گے، اس وقت مسجد کی جگہ کی حفاظت کرنا جو ضروری ہے مشکل ہو گئی ہے، لہذا مذکورہ جگہ غیر مسلم سے فروخت کرنے کے لئے کوئی صورت جواز کی ہے یا نہیں، واضح ہو کہ مذکورہ نصف کد ارزین مالک نے مسجد کے لئے وقف کیا تھا، اس سے کچھ زمین غیر مسلم کے قبضہ میں نیز بوقت تبدیل مقبوضہ زمین غصب ہو سکتی ہے۔

س۔ دریافت ہے کہ مذکورہ موقوفہ زمین کی آمدنی مسجد کے کاموں میں لگائی جاسکتی ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

سوال کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے لئے چندہ ہوا ہے اور وقف نامہ میں شرط لگائی گئی ہے کہ مذکورہ زمین کی آمدنی مسجد کے خادم استعمال کرے۔

مسجد کے خادم امام، مؤذن، فرائض وغیرہ تو ہو سکتے ہیں لیکن بچوں کے معلمین نہیں ہو سکتے ہیں، لہذا اس آمدنی سے معلمین کی تنخواہیں نہیں دے سکتے۔ اس کے لئے اگر انتظام کرنا ہے تو دوسرا انتظام کرنا ضروری ہوگا، شرائط واقف کا لحاظ جب تک نص شرعی کے خلاف نہ ہو واجب ہے کما ہو مصرح فی الفقہ (۱)۔

۲۔ کوئی زمین جب مسجد ہو جاتی ہے تو قیامت تک کے لئے مسجد ہو جاتی ہے، اس کو فروخت کرنا یا کسی دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں ہوتا، بلکہ جس طرح ممکن ہو حفاظت ہی کرنا واجب رہے گا علی القول المفتی بہ (۲)، جب خدا نخواستہ وہاں مسلم آبادی بالکل نہ رہے، اس وقت اس جز کا سوال کر کے جواب معلوم کر لیں۔

س۔ مذکورہ موقوفہ زمین کی آمدنی مسجد کے کاموں میں لگائی جاسکتی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عہ، محمد جمیل الرحمن، سید احمد علی سعید

۱۔ "شرائط الوقف معصومة إذا لم يخالف الشرع" (مطبعة عثمانیہ)۔

۲۔ "المسجد لا يخرج عن المسجدية أبداً، (شامی قدیم ۳/۵۳۱، مطبعة عثمانیہ)، قال أبو يوسف: إن المسجد إذا خرب واستغنی الناس عنه يبقى مسجداً إلى يوم القيمة كذا في البدائع، وقول أبي يوسف يبقى المسجد بعد خرابه والمفتی به كما صرح به في الحاوی القدسی" (المحررات ۳/۵۰۳)، لا خلاف فی بطلان بیع الوقف لانه لا تقبل التملك والتملك (مطبعة عثمانیہ)۔

۱- مسجد کی موقوفہ زمین کا تبادلہ:

اسکول یا مدرسہ کے متصل مسجد کی کچھ زمین ہے ان زمینوں کو اسکول کی ضرورت ہونے کی بناء پر اس کے بدلہ میں مسجد کو دوسری جگہ دوسری زمین دی جاسکتی ہے یا کہ نہیں، یہ بھی خیال رہے کہ وہ زمین اسکول کے متصل ہونے کی وجہ سے پیداواری میں بہت زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے۔

۲- مسجد کے لئے زمین وقف کرنے کی وصیت کی تو کیا اس سے رجوع صحیح ہے:

کسی شخص نے ایک جگہ زمین اس طریقہ سے وقف کی کہ میں اس کی آمدنی زندگی بھر کھاتا رہوں گا اور میرے مرنے کے بعد وہ زمین مسجد کی ہو جائے گی، اب سوال یہ ہے کہ وہ شخص اپنی زمین میں اپنی زندگی ہی میں وقف مسجد کو باطل کر کے کسی دوسری جگہ وقف کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

۱- جو زمین مسجد کی ہو جاتی ہے اس کو دوسری زمین سے تبدیل کرنا یا کسی دوسرے مصرف میں خرچ کرنا خواہ کوئی دینی ہی مدرسہ کیوں نہ ہو جائز نہیں ہے، ہاں اگر نقصان کا قوی اندیشہ ہو اور مسجد کو خود اس زمین کی نہ اس وقت کوئی ضرورت ہو اور نہ آئندہ ضرورت ہونے کی توقع، پھر اور تبدیل کرنے میں مسجد کا زیادہ نفع ہو پھر تو وہاں کے ذمہ دار و دیندار مسلمانوں کے مشورہ سے تبدیل کر سکتے ہیں (۱)، بلا مشورہ تنہا متولی یا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا ہے یا اسی طرح بعد مشورہ مذکورہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ اس زمین میں دینی مدرسہ کھول دیا جائے اور مدرسہ پر مناسب کرایہ رکھ کر مسجد کو دیا جائے، لیکن یہ یاد رہے کہ اس صورت میں وہ زمین مدرسہ کی نہ ہو جائے گی مسجد ہی کی رہے گی، مسجد کو جب ضرورت ہوگی خالی کر کے اپنا قبضہ و تصرف سب اس پر کر سکتی ہے۔

۲- ان الفاظ سے وقف کرنے میں (کہ میں اس کی آمدنی زندگی بھر کھاتا رہوں گا اور میرے مرنے کے بعد وہ زمین مسجد کی ہو جائے گی) وقف نام نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کی حقیقت ایک وصیت کی ہو جاتی ہے اور موصی کو اپنی زندگی میں اپنی وصیت ختم کر کے دوسرے مصرف میں صرف کرنا جائز رہتا ہے (۲)۔

۱- "صار بحیث لا یمنع بہ بالکلیۃ بان لا یحصل مدہ شی اصلًا اولًا یفی بمولہ فہو ایضا جائز علی الاصح اذا کان باذن القاضی ورأیہ المصلحۃ فیہ" (مٹائی ۵۳۵، مطبعہ عثمانیہ)۔

۲- "یصح للموصی الرجوع عن الوصیۃ" (ہندیہ ۹۲/۶، رشیدیہ پاکستان)۔

اس لئے صورت مسئلہ میں یہ وقف نام نہ ہوا بلکہ وصیت کی حقیقت ہوگی جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس کو ختم کر کے دوسری جگہ صرف کر سکتا ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسجد موقوفہ ہوتی ہے یا مملوکہ؟

۱- ایک صاحب نے ۱۹۷۵ء میں ایک مسجد شمشاد بلڈنگ میں اپنی زمین اور اپنے پیسے سے بنوا دی، محلہ کے مسلمانوں اور بازار کے دوکاندار مسلمانوں کے لئے اب یہاں کی ملکیت ہے یا وقف ہے۔

احاطہ مسجد میں امام کے لئے حجرہ بنانا جائز نہیں ہے:

۲- عرصہ بیس ۲۰ سال سے ان کے ورثہ نے انتظام کرنا چھوڑ دیا ہے، اس عرصہ میں آبادی بڑھی، مسجد کی ضروریات کے لئے مسلمانوں نے زمین خرید لی تھی اور انتظام بھی کرتے رہے امام بھی رکھا اور بنیوقتہ اور جمعہ کی نماز بھی ہوتی رہی ہے، نمازی بھی بڑھے اور امام کے لئے حجرہ کی ضرورت پڑی مسجد میں کوئی حجرہ نہیں ہے، اس سے امام کو بھی تکلیف ہوتی ہے، لہذا کمیٹی نے اندرون مسجد میں برآمد اور حجرہ ہونے کی بناء ڈالی ہے اس کے اوپر ایک شخص نے اعتراض کیا ہے عرض ہے کہ کمیٹی کو اس کے ہونے کا حق ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

۱- مسجد قرار دینے جانے کے بعد کسی کی ملک نہیں رہتی ہے، ہونے والے کی بھی ملک نہیں رہتی بلکہ وقف علی اللہ اور خاص اللہ کی ملک ہو جاتی ہے (۱)۔

۲- مسجد کے صحن میں امام کے لئے یا کسی اور کام کے لئے حجرہ بنانا جائز نہیں ہے، وقف اور بانی مسجد کو بھی جائز نہیں ہے پھر دوسرے کا کیا شمار (۲)، ہاں نمازیوں کو دھوپ، برسات، سردی، گرمی سے بچنے کے لئے سائبان بنا سکتے ہیں اور صرف

۱- "وأما حكمه (الوقف) فعددهما زوال العين عن ملكه إلى الله تعالى" (ہندیہ ۳/۵۲، رشیدیہ)۔

۲- "لو تمت المسجدة ثم أراد البناء مع: ولو قال: عبت ذالك لم يصدق (نادا خالہ) فاذا كان هذا في الوقف فكيف بغيره فيجب هدمه" (الدر المختار ۱/۳۷۹، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

نماز پڑھنے کے کام میں لا سکتے ہیں، اگر امام کے لئے حجرہ کی ضرورت ہو تو انہی بزرگ سے جنہوں نے پہلے مسجد کے لئے زمین دی ہے پھر مانگ لی جائے۔

مفت نہ دیں تو قیمت دیکر لی جائے، غرض مسجد کے حدود کے اندر حجرہ امام بنانا جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

مسجد کی پرانی لکڑی کو فروخت کرنا:

ایک بہت پرانی مسجد ہے، اس کا کچھ حصہ شہید ہو گیا ہے منہدم ہو گیا ہے، اب ہمارا ارادہ ہے کہ ہم پوری مسجد شہید کر کے دوبارہ بنائیں، اس میں جو قدیم لکڑی لگی ہے اس کو فروخت کر دیں یا ک نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

اگر لکڑی فروخت نہ کرنے سے شراب ہو جائے اور مسجد کو آئندہ کوئی ضرورت نہیں ہوگی تو اس کو فروخت کر سکتے ہیں، لیکن اس لکڑی کی قیمت کو اس مسجد میں خرچ کرنا ضروری ہوگا۔ مہذب (ص ۴۵۱) میں ہے: ”والثانی یجوز بیعہ لانه لا یرجی منفعة فکان بیعہ اولیٰ من ترکہ الخ“ (۱)، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عہد

مسجد کا متولی کون ہوگا؟

۱- زید اپنی قیمتی خاص زمین اس شرط پر حوالہ کیا کہ اس زمین پر مسجد تعمیر کی جاوے، ایک مدت کے بعد ایک مالدار آدمی نے کافی رقم صرف کر کے مسجد کی بناء ڈالی، بعد ازاں دوسرے اشخاص نے بھی اپنی خاص رقموں سے مسجد کی تعمیر کی اور اسے تکمیل کو پہنچایا اور بیرون مقامات سے اس کے لئے چندہ وصول کئے گئے، اب مسجد آباد ہے، اول واقف جس نے زمین

۱- ”وما الہدم من بناء الوقف و آله صرفه الحاکم فی عمارة الوقف ان احتاج الیه وان استغنی عنه امسکه حتی یحتاج الی عمارة فیصرفه فیہا“ (مانگیری ۲/۳۶۹، رشیدیہ پاکستان)۔

وقف کی مرحوم ہو گیا ہے، اس کی نسل سے چند نرینہ اولاد بھی ہیں، اب انکا دعویٰ ہے کہ مسجد بھی ہماری تولیت میں ہونی چاہئے، کیونکہ یہ زمین ہمارے والد کی ہے۔

اور مسجد کے لئے جس نے کافی رقم خرچ کی وہ کہتا ہے کہ میں نے مسجد بنا ڈالنے میں ۲۰۰۰ ہزار روپیہ خرچ کر دیا لہذا میں مقدم ہوں۔

۲- ہمارے شہر میں ایک مکتب ہے، یہ زید کے صرف خاص سے بنا ہوا ہے، اس مکتب کو چلانے کے لئے چند مکانات اور دو کانیں وقف کئے گئے ہیں۔ اور تعلیم دین کی شرط بھی لگا دی گئی ہے زید کی موجودگی میں آپ خود متولی بنارہا ہے زید کے بعد کیے بعد دیگرے متولی بنتے رہے ہیں اور اس مکتب کی نگرانی اور دیگر مکانات کی نگرانی ہوتی رہی، اب موجودہ متولی جو زید کے وارث سے نہیں ہے کرایہ اور مصارف میں چشم پوشی کرتا ہے اور اپنے متعلق واجباب کے لئے واقف اصل زید کے وارثین میں کسی کے لئے ۳۰ روپیہ کرایہ کے مکان کے ۲۰ روپیہ وغیرہ رعایت کرتا ہے اور جو منشی مقرر ہے وہ بھی رشوت لیکر چھوڑ دیتا ہے آیا از روئے شریعت یہ حرکات جائز ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

۱- اس صورت میں خاص کر جب نزاع بھی ہے تو بہتر یہ ہے کہ اہل محلہ کی ایک ایسی کمیٹی بنالیا جائے جس میں اول واقف کی اولاد میں سے بھی ایک دیانتدار امانتدار صالح آدمی ممبر ہو اور جس نے تعمیر میں کافی رقم خرچ کی ہے وہ بھی اس کا ممبر ہو اور ایک ایسا عالم دین جو مسجد و اوقاف کے احکام و مسائل سے واقف ہو اس کو بھی شریک کر لیا جائے اور شریعت کی روشنی اور حدود کے اندر تمام معاملات آپس کے مشورے سے طے کر لیا کریں اور اسی کے مطابق عمل کیا کریں۔

ذاتی و انسیاتی بات کو دخل نہ دیا کریں، ہر شخص یہ خوب سمجھ لے اور ہر وقت متحضر رکھے کہ نیک کام بھی اخلاص سے قبول ہوتا ہے، نام آوری، حکومت اور بڑائی کا تخیل نیکی کو برباد اور گناہ لازم کر دیتا ہے اور خسر الدنیا والاخرۃ کا مصداق بنا دیتا ہے۔

۲- اس میں بھی ۲ کی طرح ایک ایک کمیٹی بنا کر عملدرآمد کیا کریں، خیانت کے شرعی ثبوت کے بعد بھی ڈھیل دینا گناہ اور اعانت معصیت بھی معصیت ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۹/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عنہ

مسجد کی آمدنی مدرسہ یا دوسرے گاؤں کی مسجد پر صرف کرنا:

ہمارے دادا نے کچھ زمین مسجد میں وقف کیا تھا تا حیات وہ خود متولی رہے، ان کے بعد ہمارے والد ذاکر محمد احسن متولی ہوئے اور اس وقت متولی ہم ہیں، مسجد کی زمین کی آمدنی مسجد کے سالانہ خرچ سے زائد ہے اور مسجد کی عمارت مکمل ہے آمدنی کا روپیہ ۲۲۰۰ ہے۔

۱- مسجد کے پاس ایک مدرسہ ہے جو کہ مسجد کی آمدنی سے والد صاحب نے بنایا تھا، اب اس کی عمارت کو مرمت کی ضرورت ہے اس روپیہ سے مرمت ہو سکتا یا کہ نہیں۔

۲- قریب کے دوسرے گاؤں میں ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے، وہاں کے لوگوں کی مالی حالت خراب ہے، کیا اس مسجد کے کچھ روپیہ اس مسجد کی تعمیر میں دے سکتے ہیں یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

خدا کا شکر ہے اور آپ لوگوں کی مساعی نیک کا ثمرہ ہے کہ مسجد مالدار ہے، لیکن مسجد کے روپیہ سے مدرسہ کی تعمیر جو ہوئی وہ غلط اور ناجائز ہوئی، اس لئے آئندہ بھی مرمت مدرسہ مسجد کے روپیہ سے جائز نہیں ہے (۱)۔

یہ قریب کے گاؤں میں جو مسجد تعمیر ہو رہی ہے اگر وہاں ضرورت ہو اور اس مسجد کو جس کا روپیہ ہے مستقبل میں ضرورت متوقع نہیں ہے اور نہ اس وقت کچھ دقت پیش آنے کا احتمال ہے تو اس مسجد پر خرچ کر سکتے ہیں (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود علی عمنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "الواجب أن يبدأ بصرف الفروع إلى مصالح الوقف من عمارته وإصلاح ما به من بنائه وماتو مؤناته التي لا بد منها" (برائع المسانح ۵/ ۳۳۰)۔

۲- "الفتاویٰ علی أن المسجد لا يعود میراثاً ولا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر" (مٹائی ۳/ ۵۱۳)، اس کے اگلے صفحہ پر ہے: "والدی یبغی متابعة المسانح المذكورین فی جواز النقل بلا فرق بین مسجد أو حوض کما أفتی به الإمام أبو شجاع والإمام الحلوانی وکفی بها قدوة لا سيما فی زماننا" (مٹائی ۳/ ۵۱۳)۔

متولی کا مسجد میں چندہ کرنے سے روکنا:

یہاں ایک انجمن اوقاف ہے جس کے زیر انتظام جامع مسجد، مدرسہ، عیدگاہ اور قبرستان وغیرہ ہیں۔ کیا اس انجمن کے ممبران یا متولی اور صدر کو شرعاً یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی انتظامی یا دینی مصلحت سے کسی خاص شخص یا اشخاص کو کوئی خاص مدرسہ کا چندہ کرنے کی جامع مسجد میں اجازت نہ دیں اور اجازت نہ دینے کی صورت میں اگر وہ شخص یا اشخاص انجمن کے ممبران یا متولی و صدر کے حکم کو ماننے سے انکار کریں اور علی الرغم چندہ کرنے کی کوشش کر کے انتظامی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کریں تو شرعاً انکا یہ فعل کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

متولی یا صدر یا جو انتظام کا ذمہ دار بنایا گیا ہو اس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ دینی و انتظامی مصالح کے تحت جامع مسجد میں چندہ اور سوال کرنے والے کو روکدیں یا اجازت نہ دیں، لیکن ضرورت مند مدارس عربیہ و دینیہ یا اہم دینی امور کے لئے بوقت ضرورت اس شرط کے ساتھ دے دینا کہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو، گردنوں پر سے پھلانگ نہ جائے، نمازیوں کے سامنے سے گزر نہ جائے موجودہ وقت میں نہ یہ کہ مباح ہے بلکہ مندوب و مناسب ہے مکمل مستفاد من کتب الفتاویٰ (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۱۱/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح فخر الحسن غفرلہ دارالعلوم دیوبند

محکمہ کی اجازت کے بغیر مسجد میں بجلی کا استعمال:

زیر تعمیر جامع مسجد موضع ایلو کے کارکنوں نے جامع مسجد مذکورہ بالا کی تعمیر کے لئے پانی کی ضرورت اور اسکی کمی کے پیش نظر مسجد کے پرانے کنویں میں جس کا پانی گرمی کے دنوں میں بہت کم ہو جاتا تھا اور جمعہ کے دن خاص طور سے وضو وغیرہ کے لئے سخت پریشانی ہوتی تھی، یوب ویل کی بورنگ کرائی اور اسے چالو کرنے کے لئے محکمہ بجلی میں کنکشن کی درخواست دی اور اس کے لئے ضروری رقم بھی ساتھ ہی جمع کر دی، چونکہ مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا تھا اور کنویں کے ہینڈ پمپ سے تعمیر

۱- "والمختار أن السائل إن كان لا يمر بين يدي المصلي ولا يخطي الرقاب ولا يسأل إلخافاً بل لأمر لا بد منه فلا بأس بالسؤال والإعطاء" (رد المحتار ۱/۵۵۳)۔

کے لئے مطلوب پانی کی مقدار اہم نہیں ہو رہی تھی اور کام میں خرچ ہوتا تھا، اس لئے محکمہ بجلی کے مقامی انسراں جو کہ مبارکپور بجلی کالونی میں رہتے ہیں، سے جلد از جلد کنکشن جوڑنے کی درخواست کی گئی تاکہ پانی کی کمی دور ہو جائے اور تعمیر میں آسانی ہو، چونکہ دفتری کارروائی میں بہت دیر ہوتی ہے، اس لئے مسجد کی فوری ضرورت کا احساس اور لحاظ کر کے ان مقامی انسراں نے یہ کہ کر کہ یہ دھرم کا کام ہے جب تک باقاعدہ کنکشن نہیں مل جاتا آپ لوگ مین لائن سے ڈسکٹ تار لگا کر مسجد کا کام نکالنے۔ بجلی کے ذریعہ ٹیوب ویل چلانے کی اجازت دیدی۔ اس سلسلہ میں محکمہ بجلی کے کسی ملازم یا انسرا کو کوئی نذرانہ یا بخشش یا رشوت کہیں بھی نہیں دی گئی۔ اور نہ انہوں نے کبھی بھی اس طرح کا کوئی مطالبہ یا اس کی خواہش کا یہی اظہار کیا، محکمہ بجلی کے ان مقامی انسراں کی اجازت کے بعد تقریباً ۹ ماہ تک باقاعدہ کنکشن نہیں ملا، اور مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں بوقت ضرورت مذکورہ بالا طریقہ سے ٹیوب ویل چلا کر پانی حاصل کیا گیا، مصلیان مسجد اس سے غسل اور وضو بھی کرتے رہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طرح بلا باقاعدہ کنکشن ملے ہوئے ڈسکٹ کنکشن جوڑ کر ٹیوب ویل چلانا اور اس سے حاصل شدہ پانی سے مسجد تعمیر کرنا کیسا ہے؟ اور اس تعمیر شدہ مسجد کا کیا حکم ہے؟ اور اگر خدا نخواستہ شریعت کے نزدیک یہ کام غلط تھا تو اب اس کی تلافی کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

(نوٹ) سوال میں مذکورہ ۹ ماہ تک مقامی انسراں اور ملازمین کی اجازت سے جو بجلی استعمال کی گئی اس کا کوئی معاوضہ گورنمنٹ کے خزانہ میں آج تک جمع نہیں کیا گیا اور جن انسراں اور ملازمین نے بجلی استعمال کرنے کی اجازت دی تھی ان کو گورنمنٹ نے یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ کسی کو بھی اس طرح بجلی استعمال کرنے کی اجازت دے۔

ابوالقاسم (مبارک پور، الملہ، ضلع اعظم گڑھ)

الجواب وبالله التوفیق:

مذکورہ صورت کا از روئے فتویٰ شرعی حکم یہ ہے کہ اس طرح عمل کرنا غلط ہوا، ایسا کرنے والے گنہگار ہوئے اور ان پر اس عمل پر تائب ہونا ضروری ہے اور توبہ یہ ہے کہ استغفار کے ساتھ یہ بھی کریں کہ ۹ ماہ تک بجلی کا جتنا قانونی چارج ہوتا ہے اتنا کسی نہ کسی حیلہ و ذریعہ سے محکمہ کی ملک میں داخل کر دیں۔ باقی یہ مسجد شرعی مسجد قرار پائے گی اور جن لوگوں نے اس پانی سے غسل، وضو وغیرہ کیا ہے ان سب کی نمازیں ادا ہو گئیں۔ اگر ایسا غلط عمل کرنے والے (ذمہ داران) غریب ہوں، ۹ ماہ تک

کابلی کا اصلی چارج دینے کی طاقت نہ ہو تو ان کے ساتھ تبرع کر کے بذریعہ عام چندہ اس رقم کی ادائیگی کرا دینا بہتر ہوگا (۱)،
فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/ ۳/ ۱۳۰۲ھ

اختلاف کی بنا پر جدید مسجد کی تعمیر:

ایک مسجد باہمی جھگڑے اور خاص طور پر امام کے ساتھ ذاتی اختلافات کی بنا پر بنائی گئی جب کہ پہلے سے یہاں مسجد موجود تھی اور سارے گاؤں کے لوگ اس میں نماز پڑھتے چلے آ رہے تھے۔ جہاں دوسری مسجد بنائی گئی ہے اس آدھی زمین ایک دوسرے شخص کی ہے جو مسجد بنانے کے صرف اس لئے حق میں نہیں تھا کہ یہ تفریق بین المؤمنین کا سبب بنے گی مگر بنانے والوں نے کوئی پروا نہیں کی اور یہ کہا کہ ہمیں مسئلہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم مسجد بنا کر چھوڑیں گے، چنانچہ مسجد بن گئی اور جسکی زمین دہائی گئی تھی وہ اب بھی مارضی ہے، ایسی صورت میں اس نو تعمیر مسجد میں نماز پڑھنا کیسا ہے، جبکہ اس کے بننے سے گروہ بندی ہوئی ہے، اگر کبھی پورا گاؤں آپس میں میل جول کر لے، باہمی جھگڑے ختم ہو جائیں تب اس مسجد میں نماز پڑھنا درست ہوگا یا نہیں، یا پھر بھی زمین والے کی رضامندی ضروری ہوگی؟

عبد السلام (مندیروہ راجستھان)

الجواب وبالله التوفیق:

مسجد، جھگڑے اور ذاتی اختلاف کی بنا پر بنانا ناجائز فعل ہوگا اور سخت گناہ کا کام ہوگا، اسی طرح دوسرے کی زمین پر اس کی اجازت و مرضی سے بنالیا بھی ناجائز اور حرام فعل کا ارتکاب ہوگا۔

البتہ جب مسجد بن گئی اور اپنے اور غیروں نے سب نے اس کو مسجد سمجھ لیا اور مسجد کہہ دیا تو اس میں شعائر اللہ ہونے کی شان پیدا ہوگئی، اس کو اب گرانا اور مسمار و منہدم کرنا جائز نہ ہوگا، بلکہ اب ضروری ہے کہ جھگڑا ختم کر کے دونوں مسجدوں کو

۱- ”لا يجوز لأحد أن يصرف في ملك غيره بلا إذنه أو وكالة منه أو ولاية عليه وإن فعل كان ضامنا“ (شرح المجملہ لسلیم رحمہ اللہ ج ۱ ص ۶۱ مادة رقم ۹۶) ”عن أبي حرة الواقشي عن عمه قال قال رسول الله ﷺ: ألا لا تظلموا، ألا لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفسه منه“ (مشکوٰۃ ص ۲۵۵)۔

آباد کرنے کی کوشش کی جائے (۱)، اور جس کی زمین پر بغیر اس کی اجازت و مرضی کے مسجد بنالیا ہے اس سے اجازت حاصل کیا جائے اور اجازت چاہے مفت دے یا قیمت لے کر دے، جس طرح دے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس شخص پر بھی ضروری ہے کہ اجازت دیدے خواہ معاوضہ لے کر ہو یا بلا معاوضہ لے کر ہو (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳/۹/۱۳۰۲ھ

بچے اور پاگلوں کا مسجد میں داخل ہونا:

بچوں اور پاگلوں کو مسجد میں داخل کرنا کیسا ہے؟ یہاں یہ دیکھا جا رہا ہے کہ نابالغ بچے اور پاگل جماعت میں بے دھڑک شامل ہوتے ہیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

ما سمجھ بچوں اور پاگلوں کا مسجد میں لے جانا حرام ہے، اس سے خدا کے گھر کی بے حرمتی ہوتی ہے، سختی سے روکنا چاہئے، کیونکہ خدا کے گھر کی بے حرمتی خدا کے غضب کے نزول کا سبب ہے، ”و یحرم ادخال صبیان و مجانین حیث غلب تنجسہم وإلا فیکره“ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ بچاؤ اپنی مسجدوں کو بچوں سے اور پاگلوں سے اور بیچ و شراء سے اور شورغل وغیرہ سے اور مسجدوں میں خوشبوؤں کی دھونی دیا کرو اور ان میں آفتا بے رکھا کرو (۳)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عزم

۱- ”وفی شرح المبیة للحلی: بی مسجد فی أرض غصب لا بأس بالصلاة فیہ“ (رد المحتار علی الدر المختار ۲/۳۳)۔

۲- ”ولو ضاق المسجد علی الناس وحبیه أرض لرجل لو خد أرضه بالقیمة کرها کذا فی فتاویٰ قاضی خان“ (فتاویٰ عالمگیری ۲/۵۶)۔

۳- ”قوله و یحرم لما أخرجه المذنبی مرفوعاً“ ”جبوا مساجدکم صیالکم و مجالسکم و بیعکم و شراءکم و رفع أصواتکم و ملّ مبوفکم وإقامة حدودکم، و جمروها فی الجمع واجعلوا علی أبوابها المطاهر بحر“ (تاریخ ص ۳۸۶، رد المحتار علی الدر ۲/۳۹، باب یفسد ما یکره فیہا، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

شرابی کو مسجد سے نکالنا جائز ہے یا نہیں؟

ایک شخص نے اپنے ساتھی کو نماز کے لئے بلایا ہے اور اس کے ساتھ مسجد نماز کے لئے گیا ہے، مسجد میں داخل ہونے تک یہ معلوم نہ ہوا کہ یہ شراب پیئے ہوئے ہے، اندر داخل ہونے کے بعد معلوم ہوا تو اس نے مادم ہو کر اتنا کہا کہ اللہ معاف کرنے والا ہے۔

اب اس ساتھ لانے والے کو مسجد سے چلے جانے کے لئے کہنا درست ہو گا یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

ہاں شرابی کو مسجد سے چلے جانے کے لئے کہنا درست ہے، اب وہ شرابی واپس نہ جائے اور ویسے ہی نماز پڑھ لے تو اس لانے والے پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۹/۱۳۸۵ھ

اس لئے درست ہے کہ اس کے منہ سے شراب کی بو جو نکلے گی وہ باعث ایذا ہوگی اور نشہ میں ایسی حرکات کر سکتا ہے جس سے مسجد کی بے حرمتی ہو۔

الجواب صحیح سید احمد علی سعیدنا عب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسجد کے لئے وقف شدہ ڈول اور رسی کا حکم:

مسجد کے اندر پانی کا کنواں ہے اور اس پر ایک ڈول ہے جس سے بچوقتہ نماز و جمعہ کی نماز کے لئے وضو کا پانی کھینچا جاتا ہے، اس ڈول سے پڑوسی لوگ اپنے گھروں پر پانی لے جاتے ہیں اور بے نمازی لوگ غسل کرنے والے کپڑے بھی دھوتے ہیں یہ عمل جائز ہے یا ناجائز ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

وہ ڈول رسی اگر وقف کے مال سے خرید آگیا ہے جب تو محض نماز اور طہارت کی ضرورت میں استعمال کر سکتے ہیں،

نہ اس کو گھر پر پانی لیجانے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں اور نہ بے نمازی لوگ اپنی کسی ضرورت میں استعمال کر سکتے ہیں، اور اگر وہ رسی ڈول وقف کے مال سے نہیں خرید آگیا ہے بلکہ کسی نے اپنی ملک سے رکھے ہیں اور وہاں کا عرف یہی ہے کہ محض مصلیان ہی ضرورت نماز کے لئے استعمال کریں جب بھی یہی حکم سابق ہے کہ محض مصلیان ہی ضرورت نماز کے لئے استعمال کریں، ہاں اگر دینے والا تصریح کر دے کہ جو شخص چاہے استعمال کرے تو ہر شخص استعمال کر سکتا ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

امام کے ساتھ سخت کلامی:

امام صاحب کے ساتھ سختی سے بات چیت کرنا یا انکی بے ادبی یا بدتمیزی کرنی کیسی ہے اور توہین کرنی وغیرہ۔

الجواب وبالله التوفیق:

امام کے ساتھ سخت کلامی یا بے ادبی و گستاخی یا توہین کرنا یا ان پر حکومت کرنا اور عترت اہل گناہٹنا بالخصوص غلط طریقہ سے بہت ہی برا اور عند اللہ مہجوس ہے، امام کے پاس وادب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عہد

ایسی جگہ جہاں سو سال کے بعد مکانات منہدم کر دیئے جاتے ہوں وہاں مسجد کا حکم:

۱- ہمارے شہر میں دس بارہ سال سے ایک گرجا خرید آیا ہے اور اس کو عبادت خانہ کے طور پر استعمال فرما رہے ہیں، ایک مہینہ پہلے حضرت مولانا ابراہیم صاحب تشریف لائے ہوئے تھے، حضرت والا نے اپنے معمول کے مطابق فرمایا کہ کیا شرعی مسجد نہیں بنائی گئی کہ ابھی تک اس کو عبادت خانہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، لوگوں کو حضرت والا نے توجہ دلائی اور لوگوں کے ذہن کو صاف کیا، یہاں کے لوگوں کے ذہن میں یہ بات ہے کہ حکومت کا قانون ہے کہ جب مکانات سو ۱۰۰ سال

۱- دیکھئے مطلب مراعاة غرض المؤمنین و اہل العرف (مصلح خمسہ)، (رد المحتار علی الدرر) ۶۶۵، مکتبہ ذکریا۔

کے ہو جاتے ہیں اس کو حکومت گرا دیتی ہے اور وہاں کے رہنے والے اس شہر میں دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں اس وقت اس مسجد کو کون آباد کرے گا، اس وجہ سے یہاں اکثر شہروں میں لوگوں نے مکانات کو عبادت خانہ بنا رکھا ہے، خدمت اقدس میں عرض ہے کہ اس عبادت خانہ کے اوپری حصہ میں پانچ وقت کی نماز جمعہ و عیدین پڑھتے ہیں، تقریباً ۳۰۰ افراد اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں اور نیچے تہہ خانہ ہے تو اس میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے بچے پڑھ رہے ہیں مگر اوپر کے حصہ کی چارصف تک مسجد کی نیت کر لی جائے، اور تہہ خانہ کو مصالح مسجد مثلاً کتب مسجد کا سامان، میت رکھنے کے لئے چارپائی وغیرہ ضروریات کے لئے استعمال کریں تو شرعی طور پر اس طریقہ سے مسجد کی نیت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۲- اور اس طریقہ سے مسجد کی نیت کرنے کے بعد خدا نخواستہ اس جگہ کو حکومت نے آبادی کو وہاں سے منتقل کر دیا تو شوری کے آدمی عند اللہ مجرم ہوں گے یا نہیں؟ اور لوگوں کا اس بات کا سوچنا کہ اس کے بعد کون آباد رہے گا شرعی نقطہ نظر سے درست ہے یا نہیں؟

اس یوٹیوٹ (۳۳) تھنگ انگریز ہائے انگلینڈ)

الجواب وبالله التوفیق:

(۲۱) حضرت مولانا امیر الحق صاحب مد فیضہ کا توجہ دلانا صحیح و بر محل ہے، عبادت خانہ میں جتنا ثواب ملتا ہے مسجد شرعی میں کم از کم اس سے بچیں ۲۵ گنا زیادہ ثواب ضرور ملتا ہے (۱)۔ ورنہ روایات اس سے زائد کی بھی ہیں اور مسجد شرعی وہ جگہ ہوتی ہے جس کو نماز پڑھنے کے واسطے قیامت تک کیلئے وقف کر دیا گیا ہو، اس جگہ اور عمارت کو مالک نے برائے مسجد وقف کر دیا ہو، وقف کرنے سے وہ جگہ و مکان واقف کی ملک سے نکل کر اللہ کی ملک میں مفتی بقول میں داخل ہو جاتی ہے اور تا قیامت قیامت وہ جگہ و مکان مسجد ہی قرار پاتا ہے، مسجد کے اوپر عنان نہا تک اور نیچے تخت اٹری تک سب بحق مسجد خالص ہو کر محفوظ ہو جاتا ہے، اس لئے اس کے اوپر و نیچے کسی طرف نماز و ذکر و تلاوت یعنی عبادات خالصہ کے علاوہ کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں رہتا حتیٰ کہ امام و موزن کے لئے اس کے اوپر نیچے کوئی کمرہ تعمیر نہیں کر سکتے حالانکہ امام و موزن عین ضروریات مسجد میں سے ہوتے ہیں اور ان ہی وجوہ سے غسل خانہ و وضو خانہ وغیرہ بھی مثل کمرہ موزن و امام کے ہیں مسجد کے اوپر یا نیچے بنانا

۱- "صلوة الرجل في جماعة تضعف على صلواته في بيته وفي موفه خمساً وعشرين ضعفاً" (المدرسة (رواه البخاري واللفظ له مسلم و ابو داود والترمذي وابن ماجه، الترغيب والترہيب للحميدي ۲/۲۵۹)۔

درست نہیں ہے، اس طرح کتب و مدرسہ خواہ دینی تعلیم کا ہو یا میت کے غسل و لانے وغیرہ کی جگہ بھی یا مردہ رکھنے کے لئے فیریز وغیرہ رکھنے کی جگہ کو بھی عین مسجد کے اوپر نیچے قائم کرنا جائز و درست نہیں ہے، اگر ضرورت ہو تو امام و مؤذن کے کمرہ کی طرح حاشیہ و مسجد میں خواہ متصل عین مسجد کے ہو رکھنا چاہئے، ہاں عین مسجد کے اوپر و نیچے خاص مسجد کا سامان جیسے مسجد کے لوٹے جا نماز وغیرہ رکھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں متعین کر کے کمرہ کی شکل بھی دے سکتے ہیں، اس لئے مالکان عبادت خانہ کو مسئلہ خوب سمجھا کر اور شرعی مسجد کی فضیلت سمجھا کر ترغیب دینا چاہئے کہ وہ عبادت خانہ برائے مسجد وقف کر کے مسجد شرعی قرار دے دیں، بے انتہاء ثواب اور حصول خیر و برکت کا کام ہوگا، رہا یہ اشکال کہ یہاں کے قانون حکومت کے ماتحت سو ۱۰۰ برس کے بعد گرانے والے پلان میں آکر وہ جگہ یعنی مسجد بھی گرا دی جائیگی تو ایسی صورت میں اس نیت کرنے والے پر تو کچھ وبال نہ آئے گا، اگر اس جگہ دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت بھی مل جائے تو چونکہ اس جگہ کے مسلمان متفرق ہو چکے ہوں گے آباد کون کرے گا یہ اشکال شرعاً معتبر و صحیح نہیں ہے، اولاً تو اس لئے کہ بعض لوگوں سے کچھ اس طرح سننے میں آیا ہے اگر گر جاگھر اور شرعی مساجد جو حکومت کے نزدیک بھی شرعی مسجد تسلیم ہو چکی ہو وہ اس کو گرانے والے پلان سے مستثنیٰ ہوتی ہے اگر ایسا ہو تو یہ خلیجان رہ جاتا ہے وہاں کے مسلمانوں کے منتشر ہو جانے کے بعد کون آباد کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس گرا دینے کے بعد پھر چند مہینوں میں وہ جگہ لوگوں سے آباد بھی ہوتی ہوگی، اس وقت اس جگہ کو اکثر مسلمان لے لیں یا لینے کی سعی کریں کامیاب ہو گئے تو اس سعی کو ثواب کے ساتھ ساتھ احیاء دین و احیاء مشاعر کا بھی ثواب ملے گا ورنہ اس سعی کا ثواب تو ضرور ملے گا اور یہ بھی نفع سے خالی نہیں اور ثانیاً اس کے لئے یہ گر جاگھر اور مساجد شرعی بھی اس گرانے کے پلان میں آتے ہوں جب بھی اس مذکورہ بلا سعی وغیرہ کا ثواب کہیں جاتا نہیں اور چونکہ یہ گرانا اور آبادی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ وغیرہ منتقل کرنا خود اپنے اختیار و خوشی سے نہیں ہوگا اور وہ خود اپنا فعل نہیں ہوگا۔

بلکہ حکومت قہری طور پر ایسا کرے گی اور مسلمان معذور ہوگا ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ“ (۱)، ایک شخص کی غلطی کی سزا دوسرے کو نہیں دی جاتی اور احادیث صحیحہ میں آتا ہے: ”رفع عن امتی الخطاء والنسيان وما استكروها عليه أو كما قال عليه الصلوة والسلام“ (۲)۔

یعنی سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت سے خطا اور نسیان اور اس چیز کا گناہ وبال مرتفع کر دیا گیا ہے

۱- سورہ فاطر: ۱۸۔

۲- ”تکدر هذا الحديث في كتب الفقهاء والأصوليين بلفظ: رفع عن امتي ولم يزل في الأحاديث المتقدمة عدد جميع من أخرجوه“ (الشيخ المير ۵۱۱/۱، مؤسسة القرب، جامع صغير للسيوطي)۔

جس میں وہ مکرمہ (معذور) ہو، اس آیت کریمہ وروایت کی بنیاد پر اس تغیر کا وبال مسجد کی نیت کرنے والوں اور وقف کرنے والوں پر بالکل نہ پڑے گا، بلکہ کیا عجب کہ مخلص کی سعی اللہ تبارک و تعالیٰ کو اتنی پسند آجائے کہ اس کی برکت سے اس کے گرانے کا پلان یا معاہدہ و مساجد گرانے کا پلان مستثنیٰ ہو جائے اور اگر مستثنیٰ نہ ہو تو بھی ”انما الاعمال بالنیات“ (۱) کے تحت اور ”نیۃ المؤمن خیر من عملہ“ (۲)، کے تحت ثواب تو کہیں جاتا نہیں، اس لئے قول کی توجہ اس طرف متعطف کر کے ان عبادت خانوں کو شرعی مساجد بنانے میں پوری سعی کرنا چاہئے اور الدال علی الشئی کفاعلہ کے مطابق سعی سے بھی پورا عمل کرنے والے کے ثواب کی نیت رکھنا چاہئے اور خلاصہ جواب یہ نکالنا کہ اس نیت کرنے کے بعد اگر خدا نخواستہ اس جگہ کو حکومت نے لے لیا اس جگہ کی بستی کو دوسری جگہ منتقل کر دیا جب بھی یہ نیت کرنے والے اور شرعی مسجد قرار دینے والے مجرم و ماخوذ نہ ہوں گے بلکہ یہ نیت و سعی باعث اجر و ثواب و باعث خیر و برکت بنے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمار پورہ ۱۴۱۸ھ / ۲۰۰۳ھ

۱- مسجد کی آمدنی سے امام کی آمد و رفت کا کرایہ دینا:

مسجد میں جو امام ہے اس کے گھر آنے جانے کا کرایہ دینا طے ہے، اگر کسی وقت روپے لوگ اپنے پاس سے نہ دے سکیں پورا یا کچھ کی رہ جائے اور مسجد کی آمدنی میں سے دیدیں تو کچھ حرج ہے یا نہیں؟

۲- امام کے ناشتہ وغیرہ کا نظم مسجد کی آمدنی سے:

امام صاحب کے ناشتہ کا انتظام مسجد کی آمد سے کر دیں اور مسجد میں جانے کے لئے مٹی کا تیل، آٹا اور ماچس اگر بخوشی لوگ اجازت دیدیں، اسٹوپ اور حجرہ میں روشنی کے لئے جانا جائز ہے یا نہیں؟

۳- مسجد کی آمدنی سے انعام دینا:

جیسا کہ اب دستور ہو گیا ہے کہ کوئی شخص مسجد کی آمد کرنا ہے تو اس کو مالک پر بولا جاتا ہے اس کو سن کر لوگ اور دیتے ہیں اور بعض جگہ امام کو کبھی کبھی پڑھنا پڑ جاتا ہے یعنی نظم وغیرہ تو اس سلسلہ سے اچھی آمدنی مسجد کو ہو جاتی ہے تو اس میں سے یعنی مسجد کی آمدنی سے کچھ بطور انعام امام صاحب کو دیدیں تو جائز ہے یا نہیں؟

۱- مشفق علیہ، مشکوٰۃ ۱۱۔

۲- ضعیف کما قالہ العراقي، اتنی الطالب ۱/ ۳۰۸، دارالکتب العلمیۃ، بیروت۔

الجواب وبالله التوفیق:

۱- اگر گھر آنے جانے والے کا کرایہ لینے دینے کا معاملہ مسجد کے ذمہ داروں اور اراکین مسجد سے طے ہے کہ مسجد کے پیسے سے دیدیا جلیا کرے جب تو ایسے وقت میں مسجد کے پیسہ لیکر خرچ کر لیں اور بعد میں مسجد کے ذمہ داروں کو بتا دیں اور اگر اس طرح معاملہ ہے نہیں تو مسجد کے پیسے سے لینے کے بجائے کسی سے قرض لیکر کام چلائیں اور بعد میں طے شدہ معاملہ کے مطابق وصول کر لیا کریں۔

۲- امام کے مآخذ کا انتظام مشورے سے طے ہے تو کر سکتے ہیں ورنہ نہیں اور مسجد کے صحن میں بھی جو عین مسجد قرار پا چکا ہو اس میں مٹی کا تیل اور کوئی بدبودار چیز کا استعمال جائز نہیں (۱)، ہاں اگر وہ حصہ صحن میں مسجد نہ ہو بلکہ وضو خانہ و غسل خانہ وغیرہ کا جزء ہو تو وہاں جا سکتے ہیں۔

۳- مسجد کی آمدنی بڑھانے کے لئے سادہ اور خموش طریقہ افضل ہے یہ مذکورہ طریقہ اچھا نہیں، باقی اگر اس طرح وصول کر لی گئی ہو اور اس میں سے بطور انعام کے امام صاحب کو بھی کچھ دیدیا تو اس کا لے لینا امام صاحب کو جائز رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمار پورہ ۸/ ۸/ ۱۳۰۳ھ

مساجد میں اناج کا دسواں حصہ لگانا:

مساجد میں اناج کا دسواں حصہ لگ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

مساجد میں اناج کا دسواں حصہ (عشرہ) نہیں لگ سکتا ہے، جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمار پورہ ۹/ ۱۲/ ۱۳۰۳ھ

۱- ”من أكل ثوما أو بصلاً فليعتزلنا أو يعزل مسجدنا“ (بخاری ۸۲۰/۲، باب ما یکرہ من الشوم والبعول)۔

عید گاہ کے لئے وقف شدہ زمین کا مصرف:

ایک آراضی جو کہ ۱۶ سہل کی تھی جس میں ہم لہ کے حصہ دار تھے وہ ہم دونوں حقداروں نے عید گاہ کے لئے قریب پانچ سال ہوئے، بخوشی دیدی تھی اور نماز عید الفطر اور عید الاضحیٰ چار سال سے وہاں متواتر ہوتی رہی، عمارت کسی طرح کی نہیں بنی اور نہ کسی طرح کی بنیاد پڑی، اب پبلک میں دو پارٹیاں ہونے پر اعتراض ہوا ہے کہ ہم لوگ قریب کے گاؤں میں نماز پڑھیں گے، ہم لوگ تھوڑے ہونے پر مجبوراً خاموش رہے ہیں، اب اس میں عید گاہ بننے کی کوئی امید نہیں ہے اب اس آراضی کا کیا ہونا چاہئے وہ بیکار پڑی ہے پہلے اس میں کاشت ہوتی تھی۔

الجواب وبالله التوفیق:

اس جگہ مسجد بنادیں جائے، بہر حال یہ جگہ وقف ہو چکی اور کسی ذاتی خرچ میں بھی نہیں آ سکتی ہے (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسجد بنانے کے لئے بینک سے سودی قرض لینا:

اگر کسی مسجد کے منتظمین مسجد بنانے میں بینک سے سودی قرض لے اور ادارہ کے حساب سے سود ادا کرے تو شرعی حکم کیا ہوگا؟ اور یہ کہ ایسے منتظمین کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

ابراہیم باوا

الجواب وبالله التوفیق:

بینک سے بھی سودی قرض لینے کی بغیر سخت مجبوری اور ضرورت کے گنجائش نہیں ہوتی اور مسجد کا پختہ کرنا ضروری نہیں، اس لئے ایسا پیسہ لے کر مسجد میں لگانا ہی جائز نہیں، پھر اس کا سود مسجد کے پیسہ سے دینا کب جائز ہوگا؟ کسی مسجد کے منتظمین اگر سودی قرض لے کر تعمیر مسجد میں لگائیں گے تو گنہگار ہوں گے اور اس کا سود اگر مسجد کے پیسے سے دیں گے تو گنہگار بھی ہوں گے اور ان پر ضمان بھی عائد ہوگا، البتہ چونکہ مسجد اسلام کے اعلیٰ شعائر میں سے ہے، اس

لئے اس کی عظمت و اظہار کے پیش نظر مساجد کا عام مکاناتوں سے اعلیٰ و ارفع بنانا افضل و احسن ہے، اس لئے اہل ثروت اور اہل خیر حضرات کو دل کھول کر پاک کمائی سے تعمیر مسجد میں حصہ لینا چاہئے (۱)۔

”انما یعمرو مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر و اقام الصلوٰۃ“ (۲) کی فضیلت حاصل کرنے پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۱۲/۱۴۰۰ھ

مسجد کی تعمیر کے لیے سودی قرض لینا کیسا ہے؟

اگر کسی مسجد کے منتظمین مسجد تعمیر کرنے میں بینک سے سودی قرض لیں اور ادارہ کے حساب سے سود ادا کریں تو شرعی حکم کیا ہوگا؟ اور یہ کہ ایسے منتظمین کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ فقط والسلام

الجواب وبالله التوفیق:

بینک سے سودی قرض لینے کی بغیر سخت مجبوری اور ضرورت کے گنجائش نہیں ہوتی اور مسجد کا پختہ کرنا ضروری نہیں ہے، اس لیے ایسا پیسہ لے کر تعمیر مسجد میں لگانا ہی جائز نہیں، پھر اس کا سود مسجد کے پیسہ سے دینا جائز ہوگا۔ کسی مسجد کے منتظمین اگر سودی قرض لے کر تعمیر مسجد میں لگائیں تو گنہگار ہوں گے اور اس کا سود اگر مسجد کے پیسہ سے دیں گے تو گنہگار بھی ہوں گے اور ان پر ضمان بھی عائد ہوگا۔

البتہ چوں کہ مسجد اسلام کے اعلیٰ شعائر میں سے ہے، اس لیے اس کی عظمت و اظہار کے پیش نظر مساجد کا مکاناتوں سے اعلیٰ و ارفع بنانا افضل و احسن ہے، اس لیے اہل ثروت اور اہل خیر حضرات کو دل کھول کر پاک کمائی سے تعمیر مسجد میں حصہ لینا چاہیے: ”انما یعمرو مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر و اقام الصلوٰۃ“ الخ (۳) کی فضیلت حاصل کرنے

۱- ”اما لو اُلْفِقَ فی ذلک مالا خبیثاً ومالا مسیہ الخبیث والطیب فیکره، لان اللہ تعالیٰ لا یقبل الا الطیب، فیکره تلویث بیه بما لا یقبلہ“ (شرح بزیلیہ۔ رد المحتار علی الدر المختار ۳/۲۳۱ قبل مطلب فی افضل المساجد)۔

۲- ”انما یعمرو مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر و اقام الصلوٰۃ و آتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ فیسى اولئک أن یکولوا من المہتجین“ (سورہ توبہ ۱۸)۔

۳- سورہ توبہ ۱۸۔

پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۱۲/۱۴۰۰ھ

مسجد سے متصل صحن کا حکم:

محلہ میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے، مسجد مذکور سے متصل ایک حجرہ بھی بنا ہے جس میں مؤذن وغیرہ رہتے ہیں، حجرہ مذکور کے سامنے جو صحن فرش ہے وہ مسجد کے صحن اور فرش کے ساتھ ملا ہوا ہے، بعض مرتبہ جب زیادہ لوگ آجاتے ہیں تو جب مسجد کے صحن میں لوگ صف بناتے ہیں تو اس کا سلسلہ حجرہ والے صحن تک چلا جاتا ہے، اب اس میں دریافت یہ کرنا ہے؟

- ۱۔ حجرہ والے صحن کا کیا حکم ہے، وہ مسجد میں داخل مانا جائے گا یا مسجد سے خارج مانا جائے گا؟
- ۲۔ جو لوگ حجرے والے صحن میں نماز پڑھیں گے ان کو بھی مسجد میں پڑھنے والوں کے برابر ثواب ملے گا یا کچھ کم ملے گا۔

س۔ حجرے والے صحن میں مؤذن وغیرہ گرمیوں میں چارپائی بچھا کر سو سکتے ہیں کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

- ۱۔ محض مصلیوں کی زیادتی سے وہاں سلسلہ پہنچ جانے سے اس صحن کو مسجد کا حکم نہ دیں گے جب تک کہ اس کو مستقلاً اور بالاصل مسجد قرار نہ دے لیا جائے۔
- ۲۔ کچھ کم ثواب ملے گا جس طرح دیر سے آنے والے کو پہلے آنے والے کے اعتبار سے کچھ کم ثواب ملتا ہے۔

س۔ جب تک اس صحن کو مستقلاً مسجد قرار نہ دے لیا جائے اس وقت تک کوئی سوء اوہنی نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۷/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد سعید حیدر رحمہ اللہ مفتی دارالعلوم

مسجد کی آمدنی سے مسجد کے حمام کی لکڑی جلانا کیسا ہے؟

۱۔ مسجد کی دوکانوں یا مکانوں کی آمدنی سے مسجد کے حمام کی لکڑی جلائی جاسکتی ہے؟

- ۲- جبکہ کچھ دوکانیں مسجد کی جائیداد میں بنی ہوئی ہیں جو کہ چندہ سے اور مسجد کی دیگر آمدنی سے تعمیر ہوئی ہیں۔
- ۳- کچھ دوکان اور مکان کچھ مرحومین نے مسجد کے کام وقف کر دئے تھے، ان کی بھی آمدنی آتی ہے۔
- ۴- محلے والے بہت غریب ہیں اور تھوڑے کچھ مالدار بھی ہیں۔
- ۵- مگر مالدار اتنے چندہ نہیں دیتے جس سے مسجد کے حمام کی لکڑی پوری ہو جاوے اور عنداشرع کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

لکھی ہوئی پانچوں صورتوں پر نظر کر لی گئی، ان تمام آمدنیوں سے مصلیوں کے لئے پانی گرم کر سکتے ہیں جائز ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی، سید محمود علی عن مفتی دارالعلوم دیوبند

مسجد کی آمدنی دوسرے کاموں میں خرچ کرنا کیسا ہے؟

یہاں کے پنجابتی لوگ شادی گھر کا لڑکا اور لڑکی سے مسجد کے کام سے لڑکے والے سے ایک سو روپیہ اور لڑکی والے سے مسجد کے لئے پندرہ روپیہ لیتے ہیں اور روپیہ مسجد کے فنڈ میں رہتا ہے، اس روپیہ سے مسجد کے لئے کچھ زمین بھی خریدی گئی ہے اس زمین سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ مسجد کے فنڈ میں جمع رہتی ہے اور اسی روپیہ سے مسجد کا تمام کام ہوتا ہے اور پیش امام کو تنخواہ دی جاتی ہے اور گاؤں والے پیش امام کو باری کر کے چار مہینہ میں ایک آدمی ایک دن کھانا کھاتا ہے جس میں غریب اور بیوہ بھی شامل ہیں، اس لئے سال میں ایک مرتبہ مسجد کے دھان اور روپیہ سے کھانا پکا کر تمام پنجابیت کے لوگ بلا فر وخت کئے بانٹ کر کھانا لیکر کھاتے ہیں۔

۱- کیا مسجد کے روپیہ کو گاؤں والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ روپیہ ہمارا ہے ہم دیتے ہیں اس لئے ہمارا حق ہے، ہم مسجد میں خرچ کریں یا جس راستہ میں چاہیں خرچ کر سکتے ہیں، کیا جائز ہے؟

۱- ”مسجدہ مستغلات وأوقاف، أراد المولى ان يتسرى من غلة الوقف للمسجد وهذا أو حصيرا أو حبشا أو اجرا وجسا لفرش المسجد أو حصي قالوا ان ومع الوقف ذالك للقبم وقال: فعلى ما ترى لمصلحة المسجد كان له ان يتسرى للمسجد ما شاء“ (فتاویٰ ہندیہ ۳/۶۱، رشیدیہ پاکستان)۔

- ۲۔ کیا مسجد کے نام کا روپیہ مسجد کو چھوڑ کر دوسرے کسی کام میں لگانا جائز ہے۔
- ۳۔ کیا یہ کہہ کر کہ بیوہ اور غریب لوگ پیش امام کو کھانے کو دیتے ہیں وہ پنچائیت کی طرف سے کچھ پاتے نہیں ہیں، اس لئے انکو خوش رکھنے کے لئے تاکہ وہ پیش امام کو کھانا دیں، اس وجہ سے سال میں ایک دفعہ مسجد کے روپے سے کھانہ پکا کر اس کو فاتحہ دلا کر تمام پنچائیت کے لئے کھانا جائز ہے یا کہ نہیں؟
- ۴۔ مسجد کے روپیہ سے چار مچھلی خرید کر مسجد کے تالاب میں ڈال دیا جائے اور جب مچھلی بڑی ہو جائے تمام پنچائیت اس کو پکا کر کھانا کیسا ہے؟ جو مسجد کے روپے سے مسجد کے تالاب میں ڈالا گیا تھا، یہ فعل کیا جائز ہو سکتا ہے یا کہ نہیں؟
- ۵۔ کیا مسجد کے روپے سے بارہ وفات اور گیارہویں شریف میں مٹھائی منگا کر فاتحہ کرنا اور تمام پنچائیت کا اس مٹھائی کو بلا اجازت کے بانٹ کر کھانا کیسا ہے، کیا جائز یا کہ نہیں؟
- ۶۔ مسجد کے روپیہ سے کسی انجمن یا لائبریری کو یا کسی غریب کو یا مسافر کو یا کسی مدرسہ کو دینا یا کہ مولوی صاحب کا وعظ سنکر اس کو دینا، یا وعظ کے واسطے کسی مولوی صاحب کو اس روپیہ سے دینا یا کہ گاؤں کا راستہ کی مرمت کرنا یا کسی سرکاری پیر کا مزار بنانا یا کہ عید گاہ بنانا یا کہ گاؤں کے پانی کے لئے کنواں کھودوانا وغیرہ یہ تمام کام مسجد کے روپیہ سے کرنا کیسا ہے؟
- ۷۔ مسجد کے روپے سے پیش امام کو تنخواہ دینا کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

اپنی جو رقم یا جو چیز مسجد کو دیدی جاتی ہے وہ مسجد کی ہو جاتی ہے، اب اس کا استعمال کسی اور جگہ میں جائز نہیں رہتا ہے، خود دینے والے کو بھی دینے کے بعد یہ اختیار نہیں رہتا ہے تو دوسروں کا کیا شمار، اب وہ چیزیں مسجد پر وقف اور اللہ تعالیٰ کی ملکیت خاصہ ہو جاتی ہیں (۱) اب اپنی مملوک چیز جیسا معاملہ اسکے ساتھ کرنا سخت گناہ اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث ہوتا ہے اس لئے ان تمام سوالات کا جواب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں غلط اور ناجائز ہو رہی ہیں، بجائے ثواب الٹا گناہ ہوگا، دنیا میں بھی اس کا وبال پڑنے کا ڈر ہے۔

۱۔ ”أما تعريفه إلى قوله: وعندهما حبس العين على حكم ملك الله تعالى على وجه يعود منفعه إلى العباد فيلزم ولا يباع ولا يوهب ولا يورث كذا في البداية، وفي العيون والجملة: ان الفتوى على قولهما كذا في شرح الشيخ أبي المكارم للفقاية“ (ہنگیری ۲/ ۵۰۳، رشیدیہ پاکستان)۔

۷۔ امام مسجد کو تنخواہ دینا یہ مسجد ہی کا کام ہے جائز ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

توسیع کی غرض سے مسجد کے متصل قبرستان اور حجرہ کو مسجد میں شامل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

مسجد کے دائیں جانب ایک حجرہ ہے اور بائیں جانب کچھ جگہ پڑی ہوئی ہے، جس میں دو قبریں ہیں، ایک تو بوسیدہ ہو رہی ہے اور دوسری صحیح ہے اور مسجد کے اندر کی جانب دوضف ہو جاتی ہے، لیکن سردی کی وجہ سے نمازی رمضان شریف میں کافی ہو جاتے ہیں، جو لوگ باہر رہ جاتے ہیں وہ بہت کم ہیں، جو قرآن سنتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اور دن میں تو ہم فرض و سنت پڑھ کر چلے جاتے ہیں تھوڑا کام لگتا ہے مگر رمضان شریف میں اتنی دیر سردی میں کھڑا نہیں ہو جاتا ہے، خیال یہ ہے کہ اگر آپ صاحب الہ بات کی اجازت دیں کہ دائیں جانب کا حجرہ جو مسجد سے ملا ہوا ہے اس کو مسجد میں ملا لیا جاوے اور بائیں جانب جو جگہ ہے اس کو بھی ملا لیا جاوے مسجد قبرستان میں ہے، لیکن آبادی زیادہ ہونے کے بعد شہر میں ہو گئی ہے، اس قبرستان میں دفن اموات بھی اب بند ہو گئیں ہیں، پچاس ساٹھ سال قبل دفن ہوتے تھے۔

الجواب وبالله التوفیق:

مسئلہ یہ ہے کہ جب قبریں بہت پرانی اور بوسیدہ ہو جائیں اگرچہ بالکل بے نشان نہ ہوئی ہوں جب بھی اس کو برآمد کے نشان مٹا کر مسجد بنا سکتے ہیں اور جب پچاس سال سے زائد سے وہاں مردے دفن نہیں ہوتے بلکہ آبادی بڑھنے سے وہ قبرستان آبادی میں آگیا ہے تو اگر اس قبرستان کی زمین موقوف بھی ہو جب بھی اس پر مسجد بنالیا منشا واقف کے خلاف ظاہر و متبادر نہ ہوگا، اور حجرہ تو بظاہر متعلق مسجد ہی ہے، لہذا ایسی صورت میں جب مسجد میں تنگی ہے اور توسیع کی ضرورت ہے تو نشانات قبر مٹا کر مسجد کے دونوں جانب توسیع کر سکتے ہیں (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱ شعبان ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عہد

۱۔ "لا نصح الإجارة الى قوله: ولا لأجل الطاعات مثل الأذان، والحج، والإمامة وتعليم القرآن، والفقه، ونفسي اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والإمامة والأذان" (الدر المختار علی الرد ۵/۶۶، مختارہ)۔

۲۔ "وضعه مسجداء، الماروى ان مسجد النبي كان قبل مقبرة للمشركين فبنت كذا في الوقعات" (رد المحتار ۸/۸۳۵، مطلب في دفن الميت)۔

مال حرام سے بنی ہوئی مسجد کا حکم:

مسجد کی تعمیر مال طیب اور حلال سے ہوئی چاہے مال خبیث اور حرام سے نہیں سوال یہ ہے کہ ایک مسجد مال خبیث اور طیب دونوں سے ملا کر بنی، ایسی مسجد میں نماز مقبول ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا رشید صاحب گنگوہی مکر وہ تحریری کہتے ہیں اور اعادہ ایسی نماز کا واجب ہے یا نہیں اور ایسی مسجد کا شہید کر دینا شعار اسلام کی وجہ سے باطل ہوگا اور دوسری نئی مسجد کی تعمیر لوگوں کے لئے شاق اور تکلیف مالا یتلاق سے کم نہیں، اب نماز کی اصلاح کے لئے ایسا کیا جائے کہ جولاگت یا خرچ مال خبیث اس مسجد میں لگا ہے صحیح حساب کر کے اپنی پاک اور حلال کمائی کے اتنی رقم یا تو مالک تک اور عدم رسائی میں کل رقم غرباء و مساکین ہی میں تقسیم کر دیا جائے کہ مجبوری کے وقت یہی حکم ہے کیا ایسا کرنا درست ہوگا اور اس تبدل موال الخبیثہ باموال الطیبہ کے بعد مسجد میں نماز بلا کر اہیت درست ہونے لگے گی یا نہیں، اور اب یہ اور مسجدوں کی طرح اس علی التوفیقی کی مصداق ہوگی یا کہ نہیں جو مسجد مال خبیث سے بنائی گئی ہے اس میں نماز مکر وہ تحریری ہے، جیسا کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے، اب اگر ایسی مسجد میں نماز پڑھنے کا سابقہ پڑ جائے یا جماعت ہی کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہو جائے تو ایسی مسجد سے گھر کی نماز با جماعت اول ہوگی یا نہیں؟ مسکوں کا جواب محققانہ ہو۔

الجواب وبالله التوفیق:

کوئی مسجد اگر محض خبیث مال سے بنی ہو تو اس کا حکم اور ہے اور اگر خبیث اور طیب دونوں سے ملکر بنی ہو تو اس کا حکم اور ہے اور پھر ہر حکم میں تفصیل ہے جو صورت واقع ہوئی ہو اسی کو دریا فت فرما دینے، ہاں اتنا سن لیجئے کہ اگر طیب و پاکیزہ مال بھی اس میں لگا ہوا اور نصف سے زائد لگا ہے تو اس میں نماز جائز ہوگی، اس طرح خبیث مال سے مراد اگر یہ ہے کہ خباثت محض معاملہ میں ہے حاصل شدہ مال میں نہیں ہے تو اس صورت میں بھی نماز جائز ہے گو بطریق خبیث حاصل ہونے کی وجہ سے اس کو بھی خبیث کہیں ماصرح بہ اللہ ہاء، باقی تطہیر و اصلاح کا طریقہ جو آپ نے لکھا ہے وہ صحیح نہیں، اس لئے کہ اگر وہ باقی ہیں تو نہ اس کا عوض دے اور نہ اس کو بعینہ تصدق کرے بلکہ اس میں خرچ شدہ حرام رقم کی مقدار اپنا دوسرا پاک و طیب مال اس کے عوض میں تصدق کرے جب بھی مفید مطلب نہیں اور تطہیر اس مسجد کی نہ ہوگی کیونکہ خبیث و حرام شئی بعینہ اب تک موجود ہے اور خبیث و حرام شئی جب تک بعینہ موجود ہو اس کا حکم فقط یہ ہے کہ یا تو اس شئی کو اس کے جائز مالک کے پاس واپس کر دیا جائے اور یہاں ممکن ہو تو خود اس شئی کو اپنی ملک سے نکال کر فقراء کو دیدے اور تصدق کر دے اور یہاں یہ دونوں نہیں ہوا اور نہ ممکن ہی

ہے جیسا کہ آپ خود اس کو تسلیم کر رہے ہیں، اس طرح دوسرے لوگ جو اپنے طور پر کریں گے اس سے بھی اس خبیث و حرام شئی کا تصدق نہ ہوگا بلکہ وہ معینہ غلی حالہ میں جو رہے گی پس اگر تطہیر و اصلاح واجب ہی ہو تو اس طرح کر لیں کہ اس مسجد کو ہٹا کر پھر سے جدید تعمیر جائز و حایل مال سے کر کے اس میں نماز پڑھیں (۱)، یہ صورت بالخصوص ہمارے دیار میں فی زمانہ بالکل جائز ہوگی اور اس کے علاوہ بھی حدود و ضوابط میں داخل ہو کر بابت صلاۃ کے لئے کافی ہو جائے گی و ہوا لہر ادا اور نماز پڑھنے کے لئے پختہ و ریختہ ہی عمارت ہونا ضروری نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد سعید محمود علی عین مفتی دارالعلوم دیوبند

اور جواز نماز بلا کر اہیت کے لئے یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ صرف فرش اکھڑا دیا جائے اور جائز و حایل آمدنی سے دوسرے فرش بنوایا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۱/۸/۱۳۸۵ھ

مسجد کی آمدنی کو دوسرے کار خیر میں خرچ کرنا درست ہے یا نہیں؟

۱- مسجد کی آمدنی سے مصلیوں کی دینی کتابیں مثلاً قرآن، حدیث، رسالہ دینیات یا وہ کتابیں جو دین کا علم سکھانے میں مدد و معاون ہوں خریدنا درست ہے یا نہیں، جبکہ مسجد کی آمدنی کے سارے اثراجات کو بدرجہ اتم پورا کر کے کافی مقدار میں بچی رہتی ہے، اسی طرح اگر مسجد کی آمدنی میں کشائش گنجائش ہو تو اس سے ایک چھوٹے مکتب کی بناؤ انا جو مصلیوں کو علم سکھانے کے مقصد سے کھولا جائے گا یا اس آمدنی سے ایسے معلمین کی تنخواہ دینا جو مصلیوں کو ضروری مسائل سے واقف کراتے ہیں یا وعظ و نصیحت سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے رہتے ہیں جائز ہوگا یا کہ نہیں، مسجد میں آمدنی کا ذریعہ ایک تو آراضی موقوفہ مسجد سے ہے، دوسری موقوفہ قاعوام اناس کی اعانت ہے، دونوں کا حکم یکساں ہے یا کچھ فرق ہے؟

۲- ایک مسجد کی تعمیر آراضی موقوفہ للمسجد اور عام لوگوں کی اعانت سے ہوئی، مسجد مکمل ہو جانے کے بعد مسجد کی

۱- ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من تصدق بعدل تمرة من کسب طیب ولا یقبل اللہ الا الطیب“ مشکوٰۃ ص ۶۷ باب فضل الصدقة۔

آراضی موقوفہ سے برہنہ ہوتی آمدنی دیکھ کر لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ اپنے موقوفہ روپیوں کو جو مسجد میں لگایا ہے مسجد کی آمدنی سے وضع کر لیں اور ان روپیوں سے دوسرے کار خیر مدرسہ وغیرہ کی اعانت کریں، ظاہر ہے کہ موقوفہ جائداد میں تصرف بالکل روا نہیں لیکن یہاں جبکہ مسجد کی زمین کی آمدنی وسیع پیمانہ پر مسجد کے جملہ مصارف پورا کر کے بچی رہتی ہے، اس سے لوگ اپنے موقوفہ روپیوں کی تبدیل چاہتے ہیں اور مقصد خدمت خلق و رعایہ پروری ہے اس کی پوری تحقیق فرمادیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

۱- اس میں سب مانع ہے جب کوئی چیز مسجد کی ہو جاتی ہے خواہ وقف سے یا عطاء سے از قبیل عروض و مال ہو یا نقد کسی حال میں بھی اس کو مسجد کی ملک سے نکالنا کسی دوسرے مصرف میں پیش کرنا خود وقف کو بھی جائز نہیں پھر دوسرے کا کیا شمار ہوگا؟

۲- بالکل جائز نہیں کما مر آنفاً اگر لوگوں کو زیادہ شوق ہو یا زیادہ ضرورت ہو تو اپنے مملوک اموال سے کریں مسجد کی آمدنی یا مال سے ہرگز نہ کرے، مدرسہ خواہ دینی ہو یا دنیوی کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۸/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود علی عند

غصب شدہ زمین میں مسجد بنانے اور نماز پڑھنے کا حکم:

ایک مسجد میں اس کے حقیقی و واقعی رقبہ سے جو سرکاری کاغذات میں درج ہے زیادہ زمین بجز بحیثیت غصب شامل کر لی جائے اور اس غصب شدہ اراضی میں مسجد کی آمدنی بذریعہ دوکانات بڑھائی جاوے یا غلہ خانہ اور حمام یا دارالوضوء بنایا جائے، آراضی غصب شدہ خواہ کسی کی ملک ہو یا کسی کے حق آسائش یا راستے کی ہو ایسا کرنے والے حضرات کا کیا حشر ہے اور اس مسجد میں نماز پڑھنے کا کیا نتیجہ ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

کسی مسجد میں کسی دوسرے شخص کی زمین غصب کے طور پر لیکر شامل کرنا جائز نہیں، اگر غصب کے ذریعہ کوئی زمین حاصل کی جائے اور مالک زمین رضامند نہ ہو تو اس کا استعمال کرنا اور اس پر نماز پڑھنا کچھ بھی جائز نہ ہوگا نوٹ: لیکن اگر کسی

کے ارض مقصود میں نماز پڑھ لی تو درست ہو جائے گی (۱) ایسا شخص عند اللہ سخت مجرم اور باعث غضب خداوندی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۸/۱۳۸۵ھ

مسجد میں نکاح کا سہرا پڑھنا:

مسجد میں سہرا نکاح کے موقع پر پڑھنا جائز ہے یا کہ نہیں جواب مکمل تحریر فرماویں۔

الجواب وبالله التوفیق:

مسجد کی بناء جماعت کے لئے ہوئی ہے اور معصیت کا مسجد میں کرنا مطلقاً ممنوع ہے، اب اگر کوئی ایسے امر کے لئے مسجد میں جائے جو نہ طاعت ہے نہ معصیت بلکہ مباح ہے تو اس لئے خاص مسجد میں جانا مکروہ ہے، لیکن پہلے سے وہ شخص مسجد میں حاضر ہے اور اتفاقاً اس مباح کی حاجت پیش آگئی ہے اور اس کی نیت سے مسجد میں نہیں گیا تھا، بلکہ کسی طاعت کے لئے آگیا تھا اور وہاں اس مباح میں بھی اشتغال ہو گیا، تو بشرط عدم اکثار جائز ہے۔

لہذا صورت مسئلہ میں اگر سہرا صد و شرعیہ کے اندر اور بغرض سہرا مسجد میں نہیں گیا ہے اور سادگی کے ساتھ اسکو پڑھتا بھی ہے، اس کے اندر ایسا ترنم نہ ہو جو گانے کے قریب ہو جاوے کہ حاضرین اس سے لذت محسوس کرنے لگیں، ان قیود کے بعد پڑھنے کی اجازت ہوگی، لیکن نہ پڑھنا اولیٰ ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۸/۱۳۸۵ھ

چھوٹے سے محلہ میں دو مسجد کی بنیاد ڈالی تو کیا حکم ہے؟

تیسرہ گھر کا ایک چھوٹا سا موضع ہے جس میں ایک مسجد بھی تھی، عوام کی بے توجہی سے وہ مسجد منہدم ہوگئی، بعد میں رائے عامہ سے ایک کشادہ جگہ میں نیو ڈالی گئی جب مسجد کی دیوار کچھ اونچی ہوئی تو پھر لوگوں کی اڈے میں تبدیل پیدا ہوگئی اور تیسری جگہ مسجد کا بنانا طے ہوا اور اس تیسری جگہ بھی نیو کھودی گئی اور کچھ رقم بھی بطور چندہ اکٹھا کی گئی اور دوسری مسجد جس کی

۱- ”وفی شرح المبیة للحلی: بنی مسجد فی ارض غصب لا یأمن بالصلوة فیہ“ (رد المحتار ۱/ ۳۵۳، عتائے)۔

دیوار کچھ بلند ہو چکی ہے اس میں قدرے سامان موجود ہے اب محلہ مذکورہ کے لوگ متفق ہو کر یہ چاہتے ہیں کہ صرف ایک مسجد کا بنانا از روئے شریعت جائز ہوتا اور ایک مسجد کا سامان دوسری مسجد پر لگانا ہوتا تو بہتر تھا۔ جواب میں سارے مقامی علماء نے انکار کر دیا یہ جواب پا کر محلہ والوں نے ہر ایک مسجد کا بنانا بند کر دیا ہے بس ایک مسجد بنانا چاہتے ہیں تو ایسی صورت میں صرف ایک مسجد بنانا جائز ہو سکتا ہے اور نمازی مشکل سے محلہ مذکورہ میں پانچ چھ ۶ ہوں گے، نیز ایک مسجد کی اذان کافی ہو سکتی ہے یا کہ نہیں، یا ہر ایک میں اذان دینا ضروری ہے، یوں ہی نماز صرف ایک مسجد میں جماعت سے ادا کی جاتی ہے، باقی دو جگہیں ترک کر دی جائیں کیا قیاحت لازم آئے گی اگر ان تین سے ایک کو جامع مسجد قرار دیا جائے درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

مقامی علماء کا انکار کرنا درست اور صحیح ہے ایک مسجد کا سامان وغیرہ دوسری مسجد میں لگانا جائز نہیں ہے ”وفی رد المحتار (ج ۳/ ۵۷۴) قول أبی یوسف إنه لا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر“، اور جو جگہ ایک مرتبہ مسجد کے لئے متعین کر دی جائے وہ الی یوم القیامۃ مسجد ہی رہتی ہے لہذا بہتر طریقہ یہ ہے کہ پہلی مسجد جو لوگوں کی بے توجہی کی وجہ سے سمار ہو چکی ہے اسے الاول فالاول کے اصول کے تحت تعمیر کر لی جائے اور باقی دونوں کی پوری حفاظت کی جائے اب اگر کوئی مسجد اس مسجد کے سامان وغیرہ سے مستغنی ہو تو اس سامان وغیرہ کو دوسری مسجد میں لگانا جائز اور درست ہے۔ ”وفی رد المحتار (ج ۳/ ۵۷۴) قال الزیلعی وعلی هذا حصیر المسجد وحشیشہ إذا استغنی عنہما - إلى قوله - ینقل الی مسجد آخر“ (۱) لہذا صورت مسئلہ میں ان دونوں نامکمل مسجدوں کا چندہ وغیرہ اول مسجد میں لگانا درست و صحیح ہے۔

اور اگر پہلی مسجد آبادی سے دور یا کنارے واقع ہو تو جو مسجد بھی قریب ہو اس کی تعمیر کی جاوے اور بقیہ کی حفاظت کی جاوے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

صحن مسجد میں وضو خانہ کا حکم:

مسجد کے آداب کے مطابق مسجد میں کلی کرنا، وضو کرنا درست نہیں ہے، ہمارے یہاں کی مسجد میں صحن ہے جو مسجد میں ہی شمار ہوتا ہے اس صحن میں جنوب کی دیوار میں ایک موری بنا رکھا ہے اور اسی موری کے سہارے صحن میں ایک پتھر مشرق سے مغرب کی لمبائی میں بچھا ہوا ہے، برائے مہربانی اس پتھر کا بچھا مسجد کے صحن میں درست ہے یا کہ نہیں اور اس پر نماز پڑھنا، وضو کرنا یا وہاں کلی کرنا درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

وضو خانہ کا نقشہ منسلک دیکھا اسکا حکم شرعی یہ ہے کہ مسجد تعمیر ہوتے وقت میں اس جگہ کو وضو خانہ کی نیت سے تعمیر کیا ہے جب تو بلا تکلف وہاں وضو جائز ہے، اور مسجد کی تعمیر میں وہاں وضو کی نیت نہیں تھی بلکہ مسجد کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد مسجد سے خارج کر کے وہاں وضو کرنا شروع کیا گیا تو یہ درست نہیں ہے (۱) موری کا وہاں بنا ہوا ہونا پتھر وہاں ایک لمبا پتھر بچھا ہوا ہونا جو خاص وضو کے لئے ہے یہ سب اس بات کا قرینہ ہے کہ بانی مسجد کے ذہن میں وہ جگہ وضو خانہ ہی کے لئے ہے، البتہ اہل مسجد کے متصل ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ سب عمل بوقت تعمیر کے ہیں غرض بانی مسجد سے تحقیق و انفع کر کے پھر حکم مذکورہ دونوں شقوں میں سے جو ہو منطبق کر لیا جاوے علی الاطلاق کوئی بات یا تکیر نہ کی جاوے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۹/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید ابن مفتی دارالعلوم دیوبند

مسجد کا سامان منتقل کرنا کیسا ہے؟

جنگڑے کے سبب بستی کے مسلمان دلفریق ہو گئے ہیں، ایک فریق کو ہندوؤں نے مشورہ دیا کہ ہم چندہ دیں گے تو دوسری مسجد بناؤ اور پہلی مسجد میں نماز پڑھنا چھوڑ دو، چنانچہ ایسا ہی ہوا دوسری مسجد تیار ہو گئی اور چندہ مینے اس میں نماز بھی پڑھی گئی ہے اس کے بعد اختلاف دور ہوا تو پہلی ہی مسجد میں نماز پڑھنے لگے اور دوسری مسجد میں تالا ڈالا کہ دوسری مسجد جو ہندو مسلم کے چندہ سے تیار ہوئی ہے اس کا سامان منتقل کرنا کیسا ہے۔

۱- "لأن المسجد لا يخرج عن المسجد أبداً" (ثانی حدیث علی الدرر ۶/۷۷، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

الجواب وبالله التوفیق:

جب مسجد بن گئی تو اب وہ مسجد ہی ہے اور رہے گی اس میں تالا لگانا جائز نہیں ہے (۱)، اس کو آبا درکھنا چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۲/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

مسجد میں استنجا خانہ بنانا:

قریب تین ہفتہ ہوا ہے کہ سلسلہ روزگار میر اسٹروپلی کا ہوا اور صدر بازار میں مال خریدنے کی غرض سے ٹھہرا، صدر بازار میں ایک مسجد ہے جو بڑی ہے، ہزاروں آدمیوں کی نماز پڑھنے کی جگہ ہے، نمازی زیادہ بیوپاری ہوتے ہیں، قریب قریب دو سو آدمی ہو جایا کرتے ہیں، میر اقیام دور و نزدیک ہر نماز کی جماعت میں شرکت کا ہوا، اسی مسجد میں لیکن اتنی بڑی مسجد میں استنجا خانہ کے لئے باہر جانا پڑتا ہے ہر کاری پاخانہ ہے جو مسجد سے کچھ دور ہے قریب قریب ایک سو قدم پر ہے، وہاں ڈھیلے رکھے ہوئے ہیں ان سے صاف کر لیجئے پھر طہارت آ کر غسل خانہ میں کر لیجئے، میں نے کہا کہ اس کو کسی عالم یا مولوی سے معلوم کرو۔ دریافت ہے کہ کیا مسجد میں استنجا خانہ بنانا ضروری نہیں ہے جبکہ جگہ موجود ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

مسجد کے قریب مصلیوں کے لئے استنجا خانہ بنانا شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ بہتر ہے، دہلی میں اس کا رواج اس لئے متروک ہے کہ استنجا خانہ کو پاخانہ بنا ڈالتے ہیں اور گندہ رکھتے ہیں اور منتظمین مسجد قابو پانے سے عاجز رہتے ہیں، اس لئے منتظم لوگوں نے یہ سلسلہ ہی ختم کر دیا۔ خود وہاں کے لوگوں سے ایسا ہی سننے میں آیا ہے ورنہ شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۲/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی احمدی مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "لأن المسجد لا يخرج عن المسجعية أبداً" (رد المحتار علی الدرر ۶/۱، ۵۷، مکتبہ زکریا دیوبند)، "اعمال و خدمت المسجعية ثم أراد البناء منع" (رد المحتار علی الدرر ۶/۱، ۵۳، مکتبہ زکریا)۔

جہاں استنجا خانہ بنانے سے مسجد کی بے حرمتی ہو، وہیں استنجا خانہ بنانے کا حکم:

ایک مسجد ہے جو پہلے ایک درجہ تھی اب قریب دو سال کے ہوتا ہے کہ دو درجہ ہو گئی ہے، اس مسجد میں استنجا خانہ پہلے سے موجود تھا، اس کا راستہ پہلے مسجد کے باہر سے عام راستہ پر تھا کہ عرصہ سات سال کا ہوا اس کا راستہ باہر سے بند کر کے مسجد کے اندر سے بنادیا گیا ہے، کیونکہ باہر سے استنجا خانہ کا راستہ رہنے سے مسجد کی بے حرمتی ہوتی تھی اور گناہ ہوتا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسجد کے سامنے ایک اسکول ہے اس کے عام راستہ پر رہنے سے ہر مذہب کے لوگ استنجا کرتے تھے اور مثلاً کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، قبلہ رو ہو کر پیشاب کرنا، اب لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے، لہذا ایک استنجا خانہ اور بنایا گیا جو پہلا استنجا خانہ تھا اس کی چھت پر بنایا گیا ہے، اس کا راستہ باہر سے آسکتا ہے تو ایسا کرنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

وہی پہلے والا استنجا خانہ پھر باہر سے کھولنے میں مسجد کی بے حرمتی حسب سابق لوٹنے کا خطرہ نہ ہو تو کھولا جاوے ورنہ نہیں، بے حرمتی سے حفاظت واجب ہے (۱)۔

البتہ استنجا خانہ کی چھت پر جہاں غسل خانہ بنا ہوا تھا اگر وہاں استنجا خانہ بنانے پر مسجد کی بے حرمتی نہ ہوتی ہو تو وہاں بھی بنا سکتے ہیں، اسی طرح مسجد سے باہر قریب تر جگہ میں جہاں بھی استنجا خانہ بنانے سے کام چل جاوے اور مسجد کی بے حرمتی سے محفوظ رہے، بنا سکتے ہیں، الغرض استنجا خانہ بنانا محض اپنی اور مصلیوں کی سہولت کے لئے ہے بذات خود واجب نہیں ہے اور نہ مقصود اصلی ہے اور مسجد کی حفاظت اور مسجد کا بے حرمتی سے بچانا واجب اور مقصود اصلی میں ہے، لہذا یہ مقدم رکھا جاوے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۹/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسجد کی اینٹ مدرسہ میں یا مدرسہ کی مسجد میں لگی تو کیا حکم ہے؟

ہمارے یہاں پر ایک ہی ساتھ مسجد اور مدرسہ اور حجرہ بیتوں عمارتیں شہید کی گئیں اور اس کے بعد تعمیر کی گئی، اب

۱- ”فکان فی جعلہ مسجداً ضرورۃ بخلاف جعل المسجد طریقاً“ (رد المحتار علی الدرر ۶/۵۷۶، مکتبہ زکریا)۔

چونکہ یہ قریب قریب ہیں ان کے شہید کرنے کے وقت کا صحیح اندازہ کسی صاحب کو نہیں ہے کہ مسجد کی اینٹ یا سامان مدرسہ میں لگایا مدرسہ کا مسجد میں لگا اور ایک آدمی کہتا ہے کہ لگا نہیں ہے جو یہ کہتا ہے کہ مدرسہ کی اینٹ لگی ہے لیکن کتنی مقدار میں لگی ہے ہم کو یہ دھیان نہیں ہے، اب اس کا کیا ہونا چاہئے؟

الجواب وبالله التوفیق:

جو لوگ اس تعمیر کے کارکنان تھے وہ لوگ ذمہ دار ہیں آپ لوگوں پر کوئی گناہ نہیں ہے، بے فکر مسجد میں نماز پڑھیں، کارکنان کو چاہئے کہ اندازہ کر کے جتنا سامان ادھر کا ادھر لگا ہوا اس کا تاوان وہ خود دیں اگر نہ دیں گے تو خدا کے یہاں پکڑے جائیں گے (۱) آپ لوگوں سے مطلب نہیں ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پور ۲۳/۱۰/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عزمہ سید احمد علی سعید

مسجد میں دی ہوئی چیزیں واپس لینا:

زید کی بستی جس کی آبادی بہت مختصر ہے تقریباً ۵۵ گھر مسلمان رہتے ہیں، یہاں ایک ہی مسجد ہے، نمازیوں کی تعداد بہت مختصر ہے کبھی نماز کی جماعت ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی ہے، ایسی صورت میں بکر اور زید میں نزاع ہو گیا ہے، لہذا بکر نے عید کی نماز مسجد کے تین گز کے فاصلہ پر علیحدہ پڑھی اور بکر نے کچھ مصلیٰ اور دری مسجد میں دیا تھا اور کچھ اینٹ بھی، اب وہ اپنی چیزیں واپس کرنا چاہتا ہے اور دوسری مسجد بنانے کو تیار ہے اس کے لئے عند اللزوم کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

مسجد میں دی ہوئی اینٹ وغیرہ اگرچہ جب تک خرچ نہ ہو چکی ہوں دینے والا واپس لے سکتا ہے، لیکن صورت مسئلہ میں بکر کے یہ افعال کسی طرح صحیح نہیں، اگر واقعات ایسے ہی ہیں جیسا کہ سول میں مذکور ہے تو بکر کو فوراً باز آنا چاہئے

۱- ”ولا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه أولا وهو الفتاوى“ (رد المحتار علی الدرر ۱/۵۳۸، مکتبہ زکریا، مطلب فیما لو خرج المسجد أو غيره)۔

اور ہرگز اختلاف نہیں کرنا چاہئے بل جل کر رہنا اور کام کرنا ضروری ہے، ورنہ ساری خرابیوں کا وبال اس پر پڑے گا۔ فقط واللہ
اعلم بالصواب

جواب صحیح ہے: ایسے چھوٹے گاؤں میں نماز عید درست نہیں ہے۔ محمود عثمانی عنہ۔

دوسری مسجد کی تعمیر کے بعد پرانی مسجد کا حکم:

ایک گاؤں میں پہلے ایک ہی مسجد تھی، بعد میں نمازی زیادہ ہونے کی وجہ سے گاؤں والوں نے مشورہ کر کے
دوسرے محلہ میں اس مسجد کو منتقل کر دیا، واضح رہے کہ کو پرانی مسجد باقی نہیں ہے لیکن جگہ مجدد باقی ہے اور اس جگہ ہر سال نماز
عیدین پڑھی جاتی ہے ایسے گاؤں کے آدمیوں میں کسی بات پر نزاع ہو گیا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ پرانی مسجد کے محلہ والے اس کو
آباد کرنا چاہتے ہیں، دریافت کیا اس پرانی مسجد کی جگہ پر پھر مسجد قائم ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

مسجد جب ایک مرتبہ مسجد ہو جاتی ہے قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے (۱)، اس کو ویران یا ترک نہیں کرنا چاہئے دونوں
مسجدوں کو نماز پڑھنا نہ سے آباد کرنا چاہئے۔ تنازع البتہ نہایت بری چیز ہے (۲)، اس کو جہاں تک جلد ہو سکے ختم کر دینا
چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود عثمانی عنہ

مسجد کے صحن کے کچھ حصہ پر مسجد کی آمدنی کی خاطر دوکان کی تعمیر:

مسجد کے لیے پورب کی طرف لب روڈ کچھ دوکانیں تعمیر کرانے کا پروگرام ہے، دوکانوں کے لیے اندر کی موجودہ

۱- "ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجدا عند الامام والعالی ابداً إلى قیام الساعة وبه
یفی" (الدر المختار ۳/۷۱۳)۔

۲- "والفسدة اخذ من القفل" (سورة یوسف ۱۹۱)۔

زمین حساب سے کچھ کم پر رہی ہے، مسجد کا موجود فرش جو بعد میں بڑھایا گیا ہے، اگر اس فرش کی تین فٹ زمین دوکانوں میں شامل کر لی جائے تو دوکانیں اچھی اور زیادہ کارآمد ہوں گی، مسجد کے مفاد کی خاطر کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

فرش کا جو حصہ اگرچہ ضرورتاً مسجد میں داخل کر لیا گیا اور مسجد قرار دیا گیا، تو وہ مسجد ہی کے حکم میں ہو گیا، اب اس میں سے ایک آدھ فٹ بھی دوکانوں کے لیے نہ لیا جائے، چاہے یہ لیما مسجد کے مفاد میں ہی کیوں نہ ہو، جائز نہ ہوگا، بلکہ فی الرد فی الدر وغیرہ (۱)، دوکانیں کشادہ نہ ہونے سے یا کہ آمدنی نہ ہونے سے یا بالکل دوکانوں کی تعمیر نہ کرنے میں بھی کوئی گناہ نہ ہوگا، اور اجزاء مسجد لے لینے میں سخت گناہ ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسجد کے چندہ سے دوکان و استنج خانہ کی تعمیر:

مسجد کے چندہ سے مسجد کے لیے دوکان، پیشاب خانہ اور غسل خانہ وغیرہ ضروریات کی تعمیر درست ہے یا نہیں؟ جواب کا شدید انتظار ہے۔

الطاف الرحمن (اعظم گڑھ)

الجواب وبالله التوفیق:

مسجد کے چندہ سے ان مذکورہ تمام ضروریات کی تعمیر درست ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۲/۱۴۰۱ھ

ایک سنوی موقوفہ زمین کے متعلق استفتاء:

ملک آسام میں جو لوگ بودوباش کرتے ہیں، وہاں تین قسم کی زمینیں ہیں:

۱- ایک سنوی یا یکسنیہ، ۲- میعاد، ۳- توجیح۔ تینوں کی تفصیل منسلک مسودات میں دی گئی ہے۔ مجتوٰت عنہا پہلی قسم

۱- ”کما جاز جعل الإمام الطريق مسجداً لأعکسہ“ الدر المختار علی حاشی ۸۳/۳ کتاب الوقف (مرتب)۔

کی زمین ہے۔

چونکہ مسجد، قبرستان، عید گاہ، درس گاہ ایسی زمینوں میں ہیں اور کروڑوں ہیکھے زمین ایسے اداروں کے لیے وقف ہیں، سرکار کی طرف سے وقف نامہ کی رجسٹری بھی ہوتی ہے، سلفاً خلفاً وقف قائم پر عمل اتمراری بھی ہے، اس کے خلاف آج تک کوئی فتویٰ نہیں ہے کہ ایسی زمینوں میں وقف صحیح نہیں۔

ایک شخص نے ایک زمین مسجد کی خاطر وقف کی تھی، پھر کسی وجہ سے اس کی وفات کے بعد اس کے وارث نے یہ زمین واپس لینی چاہی، حالانکہ حکومت کی طرف سے یہ زمین ”امباری لاجیت تیار پورب مسجد“ کے لیے وقف نامہ کی رجسٹریشن حاصل کر چکی تھی، اس کی آمدنی پندرہ سال تک اس مسجد میں لگ چکی تھی، اب مسئلہ کھڑا ہوا کہ یہ زمین واپس لے سکتا ہے یا وقف ثابت ہو تو واپس نہیں لے سکتا، ورنہ لے سکتا ہے۔

بعض فقہاء کرام نے فتویٰ صادر فرمایا کہ وقف ثابت ہونے کے لیے ملک بات واقف کی ہونا ضروری ہے اور ایکسٹنوی زمین میں ملک بات حاصل نہیں۔

دوسرے گروہ نے وقف ثابت ہونے کا حکم دیدیا اور کہا کہ ملک بات ایک سنوی زمین پر بھی حاصل ہے اور استدلال میں ثامی کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں: ”إن الواقف لأرض من الأراضي لا یخلو إما یكون مالکاً لها من الأصل بأن كان من أهلها حين یمن الإمام علی أهلها، فإن كان الأول فلا فی صحة وقفه لوجود ملكه الخ وإن وصلت إلى یدہ یأقطع السلطان إياها له، أو بشراء من بیت المال، فإن كان الأول فإن كانت موافقا أو ملكا للسلطان صح وقفها الخ“ (۱)۔

ایک سنوی زمین ان دونوں قسم کے اندر داخل ہے، ہند میں وقف صحیح ہے، اتنی

امید ہے کہ تمام دستاویزات پر نظر غائر توجہ مبذول فرما کر ایک محقق اور مدلل جواب عنایت فرمائیں گے۔

عبدالرحمن (قاضی شریعت ہو جائی ضلع جیت، آرام)

الجواب وبالله التوفیق:

حسب تحریر سوال جب ایک سنوی زمین میں کروڑوں ہیکھے زمین دینی اداروں کے لیے وقف ہیں تو ظاہر ہے کہ

ان اداروں کے اعتبار سے سیکھروں مسجدیں بھی بنی ہوں گی اور سب کا وقف ہونا شرعاً مسلم ہے، اسی طرح بیسیوں سے زائد قبرستان بھی موقوفہ ہوں گے اور ان کا بھی وقف ہونا ظاہر ہے اور شروع سے یہ معمول چلا آ رہا ہے اور حکومت نے کبھی کوئی ایکشن نہیں لیا تو حکومت کی جانب سے ان امور کا یہ اذن حالی ہوا جو شروع ہی سے وجود ملکیت کا قرینہ بنا۔

پھر جب ان اوقاف کا اور ایسی زمینوں کے بیچ و شراء کار رجسٹریشن بھی برآمد ہونا چلا آ رہا ہے، حالانکہ رجسٹریشن کا محکمہ حکومت کا نہایت اہم محکمہ ہے، کوئی رجسٹر حکومت کی بغیر اذن و اجازت کے رجسٹریشن کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تو یہ چیز بھی شروع ہی سے وجود ملکیت بلکہ ظہور ملکیت پر دلیل بنی، اور پھر جب اکیس سال گزر جانے پر بھی حکومت ان مذکورہ بالا امور پر اعتراض کرنے کے بجائے کچھ معمولی رقم لے کر ہمیشہ کے لئے ملکیت نامہ لکھ دیتی ہے تو یہ چیز قانوناً بھی ظہور ملک کی دلیل بنی۔

اور جب یہ معمول شروع ہی سے چلا آ رہا ہے تو اس معمول کا جاری و ساری اور دائم رہنا انتصاحب حال بھی ہوا، اور ایسے امور میں ”بقاء ما کان علی ما کان“ (۱) کے ضابطہ شرعیہ کے مطابق یہ انتصاحب حال بھی دلیل بنتا ہے۔ اس لیے بلاشبہ یہ تمام اوقاف شرعاً صحیح و نافذ قرار پائیں گے، اور اس کے خلاف فتویٰ دینا یا ان اوقاف کو وقف غلط یا وقف غیر صحیح کہنا کسی طرح درست و صحیح نہ ہوگا، اور انہی سب قرآن و وجہ سے کبھی کسی عالم و فقیہ نے ان اوقاف کو ناجائز یا غیر شرعی وغیرہ نہیں فرمایا۔

اور یہ کہنا کہ صحت وقف کے لئے موقوفہ پر واقف کی ملکیت بات ہونا شرط یا لازم ہے صحیح نہیں جیسا کہ رد المحتار کی ص ۳۹۲ والی عبارت جس کو فریق ثانی نے اپنے استدلال میں پیش کیا ہے، اس کے بعد والی عبارت، ص ۳۹۳ سے بھی یہی مستفہم ہوتا ہے، نیز رد مختار کتاب الوقف کے شروع میں ہی اس متن (وینزل ملک) کے تحت شرح نے جو لکھا ہے اس سے بھی یہی مستفہم ہوتا ہے، اور ”ولا یقسم إلا عندہما فیقسم المشاع وبہ افتی قاری الہدایۃ وغیرہ الخ“ (۲) اس عبارت سے تو یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ شے موقوفہ پر واقف کی ملکیت بات نہ بوقت وقف ملکیت بات نہ شرط یا لازم ہی نہیں، کیونکہ شے مشاع و مشترک میں اس کے ہر جز پر شریک کی ملک بالیقین ہوتی ہے، اس کے باوجود جب کوئی شریک اس مشترک کا ایک متعین حصہ (مثلاً نصف یا جو حصہ مراد ہو) مشاعاً وقف کر دیتا ہے تو مفتی بقول کے مطابق یہ وقف درست ہو

۱- الاشیاء والنظام مع شرح حموی، ص ۷۷، الفن الاول۔

۲- رد المحتار علی حاشی الثانی ۳۶۸/۳۔

جاتا ہے، حالانکہ اس پورے موقوفہ حصہ پر بوقت وقف واقف کی ملکیت بائیں ہوتی، بلکہ اس موقوفہ کے تقسیم کرا لینے اور قبضہ کرا لینے کے بعد ملک باتہ اس پر ثابت و قائم ہوتی ہے، اور بوقت وقف تمام اجزاء موقوفہ پر ملکیت یا تونی الجملہ تھی یا محض مایول کے اعتبار سے تھی پھر بھی اس وقف کو مفتی بقول میں صحیح قرار دیا گیا ہے۔

اور صورت مجوٹ عنہا میں جب اس شخص نے اپنی زمین برائے مسجد وقف کی تھی اور وقف کا رجسٹریشن بھی کرا دیا تھا اور اس زمین موقوفہ پر مسجد دس پندرہ سال سے برابر قابض و دخل چلی آ رہی ہے اور ہمیشہ اس کی آمدنی اپنے تصرف میں لا رہی ہے تو یہ کہنا کہ اس پر واقف کی ملک بات نہ تھی، اس لیے یہ وقف صحیح نہیں ہے، یہ غلط ہے، بلاشبہ یہ وقف صحیح ہے، اور اب اتنے دنوں کے بعد اس وقف کو صحیح نہ ماننا اس ضابطہ شرعیہ ”تاخیر البیان عن وقت الحاجة لایجوز“ (۱) کے بھی خلاف ہونے کی وجہ سے غیر معتبر و غیر مفید ہے۔

پھر اس اعتراض کا اگر وقت تھا تو وقف کرنے کے وقت تھا، اب اتنے دنوں کے بعد اور واقف کے مرجانے کے بعد اس بات کو اٹھانے والوں کو ٹھم کرنا ہے، اور منہم کا قول شرعاً حجت نہیں بنتا (۲)۔

اور اگر بوقت وقف کسی وجہ سے ملک بات نہ بھی رہی ہو جب بھی وقف کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا، جیسا کہ ابھی وقف مشاع کے جواز کی تقریر سے ثابت ہو چکا۔

لہذا اب وقف کے صحیح ہونے میں کسی کو کوئی تردد نہ ہونا چاہیے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۳/۱۴۰۹ھ

مسجد کی سابق عمارت گرا کر دوسری جدید تعمیر کا حکم:

التمس منک أن تجیب جواباً واضحاً بشريعة الاسلامیہ لسؤال الذی تحت هذه الرسالة، فان بلدی ادرا مفتنم بضلعة تنجاور من ریاسة تاملناد، ففی بلدنا مسجد الجامع القلیم بنی المسجد الجامع المذكور قبل ثلاث مائة وخمسون سنة وکل جدارها ومبنيها بحجر السوداء یصلون الجمعة المسلمون فیہ بغیر راحة ولا واسعة وقد یمکن ان یصلون فیہ مائة وخمسون نفراً ومجموع نفر من

۱- قواعد الفقہ ۶۷، الاثر عن شرح السیر الکبیر ۵۷/۳

۲- المنہم لبس بحجة الفلا عن شرح السیر الکبیر ۹۸، ۹۹، ۲۰۱/۱

بلدنا كانوا مسلمين قريبا خمسة عشر ألفا عداً ولذ عزمنا أن نبني مسجداً جديداً في هذا المكان الذي كان مسجداً قديماً مع الراحة الواسعة

فحينئذ ينكر بعض العلماء من بلدنا ويقولون من سبب انكارهم هدم مسجد القليم وبنى مسجد جديداً اختلاف الشريعة وحرامها، وقد وقع الفساد عندنا بأقوالهم، فالتمس عندك العظام أن تفتي فتوى واضحة لبنى المسجد الجديد.

أى: هل بنى مسجداً جديداً بعدما هدام المسجد القليم للراحة والواسعة من المسلمين المصلين؟ أم لا؟

فاكتب فتوىك بسرعة، إني أتوجه إليها والصلوة والسلام على محمد وآله وصحبه أجمعين والحمد لله رب العالمين.

الجواب وبالله التوفيق:

حامداً ومصلياً ومسلماً. فاعلموا أن تأسيس هذا المسجد ولو كان من أزيد ثلثة مائة وخمسين سنة، ولكن كان تعميره مستحكماً من الأحجار السوداء، ولم يتزلزل إلى الآن بل بقي قابلاً، لأن يصلى فيه من غير خوف الهدم والخطر عليه، فلا يجوز إهدامه بوجوه سنذكرها انشاء الله بل إن ضاق على المصلين فيلزم عليهم أن يبنوا مسجداً آخر في مقام آخر بحيث يرفع الضيق والاحتياج، وإن لم تيسر الأرض الواسعة حسب الضرورة فلهم أن يبنوا مسجداً على منازل منزلاً على منزل حسب الضرورة وحسب استطاعتهم.

وأما حكم عدم الإهدام فوجوه: الأول أن المسجد وقف ومراعات غرض الواقفين واجبة ففى الإهدام من غير داعية الإهدام ارتكاب خلاف الواجب فيخشى أن يكون مواخذاً عند الله من هذا الارتكاب.

وأما ثانياً فإن المساجد من شعائر الله وقال تعالى: "ومن يعظم شعائر الله فإنها من تقوى القلوب"، فيه إشارة إلى تحفيظ شعائرها فلا يجوز استئناسها من غير أن يكون على شرف الهدم يبقى

نخبات نظام الفتاوی - جلد دوم

کتاب الوقف (باب ما یعلق بأحكام المساجد)

استعمالها یبقی استعمالها من خوف الہدم والخطر علیہ

و أما ثالثا۔ إن المساجد النموذجة من السلف وتذکار للخلف، فیکون للعبر والتحریض لا للاستئناس۔

و أما رابعا۔ إنه فی ملک غیر اسلامی فیالہدامہ من غیر وجه شرعی داع إلى خوف الہدم والخطر ینفتح باب الإہدام عن أعداء الدین من غیر وجه شرعی، هذا ما عندی من اللہ حکم الشرع الشریف، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۱۱/۱۴۱۰ھ

نامینا کو مسجد کا سفیر بنانا:

موضع تیز واڑہ کی جامع مسجد اس وقت نہایت بوسیدہ خطرناک صورت میں ہے، اس کی جدید تعمیر کے لئے چندہ کی ضرورت ہے، اس میں ایک سفیر کی ضرورت ہے وہ ایک نامینا آدمی جنکا نام مالا شجاعت ہے سفیر رکھ دیا ہے اور ان کے ہمراہ محمد علی پسر نصیر الدین برائے خدمت بھیجا جاتا ہے اور ان نامینا کو سفیر مقرر کیا جاتا ہے، ان کی سفارت میں کوئی شرعی ثرابی تو نہیں ہے تحریر فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں اگر مفاد مسجد ہے تو شرعی کوئی نقص نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسجد میں تدفین درست نہیں ہے:

متولی مسجد صاحب اپنی قبر مسجد ہی کے اندر ایک گوشہ میں بنوانا چاہتے ہیں، شرعی اعتبار سے کیا حکم ہے؟ یہ مسجد ۱۶۵ سال سے آباد ہے، پنجوقتہ نماز باجماعت ہوتی ہے۔

مظہر پاشا حیدر آباد دکن

الجواب وبالله التوفيق:

مسجد جس جگہ قرار پا جاتی ہے اس کے بعد اس میں کسی قسم کا تعارف شرعاً درست نہیں ہوتا ہے اور جب نماز چٹاڑہ کا حکم بھی یہ ہے کہ وہ خارج مسجد ادا کی جاتی ہے تو پھر مسجد میں تدفین شرعاً کس طرح درست ہو سکتی ہے؟ (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۷/۱۴۰۱ھ

۱- "فإذا لم يلزم لایمملک ولا یملک ولا یعار ولا یرهن، قال الشامي: أي لا یکون مملوکاً لصاحبه ولا یملک أي لا یقبل المملک لغيره بالبیع والحوه لا مستحالة لمملک الخارج عن ملکه" (نئی ۳/۷۶۳ کتاب الوقف)۔

نتخبات نظام الفتاوى - جلد دوم

کتاب الوقف (باب ما يتعلق بأحكام المساجد)

باب ما يتعلق بأحكام المدارس

زکوٰۃ وصدقۃ الفطر کی رقم بغیر حیلہ تملیک کے مدرسین کی تنخواہ یا تعمیر وغیرہ میں صرف کرنا جائز نہیں:
ان مدارس کے بارے میں جن میں بیرونی طلبہ زیر تعلیم ہیں اور قیام و طعام بذمہ مدرسہ ہے، معطی کی رقم زکوٰۃ دیتے وقت یہ نیت ہوتی ہے کہ جو اپنے ذمہ زکوٰۃ ہے وہ ادا ہو جائے، یہ تو ہوتا نہیں کہ اس طرح کہتے ہیں کہ فلاں مقام پر خرچ کرو بلکہ سفیر یا مدرسہ کے مہتمم کے کہنے پر مدرسہ زکوٰۃ دلیتا ہے تو زکوٰۃ دیتے ہیں۔
سوال یہ ہے کہ مصارف زکوٰۃ کے مدرسہ میں کیا کیا مقام ہیں۔ تنخواہ معلمین، طلبہ کے قیام و طعام و لباس، مدرسہ کی توسیع، مدرسہ کے دیگر اخراجات وغیرہ مہتمم مدرسہ رقم زکوٰۃ کی حیلہ تملیک نہ کرنا ہو تو اس زکوٰۃ کی رقم کو کہاں کہاں خرچ کیا جائے؟

احمد علی صدیقی (کمر کون، ایم پی)

الجواب وبالله التوفیق:

زکوٰۃ، صدقۃ فطر اور دوسری واجب التملیک رقوم کو صرف نادار و غیر مستطیع طلبہ کے کھانے اور کپڑے پر خرچ کرنا لازم ہے، اگر تنخواہ مدرسین یا تعمیر وغیرہ یا کسی کام کی اجرت میں خرچ کرنا ہو، یا کسی بھی ایسے کام میں خرچ کرنا جس میں تملیک مستحق نہیں ہوتی، بغیر تملیک مستحق کے خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

اس لیے احتیاطی پہلو یہی ہے کہ ان رقوم واجب التملیک کے وصول ہونے کے ساتھ ہی مستحقین زکوٰۃ سے تملیک کرا کے پھر خرچ کے لیے استعمال کریں (۱)، اور تملیک کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جتنے روپے کی تملیک کرنا ہوا اتنے روپے

۱- "والجيلة أن يصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأضياء" (الدر المختار علی حاشی رد المحتار ج ۲، ۲۳ کتاب الزکوٰۃ) (مرتب)۔

کے بارے میں کسی غریب مستحق زکوٰۃ سے کہیں کہ تم اتنے روپے کہیں سے قرض لا کر مدرسہ میں بطور چندہ وعطیہ دے دو، تمہارا قرض ادا کر دیا جائے گا، پھر جب وہ غریب اتنا روپے کہیں سے قرض لا کر بطور چندہ مدرسہ میں دے دے تو اس کے بعد زکوٰۃ وغیرہ واجب التملیک والی رقم اس غریب کو دیدیں اور غریب اس رقم سے اپنا قرض ادا کر دے۔

اس کو قرض دینے میں ایسا بھی کر سکتے ہیں کہ خود اپنے پاس سے اس کو قرض دے دیں پھر جب وہ قرض لی ہوئی رقم چندہ میں دے تو اس کے بعد اپنی زکوٰۃ والی رقم اس کو دیدیں پھر جب وہ اس رقم پر مالک ہو جائے تو اس سے اپنا قرض وصول کر لیں، یہی طریقہ کسی دوسرے مالدار سے دلا کر اختیار کر سکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ۲۵/۱/۱۳۹۱ھ

فراہمی مالیات کے لئے اجرت کی ایک جدید شکل اور اس کا حکم شرعی:

میں ایک مدرسہ میں پرکھاتا ہوں جس میں مستطیع وغیر مستطیع ہر قسم کے طلبہ پڑھتے ہیں اور رہتے ہیں، میں وہاں سے چندہ کرنے کے لیے بھٹی، کجرات کے علاقہ میں جاتا ہوں، اس سال مدرسہ میں سفارتی اجرت اور انعام کی جدید شکل طے ہوئی ہے جس کو عرض کرتا ہوں۔

۱۔ تنخواہ یومیہ پچاس روپے ہوگی جس میں سفر خرچ بذمہ سفیر ہوگا۔

۲۔ پورے حلقہ کا ایک کوٹہ مقرر ہو اس طرح ہر کہ پچھلے سال کی آمدنی ۲۰۰ حصہ اس سال کے لیے کوٹا ہے، اسی طرح ہر سال کی آمدنی کا ۲۰ حصہ اپنے آئندہ کے لیے کوٹا ہوگا، مثلاً میرے حلقہ کی پچھلے سال کی آمدنی بارہ ہزار تھی اب آٹھ ہزار کوٹا ہوا۔

بہر کیف جو کوٹا متعین ہے جو کہ اوپر مذکور ہے کہ اتنی رقم وصول ہونے پر کوئی انعام نہیں ہے، صرف تنخواہ ہے اور اگر چندہ کی رقم کوٹا سے متجاوز ہوگئی تو تنخواہ تو جاری ہی رہے گی جب تک وصولی جاری رہے گی مزید مندرجہ ذیل شرح کے ساتھ محصل کو انعام بھی ملے گا۔ کوٹا سے متجاوز رقم سے ایک سے لے کر دو ہزار تک پندرہ فیصد، دو ہزار ایک سے لے کر چار ہزار تک بیس فیصد، چار ہزار ایک سے لے کر چھ ہزار تک پچیس فیصد، چھ ہزار ایک سے لے کر دس ہزار تک تیس فیصد اور دس ہزار ایک سے لے کر اوپر جتنا بھی ہو ساڑھے بیس فیصد۔ اس میں ایک چیز یہ ہے کہ مندرجہ ذیل شرحوں کے ساتھ انعام جس منزل پر بھی ہوگا وہ کوٹوں کے بعد والی رقم کو محیط ہوگا مثلاً کوٹا کے بعد چھ ہزار ایک روپیہ ہم نے وصول کر لیا تو اب ہمیں انعام پورے

چھ ہزار میں ۳۰ فیصد کے حساب سے ملے گا اسی طرح دیگر شرحیں بھی۔

۳۔ وصولی کے لیا میں ہماری پرانی تنخواہ جو اور لیا میں ہوتی ہے جاری رہے گی، یہ تنخواہ پچاس روپیہ یومیہ وصولی والی الگ ہے، تو مندرجہ بالا شکل میں یہ تنخواہ اور اس طرح انعام مقرر شدہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور ناظم صاحب کی اجازت کے بغیر ہم سفراء اگر مناد مدرسہ کو سامنے رکھ کر مزید کسی حلقہ میں کام کریں جو نیا ہے تو جائز ہے کہ نہیں جبکہ نیا حلقہ بنانے میں وقت زیادہ لگے گا تو تنخواہ زیادہ ہوگی؟ مہربانی فرما کر شرعی حکم سے نوازیں۔

محمد غفران (اعظم گڑھ)

الجواب وبالله التوفیق:

مدارس میں کمیشن پر سفراء سے جو معاملہ رائج ہے وہ جائز نہیں ہوتا، بعض صورتوں میں یہ اجارہ باطل ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں فاسد ہوتا ہے۔ اس کا جائز اور سفیر و مدرسہ دونوں کے لیے سودمند یہ طریقہ ہوتا ہے کہ اس کام کے لیے سفیر کی ایک تنخواہ مقرر کر دی جائے خواہ خشک یا خوراکی کے ساتھ اور جس علاقہ میں بھیجنا ہو اس علاقہ کے سابق وصولی کی مقدار کے مطابق یہ کہہ دیا جائے کہ اگر آپ کی وصولی اس مقدار سے نہیں بڑھے گی تو آپ کو انعام نہیں ملے گا، ہاں اگر مقررہ مقدار سے زیادہ وصولی ہو تو انعام اس طرح ملے گا کہ آپ اپنی کل وصولی مدرسہ پر بھیجتے جائیں اور مدرسہ اس کو اپنے خزانہ مدرسہ میں رکھتا جائے گا، پھر جب آپ کام ختم کر کے آجائیں گے اور حساب وصولی کریں گے تو اس وقت مقررہ مقدار سے زائد میں اتنا فیصد (جو مناسب ہو) آپ کو انعام دیا جائے گا۔ اس طریقہ کار سے سفراء کی ہمت بھی بڑھتی رہے گی اور مدرسہ کو بھی فائدہ پہنچے گا اور کوئی شرعی قیاحت بھی نہ ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۷/۷/۱۴۰۱ھ

مدرسہ کے نام موقوفہ زمین پر عید گاہ، مسجد اور مطبخ بنانا:

ہمارے جوار میں ایک صدی پہلے ایک مدرسہ کے لیے چند اشخاص نے زمین وقف کی اور ان کی اولین نیت صرف مدرسہ کی تھی، پھر اس موقوفہ زمین میں مدرسہ بنا پھر مطبخ اور دارالطلبہ بنا پھر اس زمین میں ایک مسجد بھی بنی اور اس زمین میں درخت بھی لگوائے گئے اور پھر عید گاہ بھی بنی، اس وقف میں کوئی تحریر شرائط وقف کے لیے نہیں تھی، صرف زبانی وقف ہوا اور

جوں جوں مدرسہ ترقی کرتا گیا کمرے بنتے گئے اور اس کے بعد دیگر مدارس بنے اور وقف کنندگان کی اولین نیت صرف مدرسہ کی تھی، عید گاہ کا احاطہ بھی بنا، لیکن وقف کنندگان کے تصور میں مدرسہ کی متعلقہ عمارات، مطبخ، دارالطلبہ، مسجد اور عید گاہ بھی رہی جیسا کہ ماقبل کے مدرسہ میں ہوا تو اب مسجد اور عید گاہ کی تعمیر جائز ہوئی یا نہیں اور عید گاہ کا احاطہ طلبہ کی تعلیم کے حسب موسم استعمال ہوتا ہے، اس طرح ایک مدرسہ کے لیے ماضی قریب میں زمین وقف کی گئی اور اس میں عید گاہ کا احاطہ بھی بنا اور وقف کنندگان کے کچھ افراد نے عید گاہ میں اینٹ، گارے وغیرہ میں امدادی، حالانکہ عید گاہ کی چہار دیواری ایک ہی شخص نے اپنے خرچ سے بنائی تو اس میں عید کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں:

نوٹ (۱) زمانہ ماضی میں عوام کے ذہنوں میں اگرچہ صرف مدرسہ ہوتا تھا، لیکن مدرسہ کے متعلقات یعنی مطبخ، دارالطلبہ، مسجد، عید گاہ کی عمارات ان کے تصور میں ہوتی تھیں، اس طرح آج کل بھی مدرسہ کی تحریک سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کی اولین نیت مدرسہ ہوتی ہے اور ان کے آبا و اجداد کی طرح ان کے تصورات بھی ہوتے ہیں، زمانہ گذشتہ میں مدرسہ کے نام و کام سے جو زبانی وقف ہوتا تھا کچھ دنوں کے بعد جب کہ وقف کنندگان میں کچھ لوگ فوت ہو جاتے تھے، باقی وقف کنندگان کی تحریک سے موقوفہ زمین میں مسجد عید گاہ بنتی تھی، یعنی مسجد، عید گاہ اور خالی زمین میں زراعت برائے مدرسہ اور درخت برائے مدرسہ کو لوازمات مدرسہ تصور کرتے تھے۔

نوٹ (۲) اگر تحریری وقف نامہ لکھا جائے اور صرف مدرسہ کا ذکر ہو پھر اس موقوفہ زمین میں مسجد یا عید گاہ بنائی جائے تو کیا جائز ہے؟

ماہر راغب علی (مقام پوسٹ دودھارا جملعہ پستی، پولی)

الجواب وبالله التوفیق:

مدرسہ پر وقف کرنے کا مفہوم یہی ہے کہ مدرسہ اور مدرسہ کی ضروریات پر وقف ہے اور مدرسہ کی ضروریات جس طرح درس گاہیں ہوتی ہیں، اسی طرح مطبخ، دارالطلبہ، دارالافتاء اور مسجد مدرسہ میں شمار ہو کر ان سب چیزوں کا بنانا اور تعمیر بھی واقف کے منشا کے خلاف نہ ہوگا، اسی طرح مدرسہ کی آمدنی ہڑھانے کے لیے فاضل زمین پر زراعت یا باغ لگانے سے ہونے والے نفع کا طلبہ اور مدرسہ پر خرچ کرنا یا اس فاضل زمین پر نماز عیدین وغیرہ ادا کر لینا سب درست رہے گا، ان میں سے کوئی چیز واقف کے منشا کے خلاف ہو کر ناجائز نہ ہوگی۔

البتہ نماز عید اگر باغ یا منازہ کی شکل میں ہوتے ہوئے ادا کریں تو ٹھیک ہے، باقی اس پر عید گاہ کی عمارت تعمیر کر لینا صحیح نہ ہوگا، اس لیے کہ عید گاہ کی عمارت بھی وقف ہوتی ہے، لیکن یہ عمارت ضروریات مدرسہ میں سے نہیں ہے اور جو چیز موقوفہ ہوتی ہے اس کو پھر وقف کرنا درست نہیں ہوتا ہے۔

ہاں اگر واقف نے شروع وقف میں ہی اس کی اجازت دے دی ہو، یا وقف نامہ کی عبارت سے اجازت نکلتی ہو تو دوسری بات ہوگی اور یہ حکم ہر دو صورت کا ہے کہ یہ عید گاہ کی عمارت موقوفہ مدرسہ پر بنانا ناجائز نہیں ہوگا، خواہ کوئی اپنے ذاتی روپے سے بنائے یا مدرسہ کے پیسے سے، البتہ ایسی عید گاہ میں جو نمازیں ادا کی جائیں گی وہ ادا ہو جائیں گی۔

نوٹ: واقف نے زبانی یا تحریری کوئی شرط لگا دی ہو تو ”شرط الوقف کنص الشارع فی المفہوم والدلالة فی وجوب العمل بہ“ (۱) کے مطابق اس کی اتباع اور رعایت ضروری ہوتی ہے اور اگر واقف نے کوئی شرط نہیں لگائی ہے، نہ زبانی نہ تحریری لیکن اس کے زمانہ میں جو عمل ہوا ہے اس کے منشا اور رضا کا استنباط جہاں تک ہو سکے وہیں تک وسعت دی جائے گی، یا پھر اس کے منشا وقف سے زیادہ مستحقین منشا وقف ہوا اور عند اشراق حسن منہ ہو تو اس کا اعتبار کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمار پور ۲۸/۲/۱۴۰۲ھ

سفر کے لئے مہتمم کی اجازت کے بغیر وصول شدہ رقم میں تصرف کرنے کا حکم؟

مدرسہ اسلامیہ رحمانیہ ٹانڈہ و بادلی والوں نے اپنے مدرسہ کے ایک مدرس کو پاکستان چندہ وصولیاتی کے لیے بھیجا، ان کے پاسپورٹ بنوانے، ویزہ حاصل کرنے اور اس سلسلے میں ہونے والے دیگر مصارف سفر خرچ کرایہ وغیرہ مدرسہ نے برداشت کیے، مدرسے سے روانگی تا واپسی مکمل تحفہ مدرسہ نے دی اور ان کو یہ تاکید کی گئی کہ جو بھی رقم حاصل ہو اس کا آپ سامان بالکل نہ خریدیں بلکہ جملہ رقم پاکستان میں مقیم زید، عمرو، بکر وغیرہ کے حوالے کرتے آئیں وہ اپنے طور پر یہاں روانہ کر دیں گے۔ لیکن مدرس موصوف نے اس کی خلاف ورزی کر کے اس رقم کا سامان خرید اور کسٹم آفس پر اس کو روک لیا گیا، تقریباً ایک تہائی سامان ساتھ میں لے آئے بقیہ دو تہائی پاکستان کسٹم پر روک لیا گیا اور پاکستان میں ان کے مقیم متعلقین کو واپس کر دیا گیا جو رفتہ رفتہ آنے والے لوگوں کے ذریعہ بھیجا جا رہا ہے، مدرس موصوف اس سامان کو ناجائز طریقے پر اچھے

خاصے نفع سے اس کو فروخت کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرح رقم جمع کر کے مدرسہ کی وصول شدہ رقم جمع کر دوں گا۔ اس مدرسہ موصوف کے متعلق دریافت طلب امور یہ ہیں کہ:

۱- جب موصوف کا پاسپورٹ، ویزہ، تنخواہ، سفر خرچ و دیگر جملہ مصارف مدرسہ نے دے کر ان کو چندہ کی وصولیائی کے لیے بھیجا، کسٹم کے خطرات کو سامنے رکھ کر سامان کی خریداری سے منع کیا گیا، تو ان کو سامان خریدنا اور اس کی تجارت کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

۲- اس سامان سے حاصل ہونے والے نفع کے مستحق مدرس موصوف ہوں گے یا مدرسہ، یعنی مدرسہ کی رقم مثلاً گیارہ ہزار بی مدرسہ میں جمع کرنی ہوگی جو کہ رسیدات کے مطابق ہے، یا اس پیسے سے جو رقم مع منافع مثلاً پندرہ ہزار حاصل ہوئی تھی وہ جملہ رقم مدرسہ میں جمع کرنی ہوگی۔

۳- مدرس موصوف چندہ کے لیے گئے تھے انہوں نے اس سے تجارت مائی اس رقم کا سامان خرید لیا تو اس صورت میں جن لوگوں نے ان کو زکوٰۃ کی رقم دی تھی ان کی زکوٰۃ ادا ہوگئی یا نہیں؟ ان کو دوبارہ دینی ہوگی یا نہیں؟ فرمائشی سامان لانے پر نفع لینا:

۴- مدرس موصوف کی پاکستان روانگی کے وقت بعض حضرات نے فرمائشی طور پر انہیں کچھ سامان لانے کے لیے کہا وہ سامان مثلاً سو روپے کا آیا وہ اس سامان کو ان لوگوں کو دو سو روپے کا دے رہے ہیں تو سوال یہ ہے کہ اس سامان پر ان کو نفع لینا جائز ہے یا نہیں، کیونکہ یہ تجارت نہیں ہے بلکہ فرمائش ہے، جیسے کوئی بازار جائے اور اس سے کہہ دیں کہ فلاں سامان لے آویں تو لانے والے کو اس طرح منگوائے ہوئے سامان پر نفع لینا جائز ہے یا نہیں؟

حافظ محمود علی (نامہ جہاد لی صلیع رام پور پولی)

الجواب وبالله التوفیق:

۱، ۲- اگر تحریر کردہ واقعات اسی طرح ہیں جس طرح سوال میں تحریر ہیں تو مدرس مذکور گنہگار ہوا اور وصول شدہ مال نفع سب کا مستحق مدرسہ ہے یہ مدرس نہیں ہے، بلکہ وصول شدہ رقم میں اگر کچھ نقصان ہو جائے گا تو اس کا ضمان بھی مدرس مذکور پر لاگو ہوگا۔ نیز اس مدرس پر لازم ہے کہ تمام مال مع نفع کے مدرسہ کے سپرد کر دے۔

۳- اس صورت میں زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی (۱)۔

۱- ”ہی مملکت جزء مال عبہ النشارع“ (تنویر الابصار علی رد المحتار ۲/۲ کتاب الزکوٰۃ) (مرحب)۔

۴- اس مال پر بھی اس صورت میں نفع لینا جائز نہیں ہے، ہاں اگر شروع معاملہ میں ہی اپنے اس عمل کی اجرت طے کر لی ہو تو صرف اس اجرت کو لے سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۵/۱۳۰۱ھ

مکاتب اسلامیہ میں زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور چرمقربانی کی رقم صرف کرنا، نیز حیلہ تملیک کی بہتر شکل؟
ایک بہتی مسلمانوں کی ہے، تقریباً چھ سو کی مردم شماری ہے جو مسلم کاشتکاروں پر مشتمل ہے۔ تقریباً سات یا آٹھ ہزار بڑی کاشت والے ہیں، باقی چھوٹے چھوٹے رقبہ والے، غریب کاشت کار کافی روز سے یہاں کے مکتب اسلامیہ میں کلام پاک اور اردو دینیات کی تعلیم ہوتی ہے، ایک معلم بیس روپے ماہانہ اور خوراک پر تعلیم دیتے تھے، قلیل تنخواہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے مدرسہ چھوڑ دیا تو دوسرا معلم بہت ہی تلاش کے بعد اسی روپے ماہانہ اور خوراک پر رکھا گیا، بچوں اور بچیوں کی تعداد کافی ہے جس کی بنا پر ایک معلم کے لیے تمام کام کرنا مشکل ہو گیا ہے، ایک مدرسہ ماہانہ ہے، کاشت کاروں میں جو چھوٹے درجہ کے ہیں وہ اپنے غلہ کی پیداوار سے چالیسواں حصہ نکالتے ہیں، بڑے کاشت کار اپنا چالیسواں حصہ دیگر مدارس میں دیتے تھے، اور مقامی مکتب کو بھی دیتے تھے، اب ایک معلم کے بجائے دو کی اشد حاجت ہے، مہنگائی و گرانی کو دیکھتے ہوئے اسی روپے اور ایک سو پچاس روپے بھی کم ہیں، اس آبادی میں گورنمنٹ کا پرائمری اسکول بھی قائم ہے چونکہ آبادی مسلمانوں کی ہے، اس لیے مکتب اسلامیہ کو جاری رکھنا اشد ضروری ہے، اس لیے کہ اس دور میں کلام پاک، اردو اور دینیات کی تعلیم دلانا بچوں کو بہت ضروری ہے، مندرجہ ذیل امور اس سلسلہ میں قابل غور ہیں:

- ۱- اس مکتب میں فطرہ کی امداد کرنا جائز ہے یا نہیں؟
 - ۲- اس مکتب میں چرمقربانی کی رقم یا کھال دینا کیسا ہے؟
 - ۳- نیز اس میں زکوٰۃ دینا کیسا ہے؟
 - ۴- ان تینوں مدوں کی رقمیں تملیک کر کے دینا جائز ہے یا نہیں؟
 - ۵- ناظم یا مہتمم مکتب تملیک کر سکتا ہے یا نہیں؟
- اس انداز سے جواب شرعیہ مع دلائل ہوں کہ عوام الناس بغیر تکلف کے سمجھ لیں۔

مولانا احمد علی

الجواب وبالله التوفیق:

۴۱: صدقہ فطر، زکوٰۃ اور چرم قربانی کی قیمت تملیک مستحق کے بغیر تنخواہ وغیرہ کسی مد میں خرچ کرنا درست نہیں، ہاں قربانی کی کھال بجائے فروخت کرنے کے اگر بطور ہدیہ تحفہ، نظم یا مہتمم کتب کو دے دی جائیں، پھر ماہانہ اس کھال کو اپنی ملک میں لینے کے بعد جس مصرف میں چاہے خرچ کر سکتا ہے حتیٰ کہ پھر اس سے مدرسین و ملازمین کی تنخواہ بھی دینا جائز ہو جائے گا (۱)۔

حیلہ تملیک کا بہتر طریقہ:

یہ ہے کہ صدقات واجبہ کی جتنی رقم تنخواہ وغیرہ میں دینی ہو اتنی رقم کے لیے کسی غریب سے کہا جائے کہ تم اتنی رقم قرض لا کر بطور عطیہ و چندہ مدرسہ میں دے دو تمہارا قرض ادا کیا جائیگا، پھر جب وہ غریب اتنی رقم کہیں سے قرض لا کر مدرسہ میں داخل کر دے تو صدقات والی رقم میں سے اتنی رقم اس غریب کو دے کر اس کو مالک بنا دیا جائے، پھر وہ غریب اس رقم سے اپنا قرضہ ادا کر دے، اگر کسی دوسری جگہ سے اس کو قرض نہ ملے تو اپنے پاس سے صدقات واجبہ کے علاوہ جو روپے ہوں ان میں سے قرض دے دے تو ایسا بھی کر سکتا ہے، اسی طرح اگر غریب سے خطرہ ہو کہ وہ یہ رقم لے کر قرضہ ادا نہیں کرے گا تو جس سے قرض لایا ہوا اور داخل مدرسہ کیا ہوا اس کو بلا کر اس کے سامنے صدقات واجبہ والی رقم قرض ادا کرنے کے لیے اس کو دی جائے اور پھر اسی غریب کے اس رقم کے قبضہ کرنے کے بعد اگر چاہے تو زبردستی بھی اپنا قرضہ وصول کر سکتا ہے۔

اور سب سے اہم اور پہلی بات یہ ہے کہ حیلہ تملیک سخت مجبوری کی صورت میں کرنا چاہیے، اس لیے پہلے جو لوگ متمول اور بڑے کاشت کار ہیں ان کو لازم ہے کہ صدقات نافلہ و عطیہ سے ایسی امداد کریں جس سے حیلہ کے بغیر ہی مدرسہ کا کام چلنے لگے، اس لیے کہ دینی تعلیم کا جاری کرنا اور رکھنا بہت ہی بڑا کارِ ثواب ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۴/۱۴۰۲ھ

الائونس مدرسین کے بارے میں حکم شرعی:

ایک مدرسہ میں ناخوشگوار حالات کی بنا پر چند مدرسین نے یکجا درمیانی سال میں استعفیٰ دیا، مدت استعفیٰ سے قبل مدرسہ کی مجلس شوریٰ بیٹھی جس میں استعفیٰ کی واپسی پر پورا زور دیا گیا، لیکن مدرسین واپسی پر راضی نہ ہوئے۔

۱- ملاحظہ ہو الدر المختار علی ہاشم الثانی، ۲۳ ج ۲ کتاب الزکوٰۃ (مرحب)۔

بالآخر یہ معاہدہ ہوا کہ ۳۰ رمضان تک استعفیٰ موخر کیا جائے، درمیانی سال کے سبب اس معاہدہ میں مدرسہ کی مصلحت تھی، چنانچہ شوریٰ کی کارروائی میں یہ معاہدہ طے ہوا اور اسی کو بنیاد قرار دے کر جملہ مدرسین کے الاؤنس ۳۰ روپے ماہانہ جو مدرسہ دیتا تھا بجائے ۳۰ روپے کے پندرہ روپے کم کر کے شامل تنخواہ ۳۰ رمضان تک کیا گیا اور گورنمنٹ سے ملنے والے الاؤنس پر وعدہ کیا گیا کہ وصول ہونے کے بعد ادا کیا جائے گا، اس معاہدہ کے بعد مستعفی مدرسین بھی اخیر سال تک ہمد کام کرتے رہے۔

۱۹ شعبان ۹۰ھ کو مدرسہ میں تعطیل ہو گئی مدرسین کو شعبان کی تنخواہ نہیں دی گئی وہ اپنے اپنے مکان واپس ہو گئے، وسط رمضان میں صرف ۱۸ دن کی تنخواہ شعبان بذریعہ مٹی آرڈر روانہ کی گئی جس کو مدرسین نے واپس کر دیا، مدرسین کا کہنا ہے کہ چونکہ مدرسین کی حیثیت اجیر شہریہ کی ہے بغیر معاہدہ کے بھی پورے شعبان کی تنخواہ کے ہم شرعاً مستحق تھے، اب چونکہ معاہدہ میں مدت اجارہ ۳۰ رمضان تک بڑھا دی گئی ہے، اس لیے اس معاہدہ کی رو سے پورے شعبان و رمضان دونوں مہینوں کی تنخواہ کے ہم شرعاً مستحق ہو چکے ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مدرسین اس مطالبہ میں حق بجانب ہیں یا نہیں؟ اگر حق بجانب ہیں تو شرعاً مہتمم کو ان دونوں ماہ کی تنخواہ روکنے کا حق نہیں ہونا چاہیے، ایسا کرنے پر مہتمم صاحب عند اللہ ماثوہ ہوں گے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

صورت مسئلہ میں معاہدہ مذکورہ کی وجہ سے مدرسین کا مطالبہ صحیح ہے اور مطالبہ پورا نہ کرنے پر مہتمم کے سر مواخذہ ہوگا، قال اللہ تعالیٰ و اوفوا بالعہد ان العہد کان مسئلہ (سورہ ابراہیم: ۳۲) مرتقات شرح مشکوٰۃ میں ہے: "ان الوعد للحق بالدين كما ورد عنه صلى الله عليه وسلم: العدة دين" علی مارواه الطبرانی فی الأوسط عن علی وابن مسعود "۴۶/۴۶" الاشباہ میں ہے الخلف فی الوعد حرام، صفحہ: ۵۲، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

محرمین المبارک پوری خادم بندہ رئیس والافتاء فی الجامعۃ العربیۃ احیاء العلوم المبارکھور ۱۱ ربی الحجہ

الجواب وبالله التوفیق:

یہ صحیح ہے کہ رمضان کی تعطیل استراحت کے لیے ہوتی ہے کہ بعد استراحت پھر مستعدی سے کام ہو سکے، جیسا کہ

عام مدارس میں متعارف ہے اور اس بنا پر آئندہ سال نہ آنے والے مدرسین و ملازمین کو رمضان کی تنخواہ کا استحقاق نہیں ہوتا، مگر صورتِ مسئلہ کا معاملہ اس عرف سے الگ اور ایک جدید معاہدہ کے تحت ہے، اس معاہدہ میں جب حسب تحریر سوال رمضان تک کی تصریح ہے تو یہ مستغنی مدرسین ۳۰ رمضان تک کے ہیر قمر اراپا گئے اور تعطیل گلاں عرف عام کے تحت مدرسہ نے خود کی ہے، اس لیے اس تعطیل کا تعلق اس معاہدہ خصوصی سے نہ ہوگا، ہاں اگر ۳۰ رمضان سے قبل ۱۹ شعبان کو مدرسہ بند کرتے وقت ان مستغنی مدرسین کے ساتھ پھر کوئی معاہدہ جدید کرنے کے بعد ان کو وطن واپس کیا گیا ہوتا تو بے شک سابق معاہدہ ختم ہو کر اس جدید معاہدہ کے ماتحت حکم ہوتا، لیکن جب ایسا نہیں کیا گیا تو حسب معاہدہ ۳۰ رمضان تک کے اجورہ کے مستحق شرعاً یہ مستغنی مدرسین ہوں گے، لہذا ان مدرسین کا یہ مطالبہ صحیح ہے اور وہ اجورہ پندہ مدرسہ واجب امداد ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۸/۱۲/۱۳۹۰ھ

الجواب صحیح: سید احمد سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

احکام المدارس سے متعلق ایک فتویٰ:

کیا حکم ہے شریعتِ مطہرہ کا ان دونوں صورتوں میں:

۱۔ جن مدارس کا الحاق گورنمنٹ سے ہے، وہاں کے شیخ الحدیث حضرات بکثرت ایسے طلبہ کو جو دوسرے مدارس میں تعلیم پاتے ہیں، ان کا فارم امتحان سرکاری ان طلبہ کی منظوری پر خود بھجوا کر یا ان طلبہ کے والد یا سرپرست کے ذریعہ بھجوا کر اپنے یہاں سے واقعہ کے خلاف اس فارم کی تصدیق کر کے گورنمنٹ میں امتحانات کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ تو کیا ان حضرات کے لیے ایسے فارموں کی تصدیق درست ہے؟ جب کہ ایسا کرنے پر طلبہ کی عمر کے لحاظ سے کافی نقصان ہو جائے گا۔

۲۔ مدرسین کی تنخواہیں مدارس میں طے رہتی ہیں، اس کے باوجود گورنمنٹ سے بھی کچھ امدادی رقم ان مدرسین کو مدرسہ کے ذریعہ ملا کرتی ہیں، تو کیا ایسے مدرسین کو زکوٰۃ کی رقم سے حیلہ شرعی کر کے تنخواہ لینا درست ہے، جبکہ وہ گورنمنٹ سے بھی ان کی ضرورت پوری ہو جایا کرتی ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

۱- امتحان توپرائیوٹ بھی ہوتا ہے، پس اگر محض پرائیوٹ امتحان کے فارم کی تصدیق کرنا ہے تو صحیح ہے، البتہ اگر یہ لکھتا ہو کہ یہ لڑکا ہمارے یہاں داخل ہو کر باقاعدہ پڑھتا ہے، حالانکہ داخل نہ ہو تو کذب صریح ہوگا اور ناجائز ہوگا۔

۲- تنخواہ کا معاملہ اجرت کا ہے جو اہل مدرسہ کے ذمہ واجب الادا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کی ضروریات اس میں پوری ہوتی ہیں یا نہیں؟ اور حکومت یہ سمجھتے ہوئے امداد دیتی ہو کہ اس کو مستقل تنخواہ ملتی ہے اور دونوں دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

لہذا حکومت کے دینے سے اہل مدرسہ کے ذمہ جو وجوب ہے وہ ساقط نہ ہوگا، جب تک کہ اہل مدرسہ اس سے یہ معاملہ نہ کر لیں کہ جس کو حکومت کی یہ امداد ملے گی اس کو ہم یہ سابقہ تنخواہ نہ دیں گے بلکہ کم کر کے محض اتنی دیں گے اور مدرس اس کو قبول بھی کر لے، کیونکہ صحت اجارہ میں رضا طرفین ضروری ہے اور علم دین کا باقی رکھنا اور اس کا انتظام واجب ہے اور اس وجوب کی بنیاد پر اجرت و تنخواہ کے معاملہ کا جواز اور اجرت کی ادائیگی وجوب متفرع ہے، پس اگر اہل مدرسہ کے پاس ایسی قوم نہ ہوں جن سے اجرت و تنخواہ دی جاسکتی ہو اور بغیر اس کے تعلیم دین معذور ہو، قطع نظر اس سے کہ حکومت کچھ امداد دیتی ہے یا نہیں، حیلہ تملیک کر کے بھی ادائیگی تنخواہ درست رہے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مدرسہ یا مسجد کا مکان بینک یا کسی سودی ادارہ کو کرایہ پر دینا :

مدرسہ یا مسجد کا مکان بینک یا مسلم فنڈ والوں کو کرایہ پر دینا اور ان سے دکان یا مکان کا کرایہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ بینک میں سودی کاروبار بھی ہوتا ہے، تو کیا اس سے حاصل شدہ کرایہ کی آمدنی مدرسہ یا مسجد میں لگانا درست ہوگا؟

الجواب وبالله التوفیق:

مدرسہ یا مسجد کا مکان بینک کو یا کسی ایسے ادارہ کو کرایہ پر دینا جس میں سودی کاروبار ہوتا ہو یا ایسے شخص کو دینا جو اس میں بت یا سنگھ رکھے یا بجائے، یا بت وغیرہ کو پوچھے اس کا کرایہ پر دینا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے اور صاحبین نے بوجہ

اعانت علی المعصية مکروہ فرمایا ہے اور منع فرمایا ہے، اس لیے گنجائش جوازِ ظلمے کی گرا چھانہ ہوگا اور حتی الوسع اجتناب کرنا لازم رہے گا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب، ہذہ کلہائی کتاب لاجارۃ من الکتب الفقہ

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۳/۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمن خیر آبادی

- مدرسہ کے مفاد کے پیش نظر مدرسہ کے خزانے سے خواص و عوام پر اوسط درجہ کا خرچ کرنا درست ہے؟
- ۱- ہم دارالعلوم میں کسی بزرگ یا عالم کو مدعو کریں ان کے ساتھ خدام اور ان سے مستفیض ہونے کی غرض سے عوام بھی دارالعلوم میں آئیں تو ان مہمانان کرام پر دارالعلوم کے خزانے سے خرچ کرنا جائز ہے کہ نہیں؟
- ۲- دارالعلوم میں عوام کی آمد پر دارالعلوم کے خزانے میں سے خرچ کرنے میں کوئی حرج آئے گا، نیز دارالعلوم کے معاون و مددگار لوگوں کو دارالعلوم ہی کے مفاد کے پیش نظر مدعو کیا جائے اور ان پر خرچ کیا جائے تو کوئی حرج ہے؟
- نوٹ: دارالعلوم کی اوقاف کی جائیدادیں ہیں، دارالعلوم کے اخراجات کا مدار صرف چندہ پر ہے۔

محمد اسماعیل (کیراف دارالعلوم پھروچ کتھاریہ ضلع کجرات)

الجواب وبالله التوفیق:

- ۱، ۲- مدرسہ کے مفاد و مصلحت کے پیش نظر مدرسہ کے خزانے سے اوسط درجہ کا خرچ ان جملہ مذکورین پر جائز ہے، اگر اوسط درجہ کی مقدار زمین کرنے میں اختلاف ہو جائے تو اراکین شوریٰ آپس کے مشورہ سے کوئی مناسب مقدار طے کر کے اس کا اختیار متمم کو دے دیں۔

یہ حکم چندہ ہی کی رقم ہونے کی صورت میں ہے، اگر وقف کی آمدنی ہو تو منشأً واقف کا لحاظ کرنا بھی ضروری

۱- (وجاز إجارة بیت إلی قوله لیخلد بیت دار أو کبسة أو بیعة أو یباع فیہ الخمر، وقال: لا یمبغی ذالک، لأنه إعماله علی المعصية وبه قالت الفلاح) قال الشافعی تحت قوله "وجاز إجارة بیت" هذا عنده أيضاً: لأن الإجارة علی مفعة البيت ولهذا یجب الأجر بمجردة المسلم ولا معصية فیہ، وإنما المعصية بفعل المسافر وهو مخار، فیقطع لیسبه عنه الخ" فتاویٰ ثانی ۵۱/۲ فصل فی البیع (مرتب)۔

ہو جائے گا اور خلاف منشا واقف کرنے کا اراکین یا متمم کو اختیار نہ ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۷/۱۴۰۱ھ

سینما ہال وغیرہ کی کمائی مدرسہ یا مسجد میں لگانے کا حیلہ شرعی:

زید ایک سینما ہال کا مالک ہے اور وہ فلم کی ریل منگوا کر فلم بھی چلاتا ہے، اس طرح کی کمائی ہوئی دولت، مکانات، کھیتیاں اور نقد روپیہ کی شکل میں رکھتا ہے، آٹھ دس سال سے باقاعدہ بیج گانہ نماز ادا کرتا رہتا ہے، حاجی ہے، مگر ذریعہ معاش سینما ہال اور کھیتوں کی آمدنی ہے، کھیتیاں وغیرہ بھی سینما ہال کی آمدنی سے ہی خریدی گئی ہیں، نیز وہ سینما ہال کا دھندا چھوڑ کر کوئی اور تجارت کرنے کی جدوجہد بھی کر رہا ہے، مگر لاکھوں روپیہ مذکورہ تجارت میں پھنسا ہوا ہونے کی وجہ سے جلد علیحدہ نہیں ہو سکتا ہے، اب وہ چاہتا ہے کہ ایک مدرسہ کھولے جہاں دینیات، حدیث و تفسیر اور ابتدائی علوم دینیہ پڑھائے جائیں، بچوں کے لیے ایک قیام گاہ اور ایک مسجد بھی تعمیر کی جائے، اب سوال یہ ہے کہ آیا زید کی اس آمدنی سے زید کا مدرسہ کھولنا، مسجد تعمیر کرنا جائز ہے اور جائز نہ ہونے کی صورت میں اس کی لاکھوں روپیہ کی دولت کی تطہیر کی شریعت مطہرہ میں کوئی صورت ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

ان روپیوں سے براہ راست مدرسہ وغیرہ کی تعمیر نہ کریں بلکہ کسی سے قرض لے کر تعمیر کر لیں اور وہ قرض ان روپیوں سے ادا کر دیں۔

اگر کسی غریب سے جو مصرف صدقہ ہے کہیں کہ تم اتنے روپے کسی سے قرض لے کر مجھے بطور اعانت مدرسہ میں چندہ دے دو، میں تمہارا قرض ادا کر دوں گا اور اس کو اطمینان دلا دیں، وہ غریب شخص کسی سے قرض لے کر دیدے اور پھر یہ شخص اسی پہلے روپے سے اتنا روپیہ بطور صدقہ اس غریب کو دے دے جس سے وہ اپنا قرض ادا کر دے تو اس طرح تطہیر بھی اتنے صدقہ کردہ روپیہ کی ہو جائے گی (۲)، اس روپیہ سے جو کھیت خریدی ہے، اگر اس کو اجارہ یا لگان پر دے گا تو اس کا نفع بھی صدقہ کرنا ہوگا، ہاں اگر اس کھیت میں خود کاشت کرے اور کھیتی کرے اور اپنی محنت سے جو غلہ کی پیداوار ہوگی وہ حلال ہوگی،

۱- "لأن مراعاة غرض الواقفين واجبة" (رد المحتار ۳/۲۲۳)۔

۲- "والجدة أن يصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء" (الدر المختار ۲/۲۳ کتاب الزکوۃ)۔

اس کا کھانا درست رہے گا، پس اس سابق حاصل کردہ روپیہ سے ہزار ڈیڑھ ہزار یا جتنا ہو سکے اراضی خرید کر اس میں اپنا فارم بنا کر کھیتی کرے اور پیداوار حاصل کرے اور اس کو اپنا ذریعہ معاش بنالے اور تھوڑا تھوڑا حسب موقع بغیر نیت ثواب محض وبال سے بچنے کے لیے صدقہ بھی کرتا رہے، تو انشاء اللہ ذریعہ بھی پاک رہے گا اور تطہیر بھی ہو جائے گی، جب کہ اس طرح کمائے ہوئے روپے کی مقدار صدقہ ہو جائے گا، صدقہ کرنے میں جو مدرسہ کھولے گا اس کے اندر غریب و مسکین طلبہ کے کھانے، کپڑے پر بھی خرچ کرنا درست ہوگا (۱)۔

سینما ہال اگر حرام روپے سے نہیں بنو یا ہے بلکہ پاک روپے سے بنا ہوا ہے تو اس میں صرف سینما خود چالانا بند کر کے اس کو کرایہ پر دے دینا کافی ہوگا جو کرایہ ملے گا وہ طیب ہوگا اور اگر سینما ہال بھی حرام ہی روپیہ سے خریدا ہے تو اس کی خرید کی قیمت کے برابر اسی طرح اور جو مکانات ہیں ان کی قیمت کے برابر بھی جب تصدق کر دے گا تھوڑا تھوڑا کر کے تو وہ بھی طیب ہوگا اور اس کے کرایہ وغیرہ کی آمدنی بھی حلال ہو جائے گی، البتہ ریل کوفر وخت کر دے اور اس نا جائز کاروبار کو ختم کر دے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۸/۱۲/۱۳۹۰ھ

موقوفہ مدرسہ کا کچھ حصہ یتیم خانہ کو دینے کا حکم:

مدرسہ تفریشیہ مظفرنگر ایک عرصہ سے بنا پڑا تھا، حاجی عبدالغنی نے اس کو بنام مدرسہ اسلامیہ عربیہ مراد یہ وقف کر دیا، چنانچہ مدرسین مدرسہ اسلامیہ عربیہ مراد یہ مظفرنگر میں درس و تدریس کا کام کر رہے ہیں اور بیرونی طلباء بھی اس میں رہتے ہیں واقف نے وقف نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ مکان مدرسہ کا کوئی جز کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا، سوائے تعلیم دین کے اس میں کوئی مشغلہ نہیں ہو سکتا، اب حال میں یتیم خانہ مظفرنگر کے مہتمم نے واقف سے یہ کوشش کی کہ مدرسہ موقوفہ کا اوپر کا حصہ یتیم خانہ کو دیدیا جائے، اس یتیم خانہ میں زیادہ تر انگریزی کی تعلیم ہوتی ہے، واقف مذکور اب کہتا ہے کہ اوپر کا حصہ یتیم خانہ کو دیا جائے، اس صورت میں مدرسہ موقوفہ کا کوئی حصہ یتیم خانہ کو دیدینا جائز ہے یا نہیں؟ درآں حالیکہ وہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ مراد یہ مظفرنگر

۱- ”و اما اذا كان عند رجل مال خبيث فاما ان ملكه بعقد فاسد او حصل له بغير عقد ولا يمكنه ان يردده الى مالكه ويريد ان يدفع مظلومه عن نفسه فليس له حيلة الا ان ي دفعه الى الفقراء“ (بذل الخلود ۳۷ کتاب الطہارت)۔ ویروا ویلھا علی اربابھا ان عرفوہم والا تصدقوا بھا لان میل الکسب الخبیث التصدیق اذا علم الرود علی صاحبه (فتاویٰ رضوی ۵/۲۲۵ فصل فی التبیح) ”ای مصدق بھا بلا لیلۃ القواب لما ینوی بہ برائۃ الدمۃ“ (مرتب)۔

کے نام کل کا کل وقف ہو چکا ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

واقف نے جب مدرسہ مراد یہ منظر نگار پر وقف کر دیا اور وقف مکمل ہو گیا تو اب واقف کو اختیار نہیں کہ اس وقف کو سوخت کرے یا اس کا کوئی حصہ مدرسہ مذکور کے علاوہ کسی اور مصرف میں استعمال کرے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۱۰/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

مدرسہ کے لئے وقف زمین پر مسجد و عید گاہ کی تعمیر:

ہمارے جوار میں ایک صدی پہلے ایک مدرسہ کے لئے کچھ اشخاص نے زمین وقف کی اور ان کی اولین نیت صرف مدرسہ کی تھی پھر اس موقوفہ زمین پر مدرسہ بنا اور پھر مطبخ اور دارالطلباء بنا پھر اس زمین میں مسجد بھی بنی اور اس زمین میں درخت بھی لگوائے گئے اور پھر عید گاہ بھی بنی، اس وقف میں کوئی تحریر شرائط وقف کے لئے نہیں تھی صرف زبانی وقف ہوا اور جوں جوں مدرسہ ترقی کرنا گیا کمرے بنتے گئے، اسکے بعد دیگر مدارس بنے اور وقف کنندگان کی اولین نیت صرف مدرسہ تھی، لیکن اس میں بھی جوں جوں ترقی ہوئی مطبخ دارالطلباء مسجد اور عید گاہ کا احاطہ بھی بنا لیکن وقف کنندگان کے تصور میں مدرسہ سے متعلقہ عمارات مطبخ، دارالطلباء، مسجد اور عید گاہ بھی رہی جیسا کہ ماقبل کے مدرسہ میں ہوا۔

تو اب مسجد اور عید گاہ کی تعمیر جائز ہوئی یا نہیں اور عید گاہ کا احاطہ طلباء کی تعلیم کے لئے حسب موسم استعمال ہوتا رہا، اس طرح ایک مدرسہ کے لئے ماضی قریب میں زمین وقف کی گئی اور اس میں عید گاہ کا احاطہ بھی بنا اور وقف کنندگان کے کچھ افراد نے عید گاہ میں ایٹ گارے وغیرہ میں امدادی حالانکہ عید گاہ کی چار دیواری ایک ہی شخص نے اپنے خرچ سے بنایا تو اس میں عید کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

نوٹ: (۱) زمانہ ماضی میں عوام کے ذہنوں میں اگرچہ صرف مدرسہ ہوتا تھا لیکن مدرسہ کے متعلقات یعنی مطبخ، دارالطلباء، مسجد، عید گاہ وغیرہ عمارتیں ان کے تصور میں ہوتی تھیں، اس طرح آج کل بھی مدرسہ کی تحریک سے متاثر ہوتے ہیں

۱- کافی الدرر مع الشای ۳۶/۳، ”وعدہما ہو حبسہا علی حکم ملک اللہ تعالیٰ“ و صرف منفعہا علی من احب ولو غبا فلیزم فلا یجوز له بطلالہ“ (الدر المختار علی الرد ۳۹۵/۳، مطبوعہ عثمانیہ)۔

اور ان کی اولین نیت مدرسہ ہوتی ہے اور اپنے آباء و اجداد کی طرح ان کے تصورات بھی رہتے ہیں، زمانہ گزشتہ میں مدرسہ کے نام و کام سے جو زبانی وقف ہوتا تھا کچھ دنوں کے بعد بلکہ وقف کنندگان میں کچھ لوگ فوت ہو جاتے تھے، باقی وقف کنندگان کی تحریک سے موقوفہ زمین میں مسجد عید گاہ بنتی تھی۔ یعنی مسجد عید گاہ اور خالی زمین میں زراعت برائے مدرسہ اور درخت برائے مدرسہ کو لوازمات مدرسہ سے تصور کرتے تھے اور آج کل بھی وہی حالت ہے۔

نوٹ: اگر تحریری وقف نامہ لکھا جائے اور صرف مدرسہ کا ذکر ہو تو پھر اس موقوفہ زمین میں مسجد یا عید گاہ بنائی جائے تو کیا جائز ہے بنائے تصور بالا جواب دے کر ممنون فرمائیے۔

ماہر رہبر علی (دودھارا، جلد ہستی)

الجواب وبالله التوفیق:

مدرسہ پر وقف کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ مدرسہ اور مدرسہ کی ضروریات پر وقف ہے اور مدرسہ کی ضروریات میں جس طرح درس گاہیں ہوتی ہیں، اسی طرح مطبخ و دارالاطباء، دارالافتاء اور مسجد مدرسہ سب ضروریات و متعلقات مدرسہ میں شمار ہو کر ان سب چیزوں کا بنانا و تعمیر کرنا کوئی بھی واقف کی منشاء کے خلاف نہ ہوگا (۱)۔

اسی طرح مدرسہ کی آمدنی بڑھانے کے لئے فاضل زمین پر بھیجی کر لینا یا باغ لگا کر اس کا نفع طلباء و مدرسہ پر خرچ کرنا یا اس فاضل زمین پر نماز عیدین وغیرہ ادا کر لینا سب درست رہے گا۔ ان میں سے کوئی چیز منشاء واقف کے خلاف ہو کر ناجائز نہ ہوگی، البتہ نماز عید اگر باغ یا مغازہ کی شکل ہوتے ہوئے ادا کر لیا تو ٹھیک ہے باقی اس پر عید گاہ کی عمارت تعمیر کر دینا یہ صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ عید گاہ کی عمارت بھی وقف ہوتی ہے اور یہ عمارت ضروریات مدرسہ میں سے نہیں ہے اور جو چیز موقوفہ ہوتی ہے، اس کو پھر وقف کرنا درست نہیں ہوتا جب یہ زمین ایک دفعہ مدرسہ کے لئے وقف ہو چکی تو اب اس کو عید گاہ کی عمارت کے لئے وقف کرنا صحیح نہ ہوگا (۲)۔

ہاں اگر واقف نے شروع وقف میں ہی اس کی اجازت دیدی ہو یا وقف نامہ کی عبارت سے اجازت نکلتی ہو تو

۱- ”وإذا جعله مرسداً لمصالحه أي المسجد جاز“ (الدر المختار مع رد المحتار ۶/۵۳۷)، ”لو بنی فوقہ بناءً للإمام لا یضرب لایہ من المصالح“ (الدر المختار مع رد المحتار ۶/۵۳۸)۔

۲- ”فإذا لم یلزم لا یملک ولا یعار ولا یرهن“ (الدر المختار) ”لا یملک ای لا یکون مملوکاً لصاحبه ولا یملک ای لا یقبل التملک لغيره بالبیع والحوہ“ (رد المحتار علی الدر المختار ۶/۵۳۹)۔

دوسری بات ہوگی اور یہ حکم ہر دو صورت کا ہے کہ یہ عید گاہ کی عمارت موقوفہ مدرسہ پر بنانا جائز نہیں ہوگا خواہ کوئی اپنے ذاتی روپے سے بنائے یا مدرسہ کے پیسے سے بنائے البتہ ایسی عید گاہ میں جو نمازیں ادا کی جائیں گی ادا ہو جائیں گی۔

نوٹ: واقف نے زبانی یا تحریری کوئی شرط لگا دی ہو تو ”شرط الوقف کنھ الشارع فی المفہوم والدلالة ووجوب العمل بہ“ (۱) کے مطابق اس کی اتباع و رعایت ضروری ہوتی ہے، اور اگر واقف نے کوئی شرط نہیں لگائی ہے نہ زبانی نہ تحریری، لیکن اس کے زمانہ میں جو عمل ہوا ہے اس سے اس کے منشاء مرضی کا استنباط جہاں تک ہو سکے وہیں تک وسعت کی جائے گی یا پھر اس کے منشاء وقف سے زیادہ مستحسن منشاء وقف ہوا اور عندا شرع احسن منہ ہو تو اس کا اعتبار کیا جائے گا ورنہ نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پور ۲۸/۸/۱۴۰۲ھ

سفرائے مدارس کا حکم:

ہمارے مدرسہ کے بعض علماء کو رمضان میں وصولی چندہ کے سلسلے میں مختلف علاقوں میں بھیجا جاتا ہے جن کی تنخواہ کی یہ صورت ہوتی ہے کہ اس مخصوص مبلغ تک اگر چندہ وصول کیا تو ماہواری جو تنخواہ رہتی ہے اس کا ڈٹل دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر مخصوص مبلغ میں مخصوص انعام دیا جاتا ہے۔ مثلاً ہر ہزار میں سو روپیہ انعام تو اس طریقہ سے تنخواہ متعین کرنا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہ ہو تو صحیح جواز کی کیا صورت ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مدارس میں موجود سفارت کا معاملہ جو فیصد پر طے ہوتا ہے، کئی وجہ سے ناجائز و نام درست ہے۔ شروع معاملہ میں جس وقت کوئی مقدمہ موجود ہی نہیں تو اس کا فیصد مقرر کرنا باطل اور یہ معاملہ شرعاً باطل منعقد ہوگا۔ اور اگر معاملہ اس طرح کیا جائے کہ جب وصولی ہو جائے گی تو وصولی کا یہ فیصد لیا جائیگا تو اس صورت میں حدیث فقیر طحان کی مخالفت کی وجہ سے یہ معاملہ شرعاً فاسد ہوگا۔ اور اہل مدارس کا ہی کیا کہ اگر اس طرح معاملہ نہ کیا جائے تو مدرسہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ اکثر وصولی سفراء ہی

کی نظر ہو جاتی ہے، تاہم لحاظ ضرورت ہے اور اس کا مدار اس طرح ہو سکتا ہے کہ معاملہ اس طرح کیا جائے کہ سفراء کی سابق کارکردگی کے اعتبار سے ان کی تنخواہ خشک بھتہ و سفر خرچ وغیرہ کے ساتھ مناسب ہو، مقرر کردی جائے اور ان سے کہا جائے کہ آپ جملہ وصولی مدرسہ میں بھیجتے جائیں اور مدرسہ کی تحویل میں ڈالتے جائیں اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا جائے کہ جب معاملہ ختم کر کے آپ مدرسہ میں آئیں گے تو آپ کی کل وصولی تحویل مدرسہ میں منتقل ہو جائے گی و مع الخلط استہلاک وہ ضابطہ کے مطابق مدرسہ کی ہو چکی، اب آپ کے حلقہ وصولی کے اعتبار سے جب تک اس مقدار کے اندر رہے گی آپ کو صرف تنخواہ ملے گی، ہاں جب اس مقدار سے زیادہ ہوگی تو آپ کو اتنا فیصد انعام بھی ملے گا۔ اس طرح سفراء کی ہمت افزائی ہو کر زیادہ سے زیادہ وصولی بھی ہوگی اور مدرسہ مذکور بالا خطرہ کے احتمال سے محفوظ رہے گا اور معاملہ بھی شرعاً بالکل درست و صحیح ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بلا تعدی مدرسہ کی رقم سفراء سے گم ہو جائے تو کیا حکم ہے؟

۱- ساجد نے مدرسہ کی طرف سے برائے فراہمی مالیہ سفر کیا اور مدرسہ سے تاکید کردی گئی تھی کہ جس شہر کا کام مکمل ہو جائے اس کی رقم دوسرے شہر کے سفر سے پہلے بھیج دیں اس کے باوجود ساجد نے دوسرے شہر کا رخ کر لیا اور دوسرے شہر کی مسجد میں کریم نکال کر سو گیا ابھی بیدار ہی تھا کہ کسی ہنگامہ کی صورت میں مسجد کے کسی دوسرے گوشہ کی طرف بھاگا۔ اور کرتہ سابق جگہ ہی بھول گیا۔ جب ہنگامہ فرو ہوا اور اپنی جگہ واپس آیا تو اس کی جیب خالی ہو چکی تھی روپیوں کی اور یہ نفس واقعہ کی صداقت کی تصدیق وہاں کے مقامی ذمہ داروں نے بھی کی ہے۔ اور ساجد کے حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب گمان یہی ہے کہ اس نے کذب بیانی سے کام نہیں لیا ہے اور واقعہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

کیا صورت بالا میں ساجد کو وہ رقم مدرسہ کو ادا کرنا چاہئے یا نہیں، کیا مہتمم مدرسہ یا ذمہ داران مدرسہ کو معاف کرنے کا حق ہے؟

۲- راشد نے اسی طرح سفر کیا اور تمام رقم اپنے ہمراہ لے کر واپس آ رہا تھا۔ ریل میں کسی نے اس کو مٹھائی کھلا دی اس کے بعد اس کو بیہوش ہو گئی اور سارا روپیہ اس کی جیب سے نکال لیا گیا، کافی دیر کی بیہوشی اور بگڑی حالت میں جی۔ آر۔ پی۔ والوں نے ٹرین سے اتار کر علاج و معالجہ کر لیا۔ اور تصدیق نامہ بھی دیا۔ اور بعض ذرائع سے نفس واقعہ کے پیش نظر

ان کی تصدیق ہوتی ہے اور کبھی راشد مذکور سے خیانت کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ہے اور وہ مدرسہ کا ملازم بھی نہیں ہے اور کوئی صاحب جائیداد یا باضابطہ ملازمت پیشہ بھی نہیں ہے، بلکہ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ فی الوقت وہ رقم ادا نہیں کر سکے گا، آئندہ بھی مستقبل قریب میں ادائیگی کی توقع مشکل معلوم ہوتی ہے۔

اس صورت میں از روئے شرع و انتظام کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے۔

۳۔ صورت بالا میں مزکی کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا، کیا اس کو دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنا ہوگا؟

یہ بات پیش نظر رہے کہ سیکڑوں چندہ دہندگان کو مطلع کرنا ایک امر مشکل اور مزید مشقت کا باعث ہے، علاوہ اس کے علماء اور مدارس کے ساتھ عوام و اہل خیر کو جو سوء ظن پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے بہت سے اس پر اعتماد نہ کر سکیں گے، اگر کبھی لیں تو اندیشہ ہے کہ آئندہ مدرسہ ہذا کو چندہ ہی دینا بند کر دیں اور بے اعتمادی ہو جاوے، ایسے میں ناظم مدرسہ کو کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جب ذمہ داران مدرسہ نے طریق کار کی تاکید پر ہدایت کردی تھی اور ان سفراء نے اس کے خلاف کیا تو ان سفراء پر شرعاً ضمان واجب الاداء ہو گیا۔ اور ذمہ داران کا مدرسہ کی رقم سے ضمان ادا کرنا یا اس کو معاف کرنا کچھ بھی درست نہیں۔ جب ان سفراء کا دیا نذر ہوا اور ان کا خیانت نہ کرنا اور معذور ہونا عوام کے نزدیک بھی ثابت ہے تو عوام کو ان کی طرف سے چندہ کر کے وہ رقم مدرسہ میں دیدینا چاہئے۔

اب رہ گیا یہ اشکال کہ اس تدبیر سے بھی زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ کیسے ادا ہوگی تو ایسی صورت کا اصلی حکم تو یہی ہے کہ زکوٰۃ صدقات واجتہ امتلیک رقم دینے والوں کو مطلع کر دیا جائے، تاکہ وہ لوگ معاف کر دیں ضمان نہ لیں اور صحت ادا کے لئے دوبارہ رقم دے دیں، لیکن اس صورت میں وہ اشکال بھی ہے جو استفتاء میں درج ہے اور ان سب اشکالات اور بدنامیوں سے مدارس دینیہ کے بقاء و انقیاد کے لئے تحفظ بھی واجب ہے اور خاص کر ہندوستان جیسے فساد والے ملک میں، اس لئے ضابطہ شرعیہ (بختار اھون البلیتین) کے مطابق عوام کے چندہ سے اس رقم کو پورا کر لینے کی شرعاً گنجائش نکلے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نوٹ: اگر اراکین مدرسہ غیر مناسب نہ سمجھیں تو روئیداد میں بطور نوٹ یہ جملہ بھی درج کر دیا جائے کہ آج کل فسادات کی کثرت سے راستہ میں رقوم کی بلکہ بعض اوقات سفراء کے ضیاع کا بھی خطرہ زیادہ رہتا ہے، اس لئے ایسے ضیاع کے وقت میں مقامی مخیر حضرات سے اسی ضائع شدہ رقم کی ادائیگی صحیح ہو جانے کے لئے چندہ کر کے معطلی حضرات کی جانب سے دے دیا جائے گا تا کہ ادائیگی سب کی صحیح ہو جائے۔

ہاں اگر کسی صاحب کو اس سے اتفاق نہ رہے تو مطلع کر دیا جائے، تا کہ وہ دوبارہ ادا کر کے اس کو صحیح کر لیں ایسا کرنے سے سب دشواریوں اور بدنامیوں سے حفاظت ہو جائے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

سفیر سے مدرسہ کی رقم گم ہو جانے کا کیا حکم ہے؟

مجھے مدرسہ کے فرامی چندہ کے لئے قصبہ گلاؤنچی اور شہر میرٹھ سے فراغت کے بعد قصبہ سکندر آباد (بلند شہر) جانا تھا، شام کا وقت اور کچھ بارش کا موسم تھا اور مزید برآں یہ کہ مذکورہ سکندر آباد قصبہ اپنے لئے بالکل نیا اور اجنبی تھا، وہاں رات میں کسی وقت پہنچا جانا پہنچنے کے بعد نہ معلوم کہاں قیام ہوتا، اس لئے بہتر سمجھا کہ گلاؤنچی میں اپنے جانے پہچانے سابق ائین جناب حافظ عبدالجبار صاحب امام مسجد مقبرہ والی کے پاس دو تین روز کے لئے موجودہ وصولیابی مبلغ چھ سو (=600) امانت رکھ دینے جائیں، چنانچہ اس خیال سے شام قریب ۶ بجے متوکل علی اللہ ہو کر وہ رقم موصوف کو سپرد کردی اور یہ رقم ایسی تنہائی میں سپرد کی تھی کہ انسان تو علیحدہ کوئی پرند بھی پر نہیں مار رہا تھا مراد ہے بالکل تنہائی تاکہ کوئی نہ لے لے نیز یہ معاملہ کوئی پہلا نہیں تھا بلکہ اس سے قبل ان کے پاس کئی کئی ہزار کی رقم رکھتا رہا ہوں اور الحمد للہ محفوظ ملی آج تک کوئی کھٹک نہیں ہوا مگر تقدیر کہ محنت و مشقت کی وہ رقم مدرسہ کے نصیب سے اترنے والی تھی، افسوس کہ وہ رقم حافظ صاحب کے کچھ پیسوں کے ساتھ کمرہ کے اندر کسی خاص ڈبہ سے چوری ہو گئی، یہ خبر احقر کو سکندر آباد کے قریب واپس آتے ہوئے ملی، سنتے ہی اس خون پسینہ کی وصولیابی کے ضائع ہو جانے پر طبیعت اتنی متاثر ہوئی کہ ہاتھ پاؤں تک کی روح جاتی رہی، ہوش و حواس نے ساتھ چھوڑ دیا اللہ اللہ کر کے ان حافظ صاحب کے پاس پہنچا وہاں اس کا ایک شور تھا کہ مقبرہ والی مسجد میں اس طرح چوری ہو گئی انا اللہ وانا الیہ راجعون اسی پریشانی میں وہاں کئی روز تحقیق و تجسس میں ناکامی کے بعد حافظ صاحب کو بڑی خوش آمد در آمد کر کے یہاں (دفتر مدرسہ میں) لایا، مہتمم صاحب اور بھائی محمد ہاشم صاحب اور بھائی عبدالملک صاحب اور مولانا محمد سعید صاحب صدر مدرس وغیرہ

ذمہ داران مدرسہ سے بالمشافہ بات چیت کر اگر تحریر ان کی تائید بھی پیش خدمت ہے۔

عبد محمد سمیل تاسی

سایم مسنون! بندہ کی اسی سلسلہ میں حاضری ہوئی مذکورہ بالا تحریر واقعہ کے عین مطابق ہے۔

عبد الجبار (امام مسجد مقبرہ والی گلاؤنچی)

الجواب وبالله التوفیق:

نوٹ: نفس جواب سے قبل تسہیل فہم کے لئے چند فقہی عبارتیں نقل کی جاتی ہیں:

۱- وعن محمد بن حفظها بمن يحفظ ماله كوكيله وما ذونه وشريكه مفاوضة وعنانا جاز وعليه الفتوى (۱)۔

۲- قوله لأن الظاهر أنه يلتزم حفظ مال غيره على الوجه الذي يحفظ مال نفسه وهو إنما يحفظ ماله بمن في عياله فيجوز أن يدفع إليهم الوديعة وعن هذا قيل: العيال ليس بشرط فإنه روى عن محمد أن المودع إذا دفع الوديعة إلى وكيله وهو ليس في عياله أو دفع إلى أمين من أمنائه ممن يثق به في ماله وليس في عياله أنه لا يضمن (۲)۔

۳- فكان المالك.. الخ.. أقول فيه شئ (المراد قوله) فالظاهر أن مدار ذلك هو الضرورة كما هو المفهوم من قوله ولأنه لا يجد بداً من الدفع إلى عياله، فالأولى أن يترك فكان المالك راضياً به (۳)۔

اب اس کے بعد اصل جواب معروض ہے:

سول میں ہے کہ گلاؤنچی میں شام کا وقت ہو چکا تھا، اگر وہاں بینک بھی ہو تو بھی شام کو بینک بند ہو چکے ہوتے ہیں، اس میں محفوظ کرنے کا کوئی سول نہیں ہے اور سکندر آباد قصبہ بالکل نیا اور اجنبی تھا اور حافظ عبد الجبار صاحب جانے پہچانے

۱- درمختار علی الشارح ۳/ ۶۸۷۔

۲- عنایہ علی ہاشم فتح القدیر ۷/ ۵۳۳۔

۳- فتح القدیر ۷/ ۹۰۔

معتمد شخص تھے اور معاملہ بھی پہلی بار کا نہیں تھا جیسا کہ اس خط کشیدہ الفاظ (یہ معاملہ کوئی پہلا معاملہ نہیں تھا بلکہ الخ) سے معلوم ہوتا ہے اس لئے عبارت ۱ و ۲ و ۳ سے بالخصوص عبارت نمبر ۲ کے خط کشیدہ حصہ سے ظاہر ہے کہ سفیر موصوف پر کوئی ضمان نہیں۔

علاوہ ازیں جب سفیر مذکور کا بار بار کا یہ طریقہ تھا تو یہ طریقہ قرینہ ہے کہ معطیان چندہ اور اہل مدرسہ دونوں کو یا اس میں سے کسی ایک کو اس طریقہ کا علم تھا پھر کوئی اعتراض یا تکیر نہ کرنا ان کے اذن حال پر دل و سقوط ضمان کا موبد ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پتہ ۱۹/۱۰/۱۴۰۰ھ

مدارس و مکاتب میں چرمہ تر بانی خرچ کرنے کا حکم:

ہمارے علاقہ میں قریب قریب اکثر دیہات میں مکاتب قائم ہیں جن میں کچھ سرکار سے منظور شدہ ہیں کچھ غیر منظور شدہ ہیں، نصاب تعلیم ہندی، انگلش، حساب تو سرکاری نصاب کے مطابق ہے، البتہ اس کے ساتھ مائظہ قرآن و تعلیم الاسلام وغیرہ بھی داخل نصاب ہے۔ ان مکاتب کے لئے عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک عام فضاء قائم ہوگئی ہے کہ ہر گاؤں والے اپنے یہاں کی چرمہ تر بانی کو فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے اپنے مکتب کے مدرسین کی تنخواہ میں اور تعمیرات فرش وغیرہ میں خرچ کرتے ہیں، انہیں مدرسین میں سے بعض نے عوام کو مسئلہ بتلا رکھا ہے کہ مدرسہ کو کھال بیچ کر پیسہ نہ دیں، بلکہ کھال ہی دیں، کھال اور قیمت دونوں میں فرق ہو جاتا ہے، کھال دینا درست ہے، قیمت درست نہیں، عوام مسئلہ کو سن کر مدرسہ کو کھال ہی دیدیتے ہیں، مہتمم مدرسہ کی ذاتی ملکیت میں دینے کو کوئی شخص بھی تیار نہیں، اگر مہتمم کو دیتے ہیں تو وہ بھی برائے مدرسہ ہی دیتے ہیں، کمیٹی مدرسہ ان کھالوں کو فروخت کر کے مدرسہ پر خرچ کر دیتی ہیں، نیز ان میں پڑھنے والے بچوں کے طعام کا انتظام اس طرح کیا جاتا ہے کہ ایک ایک بچہ کوئی گھر دے دیا جاتا ہے، چنانچہ ان بچوں پر وہ پیسہ صرف نہیں کیا جاتا۔

ازروئے شرع شریف فرمائیں کہ ہمارا ایسے مکاتب کو تر بانی کی کھال دینا اور کمیٹی و ذمہ داران کو ان کو فروخت کر کے مدرسین کی تنخواہوں میں تعمیرات میں خرچ کرنا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

یہ مکاتب سرکار سے منظور شدہ ہوں یا غیر منظور شدہ ہوں اگر علوم دینیہ کی تعلیم اصل مقصود بالذات ہے اور حساب و کتاب اور علوم دنیوی کی تعلیم محض بقدر ضرورت اور تبعاً ہوتی ہے تو سب کو مکاتب دینیہ شمار کریں گے اور سب کو قائم کرنا اور ان کو ترقی دینا باشارہ آیت کریمہ ”یا ایہا الذین امنوا اقوا انفسکم و اہلیکم نارا“ (۱)، واجبات اصلیہ میں سے ہے اور قوم پر ضروری ہے کہ اپنے عطیات و صدقات نافلہ سے اس کی بھرپور خدمت کریں، لبتہ صدقات واجتہ التملیک میں جیسے زکوٰۃ وغیرہ اور قیمت چہ متربانی اور ان کی رقوم کو ایسے کتب میں دینا جن میں اس کا مصرف مسلمان غریب بچے جو مستحق صدقہ اور زکوٰۃ نہ ہوں دینا درست نہ ہوگا، ان رقوم کو صرف ان مکاتب میں دینا درست رہے گا جن میں ان مستحق طلبہ کو کھانا کپڑا اور رقوم تملیک دینا جاتی ہوں کہ اس کے ذمہ داران تملیک مستحق کر سکیں اور تملیک مستحق کے بعد پھر جس مصرف میں خرچ کرنا ہو خرچ کریں۔

پس اگر کوئی مہتمم مدرسہ اس درجہ معتمد نہ ہو کہ چہ متربانی کی قیمت اس کو تحفہ یا ہدیہ وغیرہ دیا جائے تو وہ مقاصد مکاتب دینیہ کے مطابق صحیح خرچ کر سکے تو دینا درست نہ ہوگا، بلکہ اراکین کے ذمہ لازم رہے گا کہ وہ ان کھانوں کو فروخت کر کے جیلہ تملیک کے بعد جس کام میں چاہیں خرچ کریں، کیونکہ یہ رقم واجب التصدق ہے، بطور ہدیہ مدارس میں دینا کافی نہ ہوگا اور نہ ذمہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی ہوگا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جن مدارس و مکاتب میں غریب نادار طلباء ہوں، مگر ان کو کھانا کپڑا وغیرہ تملیک نہ دیا جاتا ہو، بلکہ کھانے پینے وغیرہ کا انتظام اہل محلہ پر ہو۔ ان میں بھی ان طلباء کے بہانے سے یہ رقوم دینے سے دینے والوں کا ذمہ بری نہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، بہار، پورہ ۱۵/۱/۱۳۱۱ھ

جس مدرسہ میں اسلامی کام نہ ہو اس میں چندہ دینا:

کسی گاؤں میں اسلامی طور پر ایک مدرسہ قائم کیا گیا ہو اور وہ اسلامی کام نہ کر رہا ہو اور ہندی کی ترقی کر رہا ہے اور سرکار کی طرف سے ڈپٹی صاحب جانچ کے لئے آئے ہوں اور جے جے کے نعرہ لگاتے ہوں اور مدرسہ والا مہتمم صاحب یا صدر

صاحب اسلامی نام لے لے کر چندہ کرتے ہوں، دریافت ہے کہ ایسی شکل میں جہاں گاؤں والوں سے اسلامی مدرسہ بنلا کر چندہ کرتے ہوں کیا ایسے مکتب میں چندہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

محض اسلامی مدرسہ نام رکھنے سے کوئی مدرسہ اسلامی نہیں ہوتا ہے جب تک اس میں اسلامی طور پر کام بھی نہ ہو غرض ایسے مدرسہ میں زکوٰۃ، صدقہ فطر، چہر مہربانی کی قیمت اور جتنے صدقات واجبہ جنکا مسلمان غرباء و مساکین کو مالک بنانا واجب ہے (۱)، اور بغیر ان غرباء و مساکین کے مالک بنائے ادا نہ ہوتے ہوں اور وہ اس مدرسہ میں نہ ہو تو نہ دے، اگر کوئی کچھ دینا ہی چاہے تو نقلی چندہ دے یہ سب نہ دے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عہد

جماعت اسلامی کے مدرسہ میں چندہ دینا:

ایک قریہ میں ایک مدرسہ عربی جو عرصہ سے دین محمدی عربی کی تعلیم سے بچوں کو سیراب کر رہا تھا اور یہ ادارہ جماعت اہل سنت کے ماتحت تھا، اب کسی وجہ سے اس پر جماعت اسلامی کے کارکنان کا تسلط ہے اس میں انہی کا نصاب چل رہا ہے، قرآن شریف کے کچھ بچے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ جو حضرات خیرات چندہ دیں وہ اس مدرسہ میں دیں یا اور کسی ادارہ میں اپنا روپیہ لگا کر ثواب دارین حاصل کریں آیا اس میں دینے سے ان کو ثواب ملتا ہے یا کہ نہیں ان کی نیت خدمت دین اور ثواب مد نظر ہے اگر اہل قریہ ایسے مدرسہ میں اپنا چندہ دیں تو ان پر کوئی تو حرج نہیں ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

جماعت اسلامی کے تسلط سے بچانے کی تدبیر کرتے رہیں اور اس سے بے تعلق نہ ہوں اور جب تک دینی تعلیم

۱- ”لو خلد من اعبائہم فورد الیٰ فخرانیہم“ (رواہ الجمعۃ نیل الاوطار ۲/۱۱۴)۔

۲- دیکھئے البدائع ۲/۱۶۱ مکتبہ زکریا دیوبند۔

ہوتی ہے اس میں چندہ دینے سے ثواب ملے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود علی عند

مدرسہ کی موقوفہ زمین پر اسکول بنانا:

مدرسہ دینیہ کے لئے زمین لی گئی اس میں لڑکیوں کا انگریزی تعلیم کے لئے اسکول بنانا کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

مدرسہ دینیہ کے لئے تعلیم دینے کی تصریح کیساتھ جو چندہ لیا گیا کہ اس سے مدرسہ دینیہ کے لئے زمین خریدی جائے گی اور اس سے جو زمین خریدی گئی اس پر محض دینی تعلیم کے لئے اسکول بنانا خواہ اسکول انگریزی ہو یا غیر انگریزی ہو درست نہیں "شرط الوقف کنھ الشارح" (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۴/۱۴۰۳ھ

باب ما یعلق بأحكام المقابر

متروکہ قبرستان میں مسجد کی توسیع کرنا:

ایک قدیم مسجد ہے اس کے ارد گرد قبریں ہیں، مسجد کے سامنے بھی قبرستان ہے اور دونوں طرف چند قبریں ہیں، مسجد کی طرح قبرستان بھی بہت قدیم ہے، ساٹھ، ستر سال سے اس میں تدفین نہیں ہوتی، لیکن قبریں بالکل صاف معلوم ہوتی ہیں، اس مسجد میں جمعہ ہوتا ہے اور یہی جامع مسجد بھی ہے، کبھی کبھی اتفاق سے مسجد میں تنگی محسوس ہوتی ہے، اس وجہ سے مسجد کی توسیع کی گئی، مسجد سے متصل ایک حوض ہے اور حوض قبر کے اوپر ہے، یعنی قبر کو بالکل منہدم کر کے اس کے اوپر عمارت بنائی گئی ہے، کیا یہ عمارت بنانا جائز ہے؟

بی، ایس مونی (مقامی پوسٹنالیسری و لاکائیٹ ٹینکوا ڈینیہ)

الجواب وبالله التوفیق:

مسئلہ یہ ہے کہ جب قبریں اتنی پرانی ہو جائیں کہ میت کے جسم کا مٹی بن جانا غالب ہو گیا ہو تو فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اس کے اوپر تعمیر کرنا جائز ہے (۱)، یہاں تو مسجد کی توسیع کی ضرورت ہے جس کا ثواب تدفین سے کم نہیں۔ اس لیے ایسے قبرستان میں جس میں تدفین متروک ہو چکی ہو اگرچہ موقوفہ ہو اس میں مسجد کی توسیع کرنا بلاشبہ جائز ہے اور یہ فعل حقیقتاً منشاء واقف کے بھی خلاف نہ ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ صورت مسئلہ میں حسب تحریر سوال یہ مسجد کی توسیع کر لینا یا قبرستان کو ضروریات مسجد میں لے لینا بلاشبہ جائز ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۷/۱۴۰۰ھ

۱- "إذا بلی المیت وصار لرباً یجوز ذرعه والبناء علیہ" (مٹا ی ۶۰۶/۱ کتاب الجنازہ)۔

۲- "لأن غرضه إحياء حقہ وذلک یحصل بما قلنا" (مٹا ی ۳۳/۳، کتاب الوقف) (مرتب)۔

قدیم مٹروکہ قبر کے نشانات ختم کر کے مسجد بنانا؟

ایک جامع مسجد کی بابت مندرجہ ذیل سوالات پیش خدمت ہیں، مدلل جواب سے جلد نوازیں:

۱- ایک قدیم اور بڑی جامع مسجد جو ہمارے قصبہ گھوٹی میں تھانہ سے متصل واقع ہے، اس کے جنوب میں افتادہ زمین ہے، اس زمین میں ایک قدیم مزار سید بابا کے نام سے مشہور ہے، مزار کی چوحدی پختہ لمبائی چوڑائی 6*4 ہاتھ ہوگی، مسجد بھی ایک صدی سے زیادہ قدیم ہے، اور مزار بھی کافی قدیم ہے، بہت پہلے سے صاحب مزار کا حسب و نسب اور تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا، اور نہ کوئی آدمی صاحب مزار کی تدفین ہی بتاتا ہے، البتہ اسی زمین سے متصل جنوب میں تحصیل ہے، تحصیل کے پرانے لوگوں سے اتنا معلوم ہوتا رہا ہے کہ آج سے تقریباً چالیس سال قبل فلاں تحصیلدار نے خواب میں سید بابا کو دیکھا تھا، تحصیلدار کی قیام گاہ اس زمین سے متصل تھی، تحصیلدار نے مقامی طور پر بعض مسلمانوں کو شامل کر کے ایک کار مستحسن سمجھ کر مزار کی جگہ متعین کر دی، اور معمولی طور پر اس کی کرسی بھی پختہ اینٹ سے تیار کرادی، آج بھی وہ مزار اسی صورت میں ہے، مسلمانوں سے زیادہ اہل ہنود پھول بتائے چڑھاتے ہیں اور بتدریج اس عمل میں اضافہ ہی ہے، بعض مسلمان بھی اس سے اعتقاد رکھتے ہیں، اب اس وقت مسجد کی توسیع ناگزیر ہے، کیونکہ درمیان کے پانچ سالوں کا وقت اس زمین کے سلسلے میں تھانہ والوں سے مقدمہ بازی میں گذرا، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ عدالت دیوانی سے مع مسجد و زمین عام مسلمانوں کے حق میں ہو گیا۔

کثرت ازدحام کی وجہ سے مسجد کے علاوہ اس زمین پر بھی نمازی جمعہ کے دن بھرے رہتے ہیں بلکہ کچھ تاخیر سے آنے والوں کو جگہ نہیں ملتی، مزار مذکور مسجد کی مغربی دیوار میں پڑتا ہے، تقریباً آدھی مسجد کی تعمیر اگر صرف مزار تک رکھی جائے تو نمازی کی ضرورت پوری نہیں ہوتی، اور نہ توسیع کا مقصد ہی حاصل ہوگا، اور اگر مزار ختم کر دیا جائے تو اس میں فتنہ کا امکان ہے، مذکورہ حالات میں کیا صورت اختیار کی جائے؟

الجواب وبالله التوفیق:

الحذر اراقت میں ہے: ”ولو بلی المیت وصارت ابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ“ (۱)۔

وهكذا في الرد (۱) والهندية المعروفة بفتاوی عالمگیری وغیرها۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قبر اتنی پرانی ہو جائے کہ جسمیت کے مٹی ہو چکنے کا ظن غالب ہو جائے تو اس قبر میں دوسرے مردہ کا دفن کرنا اور اس پر کھیتی کرنا اور مکان بنالیا سب درست ہے اور جائز رہتا ہے، اور جب کھیتی کرنا اور مکان بنانا جائز ہے تو مسجد کی توسیع و تعمیر بلاشبہ جائز و درست ہوگی، چنانچہ تاریخ الکعبۃ المعظمۃ ص ۱۶ میں ہے: ما بین المقام والوکن وزمزم قبر تسعة وتسعين نبياً یعنی مقام ابراہیم اور رکن اور چاہ زمزم کے درمیان میں ننانویں نبیوں کی قبریں ہیں، اور اسی کتاب میں ہے کہ جب کسی نبی کی امت ہلاک کر دی جاتی تھی تو وہ نبی بیت اللہ شریف کے پاس آ کر پناہ لیتے اور وہیں تا زندگی منعبد ہو جاتے تھے، اور ظاہر ہے کہ نبی کی جس جگہ وفات واقع ہوتی ہے وہ اسی جگہ مدفون ہوتا ہے اور اب جب کہ ان قبروں کے نشانات صدیوں سے کسی کو معلوم نہیں تو کہنا پڑے گا کہ مسجد حرام کی توسیع میں زمانہ قدیم سے ہی وہ قبریں حدود حرم میں آگئیں، اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ کی قبریں دار حطیم میں ہیں، جو حدود و مضاف میں ہے اور قبروں کا کوئی نشان نہیں ہے۔

یہ باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ پرانی قبروں کے نشانات مٹا کر بھی توسیع مسجد و تعمیر جائز ہے، اسی قسم کے مضامین طبری اور البدایہ و النہایہ جلد ۹ ص ۱۲۰، ۱۳۸، ۱۹۱، ۱۹۲ میں بھی ہیں۔

اس لیے صورت مسئلہ میں بلاشبہ جائز ہے کہ نشان قبر مٹا کر توسیع مسجد کر لی جائے، بالخصوص جبکہ اس قبر کا واقعی قبر ہونا بھی مشتبہ ہے، لیکن اگر اس میں فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو تو یہ کر لیا جائے کہ قبر کو بغیر توڑے اور منہدم کیے ہوئے مٹی اتنی اونچی پاٹ دی جائے کہ قبر زمین میں چھپ جائے اور نشان قبر تک نمایاں نہ رہے اور اس پر توسیع مسجد کر دی جائے، اگر اس صورت میں بھی کسی فتنہ و غیرہ کا اندیشہ ہو تو یہ بھی کر سکتے ہیں کہ قبر کی اونچائی کے برابر ہر طرف دیوار اٹھا کر اس پر ایک ڈال لگائیں کہ پوری قبر ڈال کے اندر آ جائے پھر اس کے اوپر مٹی ڈال کر کرسی اونچی کر انیں اور مسجد کی توسیع کر انیں، اس صورت میں اگرچہ مسجد کی کرسی بھی کچھ اونچی کرنا پڑے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، اگر اس صورت میں بھی فتنہ کا خطرہ ہو تو عجلت نہ کی جائے بلکہ عوام کو مسئلہ کی نوعیت و حقیقت بتلا کر خوب مصلحتن کر لینے کے بعد کوئی اقدام کیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

قبرستان کے پیڑ یا اس کی قیمت کو مسجد میں لگانا:

ہمیں اس امر کے لیے فتویٰ درکار ہے کہ قبرستان کے پیڑ یا ان کی قیمت مسجد کے احاطہ کے اندر یا مسجد کے احاطہ سے باہر واقع مسجد کے کمروں کی تعمیر میں استعمال ہو سکتی ہے یا نہیں، دیگر یہ کہ پیڑ کی لکڑی یا ان کی قیمت کس طور پر استعمال کرنا جائز ہے؟

نسیم اقبال (صدر منظرہ کمیٹی دوگندہ ضلع پوڑی گڑھوال)

الجواب وبالله التوفیق:

قبرستان کے پیڑوں کی قیمت یا ان کی لکڑی مسجد کے کسی کام میں اس وقت لگانا جائز ہے جب کہ وہ قبرستان کے کام و ضرورت سے بالکل فاضل ہو اور یوں ہی پڑے ضائع یا خراب ہو جانے کا غالب گمان ہو جائے، بغیر اس کے ان چیزوں کا قبرستان کے علاوہ کہیں اور استعمال درست نہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۹/۱۴۰۹ھ

قبرستان کی زمین پر دوکان کی تعمیر اور اس کی آمدنی کا حکم:

ایک قبرستان جو کہ اب سڑک ہے اس کے پاس والے خالی قبرستان کی زمین میں اگر دوکانیں بنائی جائیں اور ان کی آمدنی مدرسہ عربیہ گلزار محمدی قیموں، بیواؤں، غریب، یشتری اسکول جس کا بنانے کا ارادہ ہے اس میں خرچ کی جائے تو کیا ہے؟
محکم علی (مقام ہٹا پور ضلع منظرہ گریوٹی)

الجواب وبالله التوفیق:

وہ خالی زمین اگر اس درجہ میں ہو کہ نہ تو اس وقت تدفین کی ضرورت ہے اور نہ آئندہ ضرورت متوقع ہے، تو اس صورت میں حواشی پر دوکانیں بنا کر چوحدی قبرستان بھی محفوظ کر سکتے ہیں اور اس کی آمدنی جو قبرستان کی ضرورت سے فاضل ہو اس کو مذکورہ دینی کاموں میں بھی بہ سبیل مناسب اور بقاعدہ دیانت خرچ کر سکتے ہیں ورنہ کوئی صورت جواز کی نہ ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

قبرستان یا مسجد کے روپیہ کو تجارت میں لگانا؟

قبرستان یا مسجد کے مثلاً پانچ سو روپے ہیں، اس رقم سے قبرستان یا مسجد کے مفاد کی خاطر کوئی تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

عبد القیوم القاسمی (خادم جامعہ عربیہ اسلامیہ دارالعلوم تھانہ بنوریہ)

الجواب وبالله التوفیق:

قبرستان یا مسجد کے روپیہ سے تجارت کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، یہ حرکت منشاء وقف کے صریح خلاف ہوگی، چاہے مفاد قبرستان و مسجد ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔

اس لیے کہ دینے والے اور وقف کرنے والے نے ثواب حاصل کرنے کے لیے دیا ہے، تجارت کے لیے نہیں دیا ہے اور تجارت کرنے میں وہ رقم وقف کے مصرف میں خرچ ہونے کے بجائے تجارت میں مستہلک ہو جائے گی، ”لأن مراعاة غرض الواقفين واجبة“ (۱)، فقط والله أعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۳/۳/۱۴۰۱ھ

الجواب صحیح حبیب الرحمن خیر آبادی، محمد ظہیر الدین مفتاحی

۱ قبرستان کو آمدنی کے لیے استعمال کرنا:

مرکزی انجمن تحفظ مساجد و قبور آمدھرا پردیش آپ کو وقف کراتی ہے کہ صوبہ آمدھرا پردیش بالخصوص حیدرآباد میں آئے دن قبرستانوں پر ناجائز قبضوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، بعض قبرستانوں کو آمدھرا پردیش وقف بورڈ نے جس پر صیانت کی براہ راست ذمہ داری قانون اوتاف دفعہ ۱۵/۱۹۵۴ء کے تحت عائد ہوتی ہے۔ خود آمدھرا پردیش وقف بورڈ کئی قبرستانوں کے بعض حصوں کو کرایہ وغیرہ سے آمدنی وقف بورڈ کے عنوان سے دیا ہے اور بعض قبرستانوں کو بلڈنگیں وغیرہ بنانے کے لیے کئی سال اجارہ پردے چکا ہے۔

مرکزی انجمن نے جب بھی ارباب وقف بورڈ سے کہا کہ اراضی قبرستان کو آمدنی وقف بورڈ کے لیے استعمال نہیں کیا

جاسکتا تو ارباب بورڈ نے کہا کہ ہمارے پاس فتویٰ موجود ہے کہ فارغ اراضی قبرستان کو آمدنی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، مرکزی انجمن عالی جناب سے یہ سوال کرتی ہے کہ واقف جس غرض و غایت کے لیے اراضی کو وقف کرتا ہے واقف کے منشاء کے خلاف جانے کا کسی فرد یا حکومت کو بھی حق نہیں پہنچتا۔ جب کہ شہر و صوبوں میں بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر قبرستانوں کی صیانت ایک مسئلہ بن چکی ہے۔

۲- میت کی تدفین کے لئے قدیم قبروں کو منہدم کرنا:

شریعت میں کئی قبر بنانا جائز ہے یا نہیں؟ قبرستان محدود ہونے کی بنیاد پر کیا قدیم قبروں کو منہدم کر کے مزید میتوں کو دفن کیا جاسکتا ہے؟ یہاں بعض افراد یہ کہہ رہے ہیں کہ ساٹھ سال کے بعد قبر کو مسمار کرنے کا حکم حدیث شریف میں موجود ہے، اس تاویل کی بنا پر کئی قبرستانوں میں علانیہ عمارتیں وغیرہ تعمیر ہو رہی ہیں اور مرکزی انجمن آخر میں مسلمانوں کی آخری آرام گاہ کی صیانت و حفاظت کے لیے علماء کرام سے فتویٰ حاصل کرنا چاہتی ہے، تاکہ بعض غرض مند افراد کے غلط پروپیگنڈے ختم ہو جائیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

مسئلہ یہ ہے کہ جو قبرستان موقوفہ نہیں ہیں مملوکہ ہیں، ان میں اصل مالکوں کو تصرف کا حق حاصل ہے، لیکن جو قبرستان موقوفہ ہیں ان کا حکم یہ ہے کہ جب تک ان میں مردے ہی دفن کرنا متعین ہے، اس کے علاوہ کسی اور کام میں اس طرح لانا جس سے منشاء واقف فوت ہو درست و جائز نہیں!

ہاں جو موقوفہ قبرستان اس حالت میں پہنچ گیا ہو کہ اس میں تدفین موقوف ہوگئی اور آئندہ اس کی توقع بھی نہ ہو کہ تدفین ہوگی، بلکہ اس کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہو گیا ہو تو اس کے اور اس کے واقف کے منشاء کے تحفظ و بقاء کے لیے جو مناسب صورت ہو اختیار کرنا ضروری ہے۔

مثلاً یہ کہ اس کو چہار دیواری سے محفوظ کر کے اس میں کل کے اندر باغ لگا کر یا مثلاً اس کے حواشی پر بیرون رخی دکانیں اور اندر باغ لگا کر اس کی آمدنی دوسرے محتاج قبرستان پر خرچ کی جائے۔

اور اگر دوسرے قبرستان محتاج اعانت نہ ہو تو اس کی آمدنی دینی مدارس پر خرچ کی جائے، یا اس میں مسجد تعمیر کر دی جائے یا دینی مدرسہ قائم کر دیا جائے۔

اور جب بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر قبرستانوں کی زیادہ ضرورت ہو تو اس صورت میں اس کی آمدنی سے دوسرے محتاج امانت قبرستان پر خرچ کرنا یا مستقل دوسرے قبرستان قائم کرنا زیادہ قابل ترجیح ہوگا، ذاتی و شخصی رہائش گاہ وغیرہ بنالیا یا کوئی عمل ایسا کرنا جس سے وقف عی بالکلیہ فوت ہو جاتا ہو ہرگز جائز نہ ہوگا۔

معلوم نہیں کہ وقف بورڈ والوں کے پاس کیا فتویٰ ہے اور کہاں سے گیا ہے، جب تک وہ فتاویٰ سامنے نہ ہوں ہم ان کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتے۔

۲- قانون شرع میں پکی قبریں بنانا جائز نہیں ہے (۱)۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ جب قبر اتنی پرانی ہو جائے کہ جسد میت مٹی ہو چکنے کا ظن غالب ہو جائے تو اس میں دوسرا مردہ دفن کر سکتے ہیں۔

جسد میت کا مٹی ہو جانا یہ ملک و موسم کے اختلاف سے اور خود میت کے احوال کے اختلاف سے مختلف ہوتا ہے۔

اسی طرح اس کے پرانا ہونے کی تحدید و تعیین ساٹھ سال کے ساتھ کسی حدیث میں نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۲/۱۳۹۲ھ

پرانی قبروں کے نشان مٹ جانے پر کیا حکم ہے؟

یہاں ایک مسجد کے صحن کے جنوبی حصے کے ایک کونے میں تقریباً ۱۵ فٹ کے احاطہ میں چند پرانی قبریں ہیں اور بالکل ویران جگہ ہے جہاں بچھو وغیرہ نکلتے رہتے ہیں، ایک مرتبہ مدرسہ کی ایک بچی کو مسجد میں بچھو نے کاٹ لیا، ان وجوہات کے مد نظر منتظم مدرسہ نے ارادہ کیا ہے کہ قبروں کو ہٹا کر اس ویران جگہ سیمنٹ لگا کر صحن بنالیا جائے اور اوٹا بنالیا جائے، کیا شریعت کی رو سے مسجد کے احاطہ والی قبروں کی جگہ سیمنٹ سے پکا کرنا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر قبر اتنی پرانی ہو چکی ہو کہ مردہ مٹی بن چکا ہوگا تو قبروں کا نشان باقی رکھنا ضروری نہیں ہے، نشان مٹا کر زمین

۱- "عن جابر لہی رسول اللہ ﷺ أن یجصص القبور وأن یکب علیہا وأن یوطأ رواہ الترمذی" (مشکوۃ المصابیح ص ۱۳۸-۱۳۹)۔

ہموار کر کے پختہ صحن بھی بنا سکتے ہیں، بلکہ مذکورہ خطرہ کی صورت میں ایسا کر لینا بہتر ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب
کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

متولی کی اجازت کے بغیر موقوفہ قبرستان میں تدفین:

بغیر متولی کی اجازت کے کسی کو قبرستان میں دفن دیا جائے اس سلسلہ میں شرعی مسئلہ کیا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

سوال کے خط کشیدہ جملہ سے معلوم ہوتا ہے یہ معاملہ موقوفہ قبرستان کا ہے اور موقوفہ قبرستان کا حکم شرعی یہ ہے کہ جو متولی غیر واقف ہو اس کا واقف کے درجہ میں ہونا ضروری نہیں، بلکہ وہ واقف کی شرائط کے تابع ہوتا ہے۔ ”لأن شرط الواقف کنص الشارع“ (۲)۔

نیز شامی (۴/۴۴۳) میں ہے: ”مراعاة غرض الواقفين واجبة“ ان دونوں عبارتوں سے معلوم ہوا کہ متولی جو غیر واقف ہو وہ اوقاف کا محض نگران و منتظم و قیم ہوتا ہے اور اس کو واقف کی منشاء و غرض کے خلاف کے دن کر دینے سے حاصل ہوتا ہے، پس ”المعروف عرفاً كالمشروط شرطاً“ (۳) ضابطہ شرعیہ کے تحت کسی مسلمان کو اس قبرستان میں دن کرنے سے روکنا شرعاً جائز نہ ہوگا۔

ہاں اگر واقف نے اصل وقف نامہ میں صراحت کر دی ہو کہ اس موقوفہ میں فلاں کو دن نہ کیا جائے تو صرف اس صورت میں متولی کی بغیر اجازت دن کرنا جائز نہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۳/۱۴۱۱ھ

۱۔ قبرستان کے ارد گرد کی زمین مدرسہ میں دینا:

کسی آبادی کے قریب ایک جنگل میں کسی بزرگ کا پرانا مزار ہے جس سے قدیم لوگوں کو عقیدت تھی جس کی بناء پر

۱- ”ولو بلی الميت وصار دواباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ و زرعه والباء علیہ“ (رد المحتار ۱/۹۹)۔

۲- الدر المختار علی ہاشم الشافعی نعمانی ۱/۳۱۶۔

۳- قواعد الفقہ قاعدہ ۳۳۳۔

مزار کے گرد کچھ اراضی چھوڑ دی گئی تھی بعض خود رو درخت اور اکثر کانٹے دار جھاڑیاں پیدا ہو گئی ہیں اور اس کے قریب کی آبادی کے لوگوں نے جنگلی کاشت اس مزار کے قریب ہوتی تھی ایک فقیر کو مزار کی حفاظت کے لئے مقرر تھا دیدی تھی جو عرصہ دراز تک اس اراضی کے خود رو درختوں کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے اور آخر کار اس کو چھوڑ کر کہیں باہر چلا گیا، اس کے بعد اس کی اولاد میں کوئی دوسرا شخص اس پر قابض ہو گیا اور درخت کی لکڑیاں کاٹ کر اپنے کام میں لانا رہا ہے اور غیر مزار و عزمین کے کچھ حصہ قائل کاشت کر کے کاشت میں نام لکھا لیا ہے اس کو فروخت کر دیا باقی غیر مزار و عرصہ میں اس کی کاشت نہیں ہے اور نہ مالک کی حیثیت سے اس کا نام ہے، اب آبادی کے لوگوں نے جنگلی کاشت اس کے قریب ہے فیصلہ کیا ہے کہ مزار کی حفاظت کے لئے ایک چہار دیواری بنا کر دروازہ لگا دیا جائے اور مزار کے گرد و نواح کی غیر مزار و عزمین ایک اسلامی مدرسہ میں دیدی جائے، مدرسہ خود اس جنگل کو صاف کر ا کر لکڑی مدرسہ کے صرف میں لے آئے اور زمین کو قائل کاشت بنا کر مدرسہ ہی کاشت کرائے اور اپنے مصرف میں لانا رہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ چک بندی میں اس حصہ کا نکل جانا یقینی ہے آیا مدرسہ کے حق میں یہ فیصلہ از روئے شرع درست ہے یا کہ نہیں؟

۲۔ قبرستان کے درخت کی آمدنی مسجد و مدرسہ میں صرف کرنا:

کسی آبادی کے جنگل میں قبرستان ہے جہاں مسلمانوں کے مردے دفن ہوتے ہیں، اس زمین میں بعض درخت ہیں جن لوگوں کے مردے قبرستان میں دفن ہوتے ہیں انہوں نے قبرستان کے درخت کوٹا کر مسجد یا مدرسہ میں صرف کر نیکی اجازت دیدی ہے آیا ان درختوں کو کوٹا کر مسجد یا مدرسہ کے صرف میں لانا درست ہے یا کہ نہیں؟ نیز قبرستان کے حلقہ کی بقیہ زمین جس میں قبریں نہیں ہیں یا پرانی قبروں کے آثار بھی باقی نہیں رہے ہیں مدرسہ کو دیدی جائے تو اس میں مدرسہ کاشت کر سکتا ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

۱۔ عبارت سوال سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین جو مزار کے ارد گرد اب تک باقی ہے موقوفہ ہے یا کسی کی ملک ہے، اگر موقوفہ ہے تو وقف واقف کے شرائط کے مطابق اس کی حفاظت و ترقی و دیکھ بھال کرنی واجب ہے اس کے خلاف مدرسہ کو دینا جائز نہ ہوگا (۱)، اور اگر وقف نہیں ہے تو جس کی ملکیت ہو اس کی اجازت سے جس جائز مصرف میں چاہے صرف کر سکتے

۱۔ "ومنہ هو (القاضی الامام شمس الانامہ محمود الاوزجدلی) ایضا عن المقبرة فی القری اذا البرمت ولم یبق فیہا

ہیں اور مدرسہ اسلامی اسکا بہترین مصرف ہے اور مالکوں کا پتہ عرف عام سے بھی چل سکتا ہے، ورنہ قدیم سرکاری کاغذات بندوبست سے ضرور چل سکتا ہے، بہر حال جب کسی طرح کوئی پتہ نہ چلے اور چک بندی میں نکل جانے کا ٹکن غالب ہو تو ایسی صورت میں آبادی کے لوگوں کا یہ خیال صحیح ہے۔

۲۔ یہاں بھی یہ حکم ہے کہ اگر قبرستان وقف ہے تو اس وقف میں واقف کے شرائط و منشاء کے مطابق عمل کرنا واجب ہے اور اگر وقف نہیں ہے تو مالکوں کی اجازت لے کر درخت کٹوانے درست ہیں اور یہی حکم حلقہ کی بقیہ زمین میں کاشت کرنے کا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۷/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عہد، سید احمد علی سعید دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

مزار وغیرہ کے نام وقف شدہ زمین اور اس کی آمدنی کو مسجد میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟
کسی شخص نے کچھ زمین پہلے مزار پیر کے نام پر اور کچھ زمین محرم وغیرہ کرنے کے لئے وقف کی تھی، یعنی پیر کے عرس تعز یہ لائے بغیرہ کے لئے یہ سارے کام خلاف شرع ہونے کی وجہ سے متولی مسجد زمینوں کی دیکھ بھال کرتے رہے پھر انکو مسجد کی زمین میں شامل کر لی، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ وقف صحیح ہے، فی الحال اس کی آمدنی مسجد کے کام میں لگایا جا رہا ہے، یا یہ لگانا درست ہے اگر عدم صحت کا فتویٰ ہو تو پھر جو روپیہ لگایا جا چکا ہے انکا کیا حکم ہوگا، نیز ان زمینوں کی آمدنی کو ہائی اسکول یا مدرسہ میں یا کسی اسکول کی تیاری میں لگایا جاسکتا ہے یا کہ نہیں؟ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ واقفوں نے نہ تو مسجد کے نام وقف کیا ہے نہ مسجد کے نام پر رجسٹری کی ہے۔ موقوفہ زمین کی تبدیلی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

جس شخص نے مزار پیر یا محرم تعز یہ کے لئے یہ زمین وقف کی تھی اگر وہ اس کے ورثہ مذکورہ موجود معلوم ہوں تو ان سے اجازت لے لی جائے ورنہ اس زمین کا مسجد میں شامل کرنا یا اس کی آمدنی مسجد پر صرف کرنا صحیح نہ ہوگا (۱)۔ اسی طرح اسی

اثر المونی لا العظم ولا غیرہ ہل یجوز ذرعیہا واستعمالہا قال: لا (ہندیہ ۲/۷۰، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

۱۔ ”فی الوقفات بنی مسجد اعلیٰ سور المدینۃ لا یمبغیٰ أن یصلیٰ فیہ لالہ حق العامة فلم یخلص للہ تعالیٰ کالمبغیٰ فی ارضیٰ معصوبہ“ (شامی ۱/۳۵۳، عثمانیہ)۔

زمین کا یا اس کی آمدنی کا اپنی اسکول کی یا کسی اسکول کی تیاری تعمیر میں خرچ کرنا بھی جائز نہ ہوگا اور صحت وقف میں یہ تفصیل ہے کہ محرم و تعزیه والا تو شرعاً صحیح نہیں (۱)، اور مرزا پریر کے وقف نامہ میں اگر تصریح نہ ہو تو اس کا بھی وہی حکم ہے جو محرم کے وقف کا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو آمدنی متولی نے بلا اس شخص کی یا اس کے وارثوں کی اجازت کے مسجد میں لگائی ہوگی اگر وہ شخص یا اس کے ورثہ چاہیں تو متولی کی ذاتی جائیداد سے بطور ضمان کے وصول کر سکتے ہیں اور چاہیں تو معاف بھی کر دیں اور یہی ان کے لئے بہتر ہے تو انکو ثواب ملے گا لیکن خوب یاد رہے کہ یہاں ان و ضمان وغیرہ مسجد کے وقف یا مال سے وصول نہیں کر سکتے ہیں۔ اور اگر مرزا پریر یا محرم و تعزیه کے لئے دینے کی بابت بہت قدیم اور پرانی ہو اب اس دینے والے یا اس کے ورثہ کا بھی پتہ نہ ہو تو متولی پر کچھ ضمان نہیں، مسلمانوں کے مشورہ سے مسجد پر یا جس کار خیر میں ہو خرچ کرے اور ان سب کے مشورہ سے ایک ضابطہ و قاعدہ مطابق شرع شریف بنا کر اس کے مطابق عمل کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مترکہ قبرستان کی زمین میں غرباء کے لئے مکان بنانا:

تقریباً دو سو سال پہلے بھنور شاہ تکیہ نامی ایک جگہ میں کچھ قبریں تھیں مگر اسکا نام و نشان نہیں ہے، البتہ چند قبروں کے نشانات موجود ہیں، دیگر اراضی میں نام و نشان کسی قبر کا نہیں ہے، نہ ایک سو سال سے آج تک وہاں کسی قبر کا وجود ہے، اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس وقت اس تکیہ میں جو خالی جگہ پڑی ہوئی ہے وہاں غرباء کے مکانات تعمیر ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

قرآن تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جگہ قدیم قبرستان اور موقوفہ ہے اگر ایسا ہے تو اس سے کسی قسم کا انتفاع جائز نہیں جیسا کہ عالمگیری جلد ۲ کتاب الوقف کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ”وَسئلُ هُوَ أَيْضاً عَنِ الْمَقْبَرَةِ فِي الْقَرْيَةِ إِذَا اندرسَتْ وَلَمْ يَبْقَ فِيهَا أَثَرُ الْمَوْتَى لَا الْعِظْمَ وَلَا غَيْرَهُ هَلْ يَجُوزُ زَرْعُهَا وَاسْتِغْلَالُهَا قَالَ: لَا وَلِهَا حَكْمُ الْمَقْبَرَةِ كَمَا فِي الْمَحِيطِ وَهَكَذَا فِي قَاضِي خَانَ مِنْ كِتَابِ الْوَقْفِ (۴)۔“

۱- ”ومنها (ای من شرائط) ان یکون قربة فی ذاته وعند النصارى فلا یصح وقف المسلم او الدمی علی البیعة والکبسة

أو علی فقراء اهل الحرب کما فی البهر الفائق“ (ہندیہ ۲/ ۵۳، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

۲- فتاویٰ ہندیہ ۲/ ۷۰، مکتبہ رشیدیہ پاکستان۔

بلکہ اس کا حکم یہ ہے کہ صرف منشا وقف و واقف کے مطابق اس کا استعمال و حفاظت و آبادی کی جائے، لہذا وہ قبرستان متروک ہو گیا ہو یا اس میں دفن ممکن نہ ہو گیا ہو تو مجبوراً اس کو محفوظ کر کے اس میں باغات لگا دیئے جائیں یا جہاں خالی جگہیں ہوں وہاں پر کرایہ کی دوکانات تعمیر کر کر کر ایہ پر دیدیا جائے اور اس کا نفع جو اس کی حرمت و حفاظت سے بچے اہل محلہ کے دوسرے قبرستان پر صرف کیا جائے اور اگر دوسرے قبرستان بھی اس آمدنی کا محتاج نہ ہو تو غرباء و مساکین پر وہ نفع تقسیم کر دیا جائے ہاں اگر وہ جگہ کسی کی ملک ہو تو مالک کی اجازت سے اس پر مکان بھی تعمیر کر سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود علی عطاء رب مفتی دارالعلوم دیوبند

قبرستان کی موقوفہ زمین پر مدرسہ یا امدادیاتی کے لئے مکان کی تعمیر:

قلب آبادی بجواڑے میں ایک قدیم قبرستان ہے جس میں تقریباً ایک سو سال سے تدفین بند ہے، کچھ حصے پر بعض قبور کے کھنڈ پائے جاتے ہیں۔

حالات حاضرہ کے تحت اراضی قبرستان کا تحفظ مشکل نظر آتا ہے اس کا امکان ہے کہ اراضی دستبرد زمانہ کی نظر ہو جائے، کیا یہ بہتر ہوگا کہ اس کو لب سڑک حصہ پر مدرسہ، حفاظ و امدادیاتی کیلئے عمارت بنا کر وقف کیا جاوے تاکہ جس طرح مسلمان اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کرتے ہیں بعد الموت اس کی خاک بھی تملیک الی اللہ کی حیثیت بنکر اس سے خدمت دین میں صرف ہوتی رہے۔ مسلم عوام یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ عند الشرح اس میں کوئی ممانعت تو نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

قدیم مسلم قبرستان عموماً وقف ہی ہوتی تھیں لہذا اگر یہ قبرستان وقف ہے جیسا کہ ظاہر اور متبادر بھی ہے تو اس کو غیر قبرستان کے لئے استعمال کرنا شرعاً کسی طرح بھی ہونا جائز ہے، تحفظ دینا ضروری ہے اور اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس قبرستان کی احاطہ بندی کر ادیا جائے اور سب سڑک جہاں قبریں نہ ہوں جگہ خالی ہو ویرائے نفع و مرمت و حفاظت قبرستان دوکانیں بنادی جائیں اور رخ سڑک پر کر دیا جائے اور اندرون قبرستان جہاں جگہیں خالی ہوں کچھ درخت از قسم باغ لگا دیئے جاویں اور اس کی آمدنی قبرستان پر اور اس کے علاوہ جو دوسرے قبرستان مسلمان کا ہوں پر خرچ کیا جاوے اور اگر صحیح

ثبوت ودلیل سے یہ معلوم ہو کہ یہ قبرستان وقف کی نہیں ہے بلکہ کسی خاص شخص کی مملوک ہے تو اس مالک کی مرضی سے جہاں جگہیں خالی ہیں قبروں کے نشانات نہیں ہیں مکانات بھی بنوائے جاسکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود علی عطاء رب مفتی دارالعلوم دیوبند

عورتوں کے قبرستان جانے کا حکم:

- ۱- عورتوں کو مطلقاً قبرستان میں جانا کیسا ہے؟
- ۲- عورتوں کو کسی مزار پر زیارت کی غرض سے جانا کیسا ہے؟
- ۳- فرض نماز کے بعد سر یا پیشانی پر ہاتھ رکھ کر جو دعا پڑھتے ہیں وہ کیا ہے۔ مسنون ہے یا نہیں؟
- ۴- مسجد کے نمبر کے سامنے مطلقاً روپیہ گننا کیسا ہے؟
- ۵- مسجد کے نمبر کے سامنے اسی مسجد کے چندہ کا پیسہ کسی ذمہ دار کو دیا جائے تو جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱، ۲) عورتوں کا مطلقاً قبرستان میں جانا یا مزار پر جانا فی نفسہ جائز ہے، لیکن چونکہ کمزور دل کی ہوتی ہیں، اس لیے متاثر ہو کر بعض ناجائز فعل (شرک و بدعت وغیرہ) کر دیتی ہیں، اس لئے روکا جاتا ہے، پس اگر پردہ کے ساتھ جائیں اور سنت کے مطابق کچھ پڑھ کر ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کر کے واپس آجائیں تو اس میں کوئی ممانعت نہ ہوگی۔

۳- یہ عمل نہ تو سنت ہے نہ تو واجب صرف بطور مباح ایک فعل ضعیف دماغ سے حفاظت کی نیت سے یہ علاج کے درجہ کی چیز ہے۔

۴- جائز ہے۔

۵- جائز ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۱۱/ ۱۴۱۱ھ

چہ مہربانی کی رقم سے قبرستان کی چہار دیواری بنانا کیسا ہے؟
چہ مہربانی کے مستحق کون ہیں اور کیا چہ مہربانی کی آمدنی سے قبرستان کی دیواری بنائی جاسکتی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

قربانی کرنے والا جب تک چہم کفر و خست نہ کر دے اس کو سب اختیار ہے۔ چاہے تو خود اس کا مصلیٰ، ڈول وغیرہ کچھ بنا کر استعمال کرے یا غریب یا امیر یا اور جس کو چاہے بطور تحفہ و ہدیہ کے دے دے پھر وہ پانے والا اس چمڑے کو جس طرح چاہے استعمال کرے حتیٰ کہ کفر و خست کر کے قبرستان کی چہار دیواری بنوادے یا اس کے بنوانے کے لئے بطور عطیہ دیدے سب جائز رہتا ہے، ”و یتصدق بجلدھا أو یعمل منہ نحو غربال وجواب وقربة وسفرة ودلو“ (۱)۔
البتہ جب قربانی کرنے والا خود چمڑا کفر و خست کر دے یا کسی کے ذریعہ کفر و خست کرادے تو اس قیمت کا غرباء یا مساکین پر صدقہ کر دینا واجب ہو جاتا ہے اور کسی بھی دوسرے کام میں صرف کرنا جائز نہیں رہتا ہے، ”فان بیع اللحم أو الجلد بہ..... أو بغير اھم تصدق بشمنہ“ (۲)، ہاں وہ غریب و مسکین اپنا قبضہ قیمت پر کر کے اور مالک ہو کر پھر جہاں چاہے خرچ کر سکتا ہے قبرستان کے لئے بھی دے سکتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۱۲/۱۴۱۰ھ

قبرستان میں آبادی بسانا:

قبرستان میں آبادی کرنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

موقوفہ قبرستان میں رہائش کے لئے مکان بنانا جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۹/۱۳۸۵ھ

۱- الدرر نفیۃ ۹/۷۵۷

۲- تنویر الابصار علی ہاشم رد المحتار ۹/۷۵۷

۱- پرانی قبروں پر دوکان لگانا:

عید گاہ کے متصل قبرستان کے نشانات جہاں پر ختم ہیں وہاں عید و بقر عید کے موقع پر مٹھائی وغیرہ کی دوکانوں کی بھیڑ ہو جاتی ہے اس کا کیا حکم ہے اور گاؤں کے ذمہ دار لوگوں پر کیا حکم ہے؟

۲- قبرستان میں فقیروں کو چاول دال دینا:

مردہ کو دفنانے کے لئے جب قبرستان لے جاتے ہیں تو فقیر وہاں جمع ہوتے ہیں اور قبرستان ہی میں مردہ کو دفن کے بعد دال چاول اور نمک فقیروں کو بانٹا جاتا ہے اور وہیں سے کچھ مدرسہ کو بھی دیا جاتا ہے یہ رقم کیسی ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

۱- یہ سب غلط طریقہ ہے اور منشاء شرع کے خلاف ہے، گاؤں کے تمام ذمہ دار لوگوں پر لازم ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔

۲- یہ طریقہ خلاف شرع ہے، صدقہ کے آداب میں سے ہے کہ جہاں تک ہو مخفی اور خفیہ طور پر دیں اور اس کے صحیح مصرف میں دیں، ان فقیروں میں اکثر صدقہ کے مصرف نہیں ہوتے جن کو دینے سے صدقہ ادا بھی نہیں ہوتا اس طریقہ کی اصلاح ضروری ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپورہ ۲۸/۸/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید اعظم مفتی دارالعلوم دیوبند

امیر جماعت کے لئے درگاہ کمیٹی کی ممبری قبول کرنا:

۱- تبلیغی جماعت کے امیر کو ایسی درگاہ کمیٹی کی ممبری قبول کرنا اور اس کے لئے جدوجہد کرنا چاہئے یا کہ نہیں جس درگاہ کا عرس ہوتا ہے تو اہل زور و شور سے ہوتی ہے جہاں پر پھول چادر غلاف سے نذرانہ صندل وغیرہ چڑھایا جاتا ہے یہ کہنا کہ ان معاملات میں کچھ دخل نہیں دوں گا، یعنی میں قوالی کرنے، صندل پھول چادر غلاف وغیرہ چڑھانا سے نہیں روکوں گا یہ کہہ کر ممبری کے لئے کوشش کرنا چاہئے یا کہ نہیں۔ جبکہ یہ تمام چیزیں شرک و بدعت ہیں ایسی جگہ خصوصاً امیر جماعت تبلیغ کو ممبر بننا چاہئے یا کہ نہیں۔

۲۔ اگر صرف عوام سے کہنے کے لئے کہ مقصد یہ ہے کہ ممبر بننے ہی رفتہ رفتہ یہ تمام کام بند کر دوں گا تو ایسا کرنا عوام کو دھوکہ دینا ہو گا یا نہیں اور منافقت ہو گی یا کہ نہیں اگر ممبر بننا ہی ہے تو عوام سے صاف صاف یہ کہہ کر ممبری کے لئے کوشش کرنا چاہئے یا کہ نہیں جبکہ یہ تمام چیزیں شرک و بدعت ہیں ایسی جگہ خصوصاً امیر جماعت تبلیغ کو ممبر بننا چاہئے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

یہ طریقہ تبلیغ طریق سنت کے خلاف ہے، اپنی حفاظت مقدم ہے، ایسے مزاروں پر جہاں عرس تو الی پھول چادریں وغیرہ تمام بدعتیں ہوتی ہیں اس کے ممبر بننے کا مطلب یہ ہے کہ ان امور میں اور ان کے نظم و نسق میں برضا و رغبت شریک ہوں اور ان عمو و قواعد وضوابط کی پابندی پہلے کر لیں جو شرعاً ناجائز ہیں اور نفع کا بھی پتہ تک نہیں ہے اور شرعی قاعدہ مسلم ہے: جلب منفعت سے دفع مضرت مقدم ہے، اس لئے شرعاً اس امر کی اجازت نہ ہو گی، نیز یہی کام اصلاح والا وہ ممبر صاحب باہر سے بلا ممبر بنے بھی کر سکتے ہیں، اگر باطن و قلب میں کچھ رکھتے ہوں تو بلا ممبر بنے اس کے متولی پر اثر انداز ہوں جب بھی کام بن سکتا ہے، لہذا ان کو حسب تحریر سوال یہ شرکت وغیرہ کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/۸/۱۳۸۵ھ

قبرستان کی زمین فروخت کرنا:

ایک قطعہ آراضی کے دو حقیقی بھائی مالک تھے، جن کا نام محمد حسن اور خدا بخش تھا۔ محمد حسن کی اولاد میں شریف، منیر، فہم النساء، غفوری، امین الدین تھے، ان سب کا انتقال ہو گیا، ان کی اولاد میں سے بھی کوئی زندہ نہیں رہا، دوسرے بھائی خدا بخش تھے خدا بخش کی اولاد میں صرف کلواتھے ان کا بھی انتقال ہو گیا، کلوا کی اولاد میں ننھے اور تین لڑکیاں ننھی چھوٹی منکو ہوئیں ننھے چھوٹی منکو کا بھی انتقال ہو گیا اس وقت صرف کلوا کی لڑکی ننھی زندہ ہے۔

کلوا کے لڑکے جو ننھے تھے ان کی اولاد میں عبدالحزیز، عبدالصمد، شاہد حسین اور حامد حسین اور ننھے کی بیوی بسم اللہ اس وقت موجود ہیں ان کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں ہے، ان سب کے نام پٹواری کے کاغذوں میں موجود ہیں، یہ قطعہ آراضی ان کی ذاتی ملکیت ہے، یہ قطعہ آراضی پٹواری کاغذوں میں قبرستان درج ہے، اس قطعہ آراضی کو ان وارثوں نے فروخت کیا، اس وقت اس آراضی میں کوئی قبر نہیں ہے وقف بورڈ سے بھی اس قبرستان کا کوئی تعلق نہیں ہے، نہ وقف بورڈ سے یہ

رجسٹرڈ ہے۔

نوٹ: ان مالکوں نے قبرستان کا وہ حصہ ہمیں جس میں اس وقت قبریں نہیں رہیں فروخت کیا ہے قبرستان کا وہ حصہ جس میں قبریں ہیں اسے فروخت نہیں کیا ہے تو آیا ان مالکوں کو اس قبرستان کے فروخت کرنے کا کوئی حق ہے یا نہیں ہے جبکہ یہ ان کی ملکیت ہے، مدلل و مفصل تحریر فرمائیں۔

فلیل احمد (محلہ پہاڑی سرانے عظیمہ ضلع بجنور (پولی)

الجواب وباللہ التوفیق:

پٹواری کے کاغذ میں قبرستان درج ہونے سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ آراضی قدیم سے قبرستان نہ ہوگا، اگر ایسا ہے تو قدیم قبرستان موقوفہ ہوتی ہے اور موقوفہ قبرستان کا بغیر وجہ شرعی کے فروخت کرنا درست نہیں (۱)، پوری تحقیق کر لی جائے، اگر موقوفہ ہو تو فروخت کرنے کی وجہ شرعی واضح کر کے سوال کیا جائے۔

اور اگر واقعہ مملوک ہو موقوفہ نہ ہو تو مالکوں کو فروخت کرنے کا حق ہوگا حقیقت حال جو ہواں کے مطابق عمل کیا جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

نوٹ: یہ بقیہ سوال واضح نہیں ہے مرنے والوں کی ترتیب، انہوں نے مرتے وقت زندہ کس کس کو چھوڑا واضح کریں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مزار کی آمدنی:

قصبہ اڑ کی ضلع سہارنپور میں حدود ملٹری چھاؤنی کے اندر انگریز کے دور حکومت سے ایک شاندار مسجد ہے، انگریز کے دور میں یہاں ملٹری مسلم رہا کرتی تھی اور باقاعدہ سرکاری تنخواہ پر امام بھی رہا کرتے تھے، ۱۹۴۷ء میں وہ ملٹری یہاں سے ٹرانسفر ہو گئی، ملٹری کا اصول ہے کہ ایک جگہ چھاؤنی میں ایک مذہب کے اگر ۲۰ ماٹے والے ہوتے تو ان کو ان کے مذہب کا رہبر سرکاری تنخواہ پر امام اٹھایا جاتا ہے، ۱۹۴۷ء سے لیکر آج تک مسلمان یہاں پر رہتے نہیں جس سے سرکاری طور پر امام رکھ

۱۔ "وإذا صح الوقف لم یجز ببعه ولا تمليكہ" (ہدایہ ۲/۶۳۰)۔

کر مسجد کو آباد کیا جاسکے، چھاؤنی کے اندر ہی مسجد سے تقریباً ۲ کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک بزرگ کامزار ہے جس پر جمعرات کو عقیدت مند لوگوں کا ایک خاص جہوم ہو جاتا ہے جس میں ۹۵ پریسٹ غیر مذہب کے لوگ اور ۵ فیصد مسلمان جمع ہوتے ہیں اور اس مزار کی آمد کو انسران لوگ کھا جاتے ہیں، اس وقت ایک افسر اچھے خیال کا ہے وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ اس مزار کو مسجد سے منسلک کر لوں گا کہ اس کی آمدنی سے مسجد بھی آباد ہو جاوے اور یہ پیسے ادھر ادھر بھی نہ جائے، اگر اس پیسے سے امام کی تنخواہ مقرر کر کے امام رکھ دیا جائے اور مسجد آباد ہو جاوے تو شرعی رو سے جائز ہے، اثر اجات مسجد تو حکومت کی طرف سے پورے ہوتے ہیں جیسا کہ چھاؤنی کے اندر مندر ہے اور گردوارہ ہے انکا خرچ حکومت کے ذمہ ہے اور پنڈت کو اور گینتائی جو گردوارہ کے اندر ہے حکومت تنخواہ دیتی ہے کیونکہ جو انوں کی تعداد پوری رہتی ہے اس مسئلہ کا جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

مزار کی آمدنی کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں مثلاً:

۱- حیوان، بکرا، مرغ، بھینس وغیرہ کو مزار پر ذبح کرنے کے لئے لاتے ہیں اور وہ وہیں ذبح کر دیئے جاتے ہیں، انکے حلال و جائز استعمال ہونے کی کوئی صورت نہیں ہوتی وہ مردار اور مہیہ کے حکم میں ہو جاتے ہیں، ان کا اصلی مالک یا کوئی بھی مفت دے یا بیچ کر دے ان کا خریدنا کھانا جائز نہیں (۱)۔

۲- حیوان کو مزار پر ذبح کرنے کے لئے لاتے ہیں مگر مجاور و خادین ذبح نہیں کرتے بلکہ کسی حیلہ بہانے سے نظر بچا کر فروخت کر دیتے ہیں، انکا حکم یہ ہے کہ ان کے اول و اجبی مالک اگر تائب ہو کر اپنے عقیدہ کی اصلاح کر لیں اور اس جانور کو واپس لے لیں تو ان کا کھانا وغیرہ سب جائز ہو جاتا ہے اور اگر تائب نہ ہوں تو ان سے یا مجاورین وغیرہ کسی سے اس کو خریدنا اور کھانا ہرگز جائز نہ ہوگا۔

۳- وہ حیوان جن کو مزار پر ذبح کرنے کے لئے نہیں لاتے بلکہ بہ نیت تقرب لصاحب المزار لا کر مجاور وغیرہ کو بطریق ہبہ و تملیک دیدیتے ہیں اور اس سے ان لانے والوں کا مقصود صاحب مزار کے لئے ذبح کرنا کرنا نہیں ہوتا بلکہ صرف وہاں کے مجاورین میں غریبوں کو نفع پہنچانا ہوتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگرچہ ایسا فعل کرنا ناجائز کہا جائے مگر جس کو ہبہ و تملیک کر کے دیدیا جاتا ہے اس سے خریدنا لینا اور استعمال کرنا سب جائز ہے گا۔

۱- "إلما حرم علیکم المہنة و الدم و لحم الخنزیر و ما أہل بہ لعیر اللہ" (سورة البقرة: ۱۷۳)۔

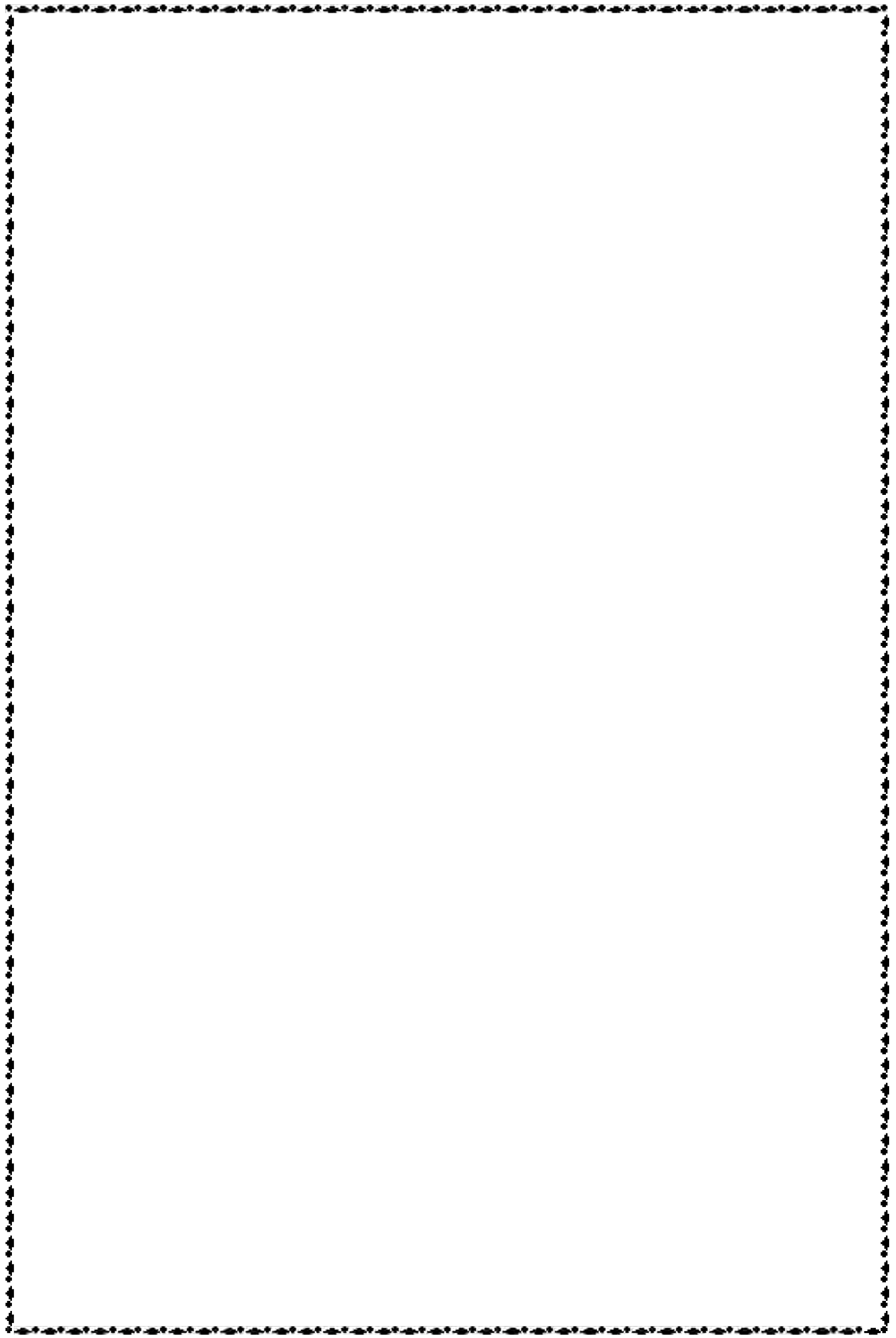
۴- وہ مٹھائیاں و چادر و زیورات وغیرہ جس کو مزار پر چڑھاتے ہیں اس کا حکم یہ ہے جب تک لانے والا تائب ہو کر اپنے عقیدہ کی اصلاح کر لے اور اس نذر کو باطل کر کے ان چیزوں کو واپس نہ لے لیں ان کا خریدنا لینا کھانا وغیرہ سب حرام و ناجائز رہے گا، ہاں اگر تائب وغیرہ ہو کر واپس لے لیں تو ان کو لینا کھانا وغیرہ سب درست ہو جاوے گا غرض اس نمبر کا حکم بالکل ۲- کا ہوگا۔

۵- وہ مٹھائیاں چادریں و زیور و نقد وغیرہ لا کر مزار پر چڑھاتے ہیں بلکہ بہ نیت تقرب صاحب مزار وہاں کے غریبوں یا محبوروں وغیرہ کو بطور عہدہ و تملیک دیدیتے ہیں اس کا حکم ۲- کا ہے جن کو بطریق عہدہ تملیک دے دیا ہے، ان سے لیکر یا خرید کر استعمال کر سکتے ہیں اور اگرچہ ان کا یہ فعل شرعاً صحیح نہ ہو یہ الگ بات ہوگی، ان تمام مذکورہ صورتوں میں کسی شرط کے ساتھ انتفاع ممکن بھی ہے، ان میں مذکورہ بالا طریق پر صاحب حق کی اجازت و مرضی سے یا ان کی بلا اجازت و مرضی لینا اور استعمال کرنا ہرگز درست نہیں اور صورت مسئلہ میں صاحب حق کی اجازت و مرضی کے بغیر محض حکامان کے دباؤ و جبر سے لے کر استعمال کرنا ہے اس کا جو از شرع میں نہیں ہے خاص کر مساجد کے لئے مساجد پر تو نہایت صحیح پاکیزہ پیسہ لگانا ضروری ہے۔ اس لئے مذکورہ مسئلہ صورت کا جو از شرعاً بالکل نہیں نکلتا ہے، ہاں اگر اس مزار سے متعلق کچھ دکانیں ہوں جن کا کرایہ آتا ہو یا کچھ کمرے ہوں اور ان سے کرایہ آتا ہو یا کرایہ آنے کی کوئی صورت نہ نکل سکے اور نکال لیجائے تو ان رقم کو لیکر مسجد کے امام کی تنخواہ میں بھی لاسکتے ہیں اگر مزار سے متعلق کچھ دکانیں یا کمرے وغیرہ ایسے نہ ہوں جن سے کرایہ آ سکتا ہو تو چونکہ سوال میں مذکور ہے کہ مسجد کے اخراجات حکومت پورے کرتی ہے اس لئے دے کر صرف امام کی تنخواہ کا معاملہ رہ جاتا ہے اس کو چندہ وغیرہ دوسری جائز صورتوں سے پورا کر کے مسلمان خود امام و مؤذن مقرر کر کے نماز جماعت کا انتظام کر لیں اور یہ امر مسلمانوں پر بیشک حسب استطاعت لازم و ضروری رہے گا، اس معاملہ کے بعض مسائل و بعض نمبروں سے متعلق پوری تحقیق و تفصیل فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد ہفتم و ہشتم کے جز امداد المفتیین میں بھی مذکور ہے، اس میں حضرت مولانا تھانوی، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے مستعمل فتاویٰ درج ہیں اور سب مضامین بھی نہایت مکمل و مدلل ہیں جناب بھی عالم ہیں مراجعت کر لیں بڑی بصیرت پیدا ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۳/۱۴۰۳ھ

الجواب صحیح عبدالحق قاسمی دارالعلوم دیوبند

كتاب الإيمان والنور



کتاب الايمان والذکر

شراب نہ پینے کی قسم کھانے کے بعد شراب پی لینے کا حکم:

ایک شخص شراب پیتا تھا، اس نے بعد میں قرآن شریف کی قسم کھائی کہ میں قرآن شریف کی قسم کھاتا ہوں کہ میں شراب نہیں پیوں گا۔ قسم کے بعد وہ شخص پھر شراب پینے لگا اب وہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے تو کفارہ ادا ہو سکتا ہے یا نہیں اور ہو سکتا ہے تو کس طرح؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب شراب نہ پینے کے لئے قسم کھائی تھی اور پھر شراب پی لیا تو قسم ٹوٹ گئی اور قسم توڑنے کا کفارہ دینا واجب ہو گیا اور قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکین کو بھر پیٹ دونوں وقت کھانا کھائے، یا دس مسکین کو ایسا کپڑا پہنا دے جس میں نماز پڑھی جاسکے اور اگر غربت و ناداری کی وجہ سے ان دونوں باتوں پر قدرت نہ رہے تو مسلسل تین دن روز رکھے یہ حکم تو قسم توڑنے پر کفارہ کا (۱) ہے اور جب پھر شراب پینے لگا ہے تو اس پر شراب پینا چھوڑ دینا واجب ہے اور جو پی چکا ہے اس پر توبہ واستغفار کرنا واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۲/۱۴۰۳ھ

منت کے روزوں کا حکم شرعی؟

میری صاحبزادی مسماۃ صبیحہ خاتون جب اپنی اسکول کا امتحان دے رہی تھی تو اس نے منت مانی تھی کہ امتحان میں

۱- "فكفاره إطعام عشرة مساكين من أوسط ما تطعمون أهلبكم أو كسوتهم أو تحرير رقبة فمن لم يجد فصيام ثلاثة أيام، ذالك كفارة إيمانكم إذا حلفتم واحفظوا إيمانكم كمالكم بين الله لكم آياته لعلكم تشكرون" (سورہ مائدہ ۸۹)۔

کامیاب ہونے پر (۵۵) روزے رکھوں گی، چنانچہ وہ پاس ہوگئی مگر اس نے اب تک صرف آٹھ روزے رکھے ہیں، باقی روزے ابھی پورے نہیں کرپائی تھی کہ وہ اتنے میں اونچے درجہ ۱۱ میں پہنچ گئی اور دو سال انٹر میں پڑھتی رہی، اس مدت میں بھی وہ منت کے روزے پورے نہ کر سکی، انٹر کا آخری امتحان دیا مگر اس میں فیل ہوگئی، اب تکمیل کے روزے پائی اسکول کے باقی ہیں، اس میں اس نے منت روزوں کی تکمیل شروع کی ہے مگر شاید پورے نہ کر سکے، کیونکہ پوزے مین کا امتحان ۱۶ اپریل ۱۹۷۱ء سے شروع ہو رہا ہے۔

اس صورت میں ان باقی ماندہ روزوں کی تلاقی صدقہ اور خیرات سے ہو سکتی ہے؟ خیرات دینے کے بعد بھی اس کی پکی نیت روزے رکھنے کی ہے، اگر تلاقی ہو جائے تو کس قدر اور کس طرح ہو؟ نیز تحریر فرمائیں کہ فی روزے کتنی خیرات کرنے سے تلاقی ہو جائے گی، آیا نقد صدقہ و خیرات سے مساکین کو کھانا بہتر ہے اور فی مسکین کس قدر صدقہ و خیرات دے، نیز ہر مسکین کو دو نوں وقت کھانا ضروری ہے یا صرف ایک وقت؟

الجواب وباللہ التوفیق:

منت کے روزوں کا بدلہ نذر یہ نہیں ہوتا وہ تو رکھنے ہی ہوں گے، چونکہ کسی زمانہ یا مدت کے ساتھ محدود نہیں، اس لیے موت سے پہلے جب بھی روزے رکھ لیں گی اور اگر اردینے جائیں گے، بے وجہ شرعی تاخیر سے ہدائی اور اسامت طاری ہوگی، نذر یہ تو صرف فرض رمضان کے روزوں کے بدلے میں شیخ فانی کے لیے ہے اور ان لوگوں کے لیے ہے جو حکم میں شیخ فانی کے ہوں، اس پر دوسرے روزوں کو قیاس نہیں کر سکتے ہیں، لہذا منت کے ان روزوں کے بدل میں قیمت وغیرہ کوئی چیز کافی نہ ہوگی، خیرات وغیرہ کرنے کے بعد بھی اس منت کو پورا کرنا اور روزے ہی رکھ کر پورا کرنا واجب ہے، ہاں اب سے ہی حسب موقع واستطاعت روزے رکھنا شروع کر دیں اور آئندہ حسب موقع واستطاعت روزے رکھنے کا عزم و تہیہ کر لیں، کبھی بیماری وغیرہ عوارض کی وجہ سے جو نذر خیر ہوگی وہ قائل معافی اب بھی ہو سکے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

نذر کے روزہ کو پورا کرنے کی صورت:

ایک شخص نے منت مانی کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو میں ایک سال تک روزے رکھوں گا جب کام ہو گیا تو وہ صرف

دو ماہ کے روزے رکھ سکا اب کاروبار کی وجہ سے ہمت نہیں تو اس منت کا پورا کرنا واجب ہے یا نہیں، اگر واجب ہے تو ۱۰ ماہ کے روزے کا فدیہ کس حساب سے رہے گا؟

الجواب وبالله التوفیق:

منت کرنے والے کا یہ قول کہ (میرا فلاں کام ہو جائے گا تو میں ایک سال روزے رکھوں گا) اس قول کے مطابق جب اس کا وہ کام ہو گیا تو فوراً روزے شروع کر دینا واجب تھا، اگر اس نے منت ماننے میں یہ نیت کی کہ مسلسل رکھوں گا تو ایک سال تک مسلسل روزہ واجب بالند رہو گیا اور ظاہر و متبادر بھی اس قول کا یہی ہے، اس صورت میں اگر اس نے دو ماہ روزہ رکھ کر ہمت چھوڑ دیا اور روزہ ختم کر دیا تو حائث ہو گیا۔ اب اس کی قضاء ایک سال روزے کی مسلسل رکھنا واجب ہے زندگی میں جب بھی قضاء کرے لیکن جہاں تک جلدی ہو سکے رکھ ڈالے اگر نہ رکھے گا اور فوت ہو جائے گا تو گنہگار ہوگا، محض کاروبار کی وجہ سے ہمت نہ ہونا یہ کوئی عذر نہیں ہے اس میں کچھ شرطیں ہیں جو آگے آتی ہیں، ہاں اگر بیمار ہو جاوے اور قوت روزہ رکھنے کی نہ رہ جائے اور موت کا ظن غالب اس حالت میں ہو جائے یا اتنا بوڑھا ہو جائے کہ بتقاضہ عمر طبعی قوت سلب ہو جائے تو فدیہ کی وصیت کرنا واجب ہوگا، ابھی فدیہ کا کوئی محل نہیں اور نہ گنجائش ہے اور اگر منت مانتے وقت ایک سال تک مسلسل روزے کی نیت نہیں کی تھی بلکہ یہ نیت کی تھی کہ ایک سال تک جتنا ہو سکے گا رکھوں گا تو ایک سال کے اندر جتنے روزے کی طاقت ہو رکھ لے ایک سال کے بعد قسم پوری ہو جائیگی اور کفارہ وغیرہ کچھ لازم نہ آئے گا، لیکن معاملہ اللہ تعالیٰ سے ہے خوب سوچ لے کہ اس کی کیا نیت تھی، کیونکہ یہ ظاہر کے خلاف ہے، کاروبار میں یہ شرط و تفصیل ہے کہ اگر کاروبار کرنے پر مضطر ہو موزدوروں نوکروں سے بھی کام نہ چلے اور نہ سرمایہ ہی ہو کہ بیٹھ کر اتنے دن گزارے غرض ہر طرح کوئی صورت نہ ہو تو روزے موخر کرے اور جب قدرت ہو قضاء کرے اور فدیہ کا وہی حکم ہے جو اوپر گذرا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۸/۱۳۸۵ھ

عہد توڑنے کا کفارہ:

محلہ کی مسجد کے متولیوں سابقین کے احوال کو دیکھ کر محلے والوں نے ایک ایسے آدمی کو متولی بنادیا جو نیک طبیعت دیندار ہے جس نے مسجد کی آمدنی بڑھائی اور دکانیں بنوائی بڑی دلچسپی سے کام کیا مگر کچھ لوگوں نے اعتراض اٹھایا جس سے

موصوف کی طبیعت اس کام کرنے سے کٹ گئی ہے اور انہوں نے بالکل ارادہ کر لیا ہے کہ وہ اس کام سے سبکدوش ہو جائے گا، چنانچہ انہوں نے اعلان بھی کر دیا ہے کہ میں اس کام سے علیحدہ ہو رہا ہوں، اس اعلان سے لوگوں کو از حد رنج ہوا اور بھنڈر ہے کہ یہ کام آپ ہی کو کرنا ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے پختہ عہد کر لیا ہے میں اپنا عہد کیسے توڑ سکتا ہوں، ایسی صورت میں جب لوگوں کی نظر ان کی طرف ہے اور اعتراض کرنے والا سامنے نہیں آتا ہے اور دوسرے کے متولی بن جانے میں مستقبل اچھا نظر نہیں آتا ہے، ان تمام حالات کے پیش نظر موصوف کے اپنے عہد کے توڑ دینے میں کوئی جرم کی بات تو نہیں ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

موجودہ صورت میں متولی کے لئے حکم شرعی یہ ہے کہ اگر قسم کھا چکے ہوں تو قسم توڑ کر قسم کا کفارہ ادا کریں (۱) اور کام سنبھالیں ان پر کوئی گناہ نہ ہوگا بلکہ ثواب ملے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۹/۲/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعیدنا، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "والقسم ایضا بقولہ: القسم أو أھلف أو أعزم" (رد المحتار ۵/۳۸۹، مکتبہ زکریا)۔

باب الحدود

محسن کی کیا سزا ہے؟

شادی شدہ ہونے کے باوجود ایک شخص کی بیوی سے صحبت کر بیٹھا، اب اس کی سزا یا توبہ کا طریقہ بتلائیں اور اس مرد کی بھی اور اس عورت کی بھی دونوں کی کیا سزا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

ایسے جرم کی سزا بھی آپ خوب جانتے ہوں گے کہ رجم اور توبہ ہے، لیکن رجم کا حق محض حکومت اسلامیہ کو ہے اور کسی دوسرے کو نہیں ہے (۱)، اب آپ آئندہ نہ کرنے کا عزم بالجزم کرتے ہوئے جہاں تک ہو سکے اللہ تبارک و تعالیٰ شانہ کے روبرو انتہائی ندامت و عجز و نیاز کے ساتھ توبہ و استغفار کریں اور دونوں آپس میں قوی پر دہ کریں کہ کسی وقت بھی ایک دوسرے کے سامنے نہ آئیں اور نہ کسی قسم کا اختلاط رکھیں، یہی حکم دونوں کے لئے ہے اور احتیاط تو اس میں ہے کہ اگر دونوں ایک مکان میں رہتے ہوں یا ایسے دو کمرے یا مکان میں رہتے ہوں کہ اختلاط یا تنہائی کا موقع آجاتا ہو تو بھی دونوں جدا جدا دوردور مکان میں رہائش اختیار کر لیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۷/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود علی عتہ، سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "(والزنا) الموجب للحد (وطني) مكلف لاطق طائع في قبل منبهة..... في دار الاسلام" (توضيح الابصار على هامش رد المحتار ۶/۵۷)۔

زنا کی سزا محض مزنیہ کے والد سے معافی مانگنے سے معاف نہیں ہوگی:

زید نے زنا کیا عمر کی لڑکی سے، جب لوگوں نے بلا کر اس سے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نے یعنی زید نے عمر کی لڑکی سے زنا کیا، اور پھر اس نے خفیہ طریقہ سے لڑکی کے باپ سے معافی مانگا۔ اگر لڑکی کا باپ اسے معاف کر دے تو کیا معاف ہو جائے گا؟

الجواب وبالله التوفیق:

زنا کا گناہ محض مزنیہ کے باپ سے معافی مانگ لینے سے یا محض اس کے معاف کر دینے سے معاف نہ ہوگا، بارگاہ رب العزت میں انتہائی عجز و نیاز و ندامت کے ساتھ قمر ارجم کرتے ہوئے اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرتے ہوئے توبہ و استغفار کرنے اور اللہ رب العزت سے معافی مانگنے سے ہوگا ”الحمد شرعا عقوبة مقلدة وجبت حقاً لله تعالى زجراً فلا تجوز الشفاعة فيه“ (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۸/۱۳۸۵ھ

غیر شرعی طریقہ پر اپنی خواہش کی تکمیل:

زید کی عمر ۲۰ سال کی ہے، پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا ہے، رمضان کے پورے روزے بھی کئی سال سے رکھ رہا ہے، بچوں کو مدرسہ میں قرآن کریم کی تعلیم بھی دیتا ہے، کسی حد تک بدعت سے بھی بچتا ہے، حایل و حرام کی بھی تمیز ہے، غلط رسموں کی وجہ سے اس کے ماں باپ اس کی شادی نہیں کرتے ہیں، کیونکہ اس کے بڑے بھائی اور بہن کی بھی شادی نہیں ہوئی ہے، زید اپنی شہوت اپنے شاگردوں سے پوری کرتا ہے جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں اور نورانی شہوت کو پورا کرنے کے لئے کبھی کبھی مشیت زنی بھی کرتا ہے، کبھی کبھی جانوروں سے بھی اپنی خواہش پوری کر لیتا ہے، ان تمام باتوں کا علم یا تو وہ خود جانتا ہے یا اس کا خدائے زید اسلامی سزا لینے کے لئے تیار ہے، اب اس نے سچے دل سے ان تمام باتوں سے توبہ کر لی ہے، لیکن اکثر یہی ہوتا ہے کہ وہ صدق دل سے توبہ کرتا ہے لیکن موقع آنے پر وہ اپنے قمار پر قائم نہیں رہتا ہے، لوگ نماز پڑھانے کے لئے اکثر کھڑا کر دیتے ہیں، کیونکہ کسی حد تک وہ صحیح کلام پاک پڑھتا ہے، آپ فرمائیے کہ اس کو نماز

پڑھانا چاہئے یا کہ نہیں، نفسانی خواہش ابھرے تو زید کو کیا کرنا چاہئے، نقلی روزے رکھنے کے لئے اس کے والدین اس کو منع کرتے ہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

آپ تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے بھی ہیں اور آخرت کی سزاؤں کا تصور بھی رکھتے ہیں پھر گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، زنا کی شرعی سزا سو کوڑے ہیں، ”الزانية والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة“ (۱) ان کے علاوہ ذرا سوچئے کہ یہ لڑکے اور لڑکیاں جب بڑی ہو جائیں گی اور آپ سے ملاقات بھی ہوگی اور آپ بوڑھے ہو چکے ہوں گے، اس وقت آپ پر کیا گزرے گی، کس قدر رندامت ہوگی جن سے آپ یہ باتیں کرتے ہیں سب اس فعل کے بعد مرتوتہ جاتے ہوں گے اور نہ مرنا ضروری ہی ہے، علاوہ ازیں جہنم کی آگ منتظر کھڑی ہے، نیز قیامت کے میدان میں یہ سارے جرم کرتے ہوئے دیکھائے جائیں گے اور سارا عالم ہر ملا دیکھے گا اس وقت آپ کا کیا حال ہوگا؟ جناب رسول اللہ ﷺ اور تمام صحابہ کرام اور تمام مومنین مومنات اور خود آپ کی ماں بہن باپ بھائی سب اس طرح کرتے ہوئے اس فعل کو وہاں دیکھیں گے جس طرح یہاں دیکھ سکتے ہیں پھر اس چھپانے سے کیا فائدہ اور ایسی حالت میں آپ پر واجب بلکہ فرض ہے کہ اپنی شادی آپ خود کہیں کر لیں، ماں باپ کی اطاعت اس معاملہ میں اور اس حال میں آپ پر لازم نہیں ہے، بلکہ اس جرم کے ساتھ اطاعت میں آپ گنہگار رہ رہے ہیں، ”لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق“ رواہ شرح السنن (۲)۔

آپ قطعاً ماں باپ کی مانرمانی کا لحاظ اس حالت میں نہ کیجئے اور نکاح فوراً کر لیجئے اور تمام جرموں سے باری تعالیٰ عزا سمد کی دربار میں صدق دل سے توبہ کر لیجئے اور ماں باپ کو اولاد نکاح کے لئے راضی کر لینے کی کوشش کریں تو بہتر ہے ورنہ خود کر لیجئے، البتہ ماں باپ کا احترام برآمد قائم رکھئے اور جب تک آپ نکاح نہ کریں نماز پڑھانے سے پرہیز کریں، سکون شہوت کے لئے نکاح جلد سے جلد کر لینا آپ پر فرض ہے (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۱۰/۱۳۸۵ھ

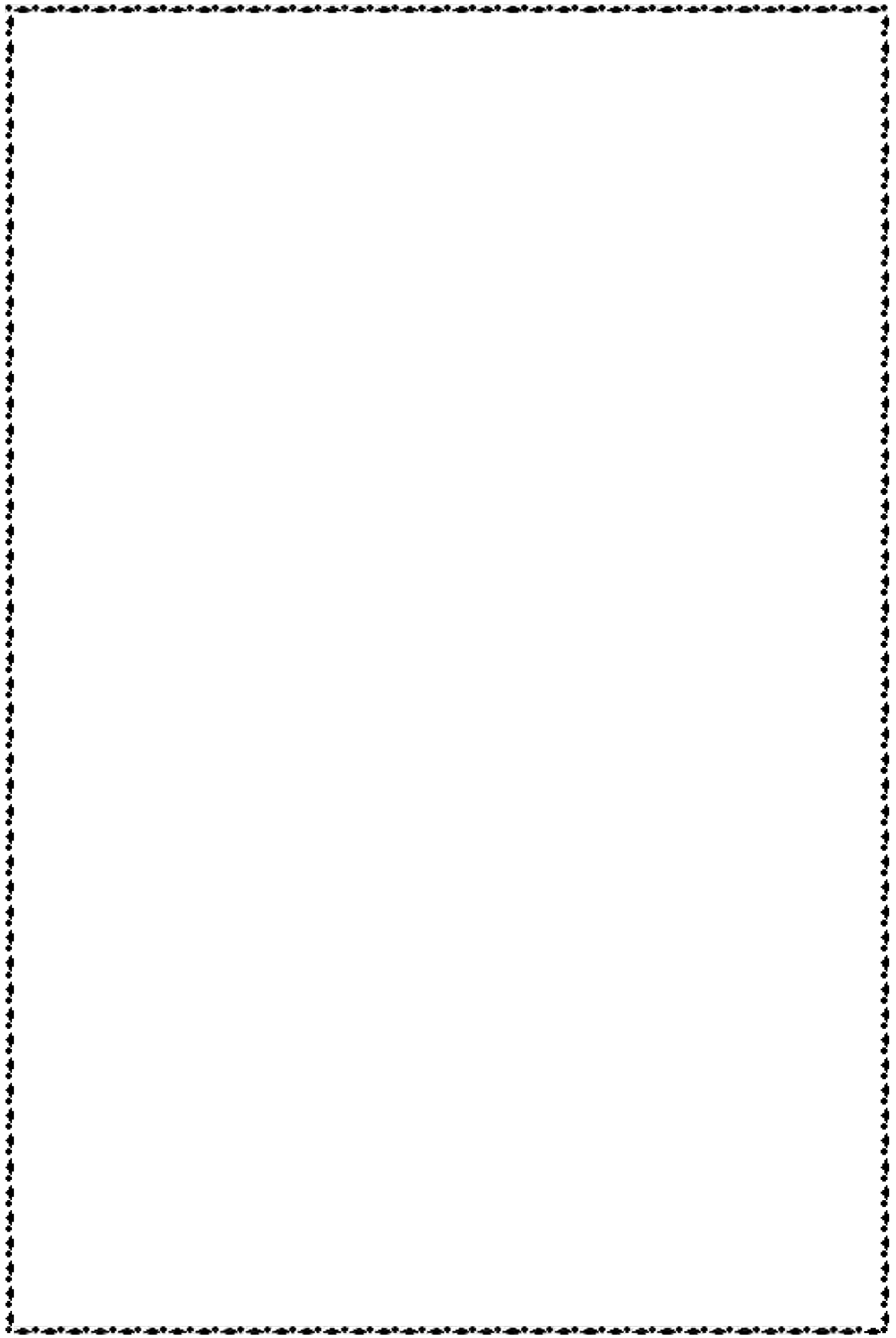
الجواب صحیح محمود علی عین مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- سورہ نساء ۲۰۔

۲- مشکوٰۃ ۳۲۱۔

۳- ”ویكون واجبا عند الوفاق فان یقن الزلا بلا به فوجس“ (الدرمختار علی رد المحتار ۶۳/۶۳)۔

كتاب المعاملات



کتاب المعاملات

پر چوں کے معے حل کر کے انعام لینا کیسا ہے؟

آج کل بعض پر چوں میں معے آتے ہیں، جن کو بھر کر بھیجنے کے بعد صحیح نکلنے پر انعامات دیئے جاتے ہیں، اور ان کو بھرنے کے لئے صرف فیس بھیجنا ہوتی ہے، اس طرح معے کا حل کرنا اور اس کا انعام لینا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

یہ معے بلاشبہ قمار پر مشتمل ہوتا ہے، جتنے لوگ فیس بھرتے ہیں ان سب کو انعام نہیں ملتا، بلکہ صرف بعض کو ملتا ہے اور بقیہ پیسہ بھرنے والوں کا پیسہ ڈوب جاتا ہے واپس نہیں ملتا، یہی قمار ہے قرآن پاک میں قمار کی ممانعت موجود ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: ”إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان“ (۱) قمار شیطانی ناپاکی ہے اس سے ہر مسلمان کو بچنا واجب ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین عظمیٰ، مفتی دارالعلوم دیوبند، ۱۱/۶/۱۴۱۱ھ
الجواب صحیحہ حبیب الرحمن عفا اللہ عنہ، محمد ظہیر الدین غفرلہ

۱- سورۃ مائدہ ۹۰۔

۲- قمار کے علاوہ کئی مفاسد ہو چکے ہیں (۱) انعام کا ملنا یعنی امر نہیں ہے لہذا یہ ناجائز ہے ”تعلیق الاملاک بالاختار باطل“ (قواعد الفقہ ص ۷۷، (۲) انعام ملنے کی صورت میں ایک روپیہ کے بدلے بہت سے روپے ملتے ہیں اس لئے ربا ہے (۳) درحقیقت یہ انعام معے حل کرنے کی اجرت ہے مگر مطلقاً نہیں بلکہ حسب مذاہب متاخر ہو جس کا دیر کو علم نہیں ہو رہا یا اجارہ جس میں دیر کو عمل معلوم نہ ہو، نہی اس کے قابو میں ہو شرعاً فاسد ہے قال فی المبسوط لا بد من اعلام ما یورد علیہ عقد الإجارة علی وجه یقطع به المنازعة بیان المدة والمسافة والعمل ولا بد من اعلام البطل“ (فتاویٰ ثنائی ۵/۲) (۴) ظاہر ہے کہ انعام دینے والوں کا مقصود محض خانہ پری نہیں، نہی اس سے کوئی خاص غرض وابستہ ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ ایک ایک روپیہ کر کے بہت سے روپے جمع ہو جائے ہیں اس لئے یہ بھی اجارہ فاسدہ ہے ”ہی تملیک لفع مقصود من العین بعوض حتی لو استاجر ثاباً أو أوالیٰ یستعمل بها (الی قولہ) فالإجارة فاسدة فی الكل ولا أجر له لألها منفعة غیر مقصودة من العین“ (الدر المختار مع الثنائی ۵/۳) (مرتب)۔

شیرز سے متعلق چند اشکالات:

نظام الفتاویٰ میں کمپنی کے شیرز کے متعلق آں جناب کا تحریر فرمودہ فتویٰ نظر سے گذرا، اس جواب میں آنجناب نے جو حوالہ فرمایا تھا اس سے مندرجہ ذیل امور ناظرین کو بادی النظر میں متصور ہوتے ہیں:

اول یہ کہ شیرز دراصل حصوں کا نام ہے اور جب حصے بولے جاتے ہیں تو تبادر بھی سے شرعی شرکت کے حصے سمجھ میں آتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ مالک شیرز اپنے شیرز کے مطابق کمپنی کا حصہ دار اور مالک ہوتا ہے اور کمپنی کے اس المال و سامان، اثاثہ وغیرہ سب چیزوں کا حریب شیرز مالک ہوتا ہے۔

تیسرے یہ کہ شیرز کا خریدنا بیچنا ان حصوں اور ان میں داخل شدہ چیزوں کا خریدنا و بیچنا شمار ہوتا ہے۔

چوتھے یہ کہ شیرز کی قیمت میں کمی بیشی تو کمپنی کے سرمایہ و سامان وغیرہ کی قیمت کی کمی بیشی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

اگر واقعاً کمپنی کے شیرز کے سلسلہ میں امور بالا تحقق تھے تو پھر اشکال کی گنجائش نہ تھی، لیکن مقلدین اور ان کی کتابوں سے تحقیق کرنے پر، نیز تعامل ماس اور عرف عام کو ملاحظہ کرنے سے شیرز کی حقیقت کچھ اور نکل آئی جو حضرت مفتی صاحب کی پیش کردہ تفصیل سے کافی متغایر ہے، لہذا آں حضرت کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش ہے کہ آنے والی تفصیل پر پھر معاملہ شیرز کو ملاحظہ فرمائیں، یہ تفصیل ہماری معلومات کا خلاصہ ہے جو ہم نے شیرز کے متعلق کی ہے۔

ذہن ذہن فقہاء کرام نے جو ان کا فتویٰ دیا ہے ان میں مستند صرف یہی تھا کہ شیرز کمپنی کے حصص کا نام ہے اور یہ شرعی شرکت کی طرح ہے، پس شیرز کا معاملہ جائز ہوگا۔ ”لکن التالی باطل فالمقدم مثله، وایضا بناء الفاسد علی الفاسد“ چنانچہ کتب اقتصادیات قوانین کمپنی کے مطابق شیرز ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ لفظ (انگریزی زبان میں) اس کے معنی حصص کے ہیں، لیکن اصطلاحاً کمپنی و قانون کنار میں شیرز نام ہے حقوق مجردہ کے مجموعہ کا۔ ان حقوق میں سے دو سب سے اہم ہیں، ایک کمپنی کے جلسوں و شوریٰ کی میٹنگ میں ووٹ کرنے کا حق، دوم منافع۔ مستقبل میں حصہ کا حق، یہ دراصل ایک بیج ہے جس میں یہ حقوق بیج کے طور پر بیجے جاتے ہیں خریدنے والے کو شیرز ہولڈر (انگریزی میں) یعنی شیردار یا حصہ دار کہتے ہیں۔ سمجھانے کے لیے آں حضور کی خدمت میں یہ احقر اس معاملہ کے آغاز و ابتدا کی تفصیل پیش کرتا ہے، یہ بھی کمپنی کی اقتصادی کتب سے مستخرج ہے:

شروع میں ایک کمپنی قائم کرنے کے ارادے سے چند لوگ جمع ہوئے اور اس کمپنی کے ذریعہ سے مثال کے طور پر کپڑے کی تجارت کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کے پاس پیسہ ایک بھی نہیں، اور کمپنی قائم کرنے کے لیے پھر اس کمپنی کے واسطے سے کاروبار جاری کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت ہے کما ہوا ظاہر، پس تحصیل فلوں کے لیے یہ چند لوگ اعلان کرتے ہیں کہ ہم کپڑے کا کارخانہ کھولنا چاہتے ہیں کمپنی کی شکل میں، اور اس کمپنی کے مثلاً ایک لاکھ شیئرز بیچتے ہیں، دس روپیہ فی شیئر، اعلان کے بعد لوگ شیئرز خریدنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ وہ لاکھ شیئرز یک گئے جس نے بھی رقم دے کر ایک یا زیادہ شیئرز خریدا ہے اس کی ملک سے رقم نکل کر کمپنی کی ملکیت بن جاتی ہے، اب واپسی کا سوال ہی نہیں، لیکن رقم دے کر عوض میں حقوق مل گئے، وہی حقوق جن کو اصطلاح میں شیئرز کہا جاتا ہے اور جن جملہ ان حقوق کے ایک مستقل نفع بھی ہے، اس عقد میں بیع و بیع نفع تھا جو فقط زمانہ مستقبل میں وصول ہوگا، کیونکہ یہ لوگ شیئرز کے بیچنے میں ملی ہوئی رقم سے اب کارخانہ کھول کر تجارت کریں گے، تجارت کر کے جو نفع حاصل ہوگا وہ شیئرز دار کو ملے گا، اور ظاہر ہے کہ یہ زمانہ مستقبل میں ہی ہوگا، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ روپیہ دے کر عوض میں بصورت بیع روپیہ لیتے ہیں، لیکن علی طریق التسنیہ، بہر حال ہر مشتری شیئرز کو ایک رسید ملتی ہے جن کو ان کی اصطلاح میں سند کہتے ہیں، اس رسید پر شیئرز دار کا نام وعدہ شیئرز مرقوم ہوتی ہے اور یہ شہادت ہے اس بات پر کہ مالک شیئرز مستقل منافع کا مستحق ہے، اب وہ کمپنی جدید قائم شدہ قانون حکومت کی نظر میں ایک قانونی شخص کی حیثیت رکھتی ہے، اب وہ مستقل ذات ہے، مالک اس کا کوئی نہیں بلکہ وہ خود اپنا مالک ہے اور جن لوگوں نے اس کمپنی کو قائم کیا ہے وہ تو محض متولین اور منتظمین ہیں، انہیں کو اراکین کمپنی سے تعبیر کرتے ہیں، وہ کمپنی کے مالک نہیں ہیں، نہ کمپنی کے کوئی جزء ان کی ملک میں داخل ہیں، تنخواہ کمپنی کے سرمایہ سے لے کر یہ لوگ کمپنی کے انتظام و کاروبار جاری کرتے ہیں، ان اراکین میں سے بعض خود شیئرز دار بھی ہوتے ہیں، ان لاکھ شیئرز کو بیچ کر جو دس لاکھ (مثلاً) روپیہ جمع ہوئے وہ سب کمپنی کے ذاتی سرمایہ بن گئے شیئرز دار ان اور اراکین کو (بجز اپنی تنخواہ کے) کوئی حق اس میں نہیں ہے، لہذا کمپنی کے مختار خود ہونے پر یہ شرع ظاہر ہوتے ہیں کہ کاروبار کے سلسلے میں جو دین لازم ہوتے ہیں، ان کے لیے ذمہ دار خود کمپنی ہے نہ کہ شیئرز دار ان یا منتظمین، ان سے کمپنی کے دین کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا، پس اگر کمپنی ٹوٹ جائے (اور یہ کثیر الوقوع ہے) تو قرض خواہوں کو اپنے دین کے نقصان اٹھانے پڑیں گے، اگر کمپنی کے سرمایہ میں ادائیگی دین کی استطاعت ہو تو اسی سے ادا کیا جائے گا ورنہ نہیں، منتظمین، اراکین، شیئرز دار وغیرہ سے طلب نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ کمپنی ایک مستقل انسان کے مانند ہے جو بذات خود اپنے حقوق کی ذمہ دار ہے، کسی قسم کا خسارہ یا ٹوٹ کمپنی کے مال پر عائد ہوگا نہ کہ اہل شیئرز یا اراکین کے مال پر، بعض صورتوں میں عدم استطاعت

دین کے وقت و قرض و دین بالکل ساقط ہو جاتے ہیں، نیز شیئر زدار و اراکین کو اپنے ذاتی معاملات میں جو دین یا قرض دینے پر لائق ہو جاتے ہیں، کمپنی اس کی ذمہ دار نہیں، کمپنی کے سرمایہ سے نہیں لیا جائے گا، اہل شیئر زدار اراکین خود ذمہ دار ہیں، اسی طرح اگر اراکین میں سے کسی ایک نے کمپنی کے سرمایہ میں سے کچھ رقم نکال لی بلا اجازت کے تو عند الحکومت وہ سرقہ (چوری) کا مرتکب قرار دیا جائے گا، اور سزا کا مستحق۔ یہ سب اسی لیے ہیں کہ کمپنی ذاتی استقلال کی حیثیت رکھتی ہے، مالک اس کا کوئی نہیں۔

غرض جو رقم شیئر ز یعنی مجموعہ حقوق کے بیچنے میں حاصل ہوئی اس کو تنظیم کمپنی کے کاروبار میں لگا دیتے ہیں، اب وہ رقم کمپنی کی ذاتی ملک بن گئی، وہ کمپنی کے پاس شیئر زداروں کی امانت نہیں ہے کہ جب چاہے واپس لے سکتے ہیں جیسا کہ شرکت میں ہوتا ہے، نہیں بلکہ کمپنی نے حقوق بیچ کر بذریعہ اپنے وکلاء یعنی تنظیم اس رقم کو حاصل کیا جیسا کہ مطلق بیچ میں ثمن ملک بالغ بن جاتا ہے۔

وفاقاً کمپنی کے جلسے منعقد ہوتے ہیں، آج کل کی اصطلاح میں اس کو میٹنگ کہتے ہیں تو اپنے شیئر ز کی بدولت شیئر ز دار بھی شریک ہو سکتے ہیں اور وہاں ووٹ کے ذریعہ کمپنی کے انتظام میں کسی قدر دخل دے سکتے ہیں، یہ تو ایک حق تھا جس کو میں نے شروع میں ذکر کیا، ان جلسوں میں تو بڑے بڑے شیئر ز دار شریک ہوتے ہیں، عموماً اکثر شیئر ز دار ان جو کم درجہ کے ہیں شریک نہیں ہوتے اور نہ ان کو ضروری سمجھتے ہیں، وہ تو فقط نفع کے درپے ہیں، تجارت کرتے کرتے ایک سال کے بعد (مثلاً) جب نفع کا جائزہ لیا جائے تو تنظیم نے دیکھا کہ پچاس ہزار کا نفع ہوا بمطابق قانون اس وقت ان کو اس نفع کا اعلان کرنے کا حکم ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی حق رکھتے ہیں کہ اگر کمپنی کے سامان سرمایہ وغیرہ میں اضافہ کی ضرورت ہو تو ان منافع میں سے یا کل منافع کے ساتھ اضافہ کر سکتے ہیں، اگر کل منافع کا اعلان کریں تو کل میں شیئر ز دار ان کا حق ہے، اگر بعض کا اعلان کریں تو اسی بعض معلن میں ان کا حق ہے، اور اگر کچھ بھی اعلان نہ کریں تو کسی چیز میں بھی ان کا حق نہیں، ایسی صورت میں آئندہ وقت کے منافع کے وہ مستحق ہوں گے، مثال کے طور پر پچاس ہزار میں سے دس ہزار اضافہ کمپنی کے لیے روک رکھا اور باقی چالیس ہزار کا اعلان کریں تو اس باقی کو منافع معلن کہتے ہیں، اس میں اب شیئر ز صاحبان کا حق ہے، اور اگر یوں اعلان کریں کہ پورے پچاس ہزار کو ہم نے کمپنی کے سرمایہ میں اضافہ کرنے کے لیے رکھا اور یہ ہر اے تقسیم نہیں ہے تو یہ منافع معلن شمار نہیں ہوتا، معلوم ہوا کہ جن منافع کا تقسیم کے لیے اعلان کریں وہ معلن شمار کیا جاتا ہے اور اس میں شیئر ز دار مستحق ہیں، غیر معلن میں نہیں، یہ بھی یاد رہے کہ ایسی صورتوں میں اراکین غداری بھی کرتے ہیں، چونکہ سب کے سب غیر مسلمان

ہیں جن منافع کا برائے تقسیم اعلان نہیں کیا گیا وہ بھی کمپنی کے ملک میں داخل ہوتے ہیں اور کسی کا حق ان پر نہیں نہ وہ کسی کی ملک رہتے ہیں (علاوہ کمپنی کے) جب بھی منافع ہوتے ہیں یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے، قانون کے تحت بعض دفعہ کمپنی کے قائم ہونے کے بعد منتظمین مزید شیئرز بیچنا چاہتے ہیں تو بذریعہ دلال اسٹاک ایکس چینج یعنی شیرز کے بازاروں میں ایسا ہی کر دیتے ہیں، اب جو دلال سے شیئرز خریدنے والے ہیں ان کا کمپنی سے واسطہ ہی نہیں اور کمپنی کو دیکھتے تک نہیں، یہاں بھی حقوق بیچے جاتے ہیں اور ہر ایک کو رسید (سند) دی جاتی ہے۔

پھر جس نے ابتداً ہمدرد راست یا بالواسطہ دلال کمپنی سے شیئرز خرید لیا ہے اگر وہ چاہے تو کسی غیر سے اپنے شیئرز کو بیچ سکتا ہے، یہ بھی دلال کے واسطے سے ہوگا، اور اب مشتری ثانی کے نام رسید کئے گی اور اسی کا نام کمپنی کے رجسٹر میں درج ہوگا، اور اب سے مشتری ثانی ہی مستقبل میں منافع مجلس کا حق دار ہوگا، تو یہاں بھی حقوق کی بیچ ہوئی، مشتری اول کے نام کو خارج کرنے کے بعد یہ طریقہ شیئرز کی بیچ و شراء عام شائع و ذائع ہے اور اقتصادیات کے میدان میں یہ مسلم و معروف ہے، ماہرین اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں جو ان معاملات میں روزمرہ مستغرق و ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں (عرضہ دراز سے یہ معاملہ بایں طور چالو ہے جہاں میں)، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا شیئرز دار کمپنی کے سرمایہ و اثاثہ میں حصہ رکھتے ہیں یا نہیں، سو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ کمپنی کی حیثیت ایک قانونی شخص کی ہے جس کا کوئی مالک نہیں بلکہ وہ خود کا مالک ہے، یہ تمام اقتصادی اور قانونی کتابوں میں مذکور ہے صراحتاً، بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ یہ سمجھنا کہ شیر دار کمپنی کے اس المال و سامان میں حصہ دار ہے، محض لوگوں کی غلط فہمی ہے، ان چیزوں میں شیئرز دار بالکل شریک نہیں، شریک تو منافع مستقبل مجلس میں ہے (اس اعتبار سے کہ اس کو حصہ دار کہا جاتا ہے نہ اس واسطے کہ کمپنی کے اس المال یا اثاثہ میں اس کا حصہ ہے) (مذکورہ بالا عبارت اقتصادیات کی ایک کتاب سے لی گئی ہیں جس کو انگریزی میں مرکٹ کلاک لاء کہتے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ شیئرز والے حقیقتہً کمپنی کے حصہ دار نہیں ہیں، کمپنی کے سرمایہ و اثاثہ میں کسی قسم کی ملکیت اس کو حاصل نہیں، یہی وجہ ہے کہ کمپنی کا قرض و دین شیئرز داران یا اراکین سے طلب نہیں کیا جائے گا یہ دونوں قسم کے لوگ کروڑ پتی ہی کیوں نہ ہوں، پس معلوم ہوا کہ شیئرز کا خریدنا اور بیچنا دراصل و فی الحقیقت کمپنی کے کسی حصہ (سرمایہ ہو یا سامان) کے خرید و بیچنے میں شمار نہیں ہے، چونکہ یہ اہل شیرز کی ملک ہی نہیں ہے۔

رہی شیئرز کی قیمت میں کمی بیشی کی وجہ سو اس میں کمپنی کے سرمایہ و سامان کو کوئی دخل نہیں، حسب ذیل متعدد وجوہ ہیں قلت و کثرت قیمت شیئرز کی۔

(۱) کمپنی کی ایسی اقتصادی حیثیت کی قوت و ضعف۔

(۲) ملک یا دیگر ممالک کی سیاسی حالت۔

(۳) ملک یا دیگر ممالک کی اقتصادی و مالی حالت۔

(۴) مشتریان شیئرز کا تجربہ و علم۔

(۵) دو ملکوں کے درمیان قلع و جگ۔

(۶) سونے کی قیمت میں تقلیل و تکثیر۔

(۷) ملک کے بڑے بڑے بازاروں میں گرائی و مہنگائی کا ظہور۔

(۸) شیرز کی بکری میں کمی زیادتی (یا مشتری کی چاہت سے زیادہ بکری یا اس سے کم)۔

یہ وجوہات خود احقر کی رائے نہیں ہیں، بلکہ معاملہ شیئرز کی قانونی کتابوں سے مستفاد ہیں، خلاصہ یہ نکالا کہ ابتدائے بائع شیئرز تو کمپنی تھی اور اراکین کمپنی کے وکلاء، شیئرز داران مشتری تھے اور بیع تھا حقوق مجردہ کا مجموعہ، پھر جب اول مشتری شیئرز اپنے شیئرز کو فروخت کرتا ہے تو وہ بائع اور غیر جو بواسطہ دلال خریدتا ہے وہ مشتری ثانی ہوا اور بیع وہی حقوق مجردہ بنا، اور بدلیل ”وبیع الحقوق بالانفراد لا يجوز“ (اشباہ تحت القاعدة ”التابع تابع“) فکذا بیع المعلوم (شامی) یہ حقوق کی بیع باطل ہوتی ہے، پس اسی بنا پر معاملہ شیئرز سرے سے باطل و ناجائز ہونا چاہیے۔

جواز کے لیے تاویل شرکت کی گنجائش نہیں ہے کہ اس میں شرائط عقد شرکت (ملک ہو یا عقد) سب مفقود ہیں،

كما لا يخفى على مثلكم العلام.

مجھے پوری امید ہے کہ ہندہ کی اس تفصیل کی تصدیق و توثیق ہندوستان میں کسی بھی قانون داں سے حاصل ہو سکتی ہے، اس لیے کہ پورے عالم میں عقود شیئرز اسی منہج پر رائج ہیں۔ جواب میں اس عریضہ کو لوٹانے کی ضرورت نہیں، نقل ہمارے پاس ہے۔

سراج احمد غفرلہ (فریقہ) بروز چار شنبہ ۲۱/۲/۱۴۰۳ھ بمطابق فریقہ)

الجواب وبالله التوفيق:

پہلے چند چیزیں بطور مقدمہ پیش کی جاتی ہیں، اس کے بعد اصل مسئلہ کے متعلق عرض کیا جائے گا:

(۱) ”وَجَازَ أَخَذَ دِينَ عَلِيٍّ كَافِرٍ مِنْ ثَمَنِ خَمْرٍ بِخِلَافِ دِينَ عَلِيٍّ الْمُسْلِمِ لِبَطْلَانِهِ، إِلَّا إِذَا وَكَلَ ذَمِيًّا بَبَيْعِهِ فَيَجُوزُ عِنْدَهُ خِلَافًا لِهَيْمًا“ (۱)۔

(۲) ”صَحَّ تَوَكُّلُ مُسْلِمٍ ذَمِيًّا بِبَيْعِ خَمْرٍ وَخَنَزِيرٍ وَشِرَائِهِمَا“ (۲)۔

(۳) ”يَكْرَهُ لِلْمُسْلِمِ أَنْ يَدْفَعَ إِلَى النَّصْرَانِيِّ مَالًا مُضَارِبَةً وَهُوَ جَائِزٌ فِي الْقَضَاءِ“ (۳)۔

(۴) شرکت منفاوضہ کے علاوہ اور غنود شرکت کا معاملہ، نیز کفالت و حوالہ وغیرہ کا معاملہ یہ سب غیر مسلم کے ساتھ صحیح و مباح ہیں، ان سب کے ماخذ کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

(۵) ”وَإِذَا خَلَطَ الْوَكِيلُ دِرَاهِمَ الرُّبَا بَعْضُهَا بِبَعْضِ الدِّرَاهِمِ الَّتِي أَخَذَهَا مِنْ حِلَالٍ يَجُوزُ أَخْذُ الرِّبْحِ مِنْهَا لَكُونَ الْخَلْطُ مُسْتَهْلَكًا عِنْدَ الْإِمَامِ لَا سِيَّمَا إِذَا كَانَ الْوَكِيلُ كَافِرًا، لَا سِيَّمَا وَالتَّقْسِيمِ مَطْهُرٍ عِنْدَنَا، كَمَا إِذَا بَالَ الْبَقَرُ فِي الْحَنْظَةِ وَقَتِ الدِّيَاسَةِ فَاقْتَسَمَهَا الْمَلَائِكُ حُلٌّ لِكُلِّ وَاحِدٍ أَكَلَهَا مَعَ التَّيَقُّنِ بِكَوْنِ الْحَنْظَةِ مُخْتَلِطَةً بِالظَّاهِرِ وَالنَّجَسِ، وَلَكِنْ الْقِسْمَةُ أَحْدَثَتْ اِحْتِمَالًا فِي حَصَّةِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنَ الشُّرَكَاءِ فَحَكَمْنَا بِطَهَارَةِ نَصِيبِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ فَكَذَا هِهْنًا، إِذَا أَرَبَى الْوَكِيلُ بِالتَّجَارَةِ وَخَلَطَ الدِّرَاهِمَ بَعْضُهَا بِبَعْضٍ ثُمَّ قَسَمَهَا عَلَى الشُّرَكَاءِ يَحْكُمُ بِحُلِّ نَصِيبِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ“ (۴)۔

(۶) ”غَاصِبٌ أَخَذَ ثَوْبَانِ مِنْ دَارِ رَجُلٍ فَذَهَبَ وَعَجَزَ صَاحِبُ الثَّوْبِ عَنِ الاسْتِرْدَادِ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ يَفِي حَتَّى اسْتَرَدَّ مِنْهُ فَبَاعَهُ بِثَمَنِ مَعْلُومٍ فَجَاءَ الْمُشْتَرِي إِلَى الْغَاصِبِ وَارَادَ أَنْ يَأْخُذَ الثَّوْبَ وَقَالَ هُوَ لِي وَكَذَبَهُ الْغَاصِبُ فَحَلَفَ الْمُشْتَرِي بِطَلَاقِ امْرَأَتِهِ ثَلَاثًا أَنَّهُ قَالُوا لَا يَكُونُ حَائِثًا لِأَنْ شَرَاءَ الْمَغْصُوبِ صَحِيحٌ“ (۵)۔

(۷) ”أَيُّ عَنْ سَمُرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: مَنْ وَجَدَ عَيْنَ مَالِهِ عِنْدَ رَجُلٍ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ وَيَتَبِعُ الْبَيْعَ مِنْ بَاعِهِ“ (۶)۔

۱- درختی علی ہاشم الثانی ۳۷۵/۵۔

۲- درختی کتاب الوکالت۔

۳- الموسط ۲۵/۱۲۵۔

۴- مقلد عن امداد الفتاویٰ ۳۸۸/۳۔

۵- قاضی خاں علی الہندیہ ۳۹۰/۳۔

۶- رواہ احمد و ابوداؤد و الترمذی، مشکوٰۃ ۲۵۵۔

(۸) یہ سب احکام دارالاسلام کے اندر ہوتے ہیں، دار غیر اسلام میں تو بہت سے عقود فاسدہ میں فقہاء متاخرین نے توسع کیا ہے اور گنجائش دی ہے اور اس کے نظام اکابر کے فتاویٰ میں بے شمار ہیں، اس کا اندازہ امداد الفتاویٰ، کفایت المفتی و فتاویٰ رحیمیہ وغیرہ سے بھی ہو سکتا ہے۔

(۹) دار الحرب میں مقیم مسلمانوں کو حربیوں سے ایسا مال لینا (خواف نقد ہو یا غیر نقد) حضرت امام ابو حنیفہؒ و حضرت امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے، جس کو حربی اپنی رضا مندی و اجازت سے دیں اور چاہے وہ مال ان کو شرعی طریقہ و حکم کے مطابق حاصل ہوا ہو، یا غیر شرعی طریقہ و حکم سے حاصل ہوا ہو ہر حال میں اس کو وہ مسلمان لے سکتا ہے اور وہ لینا اس کے لیے مباح ہوتا ہے، جیسا کہ مبسوط سرخسی کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ”وَإِذَا دَخَلَ الْمُسْلِمُ دَارَ الْحَرْبِ فَلْيَأْسُ بِأَنْ يَأْخُذَ مِنْهُمْ أَمْوَالَهُمْ بَطْلِبَ أَنْفُسِهِمْ بِأَيِّ وَجْهِ كَانَ، لِأَنَّهُ إِنَّمَا أَخَذَ الْمَبَاحَ عَلَى وَجْهِ عَرِيٍّ عَنِ الْمَعْدَرِ فَيَكُونُ ذَلِكَ طَيِّبًا لَهُ“ (۱)۔

(۱۰) ”وَلَا رِبَا بَيْنَ حَرْبِيٍّ وَمُسْلِمٍ مُسْتَأْمِنٍ ثَمَمَهُ، لِأَنَّ مَالَهُ ثَمَمَهُ مَبَاحٌ فَيَحِلُّ بَرُضَاهُ مُطْلَقًا بِإِعْلَانِ خِلَافَتِهِ لِلثَّانِي وَالثَّلَاثَةِ“ (۲)۔

ان مقدمات عشرہ کے بعد اب اصل مسئلہ کی حقیقت شریعیہ بیان کی جاتی ہے، پورا سوال بار بار اور بغور پڑھا، سوال کی اس عبارت (شروع میں ایک کمپنی قائم کرنے کے ارادے سے چند لوگ جمع ہوتے ہیں اور کمپنی کے ذریعہ سے کپڑے یا کسی اور چیز کی تجارت کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کے پاس کمپنی قائم کرنے کے لیے پیسہ نہیں ہوتا، تو شیئر یعنی حصے بیچتے ہیں اور لوگ اعلان کے بعد خریدنے لگتے ہیں الخ) سے معلوم ہوتا ہے کہ حصے (شیئر) خریدنے والے کمپنی ہی کا حصہ خریدتے ہیں اور بیچنے والے کمپنی ہی کا حصہ بیچتے ہیں اور اسی حصہ کے خریدنے سے خریدنے والے شرعاً اس کمپنی میں حصہ دار ہو جاتے ہیں اور اسی کا نام شرکت ہے، لہذا شرعاً بلاشبہ ابتداء شرکت متحقق ہو جاتی ہے، پھر بعد میں جب ان حصوں کو بیچنے والوں کے پاس سرمایہ اکٹھا ہو جاتا ہے تو تغلب کر کے خود مالک بن بیٹھتے ہیں اور کمپنی کو بمنزل انسان قرار دے کر مالک قرار دے لیتے ہیں، یہ سب فعل شرعاً ظلم و غصب ہے، اس سے حصہ خریدنے والوں کی ملکیت ختم نہیں ہوتی، بلکہ ان کو شرعاً حق رہتا ہے کہ وہ اپنے حصہ کے بقدر جس طرح ہو عدد و شرع میں رہ کر وصول کر سکتے ہیں۔

باقی یہ الگ بات ہے کہ چونکہ سب کے سب غیر مسلم ہوتے ہیں جیسا کہ خود سوال میں اس کی تصریح موجود ہے اور

۱- سرحدی ۶۰/۴ قبل کتاب الفتویٰ۔

۲- در مختار باب الربوا۔

ملک و دار کا غیر اسلام ہونا ظاہری ہے، اس لیے ملکی اور غیر شرعی قانون کی مجبوری سے کچھ چارہ جوئی وغیرہ بھی نہیں کر سکتے ہیں، مگر ان کے حقوق حصہ داری شرعاً اس سے سوخت نہ ہوں گے، بلکہ جس حصہ دار کو جس طرح بلا عذر فریب و خداع کے اپنے حصہ کے بقدر ملے وصول کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ مقدمات عشرہ مذکورہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ الگ بات ہے کہ یہ محض فتویٰ ہوگا کو اذ روئے تقویٰ احتیاط اعلیٰ بات ہوگی اور اس سے اس فتویٰ میں کوئی فرق نہ پڑے گا اور حقوق مجردہ کے منتقلی و بیع و شرا کی جتنی بحث جناب نے کی ہے اس کا یہ موقع نہیں ہے، یہ چیز عمل غصب کے بعد مرتب ہوئی ہے جو ظلم ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں، بلکہ مقدمہ ۶ و ۷ کے مطابق جہاں اور جس طرح ہو سکے اپنے حصہ کے بقدر ملے سکتے ہیں، صرف یہ خیال رکھنا ضروری ہوگا کہ اس کے لینے میں فریب و خداع و ظلم نہ ہو جیسا کہ مقدمہ ۱ تا ۱۰ سے ظاہر ہوتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۴/۱۴۰۳ھ

ہندوستان میں عقود فاسدہ کا حکم، نیز ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالامن؟

کیا ہندوستان دارالحرب ہے؟ اگر نہیں ہے تو شرعی طور پر کس قسم کے دار میں آتا ہے؟ سنا ہے بعض علماء آزاد ہندوستان کو دارالامن کہتے ہیں، کیا دارالامن کے نام سے موسوم دار کا ثبوت کتب حدیث و فقہ میں ہے؟ اگر آزاد ہندوستان کو دارالامن ہی کہا جائے تو کیا دارالامن میں دارالحرب جیسے معاملات جائز ہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

مندرجہ ذیل نمبر ملاحظہ فرمائیے:

(۱) دارالحرب لفظی معنی کے لحاظ سے تو ایسے ملک کو کہنا چاہیے جو برسر جنگ ہو، جس سے کوئی معاہدہ نہ ہو، جہاں مسلمان کے لیے امن اور تحفظ نہ ہو۔

لیکن حضرات فقہاء جن کے پیش نظر احکام اسلام کا اجراء اور نفاذ ہوتا ہے، وہ اسی نقطہ نظر سے دار (ملک) کی تقسیم

نوٹ: یہ فتویٰ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ، صدر مدرس مدرسہ امینیہ، دہلی کا مطبوعہ فتویٰ تھا، جس کو حضرت موصوف نے تصحیبات رائے کے لئے حضرت مفتی صاحب کو بھیجا تھا، اس فتویٰ کے بعد حضرت مفتی صاحب کا مستقل جواب مذکور ہے۔

کرتے ہیں اور صرف دو دار (دو قسم کے ممالک) تسلیم کرتے ہیں، دار الاسلام، دار الحرب۔

(۲) دار الاسلام: وہ ملک جہاں حکومت کا مذہب اسلام ہو اور مسلمانوں کو کلی طور پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہو۔ وہ اپنی آزادانہ رائے سے جو قانون چاہیں بنائیں اور جس قانون کو چاہیں منسوخ کر دیں وہ دار الاسلام ہے۔

الف: اس دار کے مسلمانوں پر فرض ہوتا ہے کہ وہ احکام اسلام جاری کریں اور شریعت غراء کے مطابق قانون بنائیں، اس کے خلاف قانون بنائیں گے تو گنہگار ہوں گے: ”وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ، وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ“ (۱)۔

ب: وہ ایسی طاقت فراہم کریں جو حریف طاقتوں کو اسی طرح متاثر اور مرعوب رکھے جیسے مرد جنگ میں ایک حریف دوسرے کو خوف زدہ رکھتا ہے: ”وَأَعِدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ عَدُوُّ اللَّهِ وَعَدُوُّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ“ (۲)۔

ج: وہ دفاعی حیثیت میں نہ آئیں، بلکہ ان کی قدامی صلاحیت ایسی ہو کہ ہمسایہ ممالک اس کو محسوس کرتے رہیں اور اس کا لوہا مانتے رہیں: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً“ (۳)۔
د: وہ ان کمزور مسلمانوں کی بھی امداد کریں، جو کسی دوسرے ملک میں محض مسلمان ہونے کی بنا پر ظلم و ستم کا نشانہ بن چکے ہوں اور ضرورت ہو تو ان کو نجات دلانے کے لیے فوجی طاقت بھی استعمال کر سکیں۔ ”وَمَا لَكُمْ لَا تَقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ تَنَا - نَصِيرُوا“ (۴)۔

(۳) ایسا ملک جہاں مسلمانوں کو کلی اقتدار حاصل نہ ہو، مثلاً امور خارجہ اور بین الاقوامی تعلقات میں وہ خود مختار نہ ہوں، فوجی اختیارات ان کو حاصل نہ ہوں، جرم و سزا کے قانون بنانے میں بھی وہ آزاد نہ ہوں، اہستہ سماجی اور عائلی معاملات میں وہ خود مختار ہوں، ان کا پرسنل لا محفوظ اور کا فر ما ہو۔ فقہائے اسلام اس کو بھی دار الاسلام کہتے ہیں، وہاں اقتدار اور اختیار کی حد تک احکام اسلام جاری کرنے لازم ہوں گے۔

”كُلُّ مَصْرُوفِيهِ وَالِ مُسْلِمٍ مِنْ جِهَةِ الْكُفَّارِ يَجُوزُ مِنْهُ إِقَامَةُ الْجَمْعِ وَالْأَعْيَادِ وَأَخْذُ الْخَرَاجِ“

۱- سورہ مائدہ ۵۵، ۵۶، ۵۷۔

۲- سورہ انفال: ۶۰۔

۳- سورہ توبہ: ۱۲۳۔

۴- سورہ نساء: ۷۵۔

وتقليد القضاة وتزويج الأياشي (۱)۔

یعنی جمعہ اور عیدین کا نظام قائم کرنے، خراج وصول کرنے، قاضیوں کے مقرر کرنے اور لاوارث غیر منکوحہ عورتوں کے نکاح کرنے کا اصل حق تو امام عامہ کو ہے، لیکن اگر کوئی شہر (علاقہ) امام عامہ کے بجائے غیر مسلم اقتدار اعلیٰ کے تحت ہے اور اس اقتدار اعلیٰ کی طرف سے اس کا مسلمان سربراہ (والی) مقرر ہے، اس کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ ان فرائض کو انجام دے، ایسا ملک بھی حکماء دارالاسلام ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے انگریزی دور حکومت میں حیدرآباد، بھوپال جیسی ریاستیں جو اپنے داخلی معاملات میں خود مختار تھیں، یہی حیثیت رکھتی تھیں۔

(۴) وہ مملکت جہاں مسلمانوں کو یہ اقتدار حاصل نہ ہو، خواہ مسلمان وہاں ہر طرح امن و اطمینان سے رہتے ہوں، وہاں کے سیاسی اور غیر سیاسی کاموں میں حصہ لیتے ہوں، اس کو اپنا وطن سمجھتے ہوں اور باشندہ ملک کی حیثیت سے اس کی حفاظت اور ترقی کو بھی اپنا فرض سمجھتے ہوں، اس کے لیے ایثار اور قربانی بھی کر دیتے ہوں۔ مسلمان کی حیثیت سے یا مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کی بنا پر نہیں بلکہ ایک شہری کی حیثیت سے وہ اقتدار اعلیٰ میں حصہ لے سکتے ہوں، مثلاً وہ رئیس جمہوریہ اور وزیر اعظم بن سکتے ہوں، مگر احکام اسلام جاری نہ کر سکتے ہوں، جرم و ہمز اور اقتصادی مسائل، کرنسی اور شرح تبادلہ وغیرہ کے سلسلہ میں احکام اسلام کو قانون نہ بنا سکتے ہوں، بلکہ ان میں اس ملک کے قوانین کے پابند ہوں تو وہ دارالاسلام نہیں ہے۔

حضرات فقہائے کرام کی تقسیم کے مطابق (کہ یہاں احکام اسلام جاری نہیں ہیں، یعنی قانون اسلامی قانون نہیں ہے) یہ ملک دارالحرب ہوگا، لیکن ایک پر امن اور باحفاظت ملک کے لیے اس لفظ کو غیر مانوس سمجھا جاتا ہے تو اس کو دارالامن کہہ دیا جاتا ہے۔

(۵) دارالامن ہوگا تو یہاں مسلمانوں کی حیثیت مستامن کی ہوگی، یعنی ان کو خود اپنی اجتماعی قوت کی بناء پر امن حاصل نہیں ہے، بلکہ حکومت کے قانون کی بناء پر وہ حقوق حاصل ہیں جو باشندہ ملک کو حاصل ہو سکتے ہیں، ایسے ملک میں اگرچہ قانونی طور پر مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان کوئی اقتدار یا قانون سازی کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا، مگر مسلمانوں پر فرض ہوتا ہے کہ وہ ایک نظام بنائیں اور اس کے تحت جمعہ اور عیدین کا انتظام کریں۔

”وَأَمَّا بِلَادُهَا وَلَا تَكْفَارُ فَيَجُوزُ لِلْمُسْلِمِينَ إِقَامَةُ الْجَمْعِ وَالْأَعْيَادِ وَيَصِيرُ الْقَاضِي قَاضِيًا

بتراضی المسلمین ویجب علیہم طلب وال مسلم“ (۱)۔

ایسے شہروں میں جہاں غیر مسلم حکام ہوں مسلمانوں کے لیے جمعہ اور عیدین کا قائم کرنا جائز ہے اور جس کو وہ اپنی مرضی سے قاضی بنادیں وہ قاضی ہو جائے گا اور مسلمان والی کے لیے جدوجہد کرنا ان پر لازم ہوگا۔

(۶) اگر مسلمانوں کا ایسا نظام بھی نہ ہو تو نماز جمعہ قطعاً انتشار نہیں ہوگی بلکہ یہ فریضہ تمام مسلمانوں پر عائد ہوگا کہ وہ جمعہ کا امام بنائیں اور جمعہ وعیدین کی نمازیں شہروں میں حسب شرائط ادا کریں: ”یقیمہا امیر البلد ثم الشرطی ثم من ولاية قاضی القضاة ونصب العامة الخطیب غیر معتبر مع وجود من ذکر، أجمع علمہم فیجوز للضرورة“ (۲)۔

نماز جمعہ امیر البلد (والی یا گورنر) قائم کرائے گا، وہ نہ ہو تو شرطی یعنی وہ انسرجس کو سلطان نے اسی قسم کے تقررات کے لیے مقرر کیا ہے، مثلاً صدر الصدور یا امیر الامراء وغیرہ عام مسلمان اگر خطیب اور امام جمعہ مقرر کر لیں تو وہ قابل اعتبار نہیں ہے، جب کہ ان عہدہ داران میں سے کوئی عہدہ دار موجود ہو اور اگر کوئی عہدہ دار بھی نہ ہو تو ضرورتاً تمام مسلمانوں کے انتخاب کو منظور کر لیا جائے گا اور اس کو امام مقرر دیا جائے گا جس کو مسلمان امام مقرر دے لیں۔

(۷) جہاں تک میری واقفیت ہے دارالامن جدید اصطلاح ہے۔ قرآن اور حدیث تو کیا فقہائے متقدمین کی تصانیف میں بھی یہ اصطلاح رائج نہیں ہے، لیکن اس کا تصور ضرور موجود ہے، کیونکہ غیر اسلامی مملکت میں جہاں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل نہ ہو مسلمانوں کے لیے بودوباش اور کاروبار کو حرام نہیں قرار دیا گیا بلکہ وہ مسلمان جو دشمنوں میں رہتا تھا اور کسی مسلمان کے ہاتھ سے خطا قتل ہو گیا، اس کے متعلق قرآن پاک (۳) میں احکام مذکور ہیں۔

اسی طرح سورہ انفال کے آخری رکوع میں ان نو مسلموں کے متعلق احکام ہیں جو اپنے وطن میں مسلمان ہو گئے اور

۱- رد المحتار قبل باب الحرة والخراج ۳۳۲-۲۵۳۔

۲- رد المحتار ۵۳۷۔

۳- ”سجدون اخرین یریدون ان یأمنو کم ویأمنوا قومہم کلما ردوا إلى الفضة أركسوا فیہا فإن لم یعزلو کم ویلقوا إلیکم السلم ویكفوا أیدیہم فخذلوہم والقلوہم حیث تقسموہم وأولاتکم جعلنا لکم علیہم سلطانا مبدا، وما كان لمؤمن أن یقتل مؤمنا إلا خطئا ومن قتل مؤمنا خطئا فحریرو رقبة مؤمنة ودية مسلمة إلى أهله إلا أن یصدقوا فإن كان من قوم عدو لکم وهو مؤمن فحریرو رقبة مؤمنة وإن كان من قوم بینکم وبنیہم میناق فدية مسلمة إلى أهله و تحریرو رقبة مؤمنة فمن لم يجد فصيام شهرین متتابعین توبة من الله وكان الله علیہا حکما“ (سورہ نساء ۹۱-۹۲)۔

ہجرت کر کے دارالاسلام میں نہ آئے (۱)، اسی طرح کے اور احکام جو دوسری آیتوں سے مترشح ہوتے ہیں ان سے ان کا جواز ثابت ہوتا ہے اور یہی جواز تھا جس کی بنا پر حضرات صحابہؓ اپنے دور میں اور ان کے بعد حضرات تابعین اور ان کے اتباع غیر اسلامی ممالک میں پہنچے، وہاں قیام کیا، ان کی زندگیاں اسلامی تھیں، ان کے قول و افعال میں صداقت تھی، وہ کاروبار میں نہایت دیانتدار، خلق خدا کے ہی خواہ، اور جو ان سے خرید و فروخت کرتا، اس کے بھی خیر خواہ اور صحیح معنی میں الصدوق اور الامین ہوتے تھے، ان کی اس شان نے ان ممالک کے عوام کے دلوں کو اسلام کا گر ویدہ بنایا۔ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک جن میں مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ملک کہلاتے ہیں، ان میں اسلام ان ہی حضرات کے قیام کی بدولت پھیلا۔ علاوہ ازیں جس طرح ان غیر مسلم مستانین کے احکام موجود ہیں جو دارالحرب سے دارالاسلام میں آئیں، ایسے ہی ان مسلمانوں کے متعلق بھی احکام موجود ہیں جو دارالاسلام سے دارالحرب میں مستان کی حیثیت سے جائیں۔

البتہ زمانہ جنگ میں جائز نہیں ہے کہ دارالاسلام کا کوئی مسلمان دارالحرب میں قیام کرے جس سے دشمنان اسلام کو قوت پہنچے اور خود اس کے لیے بھی خطرہ رہے، کما قال رسول اللہ ﷺ: "لا ترائی ناراضاً" (۲)۔

(۸) رہا یہ کہ دارالامن میں دارالحرب جیسے معاملات جائز ہیں؟ اس کا جواب اثبات میں دیا جاسکتا ہے۔ مگر بنیادی طور پر فقہاء کا یہ مسلمہ اصول یا درکنا ضروری ہے: "المسلم ملتزم بحکم الاسلام حیث مایکون" (۳) (مسلمان احکام اسلام کا پابند ہے جہاں کہیں بھی وہ ہو)۔

چنانچہ خیانت، دھوکہ، رشوت، احتکار، (ذخیرہ اندوزی) استحصال بالجبر، ٹیکس کی چوری وغیرہ جس طرح دارالاسلام میں حرام ہیں دارالحرب میں بھی حرام ہیں، ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ ان سب برائیوں سے بالارہے اور خصوصاً ایسے موقع پر کہ یہ امراض و بلاء کی طرح پھیل رہے ہوں، مسلمان پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ احکام اسلام پر عمل کرتے ہوئے خیر امت ہونے کا مظاہرہ کرے، یہی موقع ہے کہ عملاً اسلام کی برتری ثابت کی جاتی ہے اور دوسرے کو متاثر کیا جاتا ہے۔

باقی بہت سے معاملات ایسے ہیں جو دارالاسلام میں اسلامی قانون کے مطابق ناجائز ہوتے ہیں، اگر ان کے

۱- "والمؤمن آمنوا ولم یہاجرُوا مالکم من ولائہم من شیء حتی یہاجرُوا وإن استصروکم فی الدین فعلیکم النصرا إلا علی قوم بینکم و بینہم مفاق واللہ بما تعملون بصیر" (سورۃ انفالہ: ۷۲)۔

۲- ترمذی شریف ۱/ ۱۹۳۔

۳- شرح کبیر جلد ۲۔

سلسلہ میں کوئی مقدمہ اسلامی عدالت میں پیش ہو تو عدالت اس کے ناجائز ہونے کا فیصلہ کرے گی۔ اور اس خرید و فروخت کو ناجائز قرار دے گی، لیکن یہی معاملات اگر دارالحرب میں کیے جائیں تو وہاں کے قانون کے مطابق وہ غلط نہیں ہوتے بلکہ ان کو جائز قرار دیا جاتا ہے، مثلاً ایک من گیبوں کے معاوضہ میں ڈیڑھ من یا دو من گیبوں خریدنا ”ربوا“ کہلاتا ہے جو اسلامی قانون کے مطابق جائز نہیں ہے۔ اس طرح کی بیع اگر دارالاسلام میں ہو اور مقدمہ عدالت میں پہنچے تو اس بیع کو ناجائز قرار دیا جائے گا، لیکن اگر یہ دارالحرب میں ہو اور وہاں کا قانون اجازت دے دے تو اسے مسلمان کی ملک تصور کیا جائے گا۔ اب اگر کوئی فریق دارالاسلام میں اس مقدمہ کو چلانا چاہے تو تقاضی اسلام اس کو خارج کر دے گا، کیونکہ یہ معاملہ دارالاسلام کا نہیں ہے۔

اسی طرح کے احکام ہیں جن کے متعلق مشہور ہو گیا ہے کہ دارالحرب میں بیوع فاسدہ جائز ہوتی ہیں، بشرطیکہ فریقین راضی ہوں اور معاملہ خوش دلی سے ہو۔

سیرکبیر میں ہے: ”إذا دخل المسلم دار الحرب بأمان فلا بأس بأن يأخذ منهم أموالهم بطيب أنفسهم بأى وجه كان، لأنه إنما أخذ المباح على وجه عرى عن الغدر فيكون ذالك طيباً له، والأسير والمستامن سواء حتى لو باعهم درهماً بدرهمين أو باعهم مائة بمرأهم أو أخذ مالاً منهم بطريق القمار ذالك كله طيب لهم“ (۱)۔

(کوئی مسلمان دارالحرب میں پروانہ امن (ویزا) لے کر جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہاں دارالحرب والوں کے مال کسی بھی صورت سے حاصل کرے جو طیب خاطر اور خوش دلی سے ہو، کیونکہ یہ ایسا مال لے رہا ہے جو مباح ہے، ایسی صورت سے لے رہا ہے جو دھوکہ فریب سے پاک ہے، پس یہ مال اس کے لیے حلال و طیب ہوگا، کوئی مسلمان دارالحرب میں اسیر کی حیثیت سے ہو یا پروانہ امن حاصل کر کے (ویزا لے کر) گیا ہو۔ دونوں کے لیے یہی حکم ہے، چنانچہ اگر وہاں ایک درہم دو درہم میں فروخت کر دے یا مردار جانور کو درہموں کے بدلے فروخت کر دے (بقیمت فروخت کر دے) یا قمار کی صورت میں مال حاصل کرے تو یہ سب صورتیں اس کے لیے جائز ہوں گی) (۲)۔

(۹) سیرکبیر کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالحرب میں جو معاملہ اہل حرب سے ہو اس کے حلال

۱- سیرکبیر بحوالہ کشف الاستار۔

۲- سیرکبیر بحوالہ کشف الاستار۔

وطیب ہونے کے لیے طیب نفس یعنی خوش دلی اور رضامندی کافی ہے، وہ رضامندی شرعاً معتبر ہو یا نہ ہو، چنانچہ سود اور قمار میں جو رضامندی ہوتی ہے، اگرچہ وہ شرعاً معتبر نہیں ہے، لیکن دارالحرب میں یہ غیر معتبر بھی معتبر ہوگی۔ اور اس رضامندی سے حاصل شدہ مال طیب قرار دیا جائے گا۔

تو سولی یہ ہے کہ شریعت نے جس کو خبیث فرمایا ہے، کیا اس کی خباثت صرف دارالاسلام تک ہے یا وہ خباثت اس معاملہ کی فطرت ہے جہاں بھی اس معاملہ کا وجود ہوگا۔ خباثت موجود رہے گی۔

مثلاً قمار بقول حضرت شاہ ولی اللہ اس لیے حرام ہے کہ کسب و اتحصال کے جو ضابطے شریعت نے مقرر کیے ہیں یہ ان کے برعکس اور ان کے منافی و مخالف ہے۔ مثلاً یہ کہ ان میں ایسی محنت نہیں ہوتی جس سے قوم اور ملک کو فائدہ پہنچے۔

حضرت شاہ صاحب محنت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

چور، ڈاکو، گروہ کٹ اور بھیک مانگنے والے سب ہی محنت کرتے ہیں، مگر ان کی محنت سے نہ ملک کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے، نہ اس کی صنعت و حرفت میں، نہ تمدن ترقی کرتا ہے، نہ تعمیر ملک میں فروغ ہے، بلکہ یہ جرائم ان مقاصد کے لیے تباہ کن ہوتے ہیں، اسی طرح قمار باز اور سود خوار محنت ضرور کرتے ہیں مگر ان کی محنت سے ملک کی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ ان کی محنت ایک طرح کا ہیر پھیر ہوتی ہے جس سے دوسرے کی رقم جھپٹ لی جاتی ہے اور اس کی تہہ میں طمع و حرص کار فرما ہوتی ہے جو قانون کی حد سے آگے بڑھ کر اخلاق اور روحانیت کے نقطہ نظر سے نہایت خطرناک مرض ہیں، سود کی بھی اصل علت حرص و طمع ہوتی ہے جس میں جارحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ سود خوار کمزور کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کی کمزوری میں اور اضافہ کر دیتا ہے، کیونکہ ضرورت مندی قرض لینے پر مجبور ہے، ظاہر ہے اس میں ادائے قرض کی وسعت مشکل ہی سے پیدا ہوگی، لیکن سود خوار اس مشکل کی بناء پر رحم کرنے کے بجائے اس کی مشکل میں اضافہ کر دیتا ہے کہ سود کے مطالبہ کو دو چند اور سہ چند کر دیتا ہے (۱)۔

ان افعال کی یہ قباحتیں جس طرح دارالاسلام میں ہوتی ہیں، دارالحرب میں بھی قائم رہتی ہیں۔ تو جن معاملات کی تہ میں یہ قباحتیں موجود ہوں ان کی آمدنی کو حلال و طیب کیسے کہا جاسکتا ہے۔ قانونی نقطہ نظر سے اگر جواز پیدا ہوتا ہے تو اس کو اسی حد تک محدود رہنا چاہیے، اس کو حلال و طیب نہیں کہنا چاہیے۔ قمار سے حاصل کردہ رقم دارالحرب میں جائز ہوگی، کیونکہ اس کو اسلامی قانون کا تحفظ حاصل نہیں اور ملکی قانون اس کو جائز قرار دیتا تھا، لیکن اس جائز کو طیب نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ اخلاقی

قباحتیں اس کی شکموں میں بدستور پیوست ہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ حسن و قبح کا مدار شریعت کے فیصلہ پر ہے، شریعت جس کو جائز قرار دے وہ حسن ہے اور جس کو ناجائز قرار دے وہ قبح ہے۔

سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے غالبہ روم کی قرآنی پیشین گوئی کے سلسلہ میں بازی لگا دینے پر جو مال حاصل کیا تھا حضور ﷺ نے اس کو جائز قرار دیا، اس جائز کو حسن اور اس ملک کو طیب ہی کہا جائے، لیکن بحر العلوم حضرت مولانا فتح محمد صاحب نے اس جواز کے متعلق بیان کی ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے آپ فرماتے ہیں:

جو مال ایسے ملک سے لیا جائے جہاں صلح و عہد ہے اگر قبر و جہر لیا ہے تو غیر مملوک و حرام ہے اور اگر ایسی رضا سے لیا جائے جو شرعاً ممنوع ہے جیسے حرکی بیج یا سود یا قمار وغیرہ تو ملک آجائے گی برعایت صورتِ رضا اور حلت نہ آئے گی بوجہ مخالفت شرعی اور اگر وہ رضا شرعاً معتبر یا مسکوت ہو تو ملک بھی آجائے گی اور حلت بھی (۱)۔

(۱۰) دارالامن کے غیر مسلم کو حربی کی حیثیت نہیں دی جاسکتی، مثلاً ہندوستان کا کوئی مسلمان باشندہ لندن یا پیرس چلا جائے تو وہاں کے باشندوں سے اس کا کوئی رابطہ یا معاہدہ نہیں ہوگا، لیکن ہم وطن غیر مسلموں سے اس کے بہت سے رابطے ہیں وہ برآمد کے شہری ہیں، ملکی قانون کے پابند اور اقتصادی کاروباری معاملات اور قومی اداروں میں شریک اور ایک دوسرے کے مددگار وغیرہ وغیرہ۔

(۱۱) تنویر الابصار میں ایک جزیہ ہے:

”دار الحرب تصیر دار الاسلام یا اجراء احکام اهل الإسلام فیہا“ (۲)۔ صاحب الدر المختار نے اس کی مثال دی ہے کہ جمعہ و عید۔

در مختار کی اس مثال کی بناء پر کچھ علماء کی رائے ہے کہ ہندوستان دارالاسلام ہے کہ یہاں جمعہ اور عیدین کی نمازیں پڑھی جاتی ہیں، لیکن ہر ایک صاحب بصیرت فیصلہ کر سکتا ہے کہ جمعہ و عیدین کی مثال صحیح نہیں ہے، کیونکہ جمعہ اور عیدین کی نماز کے پڑھ لینے کو ”اجراء احکام الاسلام“ نہیں کہا جاسکتا، ایک معمولی مجسٹریٹ بھی کسی مقام پر جمعہ یا عید کی نماز سے روک دے تو مسلمانوں میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کے حکم کو منسوخ کر کے اپنے فیصلہ کے بموجب وہاں عید کی نماز یا جمعہ کی نماز پڑھ سکیں۔

۱- عطرہ برائے ۱۸۰۔

۲- تنویر الابصار ۳۵۲، قبل باب اشتر و الخراج۔

حکم اسلام کا اجراء یہ ہے کہ اہل اسلام اپنا فیصلہ نافذ کر سکیں، ادا فرض کی اجازت ہونا اور چیز ہے اور حکم اسلام کے اجراء کا اختیار و اقتدار اور چیز ہے۔ یہ مثال اس لیے بھی بے محل ہے کہ خود رد اختیار کی تحریر سابق کے مخالف ہے، جو فقرہ ”ب“ میں پیش کی گئی جس میں دارالاسلام اس علاقہ کو کہا گیا ہے، جہاں با اختیار والی مسلم ہو اگر محض نماز جمعہ پڑھ لینے سے کوئی علاقہ دارالاسلام ہو جاتا ہے تو والی مسلم کا تذکرہ غیر ضروری اور بے کار ہے۔

(۱۲) بہر حال ہندوستان کو آپ دارالحریت قرار دیں یا دارالاسلام، مگر یہ ظاہر ہے کہ یہاں عقود اور معاملات کے متعلق وہی احکام ہیں جو دارالاسلام میں ہوتے ہیں۔ پھلوں اور باغات کی بیج کی مختلف صورتوں میں وہی فتاویٰ صادر کیے جاتے ہیں جو دارالاسلام میں صادر کیے جاتے ہیں۔ کوہ عقود اور معاملات کے سلسلہ میں علماء دارالاسلام ہی مانا جاتا ہے۔

حضرت مولانا فتح محمد میاں صاحب رحمہ اللہ اس سلسلہ میں ایک ضابطہ تحریر فرماتے ہیں:

فقرہ (۹) میں جو شرطیں بیان کی عبارت گزری ہے، اس کو ملاحظہ فرمائیے، اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں: اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ دارالکفر میں با مان رہتے ہیں یا داخل ہوں یا باہم صلح و عہد رکھتے ہوں، انہیں کوئی ایسا معاملہ کرنا جو شرعاً ناجائز ہو، جیسے بیج یا اجارہ فاسد و باطل، یا شرعی ربویا رشوت وغیرہ ہرگز جائز نہیں۔

اور حدیث: ”لا ربوا بین المسلم والحرابی“ کے یہ معنی ہیں کہ مسلمان دارالکفر میں کافر سے سود لے تو وہ سود خوار اور موجب وعید ربوانہ ہوگا، اگرچہ ملک حرام کا مواخذہ باقی ہے مگر سود دینا کسی طور پر جائز نہ ہوگا، مگر جب کہ اس سود کے لینے سے وہاں کے لوگوں کا عہد و صلح ہو، یا یہ ہیں کی رعیت ہو تو لینا بھی جائز نہیں (۱)۔

(۱۳) دار کے سلسلہ میں ملک العلماء علماء الدین کا سانی رحمہ اللہ نے مسلک امام ابوحنیفہؒ کا خلاصہ ان الفاظ میں

بیان فرمایا ہے:

”إن الأمان إن كان للمسلمين فيها على الإطلاق والخوف للكفرة على الإطلاق فهي دار الإسلام، وإن كان الأمان فيها للكفرة على الإطلاق والخوف للمسلمين على الإطلاق فهي دار الكفرة“ (۲)۔

سوال یہ ہے کہ اگر امن اور خوف کا مدار کسی مذہب پر نہ ہو، حکومت کا دستور اساسی یہ ہو کہ حکومت کا تعلق کسی مذہب

۱- عطرہ ہدایہ ص ۱۸۱۔

۲- بدائع الصنائع ۱/۳۱۷۔

سے نہیں ہے، نہ کسی مذہب کی بنا پر کسی کو ترجیح دی جائے گی، بلکہ امن اور خوف کا مدار وطنیت اور شہریت پر ہو، مثلاً دہلی کا رہنے والا مسلمان ہندوستان کے کسی صوبہ یا کسی شہر میں بھی جائے وہ ہندوستانی ہونے کی بنا پر محفوظ اور مامون ہے اور اس کو تمام شہری حقوق حاصل ہیں، لیکن نیپال کا رہنے والا بدھمن ویزا کے بغیر حدود ہندوستان میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا، تو اس صورت میں اس دار کو کیا کہا جائے گا؟ کیا کسی مذہب کی طرف منسوب کرنا الزام مالا یلتزم نہیں ہوگا (۱)؟

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

دارالاسلام و دارالکفر کی تحقیق:

الجواب وبالله التوفیق:

(۱، ۲، ۳) حضرت مجیب نے بالکل صحیح فرمایا، (۲) دارحقیقت میں دو ہی ہوتے ہیں: ایک دارالاسلام جس کی توضیح و تشریح حضرت مجیب نے بہت مفصل و مدلل فرمادی ہے کہ اقتدار اعلیٰ (۳) جس ملک میں مسلمانوں کو مکمل طور پر حاصل ہو اور اس کو اسلامی احکام کے مطابق ہر قانون بنانے اور اس کو جاری کرنے کی پوری قدرت حاصل ہو۔ دوسرا دار، دارالاسلام کا مقابل ہوگا۔ اور اسلام کا مقابل کفر ہے، لہذا دوسرا دارحقیقت میں دارالکفر ہوگا اور یہی دو دارحقیقت و واقعہ ہیں۔

پھر دارالکفر کی بنیادی و اصولی طور پر چار قسمیں ہیں: (۱) دارالحاربہ (۲) دارالمعاہدہ و السلامہ (۵)

۱- حضرت مولانا سید محمد میاں رحمہ اللہ کا جواب مکمل ہو گیا، اس کے بعد اس کی مزید توضیح بعنوان دارالکفر و دارالاسلام کی تحقیق حضرت مفتی صاحب کی تحریر فرمودہ ہے۔

۲- ”قبل: الدار عندنا دار الإسلام و دار الحرب“ (عینی شرح الہدایہ کتاب اسیر ۳/ ۸۶۲)۔

۳- ”وہذا لأن دار الحرب تصبر دار الإسلام باجواء الأحكام و ثبوت الأمن للمقيم من المسلمين فيها“ (فتح القدیر ۳/ ۳۱۱)۔ دارالکفر کی یہ اقسام اربعہ باہم شیم و متفاد نہیں، جیسا کہ حضرت مفتی صاحب نے آگے اس کی وضاحت فرمائی ہے بلکہ اول الذکر دو قسمیں باہم شیم و متفاد ہیں اور ثانی الذکر دو قسمیں باہم شیم ہیں فرق صرف مقسم کے اعتبار کا ہے اگر دارالاسلام کے تقابل کا اعتبار کیا جائے تو دارالکفر کی دو اول الذکر قسمیں ہوں گی اور اگر دارالکفر کے اندرونی حالات کا اعتبار کیا جائے تو اس کی متاخر الذکر دو قسمیں ہوں گی۔

۴- ”إن كان الأمان فيها للكفرة على الإطلاق والخوف للمسلمين على الإطلاق فهي دار الكفر“ (بدائع الصنائع ۷/ ۱۳۱)۔

۵- ”إذا رأى الإمام أن يصلح أهل الحرب أو فريقاً منهم، وكان في ذلك مصلحة للمسلمين فلا بأس به“ (ہدایہ علی ہاشم الہندی ۹۹/ ۲)۔ ”إذا كانت دار من ديار الحرب قد وادع المسلمون أهلها على أن يؤدوا إلى المسلمين شيئاً معلوماً في

(۳) دارالامن (۱) (۲) دارالشر و الفساد (۲)، اس لیے کہ دارالاسلام کا محاربہ دارالکفر سے ہوگا یا نہیں، اگر ہوگا تو اس کا نام دارالمحاربہ ہوگا اور اگر محاربہ نہ ہوگا تو دو حال سے خالی نہیں۔ آپس میں ان دونوں داروں (دارالاسلام اور دارالکفر) اور ان کی حکومتوں میں معاہدہ و مسالہ ہوگا یا نہیں، اگر معاہدہ یا مسالہ ہوگا تو اس کو دارالمعاہدہ یا دارالمسالہ کہیں گے اور اگر معاہدہ و مسالہ نہ ہوگا تو پھر دو حال سے خالی نہیں یا تو اس ملک کے مسلم باشندے اور اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون و محفوظ رہتے ہوں گے یا مامون و محفوظ نہ رہتے ہوں گے، اگر مامون و محفوظ رہتے ہوں، جیسے سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ملک حبشہ تو اس ملک کو دارالامن کہا جائے گا اور اگر اس ملک کے مسلم باشندے یا اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون و محفوظ نہ رہتے ہوں تو اس ملک کو دارالشر و الفساد کہا جائے گا۔ جیسے فتح مکہ سے قبل مکہ مکرمہ ان چاروں قسموں میں سے پہلی دو قسموں میں دارالاسلام کے قتال کے اعتبار سے مطلق دارالکفر مقسم ہے، اور بعد کی دو قسموں میں دارالکفر کے اندرونی معاملات کے اعتبار سے مطلق دارالکفر مقسم ہے، اس لیے پہلی دونوں قسمیں دارالمحاربہ و دارالمعاہدہ تو آپس میں تقسیم و متضاد ہوں گی اور بعد کی دونوں قسمیں محض آپس میں تقسیم و متضاد ہوں گی اور بیک وقت جمع نہ ہو سکیں گی، لیکن پہلی دونوں قسموں میں سے ہر ایک کے ساتھ جمع ہو سکیں گی۔ یعنی ایک دار، دارالاسلام کے قتال کے اعتبار سے دارالحرب یا دارالمعاہدہ ہو اور اپنے اندرونی قوانین و معاملات کے اعتبار سے دارالامن یا دارالشر و الفساد ہو، تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ پس ایک ملک و دار بیک

کل مدة على أن لا يجوز عليهم المسلمون احكامهم فهذه دار الحرب، لأن الدار إنما نصير دار الإسلام باجواء حكم المسلمين فيها و حكم المسلمين غير جار فكانت هذه دار حرب“ (شرح اسیر الکبیر ۳/۳۰۲) ”الموادعة وهي المعاهدة والصلح على ترك القتال“ (بدرائع الصنائع ۱۰۸۷)۔

”ان النبی ﷺ صالح اهل مكة عام الحديبية على ان وضع الحرب بيده و بينهم عشر سنين“ (سوط ۲/۳۷۷) ”ولما انهي رسول الله ﷺ إلى ديوك انا يحنه بن روية صاحب إملة فصالح رسول الله ﷺ وأعطاه الجزية و كتب لهم رسول الله ﷺ كتابا فهو عندهم“ (البرية و النهاية ۵/۱۶)۔

۱- دارالامن کا لفظ اگرچہ بعد میں وضع کیا گیا ہے لیکن محدثین میں اس کی مثال موجود تھی۔ حبشہ کا ملک اسی قسم میں داخل تھا۔ ”فلما رأى رسول الله ﷺ ما يصيب أصحابه من البلاء الخ قال لهم: لو خرجتم إلى الحبشة فإن بها ملكا لا يظلم عنده أحد، وهي أرض صدق“ حتى يجعل الله لكم فرجا مما أنتم فيه، فخرج عند ذلك المسلمون من أصحاب رسول الله ﷺ إلى أرض الحبشة“ (البرية و النهاية ۳/۶۶) ”قال النجاشي للمسلمين: اذ هو أأنتم ميوم في الأرض، السيوم الآمنون في الأرض ما أحب أن لي دبراً وإني رجل منكم و الدبر بلسانهم المذهب“ (البرية و النهاية ۳/۷۷)۔

۲- فتح مکہ سے پہلے دارالشر و فساد تھا۔ ”لما جزاء اللعين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الأرض فساداً أن يقتلوا أو يصلبوا أو تقطع أيديهم وأرجلهم من خلاف أو ينفوا من الأرض“ (سورہ مائدہ ۶۴)۔

وقت دونوں قسموں کے اعتبار سے دار المعاہدہ والمسالمة اور داراشر والفساد بھی کہا جاسکتا ہے۔ اور اسی طرح پر مطلق دار کی پانچ قسمیں نکل آئیں گی: (۱) دار الاسلام (۲) دار الحاربه (۳) دار المعاہدہ والمسالمة (۴) دار الامن (۵) داراشر والفساد۔ لیکن دار الکفر کی ان چاروں قسموں میں سے پہلی قسم نہایت اہم اور شدید ہے، نیز کفر اپنی حقیقت و مفہوم و اثر کے اعتبار سے ”ودوا لو تکفرون الخ“ کی خاصیت رکھتا ہے اور اسلام اپنی حقیقت و مفہوم و اثر کے اعتبار سے ”بلغوا عني ولو آية“ (الحدیث) اور آیت کریمہ: ”وجادلہم بالتي هي احسن“ (۱) اور آیت کریمہ: ”وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا ان الله لا يحب المعتدين“ (۲) اور آیت کریمہ: ”وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله فان انتهوا فلا عدوان الا على الظالمين“ (۳) کی خاصیت رکھتا ہے اور اس کے مطابق عمل کا مخاطب ہے، اس لیے ہر وقت تصادم و کراؤ کا مظہر و خطرہ موجود رہتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ اسی وجہ سے فقہاء کرام کے یہاں ”تسمية الكل باسم الجزء یا تسمية كل افراد المقسم باسم بعض افراد المقسم“ کے مطابق دار الکفر کے سب سے اہم و شدید فرد کا ترغیباً و تحریماً علی الجہاد و دار الحرب کا نام اس کے سارے و تمام افراد پر جاری ہو گیا پھر وہی شائع و ذائع بھی ہو گیا ہو، ورنہ تمام اقسام کے احکام الگ الگ فقہاء متقدمین کی کتابوں میں بھی ملیں گے۔ پھر اسلام (۴) کے ابتدائی دور میں اگرچہ دار الکفر متعدد و مختلف تھے، مگر تمام عالم اسلام کی حکومت ایک ہی تھی اور دار الاسلام بھی ایک ہی تھا، اس لیے ان تمام اقسام و جگہ نہ سے بات آگے نظر نہیں آتی، البتہ جب (۵) بنو امیہ و بنو عباسیہ کی دو الگ الگ اور مستقل حکومتیں بن گئیں اور ہر ایک اپنی حکومت کو مستقل

۱- سورہ نحل: ۱۲۵- ۲- سورہ بقرہ: ۱۹۰- ۳- سورہ بقرہ: ۱۹۲

۴- ”عن انس بن مالک ان رسول الله ﷺ كتب قبل موته إلى كسرى وقبصر وإلى النجاشي وإلى كل جبار يدعوه إلى الله عز وجل“ (البدایہ والنہایہ ۳/۲۶۲) ”عن عبد الله بن عبد القادری ان رسول الله ﷺ بعث حاطب بن أبي بلتعجة إلى المقوقس صاحب الإسكندرية فمضى بكتاب رسول الله ﷺ“ (البدایہ ۳/۲۷۲)۔

۵- اندلس کا پہلا فرمانروا عبدالرحمن الداخل ۳۰ھ سے ۷۵ھ تک اندلس کی حکومت کا مالک رہا، اس کے بعد بالترتیب ہشام اول از ۷۵ھ تا ۱۸۰ھ، حاکم اول از ۱۸۰ھ تا ۲۰۶ھ، عبدالرحمن طائی از ۲۰۶ھ تا ۲۳۸ھ، محمد اول از ۲۳۸ھ تا ۳۰۳ھ، منذر از ۳۰۳ھ تا ۳۵۵ھ، عبداللہ از ۳۵۵ھ تا ۳۷۰ھ حکومت کے مالک ہوتے رہے لیکن ان میں سے کسی نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا ورنہ خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ ۳۷۰ھ میں عبدالرحمن طائی کا انتقال ہوا، سب سے پہلے اسی نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا اور اندلس میں اس سے خلافت کا آغاز ہو گیا۔ ”في هذه السنة (سنة خمسین وثلاث مائة) توفي عبد الرحمن بن محمد بن عبد الله صاحب الأندلس الملقب بالناصر المدين الله فكانت إمارته خمسین سنة وسنة أشهر وكان عمره ثلاثاً وسبعین سنة وهو أول من لقب من الأمويين بالقباب الخلفاء وسمي بأمير المؤمنين“ (تاریخ الکامل ۸/۱۷۶) دوسری طرف بغداد کے ندر عباسی خلفاء کے بعد دیگرے خلیفہ ہوتے رہے۔ عبدالرحمن طائی کے پچاس سالہ دور خلافت کے اندر مندرجہ ذیل عباسی خلفاء تحت خلافت پر آئے۔ المعتذر باللہ از ۲۹۰ھ تا ۳۰۰ھ، القاهر باللہ از ۳۰۰ھ تا ۳۰۲ھ، الراضی باللہ از ۳۰۲ھ تا ۳۰۹ھ، المتعز باللہ از ۳۰۹ھ تا ۳۳۳ھ

دار الاسلام قرار دینے لگا تو اگر دارالکفر کا ایک ہی ملک ایک حکومت اسلامیہ کے اعتبار سے دارالحرب اور دوسری حکومت اسلامیہ کے اعتبار سے دارالامن یا دارالمعاہدہ یا دارالشر و انصاف قرار پانے لگے یا پاجائے تو یہ کسی تعجب یا کسی اختلاف کی بات نہ ہوگی بلکہ دارالاسلام کے ان حصوں کے اختلاف کی وجہ سے یہ اختلاف ہوگا، پھر جب مسلم حکومتیں ٹویڈوں (۱) میں منقسم ہو کر اور زائد متعدد ہو گئیں تو دارالکفر کی ایک قسم مختلف مسلم حکومتوں کے اعتبار سے الگ الگ ناموں سے بھی موسوم ہو سکتی ہیں، مثلاً اگر مسلم حکومت کے اعتبار سے دارالکفر کا ایک ملک دارالمعاہدہ و المساہمہ ہو تو دوسری حکومت کے اعتبار سے وہی ملک دارالحرب اور دوسری کے اعتبار سے دارالشر و انصاف ہو اور چوتھی کے اعتبار سے دارالامن ہو اور ہر ایک مسلم حکومت اپنے اپنے

المستحکم باللہ از ۳۳۳ھ تا ۳۳۴ھ، الطبع اللہ از ۳۳۳ھ تا ۳۳۴ھ۔

عبدالرحمن ثالث کے بعد دوسرے اسی خلفاء اندلس میں خلیفہ ہوتے رہے اور عباسی خلفاء بغداد میں اندلس کے علاوہ باقی اسلامی ممالک کے خلیفہ ہوتے رہے اس طرح بیک وقت اسلامی ممالک میں دو خلیفہ کا وجود بقول تک رہا۔ ۳۹۲ھ تک اندلس سے مسلمانوں کا خاتمہ ہو گیا اور عباسی حکومت بھی رو بہ زوال ہونے لگی یہاں تک کہ قشتالہ راٹھا اور آخری عباسی خلیفہ المستعصم بن المستنصر کو ۶۵۶ھ میں قتل کر دیا گیا۔ کانت مدة خلافة المستعصم ۱۶ سنة تقرباً وعمره ۵۰ سنة الخ والقضت الدولة العباسية من بغداد بعد ان دامت ۵۲۲ سنة ای من مدة ۱۳۲ وهي السدة التي اسولى فيها النور على بغداد وعدد خلفائهم ۳۷ خليفة الخ (دروس التاريخ ۲/۲۴۳)۔

اس زمانہ میں پوری اسلامی خلافت کھڑیوں میں بٹ گئی تھی۔ کچھ مدت کے بعد پھر دوسری خلافت کا آغاز ہو جاتا ہے کیونکہ عباسیوں کے بعض افراد قشتالہ سے بچ کر مصر چلے گئے تھے وہاں جا کر انہوں نے خلافت کی بیعت لی۔ سب سے پہلا خلیفہ المستعصم باللہ ابو القاسم از ۶۵۶ھ تا ۶۶۱ھ ہوا۔ اس کے بعد الحاکم بامر اللہ ابو العباس از ۶۶۱ھ تا ۶۷۱ھ اور خلیفہ رہا، اور عالم اسلام کے اکثر حصوں پر عثمانیوں کی حکومت و خلافت قائم ہو چکی تھی، آل عثمان کی خلافت کا آغاز عثمان اول سے ہوتا ہے جو ۶۹۹ھ سے ۷۱۶ھ تک خلیفہ رہا، لیکن اسے دوسری خلافت کی ابتداء دوبارہ ہو جاتی ہے اور اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا، جب تک کہ ۹۲۶ھ میں مصر سے بھی عباسی خلافت کا خاتمہ ہو کر عثمانیوں کا قبضہ نہ ہو گیا۔ اوپر کی مختصر تاریخی تفصیلات سے یہ معلوم ہو گیا کہ بیک وقت متعدد خلفاء کا وجود رہا ہے۔ اس کی سب سے پہلی مثال حضرت سجاد اور حضرت حسن کی خلافت کے وقت ملتی ہے ایک طرف سجاد و خلیفہ تھے اور دوسری طرف حضرت حسن خلیفہ تھے، یہ ۴۰ھ کا واقعہ ہے لیکن چھ ماہ کے بعد حضرت حسن نے خلافت سے دستبردار ہو کر حضرت سجاد کو مستقل خلیفہ مان لیا: ”ثم دخلت سنة اربعين وفي هذه السنة بويع لمعاوية بالخلافة بايلاء الخ فلما قتل علي دعى لمعاوية أمير المؤمنين“ (تاریخ طبری ۶/۹۷۰ سم ۴۰)۔

۱۔ مثلاً پانچویں صدی کے اوائل میں کئی دارالاسلام بن گئے تھے۔ بغداد میں قادریہ اللہ از ۳۵۱ھ سے ۳۵۲ھ تک خلیفہ رہا۔ اسی زمانہ میں قاسم ابن حمود اشبیلیہ پر قبضہ کر کے وہاں حکومت کرنے لگا اور اسی وقت اس کا بھتیجا یحییٰ ابن علی الملقب سے قرطبہ پہنچا اور لوگوں سے بیعت لی۔ یہ واقعہ شروع جمادی الاولیٰ ۳۵۲ھ کا ہے ”لما سار القاسم ابن حمود من قرطبة إلى إشبيلية سار ابن أخيه يحيى ابن علي من مالقه إلى قرطبة فدخلها بغير مانع فلما تمكن بقرطبة دعا الناس إلى بيعه فاجابوه فكانت البيعة مسهله جمادى الاولى من سنة ائسي عشرة وأربع مائة ولقب بالمعتلي وبقي بقرطبة يدعى له بالخلافة وعمه القاسم بإشبيلية ويدعى له بالخلافة إلى ذى القعدة سنة ثلاث عشرة وأربع مائة“ (تاریخ الکامل، ۹/۹۳)۔

اعتبار سے وہاں کے بارے میں احکام مرتب و جاری کرے، یہ سب ہو سکتا ہے اور بظاہر اگرچہ ایک ہی ملک کے بارے میں متضاد قسم کے احکام و نام نظر آئیں، مگر یہ سب اصل میں احکام کا تضاد نہ ہوگا بلکہ ان مسلم حکومتوں کے اختلاف کی وجہ سے نظر آئے گا۔

پھر دار کی یہ سب قسمیں اس وقت کے اعتبار سے ہیں جب شخصی حکومتیں عام طور سے رائج تھیں اور ایک ہی قسم کے احکام قوائین پورے ملک میں یکساں طور پر جاری و رائج ہوتے تھے۔ اب جب کہ جمہوری حکومتوں کا عام رواج ہو گیا ہے اور جمہوری حکومتوں میں خاص کر بڑے ملکوں میں ایک مرکزی حکومت ہوتی ہے اور اس کے تحت متعدد صوبائی حکومتیں ہوتی ہیں اور صوبائی حکومتیں اپنے اندرونی معاملات قوائین میں خود مختار و آزاد بھی ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کے احکام قوائین میں کچھ تغایر بھی ہو سکتا ہے، پس اگر مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے دونوں احکام قوائین بالکل متحد و یکساں ہوں گے۔ جب تو یہی اقسام ہیج گانہ قائم رہیں گے اور اگر ایسا نہ ہوا بلکہ دونوں کے احکام قوائین میں کچھ تغایر ہو تو دونوں کے اعتبار سے نام و اقسام بھی الگ الگ ہو سکیں گے اور ان اقسام کے اعتبار سے احکام بھی الگ الگ ہو سکیں گے۔ یہ سب تقسیمیں اور قسمیں قوائین کے حدود میں اور حکومتی سطح پر ہیں، اور اس تقدیر پر ہیں کہ وہ احکام قوائین سارے ملک میں یکساں رائج و نافذ بھی ہوں اور اندرون ملک کے حالات و معاملات بھی انہیں احکام قوائین کے مطابق ہوں اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ حکومتی سطح کے اور قوائینی حدود کے احکام کچھ اور ہو اور عوامی سطح کے معاملات و حالات کچھ اور ہوں اور حکومت اس پر قابو نہ پائے یا بے اعتنائی برتے یا نظر انداز کرے تو حکومتی سطح اور قوائینی حدود کے احکام کچھ ہی ہوں مگر چونکہ شرعی احکام ظاہر معاملات و حالات پر دائر ہوتے ہیں اور عوامی معاملات و حالات ہی ایسی صورت میں ظاہر و باہر ہوں گے۔ اس لیے شرعی احکام انہیں عوامی حالات و معاملات پر جو ظاہر و باہر ہوں گے، دائر ہوں گے، اور انہیں کا اعتبار عند اشراع ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی ملک میں مسلمانوں کو اقتدار اعلیٰ مکمل طور پر حاصل ہو اور مسلمانوں کے قبضہ و اقتدار میں مکمل طور پر ہونے کی وجہ سے اگرچہ اس ملک پر دارالاسلام کی تعریف صادق آئے، لیکن وہاں اسلامی احکام کے خلاف احکام قوائین نافذ و جاری ہوں، یا اس ملک کے رہنے والے مامون و محفوظ نہ ہوں تو اس ملک میں یا وجود ملک مسلم اور فی نفسہ دارالاسلام ہونے کے وہاں کے مروجہ احکام قوائین اور ظاہر معاملات و حالات کے اعتبار سے جو احکام ان پر عند اشراع عائد ہوں گے وہ لاکھ ہوں گے اور فی نفسہ دارالاسلام ہوتے ہوئے غیر شرعی قوائین جو نافذ کریں گے اس پر وہ عند اللہ ماخوذ ہوں گے اور ان کے عمل کی غلطی یا کوتاہی پر عند اللہ ان سے باز پرس ہوگی۔ پس اس حیثیت سے سارے عالم کا دارالاسلام ایک ہوتے ہوئے بھی ان کی صورت کے اعتبار سے احکام بالیقین

الگ الگ اور جدا جدا ہو سکیں گے۔ لہذا اس مطلوبہ استفتاء میں درج شدہ مسائل کے احکام مستنبط کرنے میں بھی ان تمام امور پر نظر رکھنا اور سب کو ملحوظ رکھنا لازمی و ضروری رہے گا، چنانچہ حضرت مجیب نے ان امور کو حتی المقدور ملحوظ رکھا ہے لیکن اگر ایسے علماء کا اجتماع ہو جائے جن کو اس قسم کے مسائل پر بصیرت کی نگاہ حاصل ہو تو نفع سے خالی نہ ہوگا، البتہ طریقہ کار پر پہلے غور کر لینا ضروری رہے گا۔

(۳) اس نمبر میں اس لفظ (اور بین الاقوامی تعلقات میں خود مختار نہ ہوں) کے بعد یہ جملہ (لیکن اپنے داخلی معاملات میں خود مختار ہوں) کا اضافہ ضروری ہے ورنہ پھر اس جملہ (فقہائے اسلام اس کو بھی دارالاسلام کہتے ہیں) کے لیے سند کی ضرورت ہوگی، اور اس پر تفریع کردہ مثال حیدرآباد، بھوپال، چسپاں ہونے کے بجائے دیگر چھوٹی چھوٹی غیر خود مختار ریاستوں کی مثال بھی چسپاں ہو جائے گی، جیسے ریاست مالیر کوٹلہ اور ریاست باغپت وغیرہ۔

(۴) یہ تشریح بھی احقر کے نزدیک بالکل صحیح اور درست ہے، لیکن اخیر کی یہ چند سطریں (یہ ملک دارالحرب الخ) اس طرح کر دینا انسب معلوم ہوتا ہے (ایسا ملک دارالحرب کہا جاسکتا ہے) (۱) لیکن اصل میں ایک پر امن اور باحفاظت ملک ہونے کی وجہ سے دارالکفر کی تیسری قسم دارالامن اس کا نام ہوگا۔

(۵) مستامن (۲) تو اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسرے ملک میں عارضی قیام کی نیت سے کچھ دنوں کے لیے امن حاصل کر کے قیام پذیر ہو جیسے کوئی مسلمان لندن و امریکہ وغیرہ ملکوں میں بذریعہ ملازمت یا تجارت وغیرہ کے لئے عارضی طور پر قیام پذیر ہو جائے اور وہاں کا شہری نہ بنے اور جو شخص (۳) اس ملک کا مستقل باشندہ ہو اس کو مستامن نہیں کہتے، بلکہ اس کے لیے مستقل دوسرا نام ہوگا، مثلاً امریکی مسلمان، افریقی مسلمان، روسی مسلمان وغیرہ، البتہ بعض اعتبار سے اس کو مستامن کی حیثیت میں کہا جاسکتا ہے اور غالباً حضرت مجیب کی بھی یہی مراد ہوگی۔

۱- "قال النجاشي: اذهبوا فانتم مبيوم في الارض، المبيوم الامنون في الارض ما احب ان لي دبراً واهي اذيت رجلاً منكم والديرو بلسانهم المذهب" (ہدایہ ۳/۷۲)۔

۲- "وهو المسلم الذي يدخل دار الحرب بالامان وكذا الذي يطلق على الحرب الذي يطلب الامان من المسلمين" (عینی شرح ہدایہ ۲/۸۵۳) "هو يشمل مسلماً دخل دارهم بأمان وكذا الذي دخل داراً بأمان" (شرح الوثاقیہ ۱/۳۶۱)۔

۳- "إذا دخل الحربي دار الإسلام بأمان لا يمكن أن يقيم فيها مدة الخ فإن مكث مدة فهو ذمی الخ وللإمام أن يقتل له أقل من ذلك إذا رأى كالمشهور والنهريين" (ماتگیری ۲/۲۳۳) "الذي ملتزم أحكام الإسلام فيما يرجع إلى المعاملات والمساكن غير ملتزم بالملك" (المسوط ۱۰/۸۹) "لأنه بقبول عقد الدعة يصير من أهل دار لا حتى لا يمكن من الرجوع إلى دار الحرب بحال" (المسوط ۱۰/۸۷ و ۸۷)۔

(۶) یہ تشریح بھی درست ہے۔

(۷) یہ تشریح بھی بہت اچھی ہے، البتہ دارالامن جدید اصطلاح نہیں ہے، بلکہ قدیم چیز ہے (۱)، لیکن اس کا ظہور وشیوع بعد میں ہوا جیسا کہ خود حضرت مجیب کے اس جملہ (اس کا تصور ضرور موجود ہے) سے معلوم ہوتا ہے۔

(۸) یہ تشریح بھی درست ہے۔ البتہ بعض جملوں کی تعبیری عبارت میں کچھ تغیر کی ضرورت ہے جس کو اس موقع پر ظاہر کر دیا گیا ہے۔

(۹) یہ تشریح بھی بہت عمدہ ہے، صرف ایک قید کی ضرورت تھی جس کو برہا دیا گیا ہے۔

(۱۰) جی ہاں صحیح ہے، دارالامن کے غیر مسلم کو ہر حیثیت سے حربی (بمعنی حربی محارب) کی حیثیت نہیں دی جاسکتی بلکہ عموماً معاہدہ و مسلم کی حیثیت یا مومن کی حیثیت رہتی ہے۔

(۱۱) یہ تفریع بہت مناسب ہے۔

(۱۲) ان احکام کے دارالامن (دارالحرب) میں نافذ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان احکام میں اس دار کو عملاً دارالاسلام ہی مانا جاتا ہے، بلکہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہ احکام دارالاسلام و دارالامن (دارالحرب) دونوں کے لیے یکساں و عام ہیں، اس لیے نافذ کیے جاتے ہیں، جیسا کہ خود یہی بات صاحب عطر ہدایہ کی محولہ عبارت سے معلوم ہوتی ہے۔

(۱۳) ملک العلماء کی دار کے بارے میں جو عبارت نقل فرمائی گئی ہے وہ امان و خوف کی ہر صورت کو حاوی نہیں ہے، اس لیے کہ امن و خوف کے اعتبار سے چھ صورتیں اور بھی ہیں اور کل آٹھ صورتیں ہو جاتی ہیں:

۱- ”أمان للمسلمین علی الإطلاق و خوف للكفرة علی الإطلاق“، ۲- ”أمان للكفرة علی الإطلاق“
 ۲) ”و خوف للمسلمین علی الإطلاق“، ۳- ”أمان للمسلمین علی الإطلاق و خوف للكفرة مقید بقیود“ (۳)،

۱- ”فلما رأى رسول الله ﷺ أعصاب أصحابه من البلاء الخ قال لهم: لو خرجتم إلى الحبشة فإن بها ملكا لا يظلم عده أحد، وهي أرض صدق حتى يجعل الله لكم فرجاً مما أنتم فيه فخرج عدد ذالك المسلمون من أصحاب رسول الله ﷺ (البدایہ والنہایہ ۶۶/۳)“ قال النجاشي للمسلمين: اذهبوا فانكم ميوم في الأرض اليوم الامنون في الأرض“ (البدایہ ۷۳/۳)۔

۲- ”وإن كان الإمام للكفر و الخوف للمسلمین علی الإطلاق فهي دار الحرب“ (بدائع الصنائع ۱۳۱/۷)۔

۳- مثلاً دارالاسلام مسلمانوں کے لیے مطلقاً امان کی جگہ ہے اور کافر ذمیوں کو خوف لاحق ہے تقض مہر ذمی قید کے ساتھ، یا مثلاً کافر مستامن کو خوف لاحق ہے دارالاسلام میں اسلام لا کر مرتد ہو جانے کی قید کے ساتھ۔ ”إذا نقض الدمى العهد فهو بمنزلة المردود معناه في الحكم بمردود بالحق لانه التحق بالاموات“ (ہدایہ ۵۷۸/۱)، ”من اردد و العباد بالله عرض عليه الإسلام و كشفت شيعته فان استعمل حبس ثلاثة أيام فان داب فيها و إلا قتل“ (شرح الوقاہ ۵۷۲/۳)۔

(۴) ”أمان للكفرة“ (۱) ”على الإطلاق وخوف للمسلمين مقيد بقيود“ (۵) ”أمان للمسلمين“ (۲) ”مقيد بقيود والخوف للكفرة مقيد بقيود“ (۶) ”أمان للمسلمين مقيد“ (۳) ”بقیود والخوف للكفرة على الإطلاق“ (۷) ”أمان للكفرة“ (۴) ”مقيد بقيود وخوف للمسلمين على الإطلاق“ (۸) ”أمان للكفرة“ (۵) ”مقيد بقيود وخوف للمسلمين مقيد بقيود“۔

اس لیے معلوم ہوا کہ ملک العلماء نے یہ کوئی جامع و مانع تعریف نہیں فرمائی ہے کہ اس پر ہی مدار رکھ دیا جائے، بلکہ یہ بطور تمثیل کے بیان فرما دیا ہے، اسی طرح اس عبارت سے امن و خوف کا مدار بھی کسی مذہب پر نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اختلافِ دار کا مدار مذہب پر ضرور معلوم ہوتا ہے، اس لیے علامہ کا سائی کی اس عبارت کے تحت امن و خوف پر اختلافِ دار کا مدار رکھ کر سوال میں درج شدہ تفریع مشکل ہے، صحیح نہیں معلوم ہوتی، نیز التزام مالا یلزم کا لزوم بھی نظر نہیں آتا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ترقیاتی منصوبوں میں شرکت کا حکم:

ہندوستان اور جنوبی افریقہ میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات میں یہ فرق ضرور ہے کہ ہندوستان کے مسلمان یہاں کے مستقل باشندے ہیں، سیکڑوں سال تک یہاں حکمراں رہے۔ اب اگرچہ حکمراں نہیں ہیں، مگر قانون اور دستور ہند

۱۔ (مثلاً دارالکفر کافروں کے لیے مطلقاً امان کی جگہ ہے اور مسلم مسلمان کے لیے نقضِ مہد امان اور غدرو خیانت کی قید کے ساتھ خوف کی جگہ ہے۔ ”إذا دخل دار الحرب بأمان مسلم ناجر يحرم عليه أن يعرض بشيء من أموالهم ودمانهم إلا إذا غدر به ملكهم الخ“ (فتاویٰ عالمگیری ۳/۲۳۲)۔

۲۔ (مثلاً دارالاسلام میں مسلمانوں کو قید اسلام کے ساتھ امان حاصل ہے اور ذمیوں کو نقضِ مہد کی قید کے ساتھ خوف لاحق ہے) ”من اردد والعباد بالله عرض عليه الاسلام الخ فإن ناب فيها وإلا قتل“ (شرح الوقا یہ ۲/۳۷۵)۔

۳۔ مثلاً دارالاسلام میں مسلمانوں کو قید اسلام کے ساتھ امان حاصل ہے اور ایسے کافر کو جو نہ سجاد ہو نہ ذی نہ منہ من مطلقاً خوف لاحق ہے) ”من اردد والعباد بالله عرض عليه الاسلام الخ فإن ناب فيها وإلا قتل“ (شرح الوقا یہ ۳/۳۷۵) ”إن كان الأمان للمسلمين فيها على الإطلاق والحزن للكفرة على الإطلاق فهي دار الاسلام“ (بدائع الصنائع ۷/۱۳۱)۔

۴۔ (مثلاً دارالحرب میں ذمی کافر بقیہ امان داخل ہو اور مسلمان بغیر امان کے تو ذمی کافروں کو ایک قید کے ساتھ امان حاصل ہے اور مسلمان کو کلی الاطلاق خوف لاحق ہے) ”دخل المسلم أو الذمي دار الحرب بأمان الخ“ (فتح القدیر ۳/۳۱۶) ”وإن كان فيها الخوف للمسلمين على الإطلاق فهي دار الكفر“ (بدائع الصنائع ۷/۱۳۱)۔

۵۔ (مثلاً دارالحرب میں ذمی کافر اور مسلمان بغیر امان داخل ہو) ”(دخل المسلم أو الذمي دار الحرب بأمان)۔

نیز حقیقت واقعہ کے لحاظ سے وہ ملک کے حصہ دار ہیں اور ان کو وہی شہری حقوق حاصل ہیں جو دوسرے فرقوں کو حاصل ہیں، یہاں ان کے اوقاف ہیں، ان کے مدرسے ہیں، عبادت گاہیں ہیں وغیرہ وغیرہ!

لیکن اس بارے میں ہندوستان اور جنوبی افریقہ دونوں مشترک ہیں کہ ایسا اقتدار جس کے ذریعے مسلمان کوئی قانون تنہا اپنی رائے اور صوابدید اور اپنے مذہبی رجحانات کے بموجب بنا سکیں اور اس کو نافذ کر سکیں نہ افریقہ کے مسلمانوں کو حاصل ہے اور نہ ہندوستان کے مسلمانوں کو، مالی اور اقتصادی لحاظ سے وہ ایسے نظام میں جکڑ بند ہیں جس کی بنیاد اگرچہ سود پر نہیں ہے مگر اس کا پھیلاؤ اور اس کی تمام ترقی سود پر موقوف ہے، ممکن ہے مسلمان سود لینے سے احتیاط کرنے میں کامیاب ہو جائیں مگر وہ سود ادا کرنے سے محفوظ نہیں رہ سکتے، کیونکہ جو مختلف ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں وہ اس لئے مقرر کیے گئے ہیں کہ ان قرضوں کا سود ادا کیا جاسکے جو ترقیاتی منصوبوں وغیرہ کے سلسلے میں لیے گئے ہیں۔

جن مسلمانوں پر کوئی ٹیکس لازم نہیں ہوتا ان کو بھی سود کی ادائیگی میں شرکت کرنی پڑتی ہے، کیونکہ وہ گرائی ان کو لامحالہ برداشت کرنی پڑتی ہے جو ٹیکسوں کے اضافہ کے باعث کردی جاتی ہے۔

فقہی نقطہ نظر سے ایک ضرر اس کو لامحالہ برداشت کرنا پڑتا ہے، انفرادی کاروبار کی اگرچہ ممانعت نہیں لیکن حالات ایسے ہیں کہ ترقی کے امکانات انفرادی کاروبار میں ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ترقیات کے منصوبے جو ہر طرح کے کاروبار حتیٰ کہ زراعت پر بھی حاوی کیے جا رہے ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ تمام کاروبار اجتماعی نوعیت اختیار کریں، یعنی سوسائٹیاں قائم کی جائیں اور ان کے ذریعے کام کیا جائے جن کا نمونہ افریقہ اور یورپ کے ممالک میں اس وقت پایا جا رہا ہے، حکومت اس طریقہ کار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، چنانچہ ان سوسائٹیوں کو قرض دیا جاتا ہے جس کا سود ان کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

اضافہ آبادی، بودوباش کے سلسلے میں بھی مشکلات پیدا کر رہا ہے، اپنے ذاتی مکانات تنگ ہوتے جا رہے ہیں، دوسری جانب نہ صرف یہ کہ کرایہ بڑھ رہا ہے بلکہ ”پگڑی“ کی وبائے غیر معمولی مشکلات پیدا کر دی ہیں، اس طرح رہائش کا مسئلہ بھی بہت پیچیدہ ہو گیا ہے، حکومت اس پیچیدگی کو اس طرح ختم کر رہی ہے کہ تعمیر مکان کے سلسلہ میں قرض دیتی ہے مگر سود اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) ترقیاتی منصوبوں کے سلسلے میں اگر مسلمان سوسائٹی قائم کریں یا کسی قائم شدہ سوسائٹی میں شرکت کریں، تو کیا ان کے لیے جائز ہوگا کہ برادران وطن کی طرح وہ بھی حکومت سے سود کی شرط پر قرض لیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

(۱) ترقیاتی منصوبوں میں مسلمانوں کو بھی شریک ہونا چاہیے اور اپنی سوسائٹیاں اس طرح پر قائم کرنی چاہیے کہ ان میں سود اور سودی لین دین سے حفاظت رہے۔ مثلاً شرکت اور مضاربہ کے اصول پر قائم کریں اور قوانین اس طرح وضع کریں جو حد و شرع میں رہیں۔ قانون کے جس موڑ پر شرعی حیثیت سے شبہ ہو معاملہ فہم مفتیوں اور علماء سے رجوع کر کے اصلاح کر لیا کریں۔

اسی طرح قائم شدہ سوسائٹیوں میں بھی شرکت کر سکتے ہیں، بڑی بڑی کمپنیوں اور فیکٹریوں میں جس طرح شیئرز (حصہ) خرید کر شرکت درست ہوتی ہے، اسی طرح یہاں بھی درست ہو سکتی ہے۔ ہر عقد شرکت کی صحت کے لیے تمام شرکاء کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ بعض عقد شرکت میں صرف معاملہ صاف و جائز ہونا شرط ہے، جیسے شرکت عنان اور شرکتیں عموماً اسی قبیل کی ہوتی ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

محکمہ اقتصادیات سے مدد لینے کی بعض صورتوں کا شرعی حکم:

حکومت ہذا نے عوام کی بے روزگاری دور کرنے، ان کی بحالی اور ترقی کے لیے ایک محکمہ قائم کیا ہے، جس کے ذریعہ سے صنعتی کارخانہ قائم کرنے والوں کو، صنعت و حرفت اختیار کرنے والوں کو یا جو سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی صنعت و حرفت کو فروغ دینے اور چلانے سے عاجز رہتے ہیں اور ان لوگوں کو جن کے پاس مکان نہیں، مکان بنانے کے لیے، اور کھیتی کرنے والوں کو کھیتی میں ترقی کے لیے نقد روپیہ دیتی ہے اور بہت کم شرح کے ساتھ کچھ زیادہ کر کے واپس لیتی ہے اور واپسی کی مدت بھی بہت لمبی دیتی ہے اور زائد رقم سے اس محکمہ کا نظم درست رکھتی ہے اور جو رقم اس محکمہ کے خرچے سے بچ جاتی ہے اس کو پھر اس قسم کے کاموں میں خرچ کرتی ہے، حکومت کا مقصد اس سے اپنی تجارت یا سرمایہ داری نہیں ہوتا ہے، محض قوم کی بھلائی اور ترقی مقصود ہوتی ہے، کبھی نقد روپیہ کے ساتھ یا بغیر نقد روپیہ کے محض سامان تجارت و حرفت اور آلات زراعت بھی سرکاری نرخ پر بازاری نرخ سے بہت ارزاں ادھار دیتی ہے، جیسے فیکٹریوں کے لئے مشین یا دیگر سامان یا انجن یا ٹریکٹر، کھاد، بیج اور آب پاشی کے لیے ٹیوب ویل اور دیگر سامان تجارت و صنعت اور اس کی قیمت مختلف سطحوں پر وصول کرتی ہے، بلکہ بعض بعض لوگوں کو کچھ روپیہ یا سامان مشینری وغیرہ مفت دیتی ہے اور کچھ مذکورہ رعایت و تفصیل کے ساتھ دیتی ہے، اس

مفت لینے اور دینے کے لیے کچھ قاعدے اور ضابطے مقرر ہیں، اسی قاعدہ میں جو لوگ مستحق ہوتے ہیں صرف ان کو دیتی ہے۔ اور اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے کچھ انسپکٹر ان (اور ماہرین فن) ماہرین صنعت و حرفت بھی مقرر ہوتے ہیں، جو لوگوں کو طریقہ استعمال بتاتے ہیں، مفید مشوروں کے ذریعہ ہدایت و رہبری بھی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں اور بسا اوقات اپنی نگرانی میں ان سامانوں کا استعمال بھی کراتے ہیں تاکہ سامان ضائع نہ ہو اور لوگوں کو اس کا ہنر بھی اچھی طرح آجائے۔ اور مقررہ قسطوں کی وصولی میں آسانی بھی ہو۔ اور قسطوں کی وصولی کے لیے بھی ضابطے مقرر کیے ہیں مثلاً روپیہ یا سامان دیتے وقت کچھ ضمانت لیتی ہے اور وقت پر قسط ادا نہ ہو تو مہلت بھی دیتی ہے، لیکن کچھ زائد رقم بڑھا کر وصول کرتی ہے، اس کی ایک حد مقرر ہوتی ہے، اس حد کے گزرنے پر حکومت سختی بھی کرتی ہے، بسا اوقات عدم ادائیگی کی صورت میں ضمانتیں ضبط ہو جاتی ہیں، سب کا رخانے وغیرہ بلکہ اس کے ذاتی مکان وغیرہ ساری ملکیت بھی ضبط و نیلام ہو جاتی ہے، اور بعض مرتبہ جیل خانہ بھی جانا ہوتا ہے۔

(۱) اب دریافت طلب امور یہ ہیں کہ مسلمانوں کو ایسی امداد لینا اور ایسا سامان اٹھا کر بیچنا جس میں یہ سب خطرات بھی ہیں اور جس میں اپنے لیے ہوئے روپیہ سے زائد روپیہ واپس کرنا ہوتا ہے یا مقررہ قسط سے زیادہ دینے کا بھی ہر وقت احتمال رہتا ہے، جائز ہے یا نہیں؟

زائد دینا سود تو نہیں ہوگا؟ بعض علماء اس کو سود اور ناجائز کہتے ہیں اور بعض علماء ٹیکس میں داخل کر کے جائز کہتے ہیں، بعض اس کو امداد باہمی کا ایک طریقہ کہہ کر جائز کہتے ہیں اور بعض اس کو تجارت کا ایک طریقہ کہتے ہیں اور اس کو تجارت کا نفع قرار دے کر جائز کہتے ہیں۔ امید کہ مفصل جواب دے کر مطمئن کریں گے۔

واضح رہے کہ اگر مسلمان اس قسم کی امداد نہ لے تو بسا اوقات اپنی کھیتی باڑی اور صنعت و حرفت و تجارت کو باقی نہیں رکھ سکتا، اور بہت سے غریب جو بے گھر اور بے روزگار ہیں اپنا روزگار قائم نہیں کر سکتے، اپنا گھر نہیں بنا سکتے، بے روزگار، بے گھر رہ جائیں گے، اپنے معاش بھی نہ چا سکیں گے تو کیا ناجائز ہونے کی شکل میں ان کے لیے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) اگر یہ طریقہ ناجائز ہو اور یہ دینا سود ہو تو ہندوستان جیسے ملک میں اس میں کچھ فرق ہوگا یا نہیں، اگر ہوگا تو کیا

ہوگا؟

(۳) اگر یہی معاملات کسی ایسے ملک میں ہوں جن میں مسلم اکثریت ہو اور اقتدار علیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو تو کیا حکم ہوگا؟

الجواب وبالله التوفيق:

اس وقت سود یا سودی کاروبار سے متعلق کوئی اور تفصیلی کلام کرنا مقصود نہیں ہے، اس لیے کہ سود اور سودی کاروبار کی حرمت میں آیات قرآنیہ، احادیث صحیحہ و صریحہ اس قدر کثرت سے اور اس طرح تربیعی انداز میں موجود ہیں کہ سود کا شرعی مفہوم صادق آجانے کے بعد اس کے جواز و باحت کی طرف جانے کی جرأت ذرا بھی نہیں ہو سکتی۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک آیت ربو اِپورے قرآن میں زیادہ خوفناک آیت ہے: ”کان ابوحنیفۃ رضی اللہ عنہ یقول: ہی (یا ایہا الذین امنوا لاتاکلوا الربا أضعافا مضاعفۃ) الخ الایۃ، أخوف آیۃ القرآن، أو عند اللہ المؤمنین بالنار المعدۃ للكافرين إن لم يتقوه فی اجتناب محارمه الخ“ (۱)۔

نیز جس وقت سود (ربو) کی حرمت نازل ہوئی اس وقت مسلمانوں کے حالات آج سے بہت زیادہ ستیم و خطرناک و قاتل رحم تھے، پھر بھی کسی قسم کی گنجائش یا کسی قسم کا اشارہ باحت و جواز کی طرف نہیں دیا گیا، اس لئے جتنی صورتیں لوگ سود کی وجہ جواز کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی کافی نہیں، اور نہ مسیح ربو ہو سکتی ہے، لہذا اس رخ کی طرف کلام کی کوئی حاجت نہیں اور اضطرار و مجبوری میں فقہاء رحمہم اللہ کے کلام سے جو کچھ تغیر احکام کا شبہ ہوتا ہے، اس کا حاصل و مقصود سود و ربو کو مباح و حلال قرار دینا نہیں ہے، بیش از بیش مواخذہ آخرت سے برأت و سبکدوشی و حفاظت ہے، جیسا کہ عنقریب احقر کے کلام سے بھی معلوم ہوگا۔

البتہ چونکہ ربو (سود) کا ایک مفہوم شرعی متعین و منضبط ہے، کسی فرد یا جماعت کے کسی غیر سودی معاملہ کو سود کا نام دیدینے سے اس کو سود کہنا اور اس پر سود کا حکم لگانا دینا ضروری نہیں ہے، جیسے پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ کہ رقم میں سود کے نام سے کچھ رقم دینے سے اس کا سود ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح کسی سودی معاملہ کو کسی فرد یا جماعت کے غیر سودی قرار دیدینے سے وہ سود کے حکم سے خارج نہیں ہو جائے گا، اس لیے یہ شق کلام کی باقی رہ گئی کہ آیا یہ نوپیدا معاملات جس میں حکومت وقت قرض کے طور پر عوام کو ان کی ترقی و بہبود کے لیے کچھ سامان یا آلات و اسباب بھیجتی کرنے کے یا آپاشی کرنے کے، یا کسی اور صنعت و حرفت یا کارخانہ چلانے یا بڑھانے کے لیے (جیسے مشین، انجن، ٹریکٹر یا اس کے اور آلات و اسباب بیج، کھاد وغیرہ) ادھار سے سستے داموں پر دیکر کے اس کی قیمت وصول کرنے کے لیے مختلف قسطیں مقرر کر دیتی ہے اور قسطوں کے معینہ مدت پر وصول نہ ہونے سے اس قسط کو کچھ بڑھا کر وصول کرتی ہے اور کبھی ان سامانوں کے ساتھ ان سے کام لینے

کے لیے کچھ نقد روپیہ بھی دیتی ہے اور کبھی ان ہی عوام کی ترقی و بہبود کے لیے محض نقد روپیہ دے کر پھر اس پر کچھ زیادتی کے ساتھ وصول کرتی ہے تو آیا اس پر سود کی شرعی تعریف صادق آتی ہے یا نہیں، اور سمجھنا ضروری ہے کہ یہ معاملہ شرعاً ربا ہے یا اس کی حقیقت شرعیہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے یا ہے۔ اس وقت یہی پیش نظر ہے اور اس کے متعلق حکم شرعی مختصر لفظوں میں واضح کرنا مقصود ہے۔

سوالنامہ میں تصریح ہے کہ اس قسم کے اعانت کے طریقوں سے فرد اور ملک کی ترقی اور انہیں زوال سے محفوظ رکھنا اور ان کی بعض پریشانی دور کرنا حکومت کا مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ بعض مرتبہ بعض حصہ قرض یا بعض حصہ سامان کے مفت چھوڑ دینے سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے، جس کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ ان طریقوں سے نفع خیزی یا زراعت و زری یا کوئی سودی کاروبار کرنا حکومتوں کا مقصود نہیں ہوتا ہے۔ اسی بنا پر سود کے نام سے لی ہوئی جزوی رقم اول تو عام رقم سود سے بہت تھوڑی ہوتی ہے، پھر اس سلسلہ کے اخراجات کے پورے کرنے کے بعد جو رقم بچ جاتی ہے تو اس کو اسی قسم کے اعانتی کاموں میں خرچ کر دیا جاتا ہے، کما هو مصرح فی السؤال، تو مطابق قاعدہ مسلمہ فقہیہ: ”الأمور بمقاصدھا و فیہا بیان ان الشئ الواحد یتصف بالحل و الحرمة باعتبار ما قصد له“ (۱)۔

سوالنامہ کی تصریحات کے بموجب اس زائد رقم کو جو قرضہ کے سلسلے میں وصول کی جاتی ہے، ٹیکس قرار دینا جیسا کہ بعض لوگوں کی تحریر سے اخذ کیا گیا ہے صحیح نہ ہوگا، کیونکہ ٹیکس محض قرضہ دینے پر نہیں لیا جاتا بلکہ انسان کی آمدنی اور کاروبار میں اس وقت لا کو اور عائد ہوتا ہے جب کہ اس کی معتد بہ مقدار جو حکومت کے قانون میں مصرح ہوتی ہے، موجود ہو کر ایک سال بھی گزر چکا ہوتا ہے، یہاں پر ایسا نہیں ہے اور یہ فرق بدیہی ہے، البتہ اس قسم کے معاملات کی احتیاج اور اس کی ضرورتیں چونکہ عام ہوتی جارہی ہیں، بلکہ عموم کا ایک درجہ اختیار کر چکی ہیں جیسا کہ سوالنامہ میں پیش کردہ حالات نیز روزمرہ پیش آمدہ واقعات جو شکل استثنائاً تحریری و زبانی ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں، اس لیے ضرورت داعی ہے کہ اگر کوئی توجیہ و تاویل معاملہ کے حدود شرع میں لانے کی ہو سکتی ہو تو حفظاً للعوام تلاش کرنی چاہیے۔ کما سیجی، استحسنانہ۔

پس اس معاملہ کی توجیہ یہ کی جاسکتی ہے کہ اس جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے، حقیقت میں وہ سود نہیں ہے، بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت میں اور جو سامان وغیرہ اس پر خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں، ان کی قیمت میں لی جاتی ہے جس سے انتظام میں سہولت رہتی ہے اور اعانت لینے والوں اور دینے والوں دونوں کا معاملہ

صاف رہتا ہے اور یہ محض ایک قومی و مشترک نظام کی صورت و نوعیت ہے، کوئی سودی کاروبار نہیں ہے بلکہ قوم کا سرمایہ ہے اور قوم ہی کے کام میں صرف کیا جاتا ہے اس کے منتظمین و کارکنان قوم کے ایجنٹ و وکیل ہو سکتے ہیں اور غریبوں کی اعانت اور پس ماندوں کو آگے بڑھانے اور ان کے لیے اسباب معیشت فراہم کرنے کی راہیں کھولنے کا انتظام کہا جاسکتا ہے، نیز اس طریقہ کار و محکمہ میں نفع و سہولت بھی دونوں جانب کثیر تریب و قریب یکساں حاصل ہوتی ہے۔ سود تو نام ہے اس نفع اور زیادتی کا جو محض ایک جانب کو حاصل ہو، اور عوض سے خالی ہو۔ کما صرح به الفقهاء: ”الربوا هو فضل خال عن عوض لأحد المتعاقدين في المعاوضة“ هذا التعريف يستفاد من الشامي من باب الربوا (۴۰۶/۷)۔

غرض یہ مفہوم سود کے مفہوم سے جدا کہا جاسکتا ہے، اور یہ توجیہ قریب تریب ایسی ہی ہوگی جو اس رقم میں کی جاتی ہے جس کو حکومت اپنے ملازمین کو ختم ملازمت کے وقت اگرچہ سود کے نام پر دیتی ہے، مگر ہمارے فقہاء محققین اس کو سود نہیں کہتے بلکہ انعام کہتے ہیں اور اس کو جائز فرماتے ہیں (۱)۔

نیز یہ توجیہ ایسی ہوگی جیسی منی آرڈر کی فیس میں کی جاتی ہے، فیس کو اجرت کتابت اور اجرت روائگی فارم کہا جاتا ہے، جیسا کہ علامہ تھانوی امداد الفتاویٰ میں ایک طویل سلسلہ کلام میں فرماتے ہیں: البتہ بہت عرق ریزی سے اس قدر تاویل کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ فیس منی آرڈر کو اجرت کتابت اور روائگی فارم کہا جاوے، اس سے اس کی حرمت تقاضل تو رفع ہو جائے گی مگر کراہت سفتجہ باقی رہے گی۔

ایضاً ثم قال فی مقام آخر: اور معاملہ پیش نظر میں جب اشکال حرمت تقاضل کا ختم ہو گیا تو اباحت اصلہ لوٹ آئے گی وھو المراد، پھر اسی امداد الفتاویٰ، (۱۰۸/۳) میں فرماتے ہیں: البتہ فیس منی آرڈر کو اجرت کتابت و روائگی فارم کی کہہ کر حرمت تقاضل کو رفع کیا جاسکتا ہے، لیکن کراہت سفتجہ کے رفع کی کوئی وجہ خیال میں نہیں آتی، کو ابتلاء عام کی وجہ سے دل ضرور چاہتا ہے کہ اس کی بھی کوئی وجہ نکل آئے (الی قول) حتیٰ کہ اگر یہ بھی نقل صحیح سے مل جائے کہ سفتجہ کے جواز کی طرف امر اربعہ میں سے کوئی امام گئے ہیں، تب بھی ضرورت اس پر عمل کرنے کو کہا جائے گا (ثم قال فیہ ۱۰۸/۳): منی آرڈر مرکب ہے دو معاملوں سے: ایک قرض سے جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرے اجارہ سے جو فارم لکھنے اور روانہ کرنے پر بنام فیس کے دیجاتی ہے اور دونوں معاملے جائز ہیں، پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے اور چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے، اس لیے یہ تاویل کر کے جواز کا فتویٰ دینا مناسب ہے (انتہی بلفظہ) امداد الفتاویٰ کی ان مجموعی عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے

معاملات میں جب ابتلاء عام ہو جائے یا ضرورت صحیحہ دائی ہو جائے تو حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے محمداً کن تو جیہہ جواز تلاش کرنا امر مستحسن ہے، نیز عالمگیری کتاب الحیل کی عبارت سے ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے:

”وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال فهي حسنة، والأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله عز وجل: ”وخذ بيدك ضغثاً فاضرب به ولا تحنث“ وهذا تعليم المخرج لأبواب النبي عليه وعلى نبينا الصلاة والسلام (الى قوله) وعامة المشايخ على أن حكمها ليس بمنسوخ وهو الصحيح من المذهب كذا في الذخيرة“ (۱)۔

حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے حل و توجیہات کا مدار ابتلاء عام اور ضرورت صحیحہ معتبرہ پر ہے اور سوائنامہ سے بھی ان دونوں چیزوں کا وجود مترشح ضرور ہوتا ہے، اس لیے یہ توضیح مستحسن بھی ہو سکتی ہے، خاص کر ایسے ملکوں میں جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو، وہاں یہ توجیہہ اور بھی آسان ہوگی۔ علی ما فصل المحققون من الفقهاء بالتفصيل التام چند شبہات اور ان کا ازالہ:

اول یہ کہ ان تاویلات کا معاملات متعلقہ سے کیا تعلق ہے؟ اگر یہ تاویلیں کی گئیں تو منی آرڈر وغیرہ معاملات میں کی گئی ہیں اس معاملہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

جواب: یہ بات محض درجہ نظیر میں یہاں پیش ہے کہ ”لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا“ اور ”الَّذِينَ يَسِرُوا“ کے ہمارے فقہاء کرام و مشائخ عظام نے اس قسم کے نوپید مسائل میں جن میں عام ابتلاء ہوا ہے، حدود شرع میں رہتے ہوئے توسع سے کام لیا ہے اور قوم کو تنگی میں پڑنے سے بچایا ہے، اس ذوق کے ماتحت مسئلہ مجوشہ عنہا میں بھی حدود شرع میں رہتے ہوئے توسع تلاش کرنا منشاء شرع و شارع کے خلاف نہ ہوگا، نقطہ اسی استدلال کے پیش نظر بطور نظیر یہ تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، ورنہ یہ تمثیل نہیں کہ باعث اشکال یا اعتراض ہو۔ دوسرا شبہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تاویلات و توجیہات ارباب حکومت یا اس شعبہ کے اصحاب حل و عقد کے پیش نظر نہیں اور نہ وہ اس کے مطابق معاملہ کرتے ہیں تو پھر یہ توجیہات و تاویلات کس طرح مؤثر اور مفید ہو سکتی ہیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہی اشکالات پر اوپنٹنڈ فنڈ اور منی آرڈر کی تاویلات میں بھی وارد ہوتے ہیں اور باوجود اس کے علماء ان کو صحیح اور معتبر تسلیم کرتے ہیں، کما اثرت الیہ سابقا پس اسی طرح یہاں بھی معتبر و مفید کہا جاسکتا ہے، چونکہ

معاملہ اموال ربویہ کا اور حرمت و باحت کے مقابل کا ہے، اس لئے اکابر امت و علماء فحول بطور خود بھی غور فرمائیں۔
اگر ابتلاء عام یا ضرورت صحیحہ و معتبرہ واقع میں متحقق ہے جب تو اس توجیہ میں کوئی کلام ہی نہیں و ہوا المراد۔
اور اگر ایسا نہ ہو جب بھی اگرچہ اس قسم کے نفس معاملہ کو ناجائز کہا جائے اور نفس معاملہ کرنا کو گناہ ہو مگر مجبوری اور حاجت شدیدہ کے وقت جب کوئی دوسرا ذریعہ معاش معیشت سنبھالنے کا اور ضرورت رفع کرنے کا نہ رہے، یا معذور ہو جائے تو اس وقت اس قسم کا معاملہ کرنے کی گنجائش ہوگی۔ الاشباہ والنظائر اور حموی کی اس تشریح کے مطابق رہے گی: کما قال: القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التيسير، وفي القاعلة السادسة من الحاشية ۱۱۵: يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح انتهى وأيضاً يعلم مما تحته في الحموی و كذلك نحوه أن يقترض عشرة دنانير مثلاً ويجعل يربها شيئاً معلوماً في كل يوم ربحاً اهـ۔

اس صورت میں اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو یا غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو، کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اس تمہید کے بعد اب تحریر کردہ ہر سہ سوالات کے جوابات نمبر وار درج ہیں:

(۱-۲) اس زائد رقم پر جس کو حکومت قرض لینے والوں سے وصول کرتی ہے، ٹیکس کی تعریف صادق نہیں آتی، لیکن اس کو علی الاطلاق سود کہنا بھی ضروری نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہوگی وہ یہ کہ اگر محض نقد روپیہ بطور قرض لیا جائے اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے، یا سامان وغیرہ کے ساتھ ہی لیا جائے، مگر نقد کی وہ مقدار سامانوں سے کام چلانے کی مقدار سے زائد ہو اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے اور واپسی کی کل رقم یا فتنی سے زیادہ ہو جائے تو سود کی تعریف: هو فضل خال عن عوض لأحد المتعاقلين في عقود المعاوضة (۱) صادق آجائے گی، مقدار نفع کم ہو یا زیادہ اور چونکہ معاملہ نقدین میں اور خالص مبادلہ اور عوض کا ہوگا، اس لئے وہ نفع سودی ہوگا اور حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہوگا، اور مجبوری کا حکم دوسرا ہے جو اس جزئیہ: "يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ احتیاج شدیدہ کی حالت میں فقہاء امت سودی قرض بقدر ضرورت لینے کی اجازت دیتے ہیں۔

البتہ جو رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جائے، اس میں تاویل چل سکے گی اور اس کو کام چلانے کے لیے اعانت میں داخل کر کے اس پر سودی معاملہ کا حکم نہ لگائیں گے، بلکہ انتظامات کی درستگی کے لیے ایک قسم کی

۱- الدر المختار ۷/۳۰۰۔

۲- الاشباہ ۱۱۵۔

فیس میں داخل کیا جاسکتا ہے اور اس صورت میں یہ معاملہ جائز رہے گا۔

اسی طرح مثلاً کسی نے پروجیکٹ (محکمہ ترقیات کا ایک شعبہ) سے چار ہزار روپے کنویں بنوانے کے لئے نقد لئے، محکمہ پروجیکٹ نے اپنے قاعدہ کے ماتحت ایک ہزار نقد بالکل معاف کر دیا اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقعہ دیا، پھر دو سال کے بعد چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لیے متعین کیں اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا، مگر کل وصولی چار ہزار سے زائد نہ ہوئی، تو اب قسطوں کے ساتھ جو زیادتی تھی وہ سود نہ ہوگی، اور معاملہ بھی جائز رہے گا، کیونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا، چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا کہ، فاضل خال عن العوض الخ یا ”کل قرض جو نفعاً“ وغیرہ رو کی تعریف صادق آسکے۔

اسی طرح محکمہ اعانت و ترقی میں مشین لگانے کے لیے، فیکٹری قائم کرنے کے لئے یا کوئی صنعت و حرفت یا کارخانہ چلانے کے لئے سامان لینے کی درخواست کی، محکمہ نے اپنے ایک شعبہ سے اس کا مقصود کے مناسب حال نقد روپے دینے اور سامان خریدنے کے لیے اپنے دوسرے شعبہ کا تعین کر کے حکم کیا کہ اس شعبہ سے جو سامان درکار ہو خرید لو، اس دوسرے محکمہ نے ارزاں قیمتوں پر باقسط وصولی کے ساتھ سامان دیدیا یا حسب ضرورت دیتا رہا، اور پہلا محکمہ ان قسطوں کی ادائیگی کے مطابق نقد روپے قرض کے نام پر دیتا رہا اور اس لینے دینے میں دینے ہوئے روپیے سے کچھ زائد وصول کیا تو یہ زیادتی بھی سود نہ کہلائے گی، بلکہ انتظام کے درست و صحیح رکھنے کی فیس کہی جاسکے گی اور یہ معاملہ بھی جائز رہے گا۔

اسی طرح ہر معاملہ جو اس قسم کے لین دین کا حکومت کے امانتی محکموں سے ہو، اس میں غرض و مقصود سامنے رکھتے ہوئے اس زیادتی کی حیثیت پر غور کریں گے جب تک کوئی صحیح تاویل ملتی رہے گی، ربوا، سود کہنے سے اجتناب کریں گے اور خاص کر جب بجائے نقد کے محض سامان و آلات ادھار دے کر اس کی قیمت مقررہ قسطوں کے مطابق وصول ہو جائے تو اس میں کوئی شبہ کسی کو نہیں۔

اسی طرح وقت پر کسی ایک قسط کے یا تمام قسطوں کے وصول نہ ہونے پر جو رقم زائد وصول ہوتی ہو، اس کو بھی قاعدہ کے مطابق انتظامات کی درنگی باقی رکھنے کے لیے ایک قسم کی فیس میں داخل کر کے جائز کہا جاسکتا ہے، بالخصوص ہندوستان جیسے ملکوں میں۔

فقہاء محققین کا رجحان اس طرف ہے کہ بہت سے عقود فاسدہ میں بوجہ ابتلاء کے کوئی توجیہ تاویل کر کے حد جواز میں داخل کرنے کا توسع کیا جائے، جیسا کہ اوپر کی پیش کردہ عبارتوں سے بھی واضح ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ بھی متعدد جزئیات امداد الفتاویٰ کی اس پر شاہد ہیں، لیکن چونکہ بسا اوقات جب ادائے گی پر قدرت نہیں ہوتی، بڑی خطرناک اور

مضررت خیز شکلیں بھی سامنے آ جاتی ہیں، جیسا کہ بعض شکلیں بسلسلہ بیان نقصانات مذکور بھی ہیں اور بہت سے لوگوں کے تجربہ میں بھی ہیں، اس لیے جہاں تک ہو سکے اس قسم کے معاملات سے پرہیز رکھنا ہی ضروری ہے، بغیر کسی شدید معذوری کے اس کے قریب بھی نہ جانا چاہیے اور اگر اس کو سودی قرار دیا جائے جب تو اس سے اجتناب اور پرہیز کا حتی المقدور ضروری ہونا ظاہر ہی ہے۔

(۳) اگر یہ تحقیق و تفصیل صحیح ہے جب تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے اور یہ تحقیق و تفصیل صحیح و معتبر نہ ہوئی تو بھی اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو یا غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو، اصل جواب میں جو (۱، ۲ و ۳) میں مذکور ہے کوئی فرق واقع نہ ہوگا، اگر واقع ہو گا تو صرف اس قدر کہ جب اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو تو اس مسلم صاحب اقتدار پر ایسی صورتیں صاف واضح طور پر رائج کرنا ضروری ہوگا کہ جن میں عدم ربو اکالیقین ہو، اور کہیں سے ربو اکالام بھی نہ آئے اور اگر وہ اعلیٰ صاحب اقتدار اس طرف متوجہ نہ ہو تو اس کے بعد والے صاحب اقتدار امر اور حکومت پر درجہ بدرجہ حتیٰ کہ عوام میں بھی جو صاحب اقتدار ہوں، ان سب پر حسب حیثیت قدرت اس اعلیٰ صاحب اقتدار کو اس طرف متوجہ کرنا اور اس پر عمل کے لیے آمادہ کرنا اور اس کے رواج دینے میں کوشش کرتے رہنا ضروری ہوگا۔ **هذا ماضی لى الآن فى هذا المقام مرتجلاً بتوفیق اللہ تعالیٰ وعلیہ التکلیل۔ فقط واللہ اعلم بالصواب**

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۲/۱۱/۱۳۸۸ھ

محکمہ اقتصادیات سے مدد لینا (۱):

کیا حکومت سے ایسے بڑے اثراجات کو جو معاشی ترقی کے لیے ناگزیر ہیں، حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقوں سے سرمایہ حاصل کیا جاسکتا ہے:

(۱) قرض، اس میں چھوٹی بچتوں کی اسکیم، بینکوں سے قرض، لمبی مدت کے داخلی قرض، ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

(۲) غیر ممالک سے قرض۔

(۳) خسارے کی مالیات۔

عنوانات سوالات مندرجہ ذیل ہیں:

قرض لینے میں نفع اندوزی کا عنصر۔

خسارے کی مالیات۔

غیر ادا حکومت کی جانب سے دینے جانے والے قرض۔

غیر ادا دینے جانے والے قرضوں کی قسمیں۔

حکومت کے ملازمین کو قرض۔

امدادی ہمی سوسائٹیوں کے ذریعہ قرض۔

مالیاتی ادارے۔

الجواب وبالله التوفیق:

سوالنامہ مع ضمیمہ بغور پڑھا، سوالنامہ کا حاصل یہ ہے کہ حکومت وقت ترقیاتی اسکیم کے تحت جو رقم قرض کے نام پر اپنی رعایا کو دیتی ہے، اس پر زائد رقم یا نفع اتنا کم لیتی ہے جو نفع کے برابر ہوتا ہے، بسا اوقات حکومت کو اس میں خسارہ ہی برداشت کرنا ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کی زرخشی یا زراعت اندوزی یا ذخیرہ خیزی وغیرہ جو عام طور سے مہاجرینوں کے یا سودی کاروبار کرنے والوں کے پیش نظر ہوتی ہے نہیں ہوتی، اس لیے یہ قرض سودی نہ ہوگا، اور مسلمانوں کو بھی اس کا لینا درست ہونا چاہیے۔

اور اگر سود کا احتمال ہو تو ٹیکس شمار کر کے یا حکومت کے حقوق عام جو رعیت پر ہوتے ہیں، ان کے تحت لا کر یا کسی اور فتنہ ناول سے یہ قرض لینا اور ان اسکیموں میں مسلمانوں کا شریک ہونا جائز و درست ہو سکتا ہے؟ تاکہ مسلمان بھی ان سے مستفید ہو کر اقتصادیات میں پیچھے نہ رہیں۔

سوالنامہ سے ان ہی امور کی شرعی تحقیق مقصود ہے کہ آیا واقعی ان امور کی گنجائش شرعاً ہے یا نہیں؟

اصل سوالنامہ کے اندر جواب طلب امور کا جہاں تک خاص تعلق ہے ان سب کا تقریباً مفصل جواب احقر کے ایک فتویٰ مکتوبہ ۲۴/۱۱/۸۸ میں آچکا ہے، جس کا حاصل بحذف تمہید و دلائل فقہیہ یہ ہے کہ سود (ربوا) کا ایک مفہوم شرعی ہے، جس کو حقیقت شرعیہ کہہ سکتے ہیں، اور اس کی حرمت متعدد آیات و احادیث میں نہایت شد و مد سے مصرح و منصوص ہے، اور

اس کے ارتکاب کرنے والوں پر بڑی سخت وعیدیں وارد ہیں، اور یہ حرمت ایک ضابطہ و قانون کی شکل میں مازل ہو چکی ہے، اور یہ قانون (حرمت ربوا) اس بادشاہ کا قانون ہے جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور تمام قانون بنانے والے دماغوں کا بنانے والا ہے، تمام کائنات عالم کا تخلیق کرنے والا اور مالک ہے۔ اور تمام گزشتہ، موجودہ اور آئندہ کے بھی تمام منافع و مضار ہر پہلو و ہر حیثیت سے اس کے سامنے ہمہ وقت مستحضر ہیں۔

دنیا کی کوئی حکومت یا قانون بنانے والی کوئی جماعت بڑے سے بڑا دماغ خواہ کتنا ہی مکمل و منضبط اور اپنے خیال میں کتنا ہی جامع اور مانع قانون بنائے وہ اس احکم الحاکمین اور وحده لا شریک له کے بنائے ہوئے قانون جیسا مکمل و مدلل و جامع و مانع و مانع نہیں ہو سکتا۔

جب اس نے یہ مکمل قانون (ربوا کی حرمت مطلقہ کا) بنا کر دنیا کو اس کے خلاف نہ کرنے کا حکم قطعی دیدیا، اور ایسے وقت میں اس کو نافذ بھی کر دیا کہ وہ وقت آج کے وقت سے کہیں زیادہ سخت اور ناقابل لحاظ و رعایت تھا، اور اس کی حرمت بھی ساتھ ساتھ اور کھلے لفظوں میں بیان کر دی، بلکہ جہالت (زمانہ پیشین) کے جتنے ربوا تھے سب کو یک لخت ختم و نسیا منسیا کر دیا، اور دنیا نے اس قانون کا امتثال کر کے اور بار بار اس کا تجربہ کر کے منافع بھی دیکھ لیا تو اب اس قانون کے مطابق سود (ربوا) کا مفہوم جب کسی معاملہ پر صادق آجائے گا تو اس کو کسی طرح بھی جائز یا مباح نہیں کہا جائے گا اور بالکل اسی طرح جب تک کسی معاملہ پر ربوا (سود) کی شرعی تعریف صادق نہ آجائے گی محض لوگوں کے ربوا کا نام اس پر رکھ دینے سے کبھی اس کو حرام و ناجائز یا ربوانہ کہا جائے گا۔

بس اس قاعدہ کے مطابق اس زائد رقم یا نفع کی تقریباً ہر شق کا جواب تفصیل کے ساتھ احقر کے سابق جواب (مکتوبہ ۲۲/۱۱/۸۸ھ) میں آچکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمہید و دلائل فقہیہ کو حذف کر کے صرف اس زائد رقم کا تفصیلی حکم یہاں لاحق کر دیا جائے۔ پھر ضمیمہ کا جواب لکھا جائے۔ البتہ اصل سوال نامہ میں جو بعض زائد باتیں ہیں، ان کے جواب کا یہاں اضافہ بھی کر دیا جائے، تاکہ بات ہر پہلو سے مکمل ہو کر سامنے آجائے اور جن صاحب کو مزید دلائل وغیرہ دیکھنا ہوں وہ اس اصل جواب کو بھی دیکھ لیں۔ اس تمہید کے بعد اس زائد رقم کا تفصیلی حکم پیش ہے:

اس زائد رقم پر جس کو حکومت قرض لینے والوں سے وصول کرتی ہے، ٹیکس کی تعریف صادق نہیں آتی۔ لیکن اس کو علی الاطلاق سود کہنا بھی ضروری نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہوگی اور وہ یہ ہے:

الف: اگر محض نقد روپیہ بطور قرض کے لیا جائے اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے یا سامان وغیرہ کے ساتھ نقد

بھی لیا جائے مگر نقد کی وہ مقدار سامانوں سے کام چلانے کی مقدار سے بہت زیادہ ہو، اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا اور واپسی کی کل رقم یا فتنی رقم سے زیادہ ہو جائے تو سود کی تعریف ”هو فضل خال عن العوض لأحد المتعاقدين“ صادق آجائے گی اور چونکہ معاملہ نقدین میں اور خالص مبادلہ اور عوض معاوضہ کا ہے، اس کے لیے وہ نفع کم ہو یا زیادہ وہ سودی ہوگا ”کل قرض جرنفعاً فهو ربوا“ بھی صادق آجائے گا، اس لیے حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہوگا، اور مجبوری کا حکم دہرا ہوگا جو اس جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے: ”يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (۱) اسی قاعدہ کے تحت احتیاج شدیدہ کی حالت میں فقہاء امت سودی قرض کو بھی بقدر ضرورت لے لینے کی اجازت دیدیتے ہیں۔

ب: جو نقد رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جائے، اس میں تاویل چل سکے گی، اور اس کو کام چلانے کے لیے اعانت میں داخل کر کے اس معاملہ پر سودی معاملہ کا حکم نہ لگائیں گے اور اس زائد رقم کو سود نہ کہیں گے، بلکہ انتظامات کی درستگی کے لیے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جاسکے گا، اور اس پہ معاملہ جائز رہے گا۔

ج: مثلاً کسی نے محکمہ ترقیات کے شعبہ سے چار ہزار روپے کنواں کھدوانے یا مکان بنوانے کے لیے یا کسی اور صنعت و حرفت کے لیے نقد لیے اور محکمہ ترقیات نے اس میں سے اپنے قاعدہ کے تحت ایک ہزار بالکل معاف کر دیئے اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقع دیا۔ پھر دو سال کی تاخیر کے بعد چھوٹی چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لیے متعین کیں اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا، مگر کل رقم وصولی کی چار ہزار (کل قرضہ) سے زائد نہ ہوئی تو اب ان قسطوں کے ساتھ جو زیادتی محکمہ نے وصول کی وہ سود نہ ہوگی اور یہ معاملہ جائز رہے گا، چونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا اور چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا کہ سود کی تعریف ”هو فضل خال عن العوض الخ نیز کل قرض جرنفعاً الخ“ صادق آسکے۔

د: مثلاً محکمہ اعانت و ترقی میں مشین (ٹیوب ویل) لگانے کے لیے یا فیکٹری قائم کرنے کے لیے یا کوئی اور صنعت و حرفت یا کارخانہ چلانے کے لیے سامان لینے کی درخواست دی، محکمہ نے ایک شعبہ سے اس کا مقصود کے لیے اس کے مناسب حال نقد روپیے اور سامان لینے یا خریدنے کے لیے اپنے دوسرے شعبہ کا تعین کر کے حکم کیا کہ اس فلاں (دفتر یا شعبہ) سے جو سامان درکار ہو خرید لو، یا لیتے رہو، اور اس دوسرے شعبہ یا دفتر نے ارزاں قیمت پر باقسط وصول کیے اور شرط کے ساتھ ساتھ سامان دیدیا، یا حسب ضرورت دیتا رہا، اور پہلا شعبہ (محکمہ کا) ان قسطوں کی ادائیگی کے مطابق نقد روپے

قرض کے نام پر دیتا رہا، اور اس لینے دینے میں محکمہ نے اپنا دیا ہوا روپیہ وصول کرتے ہوئے اپنے دینے ہوئے روپے سے کچھ زائد وصول کر لیا ہے تو اس زیادتی کا سود ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ انتظام درست رکھنے کی فیس بھی کہا جاسکے گا، اور یہ معاملہ بھی جائز رہ سکے گا۔

۱۱۔ اسی طرح حکومت کے کسی امانتی محکمہ سے کھادیا بیج وغیرہ ادھار لیا، محکمہ نے ۶ ماہ میں ہر ماہ دس روپیہ کے حساب سے کل ۶۰ روپیہ وصول کیے اور اپنے رجسٹر میں از خود اصل قیمت کے خانہ میں پچاس روپے درج کیے اور دس روپے خانہ سود یا نفع میں درج کیے تو اس دس روپیہ کا سود ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ جزو ثمن قرار پا سکتا ہے، اس لیے کہ سود نام ہے فضل خال عن العوض کا جو اموال روپیہ کے اندر عقد معاوضہ کا معاملہ کرنے میں مشروط طریقہ پر طریقین متعین کریں، اور یہاں ایسا نہیں ہوا ہے، خواہ مشتری کو اس اندراج کا علم ہو جائے یا نہ ہو، بالخصوص ایسے ملک میں جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلمین کے ہاتھ میں ہو، مسلمانوں کو قانوناً ایسا معاملہ کرنے سے روکنے کا یا اس کے اصلاح کرنے کا اختیار نہ ہو، اور خاص کر جب مجموعہ وصولی کی مقدار عام بازار کے نرخ کے اعتبار سے غبن فاحش کی مقدار سے زائد نہ ہو۔

۱۲۔ اسی طرح ہر معاملہ جو اس قسم کے لین دین کا حکومت کے ان امانتی محکموں سے ہو، اس میں غرض و مقصود کو سامنے رکھتے ہوئے اس زیادتی کی حیثیت پر غور کریں گے جب تک کہ کوئی صحیح فتنی تاویل ملتی رہے گی، اس کو سود کہنے سے اجتناب کریں گے اور خاص کر جب بجائے نقد کے محض سامان یا آلات وغیرہ ادھار دیکر اس کی قیمت مقرر متعدد قسطوں کے ذریعہ وصول ہو تو اس میں امید ہے کہ کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوگا۔

۱۳۔ اسی طرح وقت پر کسی ایک قسط یا متعدد قسطوں کے وصول نہ ہونے پر جو رقم زائد وصول ہوتی ہو، اس کو بھی قاعدہ کے مطابق انتظامات کی درستگی باقی رکھنے کے لیے ایک قسم کی فیس میں داخل کر کے جائز کہا جاسکے گا۔

بالخصوص جب ہندوستان جیسے ملکوں میں فقہائے محققین کا رجحان اس طرف ہے کہ بہت سے عقود فاسدہ میں بوجہ ابتلائے عام کے کوئی صورت تو جیہہ و تاویل کر کے حد جواز میں داخل کر لینے کی ہو تو داخل کر لینے کا توسع کیا جائے جیسا کہ تمہید میں پیش کردہ عبارتوں سے بھی واضح ہوتا ہے اور اس کے علاوہ بھی متعدد جزئیات امداد الفتاویٰ وغیرہ کی اس کی شاہد ہیں۔ جیسے گائے بھینس وغیرہ کوچہ انی پر دینے کا جزئیہ۔

لیکن چونکہ بسا اوقات جب ادائیگی ثمن قسط پر قدرت نہیں ہوتی تو بڑی خطرناک مضرت خیز شکلیں بھی سامنے آجاتی ہیں، جن سے عزت و آبرو جان و مال سب خطرے میں پڑ جاتے ہیں، جیسا کہ بعض شکلیں بسلسلہ بیان نقصانات خود

سوال میں بھی مذکور ہیں اور بہت سے لوگوں کے تجربہ و مشاہدہ میں بھی ہیں جس کا علم عام ہے، اور بعض مرتبہ محررین و کارکنان محکمہ کی بے اعتنائیوں و شرارتوں کی وجہ سے برآمدگی رقوم میں بے حد تعویقیں و دشا ریاں پیش آ جاتی ہیں، یا رشوت خوروں کی وجہ سے حاصل شدہ رقم کا ایک معتد بہ حصہ انہی کی نذر ہو جاتا ہے، اس لیے جہاں تک ہو سکے اس قسم کے معاملات میں پڑنے سے پرہیز ہی رکھنا ضروری ہے، بغیر شدید معذوری کے اس کے قریب بھی نہ جانا چاہیے۔

اور اگر اس کو سودی قرار دیا جائے تب تو اس سے اجتناب و پرہیز کا حتی المقدور ہونا ظاہر ہی ہے، یہ تحقیق و تفصیل صحیح ہے یا غیر صحیح اس کا فیصلہ تو علمائے محققین اور مفتیان مدققین کریں گے، ان سب حضرات سے درخواست ہے کہ ہر نگ اصلاح یا بصورت تائید و تصویب مطلع فرمائیں، باقی اگر اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو، اس سے اس مسئلہ میں کچھ فرق واقع نہ ہوگا، اگر واقع ہوگا تو صرف اس قدر کہ جب اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہوگا، تو اس مسلم صاحب اقتدار پر ایسی صورتیں صاف اور واضح طور پر رائج کرنا ضروری ہوگا، جن میں عدم ربو کا یقین ہو، اور کہیں سے اس میں ربو کا نام بھی نہ آنے پائے اور ”دعوا الربا والربیۃ“ کا پورا پورا مصداق ہو، اور اگر وہ صاحب اقتدار اس طرف متوجہ نہ ہو تو اس کے بعد والے صاحب اقتدار ہر او حکومت پر درجہ بدرجہ حتیٰ کہ عوام میں بھی جو صاحب اقتدار ہوں گے ان سب پر حسب حیثیت و قدرت اس اعلیٰ صاحب اقتدار کو اس طرف متوجہ کرنا اور اس پر عمل کے لیے آمادہ کرنا اور اس کے رواج دینے میں کوشش کرنا واجب رہے گا۔

نوٹ: سابق جواب یہاں تک ختم ہو گیا، اس کے بعد کا اس وقت کا اضافہ ہے جو سوائنامہ کے پیش نظر لکھا گیا۔

(۲) جس جس چیز پر سود کا مفہوم شرعی صادق آجائے گا، اس کو والی یا حاکم کے حقوق خصوصی کی بنیاد پر مباح و جائز نہیں کہا جاسکتا، خاص کر جن جن چیزوں کا حکم نص میں جس طرح آجائے، اسی طرح اس کو رکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ یہی اصل دین ہے اور دین کے خلاف کسی کا بھی حکم ہو معتبر نہیں، لقولہ تعالیٰ: ”وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ“ (۱)۔

اور اسی وجہ سے ایسی تمام چیزیں حکام و شاہان دنیا کی دسترس سے بلند و بالا تر ہوتی ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی امیر یا والی یا امام ان نصوص کے خلاف کوئی حکم کر بھی دے تو وہ مداخلت بے جا اور مداخلت فی الدین ہوگی اور کسی بھی مسلمان کو اس کی موافقت یا اتباع درست و مباح نہ ہوگی۔ اس لیے کہ اس کی موافقت و اتباع میں خالق کائنات و رب الارباب کی نافرمانی اور اس کی معصیت کا ارتکاب ہوگا اور یہ جائز نہیں، لقولہ علیہ السلام: ”لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ

الخالق“ (۱) اور ”الضرورات تبیح المحظورات“ (۲) میں الف لام عہد کا ہے اور اس سے صرف وہ ضرورتیں مراد ہیں جو ملکی ہوں، کیفیت و فطرار اور مختصہ کی جانب جیسا کہ اس جملہ سے بالکل متصل اگلی عبارت: ”ومن ثم جاز اكل الميتة عند المصمصة“ (۳) اس پر قریب ہے جس کو اسی قاعدہ کی وضاحت کے لیے مثال کے موقع پر خود مصنف (صاحب الشاہ ۱۱۵) نے ذکر فرمایا ہے اور ”يجوز للمحتاج الاستفراغ بالربح“ (۴) جوفر مایا گیا ہے اس کا مقصود سود کا جائز کہنا نہیں ہے بلکہ صرف گنجائش دینا ہے بایں معنی کہ اس معذوری میں اس طرح قرض لے لینا جائز ہو جائے گا اور سود اخذہ آخرت سے بری رہ سکے گا اور بس۔

(۳ و ۴) ان دونوں نمبروں کا جواب ابھی لے میں تفصیل گزر چکا ہے، اس کے بعد ضمیمہ کا اصل جواب عرض ہے، ضمیمہ میں دو قسم کے قرضوں کا ذکر ہے:

پہلی قسم، حکومت کا خود دوسروں سے قرض لینا:

اندرون ملک کے باشندوں سے خواہ بیرون ملک سے پھر خواہ دوسری حکومتوں سے یا وہاں کے سرمایہ داروں سے اور پھر خواہ نفس حکومت کے استحکام و ترقی پر خرچ کرنے کے لیے لیا جائے، خواہ اپنی رعیت کی فلاح و بہبود پر براہ راست خرچ کرنے کے لیے لیا جائے۔

دوسری قسم، حکومت کا اپنی رعایا کو قرض دینا:

قسم اول پر کلام کرنے سے زیادہ مقدم و اہم قسم ثانی پر کلام کرنا ہے، اس لیے کہ اسی کا تعلق مسلم عوام سے براہ راست ہے اور انہی کے لیے شرعی راہ تلاش کرنا مقصود سوال ہے، علاوہ ازیں قسم ثانی پر کلام کرنے سے قسم اول کی بہت سی صورتوں کا حکم شرعی خود بخود بھی نکل آئے گا، قسم ثانی کی موٹی موٹی اور اصولی چھ صورتیں ضمیمہ میں ظاہر کی گئی ہیں۔ ہر ایک پر بقدر ضرورت کلام کر کے اس کا حکم شرعی مؤرخ کرنا مقصود ہے۔

۱۔ بچوں، بوڑھوں، معذوروں کو کوئی وظیفہ دینا، یہ صورت اگر چہ اب تک ہمارے ملک میں ظاہر نہیں ہے، لیکن اگر عام ہو جائے تو اس کے جواز میں کوئی خفا یا شبہ نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ خالص وظیفہ یا اعانت یا انعام ہوگا بخلاف اور صورتوں کے،

۱۔ مشکوٰۃ المصابیح کتاب الامارۃ والتضاریر ۳۲۱۔

۲۔ الاشباہ والنظائر / ۱۳۰۔

۳۔ الاشباہ والنظائر / ۱۳۰۔

۴۔ الاشباہ والنظائر / ۱۳۹۔

ان میں بسا اوقات تفتیش و تحقیق کا اور حکم شرع مستنبط کرنے کا احتیاج ہوگا، پس یہ صورتیں نیز (۲ و ۵) کے اندر قرض کی قریب قریب تمام صورتوں کا حکم احقر کے سابق جواب میں آچکا ہے، اور بعض صورتیں جو رہ گئی ہیں ان کا حکم اس وقت ہر نمبر کے تحت بیان کر دیا جائے گا۔

۲- اس تحریر کا مقصد اگر یہ ہے کہ فنڈ سے لیا ہوا قرض دراصل اسی ملازم کا روپیہ ہے اور اس کی واپسی میں جو رقم زائد سود کے نام پر دی جاتی ہے وہ بھی اصل اسی ملازم کو ختم ملازمت پر واپس دے دی جاتی ہے، اس لیے یہ قرض درحقیقت قرض اور یہ سود درحقیقت سود نہ ہوا، کیونکہ قرض تو وہ چیز ہوتی ہے جو دوسروں سے لی جائے۔ اور سود اس زیادتی کا نام ہے جو دوسروں کو دی جائے۔ تو یہ توجیہ و تاویل اور یہ مقصد صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ فنڈ کی اس رقم پر بھی ملازم کی ملکیت ہی متحقق و ثابت نہیں ہوتی ہے۔

اس لیے کہ ملازم کی حیثیت اجیر کی ہوتی ہے، اور فنڈ کی رقم کا وہ حصہ جو تنخواہ سے وضع نہیں ہوتا بلکہ محکمہ اپنی طرف سے ملاتا ہے، اس وصول کے ہونے سے قبل ملک ملازم نہ ہوتا تو ظاہری ہے اور فنڈ کا وہ حصہ جو تنخواہ سے وضع ہوتا ہے وہ بھی جزء اجرت ہوتا ہے، اور اجرت پر جب تک اجیر کا قبضہ و تصرف نہ ہو جائے اس وقت تک اجیر کی اس پر ملکیت ثابت و متحقق نہیں ہوتی، صرف استحقاق ملکیت فی الجملہ ہوتا ہے، اور یہ ثبوت ملک کے لیے کافی نہیں ہے۔

اسی وجہ سے جب تک فنڈ کی رقم وصول نہیں ہو جاتی اس پر زکوٰۃ وغیرہ واجب نہیں ہوتی، اور اسی وجہ سے محکمہ جو جزو اضافہ کر کے اور زائد کر کے دیتا ہے، اگر چہ سود کے نام پر دیتا ہے، اور اپنے فہم و خیال میں اس پر سود کا اطلاق کرتا ہے اس کو سود نہیں کہا جاتا بلکہ سب کو انعام شمار کیا جاتا ہے اور جائز کہا جاتا ہے۔ غرض وہ رقم ابھی دراصل محکمہ ہی کی ملکیت ہوتی ہے اور محکمہ کی ملک میں واپس جاتی ہے، اور جب قرض کے نام پر دی جاتی ہے تو قرض ہی شمار ہوگا اور جو نفع اس پر لیا دیا جائیگا وہ قرض پر ہی نفع لینا دینا شمار ہوگا جس کا سود ہونا ظاہر ہے، اور یہ نسبت کہ یہ فنڈ ملازم کا ہے یہ نسبت مجازی ہے، مایول کے اعتبار سے ہے، اور اگر تسلیم بھی کر لیں کہ وہ زائد رقم (نفع) پھر اسی ملازم کو واپس مل جاتی ہے جب بھی کچھ مفید نہیں، اولاً تو اس لیے کہ وہ رقم بہ شکل نقد ہوتی ہے، اور نقد میں قاعدہ شرعیہ مسلمہ عندالکل ہے کہ تبدل ملک سے تبدل عین ہو جاتا ہے، اور تبدل میں واپسی کہاں :- واپسی تو بعینہ اسی سابق شے کی واپسی کا نام ہے اور پھر اگر اس واپسی کو بھی تسلیم کر لیں جب بھی مفید مدعا (عدم ربوا) نہیں ہو سکتی، اس لیے جب محکمہ اس کو سود قرار دیکر لینا ہے اور سودی کے درجہ میں رکھ کر ملازم کو ختم ملازمت پر دیتا ہے، جیسا کہ سول سے واضح ہے تو اس واپسی کو استرداد نہیں کہہ سکتے، کیونکہ استرداد میں سابق معاملہ کو فسخ کرنا اور اس کی حیثیت کو

مٹانا اور ختم کرنا منوی اور ملحوظ ہوتا ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے اور جب یہ واپسی استرداد نہیں ہوئی تو سود کی حقیقت و شناخت بھی ختم نہ ہوئی بلکہ قائم و متحقق رہی، لہذا یہ زائد رقم قرض کا نفع اور سودی کے حکم میں ہوگی اور بغیر حاجت واقعی ایسا قرض بھی لینا درست نہ ہوگا، ہاں اگر بغیر سودی قرض کے چارہ نہ ہو، اور محکمہ کے علاوہ کسی دوسرے سے قرض لینے میں سود زیادہ دینا پڑے گا تو اس صورت میں اشد المفسدین سے بچنے کی نیت سے اس اخف المفسدین کو ہی گوارہ کیا جائے گا اور اس قرض کو دوسرے قرضوں پر ترجیح ہوگی، اور بقدر ضرورت و حاجت لے لینے کی گنجائش ہوگی۔

(۳) امداد باہمی سوسائٹیوں کے ذریعہ قرض:

ان سوسائٹیوں کو بھی حکومت عی قائم کرتی ہے اور اپنی عی دی ہوئی یا دلائی ہوئی رقم اشیاء سے امداد دلاتی ہے، اس لیے ان سوسائٹیوں سے ملی ہوئی امداد (نقد یا بشکل سامان یا دونوں جو بھی ہو) سب کا حکم اور اس پر وصول کردہ رقم نام سود کا سود ہونا یا سود نہ ہونا ان سب کی تفصیل ہوگی جو اصل استفتاء مکتوبہ ۲۴/۱۱/۸۸ھ کے جواب میں گزر چکی ہے، بلکہ اگر ان سوسائٹیوں میں شرکت یا مضاربیت کے اصول پر کاروبار کیا جائے تو اس کے نفع کا سود نہ ہونا اور زیادہ آسان اور نمایاں ہو جائے گا بلکہ اس میں شرکت کرنا اور حصہ لینا بھی درست ہو سکے گا۔

(۴) بالاقساط ادائیگی ٹمن کے وعدہ پر خرید و خست کا طریقہ:

اس بیع کا حکم عام طور سے فقہاء متاخرین کے فتاویٰ میں بہ تفصیل موجود ہے، جیسے امداد الفتاویٰ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وصول اقساط کے سلسلہ میں کوئی قید عقد بیع کے منافی نہ ہو تو بے تکلف یہ بیع جائز رہے گی، اور اگر کوئی قید عقد بیع کے منافی بھی لگ جائے، لیکن ارکان بیع متحقق ہیں تو نفس معاملہ کرنے میں اگرچہ فساد آجائے اور بیع فاسد کہی جائے، لیکن یہ بیع بالکل کالعدم اور باطل نہ کہی جائے گی بلکہ مشتری کے حق میں مفید ملک رہے گی اور اس خرید کردہ شئی سے جو انتفاع ہو جائے گا وہ حرام نہ رہے گا اور جو تصرف اس میں کیا جائے گا وہ مانند صحیح رہے گا اور ہندوستان جیسے ممالک میں ایسے تو سعادت کی گنجائش ملتی ہے، جیسا کہ ہم اپنے سابق اصل جواب میں مدلل طور پر بیان کر آئے ہیں۔

(۵) مالیاتی ادارے:

پہلے عموماً بینکوں میں محض نقد کالین دین ہوتا تھا، اس لیے اس کے منافع کو نلی الاطلاق ناجائز اور سود کہا جاتا تھا، لیکن اب بہت سے بینک شرکت اور مضاربیت کے اصول پر قائم ہوتے اور چلائے جاتے ہیں، اس لیے ان بینکوں میں شرکت کرنا یا ان سے لین دین کرنا جو شرکت یا مضاربیت کے اصول کے مطابق ہونا جائز نہ ہوگا، اسی طرح ان کے منافع کا ہر حال میں سود

ہونا ضروری نہ ہوگا، بلکہ ان بینکوں کے اصول و ضوابط اور ان کے حالات کے اعتبار سے الگ الگ حکم ہوگا اور جائز بھی ہو سکے گا۔ اسی طرح ”انشورنس“ کی حقیقت ابتداءً سود و قمار میں منحصر تھی، لیکن اگر اس کے اصول و ضوابط میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے (جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں) تو اس کی تفصیل سامنے آنے کے بعد اس کے مطابق بھی حکم شرعی منجھ ہو سکے گا، بہر حال یہ مالیاتی ادارے بینک کی امداد سے قائم ہوئے ہوں یا ”انشورنس“ کی مدد سے یا کسی اور طرح سے قائم ہوئے ہوں ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں ہے۔ اس وقت پیش نظر صرف یہ ہے کہ کسانوں کی زمینیں رہن رکھ کر ان کو جو امداد دی جاتی ہے، خواہ نقد سے بصورت قرض یا بصورت سامان یا آلات زراعت بیج، کھاد و اشیاء سے ادھار فروخت کر کے، غرض ان سب صورتوں میں کون کون سی صورتیں اور کون کون سے معاملے شرعی اصول پر جائز و درست ہیں، اور کون کون سے ناجائز اور نادرست ہیں۔ ان سب کی تفصیل بھی اصل سوال کے جواب میں گزر چکی ہے، وہاں مکمل دیکھ لیا جائے۔

(۶) بواسطہ بینک خرید و فروخت و کاروبار:

۱۔ اس طریقہ سے کاروبار کرنے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:

مالک از خود بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، خریدار اس کو پسند نہیں کرتا، مگر وہ مالک بینک کے واسطہ سے مال خریدار کے پاس بھیجتا ہے، اس میں مالک مال کو کوئی فائدہ دے ہوتے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ بینک سے قیمت فوراً نقد یا کم سے کم مدت میں اور بہت آسانی سے وصول ہو جاتی ہے، دوسرے مال کے ضائع ہونے یا فریب و دھوکہ کھانے یا ادھار معاملہ میں پرکار قیمت کے ڈوب جانے وغیرہ کے احتمالات بہت کم ہو جاتے ہیں۔

۲۔ کبھی مالک مال از خود نہیں بلکہ قانون وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، اور پھر بقیہ عمل وی کرتا ہے جو نمبر ایک میں گذر چکا ہے، اور خریدار اگرچہ اس کو پسند نہیں کرتا مگر انکار بھی نہیں کرتا۔

۳۔ کبھی خود حکومت ذیل ہو کر بائع و مشتری کے درمیان میں بینک کو قانوناً واسطہ بنا دیتی ہے اور بینک کے ذریعے سے خرید و فروخت کراتی ہے، یہ دونوں صورتیں پہلی صورت کے اعتبار سے کم ہوتی ہیں۔

۴۔ کبھی بینک خود پیش کش کر کے یہ طریقہ کار جو نمبر ایک میں گذر مالک مال سے اختیار کر لیتا ہے، کیونکہ اس طریقہ کار میں بینک کو بھی فائدہ پہنچتا ہے، بینک کی آمدنی بڑھتی ہے، یہ صورت پہلی تینوں صورتوں سے کم ہوتی ہے۔

۵۔ کبھی یہ طریقہ کار (بذریعہ بینک کاروبار) خود خریدار بھی اختیار کرتا ہے مگر کم، صرف ان صورتوں میں جب خریدار کے پاس اتنا سرمایہ نہیں رہتا کہ ہمیشہ نقد ہی قیمت ادا کر سکے، یا کوئی اور قانونی مجبوری ہوتی ہے یا راستہ وغیرہ کے خطرہ

سے حفاظت مقصود ہوتی ہے۔

۶۔ انہیں موانع میں کبھی بینک خود بھی پیش کش کر کے خریدار سے براہ راست یہ طریقہ کار اختیار کر لیتا ہے۔ یہ اخیر کی دونوں صورتیں بہ نسبت پہلی چار صورتوں کے بھی بہت کم ہوتی ہیں، اس لیے کہ اس میں خریدار کو اگرچہ کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں، مگر اس پر خرچ کا بارزائد ہو جاتا ہے نیز کچھ ذمہ داریاں و پریشانیاں بھی سوار ہو جاتی ہیں۔

ان چھ صورتوں میں سے پہلی چار صورتوں میں بینک سے خریدار کے قرض لینے یا بینک کا قرض پر نفع دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ان صورتوں میں خریدار بینک سے قرض کا کوئی معاملہ ہی نہیں کرتا، بلکہ مالک خود یا دونوں براہ راست بینک سے اپنا معاملہ کر کے اس کو اپنا وکیل یا اجیر بناتے ہیں، یا بینک خود ذخیل ہو کر بجائے خریدار کے مالک مال سے اپنا معاملہ کر لیتا ہے، اور ان کی ہدایات کے مطابق جو معاملہ چاہتا ہے اس میں خریدار بینک سے کہنے نہیں جاتا کہ میری طرف سے اتنا قرض دیدو بلکہ یہ صورت قریب ویسی ہی ہو جاتی ہے، جیسی صورت اصل پر اوپنٹ فنڈ میں ہوتی ہے کہ محکمہ خود جو معاملہ چاہتا ہے اپنے ملازم کے ساتھ کرتا ہے، مثلاً یہ ہے کہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کردہ روپیہ کے مثل خود اضافہ کرتا ہے، یا مثلاً خود ہی نام نہاد جمع شدہ فنڈ پر سود یا سود در سود وغیرہ کے نام سے کچھ رقم بڑھاتا رہتا ہے، لیکن کوئی اس کو سود نہیں کہتا، پس جس طرح وہاں سود کا تحقق نہیں ہوتا یہاں بھی نہ ہوگا، کیونکہ سود کا تحقق عقود معاوضہ میں ہوتا ہے، اور یہاں سرے سے خریدار کا بینک سے کوئی عقد ہی نہیں ہوتا اور یہ ظاہر ہے۔ اور پانچویں و چھٹی صورت میں بھی جب خریدار خود بینک کا واسطہ اختیار کرے یا بینک خود براہ راست خریدار سے معاملہ کرے چھ مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

یہاں الف، ب، ج، د، و کے عنوان سے چھ صورتیں لکھی جاتی ہیں:

الف: خریدار کا نقد سرمایہ بینک میں داخل و موجود ہے اور از خود مالک مال کی قیمت جمع کر دیتا ہے تو اس کو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے، بلکہ اس جمع شدہ سرمایہ کو ادا کرنا محسوب کریں گے اور بینک کو اس کا اجیر یا وکیل کہیں گے، اور جو پیسے بینک خریدار سے مزید وصول کرے گا اس کو عمل کی اجرت قرار دیں گے۔

ب: خریدار کا کچھ سرمایہ تو بینک میں جمع نہیں ہے، لیکن بینک از خود ادائیگی ثمن کی مقررہ مدت سے قبل ہی مالک مال کو قیمت ادا کر دے، تو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے اور پھر بینک خریدار سے جو رقم اصل قیمت سے زائد لے گا اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا، اور یہ ظاہر ہے۔

ج: ادائیگی ثمن کی مقررہ تاریخ ختم ہونے کے بعد بھی اگر بینک از خود قیمت جمع کر دے، لیکن خریدار سے کوئی

معاملہ نہ کرے، جب بھی قرض لینا صادق نہ آئے گا، اور پھر اس پر بینک اصل ثمن سے زائد لے گا اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا۔

د- اسی طرح اگر خریدار کا کچھ سرمایہ بینک میں جمع نہ ہو، لیکن بینک مال کو اپنی قید اور نگرانی میں لے کر قیمت مالک مال کو جمع کر دے، پھر جب خریدار قیمت ادا کرے اس کے بعد مال پر قبضہ ہونے دے تو اس صورت میں بھی قرض لینے کا معاملہ خریدار سے نہ ہوگا اور جو پیسے بینک سے لے گا وہ بجائے سود کے اجرت عمل شمار ہوگی۔

ھ- ان تمام صورتوں میں خواہ پہلی نمبر وار چھ صورتیں ہوں (یا، الف، ب، ج، د، وغیرہ کی پانچ صورتیں ہوں) سب میں اگر بینک اپنے پاس سے قیمت مال ادا نہ کرے بلکہ خریدار جس جس طرح قیمت ادا کرنا جائے باقساط یا بہ قسط واحد بینک وصول کر کے محض وہ قیمت مالک مال کو دیتا جائے تو اس صورت میں بھی جو پیسہ خریدار سے یا مالک مال سے بینک طے کر کے خود لے گا وہ سود نہ ہوگا، بلکہ وہ اس کی اجرت اور حق المومنٹ ہوگی، اور یہ دینا لینا جائز رہے گا۔

و- البتہ اگر خریدار بینک سے واقعی قرض لے کر خود مالک مال کو قیمت ادا کرے یا بینک سے قرض لینے کا معاملہ کرے، مثلاً اس طرح معاملہ کرے کہ تم مالک مال (بائع) کو میری طرف سے قیمت ادا کر دیا کرو، میں بعد میں تم کو ادا کر دیا کروں گا تو بینک یہ دونوں معاملے قرض کے ہوں گے۔ پہلا خالص قرض کا اور دوسرا قرض اور وکالت دونوں کا ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں بینک اپنے دینے ہوئے روپے سے زائد رقم جو خریدار سے وصول کرے گا، وہ بلاشبہ سود ہوگی، اور اس صورت میں بینک سود دینے کا ارتکاب خریدار سے ہوگا جس کی اجازت بغیر شدید حاجت کے نہ ہوگی، مثلاً بغیر قرض لیے ہوئے کام نہ چلتا ہو، اور بینک کے علاوہ کہیں سے قرض نہ ملتا ہو یا ملتا ہو مگر باعتبار بینک کے سود زیادہ دینا پڑتا ہو، الغرض اس جواب ضمیمہ میں جن جن صورتوں میں نفع کو سود کہا گیا ہے وہ شرعی مفہوم و مصداق کے اعتبار سے کہا گیا ہے، اس کی حرمت ہر ملک اور ہر زمانہ کے اعتبار سے علی الاطلاق ہے، اخیر ضمیمہ میں ان سرکاری قرضوں کو جن جن صورتوں میں بانٹا گیا ہے، ان میں سے کوئی صورت بھی ہو، جب اس پر سود کا شرعی مفہوم صادق آجائے گا اس کو روائے محرم سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے، اسی طرح حضرت مولانا جعفر شاہ صاحب نے اس ربو کو جس کی حرمت قرآن پاک میں منصوص ہے، یوزری کے ساتھ خاص فرمایا ہے، اگرچہ سوالنامہ پورا حاصل نہ ہونے کی وجہ سے نیز آکسفورڈ ڈکشنری بھی سامنے نہ ہونے کی وجہ سے حضرت موصوف کی مراد متعین نہیں ہوئی، لیکن دوسری اس فن کی معتبر کتاب (آؤٹ لائن آف اکنامکس) مصنفہ من موہن سنگھ ودیا ساگر کالج کلکتہ، مطبوعہ ۱۹۲۷ء میں یوزری USURY کے یہ تین معنی لکھے ہیں۔

(۱) سود خوری (۲) مروجہ قانونی شرح سے زیادہ سود لیا (۳) بہت بھاری سود لیا (عموماً)۔

یوزری کے انہی تین معنی میں سے کوئی معنی مراد لیا یا اس کے علاوہ کوئی بھی معنی لیا آیات حرمت ربوا میں ربوا کو اس کے ساتھ مخصوص کر لیا اس وجہ سے صحیح نہ ہوگا کہ جب شارع علیہ السلام نے خود ربوا کے معنی کی تشریح یا تائید ہی اس انداز سے فرمادی جس میں ہر طرح کا اطلاق ہے تو اب کسی دوسرے شخص کو اس کے تقبید یا تخصیص کا حق نہیں پہنچتا، چنانچہ مشہور حدیث کے جس کو مسلم شریف و ابوداؤد و نسائی و ترمذی و ابن ماجہ سبھی نے نقل کیا ہے، الفاظ یہ ہیں: عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ: ”الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل يدا بيد فمن زاد أو استزاد فقد أربى“ (۱)۔

ثالث حکم جو چیز بھی ہو، اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ان چھ چیزوں میں سے جب کوئی چیز اپنی جنس کے عوض میں بیچی جائے یا بطور قرض لی جائے یا دی جائے تو کسی قسم کی زیادتی بھی ہو وہ مطلقاً ربوائے محرم ہوگی، خواہ وہ مبادلہ (قرض) پیداوار کی صلاحیت بڑھانے کی نیت سے ہو، کسی انسانی بنیادی ضرورت کی تکمیل کے لیے ہو، خواہ قرضدار کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا مقصود نہ ہو بلکہ نفع پہنچانا مقصود ہو، خواہ بھاری سود یا سود خوری وغیرہ سے بالکل خالی و صاف ہو، غرض ہر حال میں وہ زیادتی ربوا ہی شمار ہوگی اور دائرہ حرمت سے باہر نہ ہوگی۔ ہاں اگر دربار رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی اتنی صاف تصریح اور وضاحت نہ ہوتی، اور پھر کوئی مناسب تاویل قائم ہو جاتی تو گنجائش بھی ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کا حکم شارع علیہ السلام اطلاق و عموم کے ساتھ صاف و واضح لفظوں میں بیان فرمادیں تو کسی بشر کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ اس میں بغیر کسی نص کی مدد کے کوئی تقبید یا تخصیص یا کسی قسم کا تغیر وغیرہ کر سکے۔ ایک اشکال اور اس کا جواب:

اشکال یہ ہے کہ جب شارع علیہ السلام نے ربوا کا مفہوم اس طرح اطلاق و عموم کے ساتھ صاف اور واضح بیان فرمادیا تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمانے کا کیا مقصد ہے؟

”إن آخر ما نزلت آية الربوا وأن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض ولم يفسرها لنا فادعوا

الربوا والربيه“ (۲)۔

۱- مسلم باب الربا ۲/۲۵۸۔

۲- ابن ماجہ الداری، مشکوٰۃ ص ۶۳۳۔

اس کا جواب یہ ہے:

حضرت عمرؓ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آیت ربو الجمل ہے یا اپنے مفہوم و مصداق میں گنجلک ہے، جس کی وجہ سے تقاضائے آیت پر عمل کرنے میں دشواری ہے، یہ مفہوم تو ایک معمولی انسان بھی نہیں لے سکتا چہ جائیکہ حضرت عمر فاروقؓ جیسا جلیل القدر اور قوی الایمان صحابی، اس لیے کہ اس میں کھلا اعتراض اسلام و تعلیمات اسلام پر ہوتا ہے اور اس کی زوادات باری عزاسمہ پر پہنچتی ہے۔

بلکہ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ آیت ربو آیت محکم ہے، اس میں نسخ و تغیر وغیرہ کسی چیز کا احتمال نہیں ہے اور نہایت واضح اور مفسر ہے، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر نہیں فرمائی، اور اتنی اہم ہے اور خوفناک ہے کہ جو چیزیں صریح ربو ہیں ان کو تو چھوڑنا ہی ہے، جن چیزوں میں شبہ ربو اہوان کو بھی چھوڑ دینا ہے۔

چنانچہ علامہ طیبیؒ اسی مفہوم کو ان لفظوں میں ادا فرماتے ہیں: ”ان هذه الآية ثابتة غير منسوخة غير مشبهة ولذلك لم يفسرها النبي ﷺ فأجروها على ما هي عليه ولا تترتبوا فيها واتركوا الحيلة في حل الربو“۔

اور خود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس جملہ ”فدعوا الربو والريبة“ سے بھی اسی مفہوم کا پتہ لگتا ہے۔ اسی طرح ”الأمور بمقاصدها“ میں امور سے وہ امور مراد ہیں جن کا حسن و فحش یا جن کا حکم حلت و حرمت منصوص نہ ہو تو اس کا حسن و فحش یا حکم ان کے مقاصد سے نکل سکتا ہے نہ یہ کہ سارے ہی امور و احکام کا مدار ان ہی مقاصد پر ہو، اگر ایسا ہو تو دین کی اور حدود اللہ کی ساری ہی عمارت منہدم ہو کر رہ جائے گی۔

اسی طرح ”الضرورات تبیح المحظورات“ میں بھی الف و لام عہد کا ہے اور وہ ضرورتیں مراد ہیں جو ملتی اور بخر ہو جاتی ہیں، اضطراب اور مختصہ تک، نہ کہ تمام ہی ضرورتوں کا یہی حکم ہو، ایسا ہرگز نہیں ہے چنانچہ اس سے اگلا جملہ ”ومن ثم جاز أكل الميتة عند المخصصة“ (۲) جو بالکل اس قاعدہ سے متصل اور اسی کی تمثیل ہے، اس کی وضاحت کر رہا ہے، جیسا کہ سابق جواب میں بھی ہم اس کی وضاحت کر آئے ہیں۔

القرض جس معاملہ پر سود کا مفہوم شرعی صادق آجائے جس طرح اس کو غیر سود یا مباح و جائز کہنا درست و جائز نہیں ہوگا، اسی طرح جس معاملہ پر سود کا مفہوم شرعی صادق نہ آوے اس کو سود یا حرام کہنا درست و مباح نہ ہوگا، بلکہ ان فرق کا واضح

۱- الاشباہ والنظائر / ۱۴۰۔

۲- الاشباہ والنظائر / ۱۴۰۔

کرنا ہمیشہ اور ہر زمانہ کے علماء و مشائخ پر ضروری رہے گا تا کہ دین متین کی جامعیت اور جاذبیت و ہمہ گیری و ہر دلعزیزی نیز ”الحلال بین و الحرام بین“ اور ”الدین یسر“ نمایاں و غالب رہے، اس تمام تر گفتگو سے قرض کی قسم اول (حکومتوں کا خود قرض لینا) کا حکم بھی خود بخود نکل آیا، اور اسی تفصیل پر جو گزری اس کو منطبق کر لینا کافی ہو سکتا ہے، اس لیے فقط ایک بات اس کے متعلق عرض کر کے جواب ختم کرنا ہوں۔

اور وہ یہ ہے کہ اگر حکومت کو اندرون ملک کے باشندوں سے قرض لینا ہو تو سود پر نہ لینا چاہئے، بلکہ جہاں تک ہو سکے باشندگان ملک کے سامنے مکمل ضروریات رکھ کر ہمدردی کی ترغیب و تحریض دلا کر بطور قرض حسنہ (غیر سودی قرض) لینا چاہیے۔ اگر وہ ملک پر بھی اخلاقاً ضروری ہے خاص کر صاحب سرمایہ و صاحب حیثیت اصحاب پر کہ وہ ملک کی مضبوطی و ترقی کے لیے حکومت کو قرض حسنہ (قرضہ غیر سودی) دیں کہ ملک کی اور اہل ملک کی ہمدردی و یہی خوبی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۷/۷/۱۳۹۱ھ

ملکی ترقی کی سرکاری اسکیموں میں مسلمانوں کی شرکت:

عرض یہ ہے کہ چند امور قابل استفسار ہیں، اس کا جواب جس قدر بہ سہولت تمام ممکن ہو عنایت فرمادیں! ۱۔ سرکار ہند نے ملک کی ترقی کے لیے اسکیمیں کھولی ہیں، اور ان کے واسطے روپیہ کی فراہمی کے لیے سرٹیفکٹ جاری کرتے ہیں، جو لوگ سرٹیفکٹ خریدتے ہیں، ان کو سود ہر سال مل سکتا ہے، ان کا اس المال تین یا سات سال پر واپس مل سکتا ہے، یہ روپیہ سرکار اسکیم میں لگاتی ہے، لوگ روپیہ کی حفاظت کی نیت سے اور اس نیت سے بھی کہ کچھ اضافہ بطور سود ہو جاوے گا، روپیہ دے کر سرٹیفکٹ خریدتے ہیں، روپیہ فوراً نہیں مل سکتا، البتہ تین سال کے پہلے مل سکتا ہے، آیا ایسے روپیہ پر زکوٰۃ فوراً ہر سال ادا کرنے کا حکم ہے یا کس طرح اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم ہے؟

۲۔ آیا غیر مسلم حکومت سے سود لیا جاسکتا ہے اور وہ سود ہر کام میں لگا سکتے ہیں، سرکار نجوں سے، وکیلوں سے اور زمینداروں سے آدمی پر اور زمینداری و مکان پر ٹیکس لیتی ہے۔

سو ۴۔ کئی کمپنی چٹھی ڈالنے کی کہتی ہیں، جو غیر مسلم کی نہیں، آیا چٹھی ڈالنا ایسی کمپنی میں شرعاً جائز ہے؟ چونکہ کچھ لوگ اس ملک کو دارالحرب کہتے ہیں، آیا چٹھی ڈالنا یا عشر بند کرنا شرعاً جائز ہے۔

الجواب وبالله التوفیق:

۱۔ سہ کاربند نے ملک کی ترقی کے لیے جو اسکیمیں کھولی ہیں، ان میں مختلف کاروبار اور بزنس کیا اور کرایا جاتا ہے اور عوام سے بذریعہ سرٹیفکٹ جو رقمیں لی جاتی ہیں، ان ہی کاروباروں میں اور بزنسوں میں خرچ کیا جاتا ہے، اس طرح یہ روپے بمنزل شیئر (حصوں) کے ہو سکتے ہیں اور دینے والے شیئر ہولڈر کہلائے جاسکتے ہیں، جس طرح دیگر کمپنیوں میں شیئر اور شیئر ہولڈر (حصہ دار) ہوتے ہیں، پھر ان کاروباروں اور بزنسوں سے جو نفع ہوتا ہے، نفع ان شیئر داروں کو دیتی ہے، یہ تاویل کی جاسکتی ہے، لہذا سود کا نام رکھنے سے اس کا سود ہونا ضروری نہیں، جس طرح پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ میں سود کا نام رکھنے سے سود نہیں ہوتا۔

امداد الفتاویٰ میں حضرت تھانویؒ بھی اس حق میں ہیں کہ سود کا نام رکھنے سے سود ہونا ضروری نہیں اور صحیح بھی ہے، اس لیے کہ سود (ربوا) شرعی لفظ اور شرعی اصطلاح ہے، شرعی مفہوم رکھتا ہے، جب تک وہ مفہوم شرعاً صادق نہ آئے گا کسی کے سود کہنے سے سود نہ ہوگا، پس جن علماء کے نزدیک یہ تاویلات و توجیہات صحیح ہیں، وہ ان اسکیموں میں حصہ لینے اور اس کے نفع کو جائز کہتے ہیں، اور جن علماء کے نزدیک تاویلیں صحیح نہیں وہ ناجائز فرماتے ہیں، اور احقر کا رجحان بھی بحالت موجودہ جواز کی طرف ہے، اور جب وہ شخص وہ روپیہ حقیقت میں کاروبار و بزنس میں لگاتا ہے یا لگانے کے لیے دے سکتے ہیں، اس لیے اس کو زکوٰۃ بھی اپنے اور سرمایہ کے اندر لگے ہوئے روپیوں کی طرح دینی ہوگی۔

۲۔ جو نفع شرعی مفہوم کے اعتبار سے سود (ربوا) ہے، اس کا لینا دار الحرب میں اور غیر مسلم سے ہر ایک سے لینا ناجائز ہے اور حرام ہے، سود لینے پر بڑی سخت وعیدیں احادیث پاک قرآن پاک میں وارد ہیں، امام صاحب فرماتے ہیں کہ پورے قرآن پاک میں مجھے اس سے زیادہ اور کوئی آیت معاصی کے سلسلے میں خوفناک نظر نہیں آتی۔

اور اسی وجہ سے ان محکموں میں جو علماء شرکت جائز فرماتے ہیں، غایت احتیاط کا حکم دیتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے بچا جائے، ایسے کاموں میں بدرجہ مجبوری ہی شرکت کی جائے۔

۳۔ چٹھی ڈالنے کی کمپنیوں کی ذرا وضاحت فرمائیے، بہر حال اگر ان کمپنیوں میں بزنس اور کاروبار ہوتا ہے تو اس کی نوعیت اور حکم دوسرا ہو سکتا ہے، اور بالکل لاٹری والا معاملہ ہو تو دوسرا ہو سکتا ہے۔

۴۔ رہ گیا عشر کا مسئلہ تو ختم زمینداری کے بعد سے جہاں کا زمیندارہ حکومت نے ختم کر دیا، وہاں حکومت ارضیات کاشت کی مالک ہوگئی، مسئلہ استیلاء کے ماتحت وہ زمین مثل اراضی محرزہ سلطانی ملک سرکار ہو گئیں اور عشر ختم ہو گیا، باقی جس

قد رہی کوئی شخص بطور خیرات نکال دے گا باعث خیر و برکت ہی ہوگا اور نکالنا بھی چاہیے، مگر وجوب عشر نہ ہونے کی وجہ سے عدم ادائیگی میں گناہ نہ ہوگا اور ادائیگی میں ثواب ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۳/۱۲/۱۳۹۰ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

انعام کا غلط طریقہ:

چند لڑکوں نے مل کر ایک کمپنی شروع کی ہے اس کا نام ”سونا ٹریڈرس“ ہے، کمپنی کا اصول یہ ہے کہ دس ہزار ممبر بنائے جائیں اور ہر ممبر سے دس روپے فیس لی جائے۔ کل رقم ایک لاکھ روپے ہوئے، اس رقم کو لے کر تجارت کرنے کا ارادہ ہے، اور ممبران کو ان کی اصلی رقم واپس کرنے کی صورت یہ ہے کہ ہر ماہ پانچ سو روپے کے انعامات کھولے جائیں، ۸۰ انعامات ۲۵،۲۵ روپے کے اور ایک انعام تین سو روپے کا، ان انعامات کی ترتیب قرعہ اندازی جیسی ہوگی کہ دس ہزار ناموں کو ایک ڈبہ میں ڈال کر ہر چھ ماہ نکالے جائیں، اسی طرح ۵ سال تک ہر ماہ کیا جائے اور ۵ سال بعد بقیہ ممبران کو کمپنی جو بونس (نفع) مقرر کرے وہ مع اصل رقم کے واپس کر دیا جائے گا، آیا اس کمپنی میں ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی تقسیم شرع کے خلاف تو نہیں ہے مفصل تحریر فرماویں۔

(نوٹ) جن ممبران کا نام انعامات میں آجائے گا ان کو پھر کمپنی سے کوئی جوڑ یا تعلق باعتبار پیسے کے نہیں ہوگا۔

الجواب وبالله التوفیق:

اس کمپنی کا یہ طریقہ انعام و نفع تقسیم کرنے کا غلط ہے۔ قمار اور سود کو شامل ہے جائز نہیں۔ اس لیے اس میں شریک ہونا اس کا ممبر بننا جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفرلہ، سید احمد سعید مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۷/۱۳۹۱ھ

حق تصنیف سے متعلق سوال و جواب :

زید بہت بڑا عالم ہے اس نے ایک ابتدائی مذہبی کتاب لکھی جس میں بچوں کو سوال و جواب کے طور پر عقائد و اعمال کے ضروری مسائل سکھائے ہیں۔ پھر وہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ بہت سے دینی مدارس میں داخل نصاب کر لی گئی۔ اور بہت سے لوگوں (اہل علم و تجارت) نے اسکو چھپوا کر شائع کیا۔ مگر زید نے کبھی کسی پر اعتراض نہیں کیا۔ زید کے انتقال کے بعد کچھ مدت گزرنے پر عمر نے اس کتاب کو بغرض اشاعت علم و تجارت چھپوایا۔ اس پر زید کے ورثاء مطالبہ کرتے ہیں کہ تمہارے اس کتاب کو چھپوانے سے ہماری تجارت کو نقصان پہنچا تم نے بلا اجازت اس کو چھپوایا ہے، لہذا ہمارے نقصان کا ہرجانہ اتنے ہزار روپیہ ادا کرو۔ ورنہ ہم عدالت میں مقدمہ دائر کرتے ہیں کہ تم نے ہماری کتاب کو بلا اجازت چھپوایا ہے۔

اب سوال یہ ہے (۱) کیا زید کے لیے خود یہ بات جائز تھی کہ وہ اپنی لکھی ہوئی دینی ضروری کتاب کی طباعت کے حقوق قانوناً محفوظ کرائے کہ کوئی دوسرا شخص نہ چھاپ سکے۔

(۲) کیا زید کے ورثاء کے لیے خود یہ بات جائز ہے کہ انتقال زید کے بعد دوسرے لوگوں کو اس کے چھاپنے سے منع کریں۔

(۳) کیا زید یا زید کے ورثاء کے لیے یہ بات درست ہے کہ وہ حقوق طبع کسی پریس یا ناشر کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اور کیا شرعاً ایسی بیع درست ہوگی؟ اور اس بیع سے حاصل شدہ روپیہ جائز ہوگا؟ حق طبع مال منقوم ہے یا غیر منقوم؟

الجواب وبالله التوفیق :

یہ اجتہادی اور قیاسی مسئلہ ہے، مگر وں اولیٰ میں فن طباعت کا نہ وجود تھا، اور نہ طباعت کیساتھ مالی منفعت کے متعلق ہونے کا تصور تھا، لہذا اس کے بارے میں صراحت کوئی حکم مذکور نہیں ہے، لیکن اگر طباعت کو غیر منقوم اور مباح الاصل مان لیا جائے، تب بھی ایسی کتاب جس کے ساتھ مصنف کی مالی منفعت یا تجارتی مفاد وابستہ ہو تو اس کو ہر کس و ناکس کا بلا اجازت مصنف طبع کرنا جائز نہیں، کیونکہ بعض افعال ایسے ہیں کہ اصل کے لحاظ سے مباح ہوتے ہیں، لیکن اگر ان کے کرنے میں دوسرے شخص کی حق تلفی اور ضرر کا امکان ہو تو ان کی اباحت ساقط ہو جاتی ہے اور ممنوع شرعی بن جاتے ہیں، مثلاً ایک مسلمان عورت کو نکاح کا پیغام دینے کی ہر مسلمان مرد ہم کفو کو اجازت ہے، لیکن پیغام پر پیغام دینا ممنوع ہے، یعنی اگر ایک مسلمان مرد نے ایک ہم کفو مسلمان عورت کو اپنے نکاح کا پیغام دے دیا ہو، اور اولیاء کا نکاح کا کچھ رجحان بھی پایا جائے، تو جب تک

وہ عورت انکار نہ کر دے، دوسرے کسی مسلمان کے لیے یہ مباح فعل جائز نہ ہوگا (۱)۔

ایک شخص کسی سے بھاؤ طے کرے تو تیسرے شخص کو دام لگانے کا حق نہیں رہا، اپنے مکان کی چھت پر چڑھنے اور ہوا کھانے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے، مگر جب دوسرے لوگوں کے گھروں کی بے پردگی ہوتی ہو تو اس مباح کی لاحت نہیں رہے گی (کفایت المفتی کتاب المغاربه وشرکت)۔

مسجد میں ہر جگہ بیٹھنا ہر نمازی کے لیے مباح ہے۔ کوئی مقام کسی شخص واحد کے لیے مخصوص نہیں، لیکن اگر کوئی شخص کسی جگہ پر آکر بیٹھ جائے اور اپنا کپڑا وغیرہ رکھ کر کسی ضرورت کے لیے اٹھے تو اس جگہ بیٹھنا دوسروں کے لیے ممنوع ہے، یعنی اس جگہ کو جب شخص واحد نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تو دوسروں کے لیے اس کی لاحت نہ رہی، علامہ شامی نے ”باب ما یفسد“ میں ”مطلب فیمن سبقت یدہ الی مباح“ کے تحت مفصل طور پر بیان کیا ہے کہ کسی مباح کے ساتھ جب کسی شخص کا حق متعلق ہو جائے تو وہ دوسروں کے لیے مباح نہیں رہتا۔

کسی مصنف کی کتاب جو شب و روز کی شدید محنت کے بعد معرض وجود میں آتی ہے۔ اس کو طبع کرنے کا سب سے پہلا حق خود مصنف کو حاصل ہے اور اس کا مقصد علم کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ہی مصنف کے لیے مالی منفعت کا حصول بھی ہے۔ تو جب تک مصنف کا حق اس کے ساتھ وابستہ ہے دوسروں کا حق اس کے ساتھ متعلق نہ ہوگا۔ ایسے تاجر ان کتب جو مصنف کی طرف سے کتاب کی معتد بہ تعداد کی اشاعت کے باوجود اس کی کتاب کو بلا اجازت چھاپ لیتے ہیں، وہ اس کتاب کی مقبولیت سے مالی اور تجارتی فائدے حاصل کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں اور ان کا یہ غرض مسموع ہے کہ انہوں نے علم کی اشاعت کے لیے ایسا کیا ہے، کیونکہ اگر ان کے دل میں علم کی وقعت اور اشاعت علم کا جذبہ ہوتا تو وہ بڑی تعداد میں مصنف سے کتاب خرید کر غریبوں میں مفت تقسیم کرتے اور ثواب حاصل کرتے۔

اب رہا یہ سوال کہ حق طباعت کا معاوضہ لیما مصنف کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

حقوق مجرودہ میں سے وہ حق جن میں مالی منفعت نہیں پائی جاتی یا وہ تحصیل مال کا ذریعہ نہیں بن سکتے، بلکہ محض دفع ضرر کے لیے اثبات حق ہوتا ہے، مثلاً حق شفعہ، سوء جوار سے مامون رہنے کے لیے یہ حق دیا گیا ہے، بیشک ایسے حقوق کا مالی معاوضہ لیما جائز نہیں، لیکن بعض حقوق ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ صاحب حق کی مالی منفعت حال یا مستقبل میں متعلق

۱- ”إن رسول الله ﷺ قال: المؤمن أخو المؤمن فلا يحل للمؤمن أن يبيع أخيه ولا يخطب على خطبة أخيه حتى يملو“ (مسلم کتاب الکاح ۱/ ۵۴ کتاب تحریر علی خطبہ أخیه)۔

ہوتی ہے، مثلاً حق و ظائف، یعنی شاعی مناسب تو ان کا معاوضہ مال کی صورت میں لینا یا مال کے معاوضہ میں حق سے دست بردار ہونا جائز ہے۔ حضرت حسنؓ نے اپنے حق خلافت سے حضرت معاویہؓ کے حق میں دست برداری دے کر معاوضہ قبول فرمایا تھا (۱)۔

اپنے کاروبار کا کوئی نام رکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ جس کو آج کل کی اصطلاح میں گڈول (Goodwill) کہتے ہیں، لیکن اگر ایک شخص نے اپنے کاروبار کا نام ”عطرستان یا گلشن ادب“ رکھ لیا، اور اس سے اس کا تجارتی مفاد وابستہ ہو گیا تو دوسرے شخص کو وہ نام رکھنے کا حق نہیں رہا۔ اور جب کہ ایک خاص نام کے ساتھ مستقبل میں تحصیل مال اور تجارتی منفعت مقصود ہے تو گڈول کا معاوضہ لینا جائز ہے (۲)۔

اسی طرح کتاب کا حق طباعت، جبکہ اس کے ساتھ مصنف کی مالی منفعت حال یا مستقبل میں متعلق ہے۔ وہ حق بلا صالۃ ہے اور مصنف اس حق کو معاوضہ لیکر منتقل بھی کر سکتا ہے، اور عہد حاضر میں ذرائع نقل و حمل اور وسائل نشر و اشاعت کی بے پناہ وسعت کے ہوتے ہوئے اور مصنفین کے لیے اسباب قدر دانی و ہمت افزائی، نیز وجہ کفاف کے فقدان کی وجہ سے حق طباعت کا مصنف کے لیے محفوظ رہنا علمی بخل نہیں ہے، بلکہ اسی میں صالح لٹریچر کی بقاء و ترقی مضمر ہے، مگر صورت مسئلہ میں نقصان چونکہ نقصان منفعت ہے اور وہ بھی غیر متعین اور مجہول ہے، اس لیے موجب ضمان نہیں (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شرکت کی مختلف صورتیں اور ان کے احکام:

۱۔ ”وَلَا يَجُوزُ الشَّرْكَةُ إِذَا شَرَطَ لِأَحَدِهِمَا دِرَاهِمَ مَسْمُوعَةٍ مِنَ الرِّبْحِ“ (۴) مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شرکت میں شریک کو متعین نفع یعنی تنخواہ لینا ناجائز ہے، مگر کیا دوسرے شرکاء کے لئے یہ تنخواہ دینے اور شریک کو تنخواہ لینے سے بقیہ مال جو شرکاء کے درمیان تقسیم ہوگا وہ حلال ہوگا یا حرام؟

۱۔ الاشباہ والنظائر للحموی و ثانی فی غایۃ الاوطار۔

۲۔ حوادث الفتاویٰ حصہ چہارم۔

۳۔ ثانی کتاب التخصب۔

۴۔ ہدایہ ولیئم ۶۳۲ کتاب الشریکۃ ذکر یا کتب خانہ۔

۲- اگر کاروبار چلانے والے شریک کے لئے شرکت صحیح کرنے کے لئے غیر متعین حصہ طے کیا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کا کاروبار میں حصہ زیادہ ہو جانے کی وجہ سے پورے کاروبار پر خود قابض ہو کر بیٹھ جاتا ہے، اور دیگر شرکاء کے حصے کو جبراً و قہراً نکال دیتا ہے، اس لئے متعین نفع دینا ضروری ہے یہ رواج ہوکل وغیرہ کے کاروبار میں عام ہو گیا ہے اور ابتداء عام ہے، تو کیا اس صورت میں شرعاً متعین نفع کے لئے جواز کی کوئی سہیل نکل سکتی ہے تاکہ کسب حرام سے امتراز ہو سکے۔

۳- کچھ لوگوں نے ملکر ایک شخص کی دکان چلانے کے لئے لی اور بات یہ طے ہوئی کہ ماہوار ہم لوگ دس ہزار روپے (کنٹراکٹ) یعنی دکان کی اجرت دیتے رہیں گے اور پانچ سال کی مدت طے ہوئی، لیکن دکان پرانی ہو جانے کی وجہ سے اس میں کچھ مرمت و اصلاح کی ضرورت ہے، اس لئے مالک دکان نے چلانے والے لوگوں سے کہا کہ اگر تم کو دکان چلانی ہے تو جو کچھ بھی مرمت کی ضرورت ہے اپنی ذاتی رقم سے کر لو اور مرمت کا جتنا خرچ ہو وہ میرے ذمہ قرض رہے گا اور تمہارے ذمہ مجھے کنٹراکٹ دینے کی جو رقم طے ہوئی ہے اس میں سے ہر ماہ نصف نصف یعنی پانچ پانچ ہزار وصول کرتے رہیں، مابقیہ کنٹراکٹ کی نصف رقم مجھے دیتے رہیں اور مرمت کے قرض میں سے جب مبلغ دس ہزار روپے باقی رہ جائے تو کنٹراکٹ میں سے وصول کرنا ترک کر دیں وہ دس ہزار روپے اجرت کی مدت مکمل ہو جانے کے بعد میں اس کو ادا کروں گا اور تم لوگ مجھے پوری اجرت دس ہزار روپے دیتے رہو، دکان چلانے والوں نے اس بات کو منظور کر لیا اور یہ صورت اس لئے اختیار کی جاتی ہے تاکہ دکان چلانے والوں پر مالک دکان کی طرف سے ایک قسم کا دباؤ رہتا ہے جس کی بنا پر وہ لوگ دکان میں کسی قسم کا نقصان نہیں کرتے، کیونکہ ان لوگوں کو یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اگر دکان میں کسی قسم کا نقصان کیا گیا تو مالک دکان ہمیں اپنے دس ہزار کا قرض واپس نہیں دے گا تو کیا اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے، اگر اس میں کوئی مضائقہ ہو تو شرعی حیثیت سے اگر کوئی جواز کی صورت نکلتی ہو تو تحریر فرمائیں۔

۴- اگر زید نے بکر سے یوں کہا کہ خالد جو کاروبار کر رہا ہے اس میں میری جانب سے بطور قرض دو ہزار روپے دے دینا اور بکر نے زید کے حکم کے مطابق خالد کو دو ہزار روپے دے بھی دیئے تو ظاہر ہے کہ ان دو ہزار روپے پر زید کا قبضہ نہیں ہوا تو اب خالد کے کاروبار میں جو منافع ہوا وہ زید کی ملک ہو گیا بکر کی اور یہ ملحوظ رہے کہ زید نے اپنا قرضہ بکر کو کچھ ادا کر دیا ہے اور کچھ بعد میں ادا کر دے گا۔

۵- ایک دکان میں دو آدمی حصہ دار ہیں جملہ منقولی و غیر منقولی اشیاء میں، اس میں سے ایک آدمی کو دکان چلانے کے لئے متعین کیا اور دوسرا حصہ دار ان سے الگ رہا اور یہ دکان چلانے میں شرکت نہ کرنے والا چلانے والے حصہ دار سے

یوں کہ تم دکان چلاؤ۔ تے رہو اور مثلاً دو ہزار روپے مجھے میری نصف دکان کی اجرت کے طور پر دیتے رہنا، بقیہ بچا ہوا سب تمہارا ہے اور یہ صورت اس لئے اختیار کی جاتی ہے کہ متعین نفع کسی شریک کے لئے نہیں ہوا بلکہ وہ اپنے حصہ کی اجرت لے رہا ہے تو کیا یہ صورت شرعاً جائز ہے تحریر فرمائیں۔

۶۔ بعض مالک دکان، دکان چلانے والوں سے بطور ڈپوٹ (قرض) لے لیتے ہیں اور یہ رقم اجارہ کی مدت ختم ہو جانے کے بعد واپس دے دیجاتی ہے اور یہ صورت اختیار کئے بغیر دکان ملنا مشکل ہے تو اس طرح ڈپوٹ دے کر دکان چلانے کے لئے لیما جائز ہوگا اگر یہ صورت جائز نہیں ہے تو اگر یوں کیا جائے کہ مالک دکان سے کہا جائے کہ یہ ڈپوٹ نہیں ہے بلکہ یہ وہ پیشگی اجرت ہے جو مدت اجارہ کے آخری دو مہینے ہیں اس کی اجرت ہے ان دو ماہ کے قبل کی اجرت نہیں ہے تو یہ صورت جواز کی ہے یا نہیں؟

محمد سلیمان (مہتمم مدرسہ جامعہ مذہبہ یکا کوئی ضلع مہسانہ شمالی کجرات)

الجواب و باللہ التوفیق:

۱۔ ”ولا يجوز الشركة إذا شرط لأحدهما دراهم مسماة من الربح“ (۱)۔
عبارت بالا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی شریک کے لئے نفع میں سے متعین روپیوں کی شرط کر دی جاتی ہے تو شرکت درست نہیں ہوتی ہے اور یہ ایک اتفاقی مسئلہ ہے، قال ابن المنذر: لا خلاف في هذا لأحد من أهل العلم (۲)۔
اور اس صورت میں نفع کی تقسیم مال کی مقدار کے اعتبار سے ہوگی اگرچہ نفع میں تفاضل کی شرط کی گئی ہو ویکن
الربح على قدر المال، (الدر المختار) (۳)۔

رہ گیا یہ حکم کہ کسی شریک کو مشترکہ شئی میں کام کرنے کی تنخواہ اور اجرت لیما جائز نہیں سو یہ اس عبارت مذکورہ فی السؤال سے معلوم ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ حکم مندرجہ ذیل عبارات سے معلوم ہوتا ہے: ”ولو استأجره لحصل طعام

۱۔ (ہدایہ اولین ص ۶۳۲ کتاب الشریک زکریا کتب خانہ)، اس کے آگے کی عبارت یہ ہے: ”لأنه شرط يوجب القطار الشركة فعليه لا يخرج إلا قدر المسمى لأحدهما ونظيره في المزارعة“ (ہدایہ ص ۶۳۲ کتاب الشریک زکریا کتب خانہ) (مرتب)۔

۲۔ فتح القدیر ۵/۲۵۔

۳۔ ”قوله ويكون الربح على قدر المال أي وإن اشترط فيه التفاضل لأن الشركة لما فسدت صار المال مشتركا شركة ملك والربح في شركة الملك على قدر المال“ (رد المحتار علی الدر المختار ۶/۴۹۰)۔

مشارك بينهما فلا أجر له لأنه لا يعمل شيئاً لشريكه إلا ويقع بعضه لنفسه فلا يستحق الأجر“ (الدر المختار)، (قوله فلا أجر له) أي لا المسمى ولا أجر المثل زيلعي (١) والأصل أن كل ما لا يستحق الأجر إلا بإيقاع عمل في العين المشتركة لا يجوز وكل ما يستحق بدونه يجوز (٢)۔

اب رہ گئی یہ بات کہ نفع میں سے تنخواہ دینے اور شریک کے تنخواہ لینے سے یا متعین و معدود روپے دینے اور شریک کے لینے سے بقیہ مال جو شرکاء کے درمیان تقسیم ہوگا وہ حلال ہوگا یا حرام؟ سو اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں اس لئے وہ مال حلال ہوگا لان الأصل في الأشياء إلا بإحالة (الاشباہ ص ۱۳۲) (۳)۔

۲۔ سوال اول سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر متعین نفع سے آپکی مراد تنخواہ اور اجرت ہے سو اس کا حکم سوال اول کے جواب میں معلوم ہو چکا ہے کہ مشترک چیز میں کام کرنے کی اجرت و تنخواہ لیما درست نہیں لیکن امام شافعی کے نزدیک درست معلوم ہوتا ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے مستفاد ہوتا ہے: ”وَإِذَا كَانَ الطَّعَامُ بَيْنَ رَجُلَيْنِ فَاسْتَأْجَرَ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ أَوْ حَمَارَ صَاحِبِهِ عَلَى أَنْ يَحْمِلَ نَصِيبَهُ فَحَمَلَ الطَّعَامَ كُلَّهُ فَلَا أَجْرَ لَهُ وَقَالَ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللَّهُ: لَهُ الْمُسَمَّى لِأَنَّ الْمَنْفَعَةَ عَيْنٌ عِنْدَهُ وَيَبِيعُ الْعَيْنُ شَانِعًا جَائِزًا“ (ہدایہ ص ۳۰۷)۔

اور ضرورت شدیدہ اور ابتلاء شدیدہ کی صورت میں دیگر ائمہ کے مذہب کو اختیار کر لینے کی گنجائش ہے، لہذا اگر ضرورت شدیدہ یا ابتلاء شدیدہ ثابت ہو جائے تو توسع کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ مفقود کے بارے میں ضرورت شدیدہ کی بناء پر امام مالک کے مذہب کو اختیار کر لیا گیا ہے اور قاعدہ ہے کہ ما عمت بلیتہ خفت قضیتہ (۴) اور درمختار میں ہے کہ وَأُطْلِقَ الشَّافِعِيُّ أَخْذَ خِلَافِ الْجَنَسِ لِلْمَجَانَسَةِ فِي الْمَالِيَةِ قَالَ فِي الْمَجْتَبَى: وَهُوَ أَوْسَعُ فَيَعْمَلُ بِهِ عِنْدَ الْضُرُورَةِ (الدر المختار ص ۲۷۷)۔

جہاں تک ضرورت شدیدہ کا تعلق ہے تو ہمارے خیال میں اس کا تحقق نہیں، کیونکہ جو چہ تنخواہ اجرت دینے کی ذکر

۱۔ رد المحتار علی الدر المختار طبع مکتبہ زکریا ۸۲/۹۔

۲۔ رد المحتار علی الدر المختار طبع مکتبہ زکریا ۸۳/۹۔

۳۔ الاشباہ والنظائر طبع دیوبند ۱۴۰۶ ص ۱۱۵ وطبع ادارة القرآن کراچی ص ۹۷، عبارت اس طرح ہے: ”وفي شرح المدار للمصنف الأصل في الأشياء الإباحة عند بعض الحنفية ومبهم الكوخی“، اس کے تحت شرح حموی میں مذکور ہے: ”ذكر العلامة قاسم بن فطوبغا في بعض تعاليقه إن المختار أن الأصل الإباحة عند جمهور أصحابنا“ (الاشباہ والنظائر مطبوعہ دیوبند ص ۱۱۵)۔

۴۔ الاشباہ والنظائر طبع دیوبند ص ۱۳۸ وطبع کراچی ص ۱۰۷۔

کی گئی ہے، اس سے استیجار شریک و اعطاء اجرت کی ضرورت شدیدہ کا ثبوت نہیں ہوتا، اس لئے کہ اگر استیجار شریک و اعطاء اجرت نہ کیا جائے اور متعین و معدود روپے کسی شریک کے لئے مشروط نہ کئے جائیں بلکہ نفع کا جز و شائع متعین (مثلاً نصف نفع، ثلث، یا ربع نفع) ہی طے کیا جائے اور مثلاً ہر پانچ سال پر حساب کر کے کاروبار چلانے والے شریک کا زائد حصہ شرکت کے مال سے علیحدہ کر کے اس کے حوالے کر دیا جائے (جیسا کہ تنخواہ دینے کی صورت میں تھوڑا تھوڑا اس کے حوالہ ہوتا رہتا ہے) تو اس شریک کا کاروبار میں حصہ زیادہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی پورے کاروبار پر خود قابض ہو کر بیٹھ سکتا ہے اور نہ ہی دیگر شرکاء کے حصوں کو جبراً و قہراً نکال سکتا ہے۔

نیز اس ثرابی سے بچنے کے لئے وہ صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے جسکو ۵۔ کے جواب میں بعض تاویلات اور تفصیلات کے ساتھ ذکر کیا جائے گا کماستعرف انشاء اللہ تعالیٰ۔

رہ گیا ابتلاء شدید سو اگر واقعی اس علاقہ میں تحقیق ہے تو وہاں توسع کیا جاسکتا ہے، حضرت مولیٰما تھانویؒ نے امام احمدؒ کی ایک روایت کی بناء پر ”دفع بقرہ نصف نماء“ کے بارے میں فرمایا ہے کہ ”تحرز احوط ہے اور جہاں ابتلاء شدید ہو توسع کیا جاسکتا ہے“ (امداد الفتاویٰ ۳/۲۸۵) (۱)۔

اگر استیجار شریک و اعطاء اجرت کو مطابق مذہب امام شافعی اختیار کیا جائے تو مناسب ہے کہ شرکت میں بھی حتی الوسع ان کے مذہب کی رعایت کی جائے، شرکت میں ان کے نزدیک ضروری ہے کہ نفع و نقصان مال کی مقدار کے اعتبار سے ہواں کے خلاف کی شرط موجب فساد عقد ہے، ”والربح والخسران علی قدر المالین تساویا فی العمل أو تفاوتا فإن شرطاً خلافه ففسد العقد فیرجع کل أحد علی الآخر بأجرة عمله فی ماله“ (۲)۔

۳۔ اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے مستفاد ہوتا ہے: ”وإذا استأجر الرجل من آخر عروسة دار ببدل معلوم مئة معلومة وأذن له رب الدار أن يبني فيها كذا وكذا و يحسب له ما أنفق في البناء من الأجر فهذا جائز، ألا ترى إلى ما ذكر محمد رحمه الله تعالى فيمن استأجر حماماً و وكله رب الحمام أن يرم ما استرم من الحمام ويحسب له ذلك من الأجر يجوز وإذا جاز ذلك وأنفق في البناء استوجب علی الأجر قدر ما أنفق لأنه فعل بأمره والأجر علی

۱۔ امداد الفتاویٰ طبعہ ذکر کیا بکثرت پود پود ۳/۳۳۳، امام احمدی کی روایت جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی عبارت یہ ہے: ”لو دفع دابة أو لخلعة إلى من يقوم له وله جزء من لمانه صح“۔

۲۔ منهاج الطالبین للہووی ص ۵۶۔

المستاجر دين فيلتقيان قصاصا إن لم يكن بينهما فضل و يترادان الفضل إن كان بينهما فضل ويكون البناء لصاحب العرصة“ (۱)۔

اس صورت کے اختیار کرنے کی جو وجہ سوال میں مذکور ہے وہ موجب بظاہر ان یا فساد عقائد نہیں ہے۔

۴- ”أما دين الحي الفقير فيجوز لو بأمرة“ (الدر المختار) (قوله فيجوز لو بأمرة) أي يجوز عن الزكاة على أنه تمليك منه والدائن يقبضه بحكم النيابة عنه ثم يصير قابضاً لنفسه فتح (۲)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اس کاروبار میں جو منافع ہوا ہے وہ زید کی ملک ہوگا، کیونکہ وہ قرض کے دوہزار روپے اگرچہ زید کے قبضہ میں نہیں آئے ہیں لیکن زید کے نائب خالد کے قبضہ میں بحکم النيابة آچکے ہیں وہ پھر ان دوہزار روپیوں پر شرکت کے واسطے قابض ہوا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خالد کے ساتھ شرکت کا معاملہ تو زید کا ہوا ہے نہ کہ بکر کا جیسا کہ سوال سے ظاہر ہوتا ہے، پس شریک کاروبار زید ہی ہے، لہذا وہی منافع کا مالک ہوگا ورنہ غیر شریک کو منافع کا مالک قرار دینا لازم آئے گا ”وہو باطل کما لا يخفى من له أدنى مناسبة بالفقه“

پھر زید کا کچھ قرض ادا کر دینا اور کچھ بعد میں ادا کرنے کا ارادہ رکھنا اور بکر کا زید سے کچھ قرض وصول کر لینا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ شریک کاروبار زید ہی ہے لہذا منافع اس کی ملک ہوگا۔

۵- اگر وہ دکان مع عمارت و فرنیچر و سامان عمارت دونوں کی ملکیت میں ہو تو یہ صورت اس تاویل سے جائز ہو سکے گی کہ ایک شریک اپنے حصہ عمارت و فرنیچر و سامان عمارت کا کرایہ لے رہا ہے، باقی کل کاروبار و نفع سب کا شریک کر رہا ہے (ورنہ جواز کی کوئی شکل نہیں) ”و أجمعوا أن لو آجر من شريكه يجوز سواء كان مشاعا يحتمل القسمة أو لا يحتمل و سواء آجر كل نصيبه أو بعضه كذا في الخلاصة“ (۳)۔

لیکن یہ اجرت اس کے حصہ کی واقعی آمدنی سے زائد نہ ہو اور متعین و معدود روپے ہی ہوں نہ کہ چیز و شائع (۴)۔

اور اپنے حصہ کا منافع کلی طور پر مستاجر کے سپرد کر دے اور اس کے نفع سے بالکل دست بردار ہو جائے۔

۱- الفتاویٰ الہندیہ ۶/ ۳۱۳۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۹۱، ۲۹۲۔

۳- الفتاویٰ الہندیہ ۳/ ۳۲۸۔

۴- مستقائم امداد الفتاویٰ ۳/ ۲۳۱۔

۶- ڈپوزٹ دیکر دوکان کرایہ پر لینے کی گنجائش تو نکل سکتی ہے لیکن دوسری صورت (یعنی جو رقم مالک دوکان شروع میں لیتا ہے اس کو آخری دو مہینوں کی پیشگی اجرت قرار دیکر اس کے سپرد کیا جائے) چونکہ بے غبار ہے، اس لئے اسی صورت کو اختیار کرنا بہتر ہے، اس صورت کو چھوڑ کر سوال کی پہلی صورت کو اختیار نہ کرنا چاہئے اور اگر ڈپوزٹ کی رقم کو ضمانت قرار دیا جائے تو دونوں صورتیں بلا تکلف درست رہیں گی، رہ گیا تعجیل اجرت کا جواز سو وہ واضح ہے اور محتاج دلیل نہیں نیز مندرجہ ذیل عبارات سے اس کا جواز مستفاد بھی ہوتا ہے، ”إذا استأجر الرجل من آخر داراً بدين كان للمستأجر على الأجر يجوز“ (۱) ”ثم الأجور تستحق بأحد معان ثلاثة إما بشرط التعجيل أو بالتعجيل أو باستيفاء المعقود عليه فإذا وجد أحد هذه الأشياء الثلاثة فإنه يملكها كذا في شرح الطحاوی“ (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۳/۱۳۰۱ھ

الجواب صحیحہ محمود غفرلہ مفتی دارالعلوم دیوبند

شرکت عنان کے فساد کے وجوہات:

۱- شرکت عنان کن وجوہات کی وجہ سے فاسد ہو سکتی ہے یا کر سکتے ہیں اس کو مفصل تحریر فرمائیں۔

بعض شرکا کا ایک شریک کو نکال دینا:

۲- بعض شرکا دوسرے کم حصہ والے شرکا کو بلا وجہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر شرکت سے خارج کر دیتے ہیں تو کیا یہ

حرکت شرعاً جائز ہے؟

۳- شرکت عنان میں جملہ شرکا کو مساوی درجہ کا حق ہوتا ہے یا حصہ کے تفاوت کی وجہ سے حقوق میں بھی تفاوت ہو سکتا ہے، مثلاً عام طور پر ہوٹلوں وغیرہ کے کاروبار میں جو شرکا زیادہ حصہ والے ہوتے ہیں وہ کم حصہ والوں کو کسی شمار میں نہیں لاتے، یعنی ہیکل میں کسی قسم کا کام کرنا ہوٹو کر وغیرہ رکھنا ہو یا کسی بھی قسم کا رد و بدل کرنا ہو تو اپنے اختیار سے کر لیتے ہیں، کم حصہ والوں سے مشورہ لینے اور پوچھنے تک کے بھی روادار نہیں ہوتے اور ان کے اس برتاؤ پر کم حصہ والے رضا مند بھی نہیں ہوتے مگر حصہ کم ہونے کی وجہ سے مجبوراً کچھ دم نہیں مار سکتے کہ کہیں ہمارا حصہ ہی نہ نکال دیں تو اس طرح زیادہ حصہ والوں کا کم حصہ والوں کے ساتھ اس طرح رویہ اختیار کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟

۱- الفتاویٰ الہندیہ ۳/۲۱۵۔

۲- الفتاویٰ الہندیہ ۳/۲۱۲۔

مال شرکت میں شرکاء کی اجازت کے بغیر تصرف:

۴- شرکت میں جمع شدہ پیسوں کو دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر اپنے ذاتی مصرف میں لانا یا کسی دوسرے ذاتی کاروبار میں لگانا شرعاً کیسا ہے اگر نفع تقسیم کرنے کی مدت کے قبل اپنے حصہ کے مطابق اندازاً کچھ رقم اٹھالے تو کیا اس طرح کرنے میں گنجائش نکل سکتی ہے؟

مولوی عبدالرحیم کجراہی (مدرسہ جامعہ معینہ سیکولری ضلع مہمانہ کجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱ و ۲- شرکت عنان مندرجہ ذیل وجوہ سے فاسد و باطل ہوتی ہے:

(۱) احد اشریکین کی موت اگرچہ حکماً ہی ہو خواہ دوسرے شریک کو اس کا علم ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، (۲) شرکت کا انکار، (۳) احد اشریکین کا دوسرے سے یہ کہہ دینا کہ اب میں تیرے ساتھ شرکت میں کام نہیں کروں گا، (۴) احد اشریکین کا فسخ کر دینا بشرطیکہ دوسرے شریک کو فسخ کا علم ہو جائے خواہ مال نقد اور روپیوں کی شکل میں ہو یا سامان کی شکل میں ہو، (۵) احد اشریکین کا جنون مطبق، (۶) خریدنے سے قبل دونوں مالوں کا یا ایک مال کا ہلاک ہو جانا، (۷) کسی شریک کے لئے نفع میں سے متعین و معدود روپیوں کی شرط کرنا یہ آخری صورت فساد کی ہے اور بقیہ صورتیں بطلان کی ہیں ”وتبطل الشریکۃ ای شریکۃ العقد بموت أحدهما علم الآخر أولاً، لأنه عزل حکمی ولو حکماً بأن قضی بلحقه مرتداً و تبطل أيضاً بإنکارها وبقلوله: لا أعمل معک ففتح و بفسخ أحدهما ولو المال عروضاً بخلاف المضاربة هو المختار بآزیه خلافاً للزیلعی ویتوقف علی علم الآخر، لأنه عزل قصدی و بجنونه مطبقاً“ (۱)۔

”وظاهر أنه لا یحکم بالفسخ إلا بإطابق الجنون وهو مقدر بشهر أو بنصف حول علی

الخلافاً“ (۲)۔

”وتبطل الشریکۃ بهلاک المالین أو أحدهما قبل الشراء“ (۳)۔

۱- الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ج ۳، ۵، ۸، ۳۸۴۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار ج ۶، ۵۰۵۔

۳- الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ج ۳، ۷۳۔

”وتفسد باشتراط در اھم مسماة من الربح لأحدهما لقطع الشراكة كما مر“ (۱)۔
 اگر شرکاء دو سے زیادہ ہوں اور ایک کے حق میں شرکت فسخ یا باطل ہو جائے تو باقی شرکاء کے حق میں اس کا فسخ یا
 بطلان لازم نہیں آئے گا، بلکہ ان کے حق میں شرکت قائم رہے گی، ”ولو كان الشركاء ثلاثة فمات واحد منهم
 حتى انفسخت الشراكة في حقه لا تنفسخ في حق الباقيين كما في المحيط“ (۲)۔
 ”فلو كانوا ثلاثة فمات أحدهم حتى انفسخت في حقه لا تنفسخ في حق الباقيين بحر عن
 الظهيرية“ (۳)۔

شرکت عنان کو جو شریک جب چاہے فسخ کر سکتا ہے جائز ہے، لیکن اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کسی شریک
 کی حق تلفی اور ضرر کا قصد نہ ہو کیونکہ یہ معصیت ہے، اپنے مفاد کی خاطر دوسرے شریک کے نفع و نقصان کا خیال نہ کرتے
 ہوئے فسخ کرنا بہت ہی غلط ہے، کسی شریک کو شرکت سے خارج کر کے اس کو اپنے حصہ کی قیمت ہی لینے پر مجبور کرنا درست
 نہیں اور بڑی بے مروتی ہے۔

”وأحدهما يملك الفسخ وإن كان المال عروضا بخلاف المضاربة وهو المختار“ (۴)۔
 ”القاعدة الخامسة، الضرر بزال، أصلها قوله عليه الصلاة والسلام: ”لا ضرر ولا ضرار“ (۵)،
 ”وفسره في المغرب بأنه لا يضر الرجل أخاه ابتداءً ولا جزاءً آتياً“ (۶)۔

۴۔ شرکت عنان میں تخصص کے تفاوت کی وجہ سے حق تصرف میں تفاوت نہیں ہوتا، بلکہ ہر شریک کو مساوی درجہ کا
 حق تصرف حاصل ہوتا ہے، ہٹل میں جو بھی کام کرنا ہے، اس کا ہر شریک مجاز ہے، زیادہ حصہ والے شرکاء کا تمام تصرفات کا خود
 مالک بننا، اور کم حصہ والے شرکاء کو تصرف کا حق نہ دینا، اور مشورہ تک نہ لینا (جبکہ وہ اس پر راضی بھی نہیں ہوتے) ناجائز ہے،

- ۱۔ الدر المختار مع رد المحتار ۶/۳۸۹۔
- ۲۔ الفتاویٰ الہندیہ ۲/۳۳۵-۳۳۶۔
- ۳۔ رد المحتار ۳/۳۸۳۔
- ۴۔ البحر الرائق ۵/۱۹۹۔
- ۵۔ ”عن عبادة بن الصامت رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قضى أن لا ضرر ولا ضرار“ (سنن ابن ماجہ ۲/۷۸۳ حدیث
 نمبر ۲۳۳۰، وفي سنده الطحاوی اور حدیث نمبر ۲۳۳۱، عن ابن عباس رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ: ”لا ضرر ولا ضرار“
 وفي إسناده جابر الجعفي)۔
- ۶۔ الأشباه والنظائر طبع کراچی ص ۱۱۸، وطبعة دہلی ہند ۱۳۹۔

”ولکل من شریکی العنان والمفاوضة أن یبضع ویستأجر ویودع ویضارب ویوکل ویبدل فی المال أمانة“ (۱)، ”ودلیل عدم الجواز ما مر عن الأشباه من القاعدة والحلیث الشریف“۔

۴۔ شرکت میں جمع شدہ پیسوں کو دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر اپنے ذاتی مصرف میں لانا یا کسی دوسرے ذاتی کاروبار میں لگانا شرعاً درست نہیں۔ جب تک خرید و فروخت جاری ہے اس وقت تک نفع میں سے اپنے حصہ کے مطابق اندازاً کچھ رقم اٹھا لینا درست نہیں، لیکن جب خرید و فروخت دنوں موقوف ہو چکی ہوں یا صرف خرید موقوف ہوا ہو اور اب صرف تقسیم کا مسئلہ رہ گیا ہو یا بقیہ مال بیچ کر تقسیم ہی کرنا ہو اور نفع کا مال نقد کی شکل میں ہو یا ایسی چیز ہو کہ تقسیم نہ کرنے سے خراب ہو جائے گی جیسے کھانا یا بعض مکمل اور موزون چیزیں اور ضرورت بھی متحقق ہو تو گنجائش ہے، لما مر عن الکنز من قوله: ”ویدہ فی المال أمانة“ ولما مر عن الأشباه من القاعدة والحلیث الشریف ولما فی الہندیۃ من قوله فی الفتاویٰ: طعام أو ذراهم بین اثنين غاب أحدهما واحتاج الآخر الحاضر وأخذ منه نصیبہ قال محمد رحمہ اللہ تعالیٰ: أرجو أن لا بأس به قال الفقیہ ابو اللیث وبہ نأخذ کذا فی الغیاثیۃ“ (۲)۔

”وفی المکیل والموزون له أن یعزل حصته بغیبة شریکہ ولا شیء علیہ إن سلم الباقی وإن ہلک کان علیہما کذا فی النہر الفائق“ (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۳/۱۳۰۱ھ

الجواب صحیحہ محمود غفرلہ مفتی دارالعلوم دیوبند

ایک شریک کو اس کی محنت کے صلہ میں طے شدہ حصہ سے زیادہ دینا:

سوال نمبر (۱) سلیمان نے ایک ہوٹل کا ۷ لاکھ میں سودا کیا، ۵۰ ہزار بیعہ کے طور پر اپنے پاس سے دینے اور بقیہ رقم ۲ ماہ کے بعد ادا کر نیا وعدہ کیا، سلیمان سے کچھ احباب نے کہہ رکھا تھا کہ کہیں دکان ہوٹل وغیرہ خریدو تو ہمارا حصہ رکھنا، ہمارے پاس کچھ رقم موجود ہے، سلیمان نے ان لوگوں سے ایک پیسہ حصہ پر ۱۲ ہزار وصول کئے، ۶۰ پیسوں کا حصہ ۷ لاکھ ۲۰ ہزار میں فروخت کیا، اس میں لینے دینے والوں کی یہ نیت تھی کہ دکان میں جو نفع ہوگا وہ پہلے ۶۰ پیسے والوں میں تقسیم ہوگا اور

۱۔ کنز الدقائق مع شرح البحر الرائق ۵/۲۹۶-۲۹۷۔

۲۔ الفتاویٰ الہندیہ ۲/۳۴۲۔

۳۔ حوالہ بالا ۲/۳۴۲۔

جب ۶۰ پیسے والے کو ان کی رقم جو ایک پیسے پر ۱۲ ہزار دینے تھے وصول ہو جائیں گے تو سلیمان نفع کو ۱۰ پیسوں پر تقسیم کرے گا، اس میں سے ۴۰ پیسے سلیمان کو اور بقیہ دوسرے ۶۰ پیسے والوں کے ہوں گے، سلیمان کے دکان کا قبضہ لینے سے پہلے ایک ساتھی ابراہیم کو اپنے چالیس پیسے حصہ میں ۲۵ پیسے حصہ دکان ذمہ داری پر چلانے کے بدلے دینا طے کیا اور یہ طے کیا کہ اصل رقم جو ۶۰ پیسے والوں کے پاس سے وصول کی ہے وہ نفع میں سے وصول ہو جانے کے بعد تمہیں ۲۵ پیسے نفع ملنا شروع ہو جائے گا تو اب شریعت مطہرہ کے اعتبار سے یہ معاملہ صحیح ہو یا نہیں اگر صحیح نہیں ہے تو جواز کی کیا شکل ہے؟۔

(۲) ایک ہوٹل میں ۳-۴ حصہ دار ہیں جس میں ایک آدمی دکان میں محنت کرتا ہے، دوسرے محنت نہیں کرتے، جو شخص محنت کرتا ہے وہ چونکہ حصہ دار ہے اس لئے تنخواہ نہیں لے سکتا، اگر دوسرے حصہ داروں نے ملکر یہ کہا ہے کہ آپ محنت کرتے رہنے ہم سب ملکر آپ کو ہر سال ۱۲ ہزار ہمارے حساب میں سے ہدیہ بخش دیں گے تو کیا اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر محنت کرنے والے کا دکان میں کچھ حصہ بڑھا دیا تو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کبھی وہ شخص محنت کرنا چھوڑ دے یا بیمار ہو گیا یا غیر حاضر رہنے لگا تو جو حصہ بڑھا دیا وہ کیسے کم کر سکتے ہیں، آیا وقتی طور پر جب تک وہ شخص محنت کرتا رہے گا اس کو اتنا حصہ نفع میں زیادہ ملے گا اور محنت چھوڑ دے گا یا انتقال ہو گیا تو وہ حصہ نہیں ملے گا، اس طرح شرط رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟۔

شریک کا مال مشترک سے چندہ دینا و دیگر تصرفات کا حکم:

(۳) بمبئی میں ہوٹل کے کاروبار میں ۵-۶ اور زیادہ شریک ہوتے ہیں، ایک ایک حصہ دار ہوتا ہے اور ۲-۴ آنوں کا حصہ دار بھی اس میں ہوتا ہے، لیکن ایک آدمی ذمہ دار ہوتا ہے جس کے پاس حساب رہتا ہے اور وہ تمام حصہ داروں کو انکا نفع وقت پر تقسیم کرتا ہے، دکان میں کوئی مرمت کا کام آتا ہے یا سرکاری دفتروں کی لائن کے کام بھی وہی کرتا ہے، ماہ رمضان میں مسجد مدرسوں کے چندہ کرنے والے ہندوستان کی مختلف جگہوں سے آتے ہیں ان کو بھی دکان میں سے دیتا ہے، یہ چیزیں پہلے سے چلی آرہی ہیں، اس میں کسی حصہ دار کا کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن ذمہ دار شخص کبھی بھی ایک ایک پیسے اور کم زیادہ کے حصہ داروں کو جمع کر کے نہیں پوچھتا کہ اس طرح کے کام مجھے کرنے ہوتے ہیں، آپ سب ملکر مجھے اجازت دے دیں اس لئے کہ عام طور پر سب حصہ داروں کو یہ ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ اس طرح ذمہ دار شخص تصرف کرتا رہے گا جس پر کوئی مخالفت نہیں کرتا، آیا اس قسم کا کام صریح اجازت کے بغیر اور چندہ وغیرہ دکان میں سے دینا جائز ہے یا نہیں اور اس کے جواز کی کیا صورت ہے؟۔

شریک کے انتقال کے بعد اس کے حصہ کا مالک کون ہوگا؟

(۴) اگر ایک ہوٹل کے ۵، ۷ حصہ دار میں سے ایک کی وفات ہوگئی، مرحوم کے وارث موجود بھی ہیں، اب یہ وارث اس دکان میں مرحوم کے حصے کے پورے پورے نفع اور ملک میں حصہ دار ہوں گے یا نہیں؟ مرحوم کے انتقال کے بعد حصہ داروں نے اور ورثہ نے کوئی خلاصہ نہیں کیا اور ایک سال گزر گیا، تو جو نفع مرحوم کے حصہ کا ہوگا اس کے حق دار کون ہوں گے، وارث اس حصہ کو باقی رکھنا چاہتا ہے تو شرعاً کیا حکم ہے اور دوسرے شرکاء اس کو باقی نہیں رکھنا چاہتے تو اس کا کیا حکم ہے واضح فرمادیں۔

غیر شریک کا شرکاء کے لئے تنخواہ پر کام کرنا:

(۵) ایک ہوٹل کو اس کے مالکان یا کرائے دار کئی سال سے چلاتے ہیں، اب وہ ضعیف اور کمزور ہو گئے، یا کسی وجہ سے چلانے کو تیار نہیں ہے، تو یہ سب ملکر کسی ایک باہر کے شخص کو جو حصہ دار نہیں ہے، ۱۵ پیسے نفع میں حصہ دیکر رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ یعنی وہ آدمی اپنی ذمہ داری سے دکان سنبھالے گا اور جو نفع ہوگا اس میں ۱۵ فی صد وصول کر لے گا باقی مالکوں کو دے دے گا تو اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نفع کیساتھ روزانہ ۱۵ روپیہ تنخواہ بھی لیتا ہے یہ جائز ہے یا نہیں؟ ہوٹل کی ذمہ داری ایسے شریک کو دینا جو نفع زیادہ دے:

(۶) ایک ہوٹل کے پانچ سات حصے دار ہیں ہر ایک حصہ دار یہ چاہتا ہے کہ دکان کو میں سنبھالوں اور چلاؤں سب ملکر نہیں چلاتے، ایک شخص جو ذمہ دار ہوتا ہے وہی چلاتا ہے، جب آپس میں معاملہ طے نہیں ہوتا تو یہ شرکاء یہ شرط رکھتے ہیں کہ جو نفع زیادہ دینے کو تیار ہو اس کو دینا چاہئے، اب آپس میں بیٹھ کر طے کرتے ہیں اور جو زیادہ رقم دینے کو تیار ہوتا ہے، اس کو دکان ایک متعین وقت کے لئے سپرد کرتے ہیں، آیا اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں، اگر جائز نہیں ہے تو اس ہوٹل میں جو چیزیں موجود ہیں، مثلاً کرسی، میز، بنگھے جو چھت میں لٹک رہے ہیں اور لماری جو دیوار میں لگی ہے وغیرہ چیزوں کا جو زیادہ کرایہ دے اس کو ہوٹل چلانے کے لئے دیدیتے ہیں تو کیا صحیح ہے یا نہیں؟ مال اور عمل کے بغیر نفع میں شرکت:

(۷) زید کے پاس دکان خریدنے کے لئے اتنی رقم تو نہیں ہے مگر اپنی وجاہت سے ادھار خریدتا ہے، پھر خریدنے کے بعد شرکاء تلاش کرتا ہے، اس میں سے دس فی صد پیسے اپنے لئے رکھتا ہے کہ تم لوگوں کو دکان خرید کر تو میں نے دی ہے، لہذا بغیر اس المال کے دس پیسہ حصہ تم لوگ مجھے دیتے رہو اور تمام شرکاء اس کو خوشی سے قبول کر لیتے ہیں، تو اس طرح

سے معاملہ کرنا شرعاً کیسا ہے، اسی طرح اگر شرط اجارہ کی دکان میں کی جائے تو شرعاً کیا حکم ہے؟
کھیت کو پیداوار کے ایک تہائی حصہ کی شرط پر سیراب کرنا:

(۸) میرا ایک ذاتی کنواں ہے اس میں کافی پانی ہے، دوسرے لوگ مجھ سے اپنے کھیت کو سیراب کرنے کے لئے پانی طلب کرتے ہیں تو میں پانی اس شرط پر دیتا ہوں کہ تمہارے کھیت میں جو اس پانی سے پیداوار ہوگی اس میں سے تیسرا حصہ مجھے پانی کے عوض میں دینا اور کھیت والا اسے خوشی سے منظور کر لیتا ہے تو شرعاً یہ معاملہ کرنا کیسا ہے؟
اور اگر ایک گھنٹہ کے دس روپے کے حساب سے پانی دیا جاتا ہے تو اس سے کنویں والے کا نقصان ہوتا ہے بلکہ کھیت والے بھی اس پر خوش نہیں ہوتے اور اگر پانی نہ دیوے تو دوسرے لوگوں کے پاس چونکہ کنواں نہیں ہے یا اس میں پانی نہیں ہے، اس لئے پریشان ہوتے ہیں اور ان کے کھیت بے کار پڑے رہتے ہیں تو کیا ایسی مجبوری کی صورت میں شرعاً اوپر والا معاملہ کرنا درست ہے؟

مضاربیت کے بعد ارباب مال، مضاربین اور اس المال میں اضافہ کا حکم:

(۹) عقد مضاربیت تام ہو جانے کے بعد ارباب مال میں نیز مضاربین میں اضافہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

(۱۰) نیز عقد مضاربیت تام ہو جانے کے بعد رأس المال میں اضافہ کرنا کیسا ہے بحوالہ کتاب جواب عنایت

فرمائیں۔

محمد سلیمان بھاکپوری

الجواب وبالله التوفیق:

۱۔ اس سوال کے جواب سے پہلے چند باتوں کا معلوم ہونا ضروری ہے:

(۱) سلیمان نے ہوٹل پر قبضہ کرنے کے بعد اس کے ساتھ پیسے حصہ لکھن وخت کیا ہے یا قبضہ سے پہلے؟

(۲) ابراہیم سے دکان چلانے کا معاملہ کب ہوا ہے اور یہ معاملہ سب شرکاء کے مشورہ اور رضامندی سے ہوا ہے یا

صرف سلیمان کے ساتھ ہوا ہے۔

(۳) ابراہیم بھی ہوٹل کے شرکاء مالکین میں سے ہے یا نہیں؟

۲۔ یہ بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) روپے سالانہ دینے کے لئے کہنا اگر شرط کے درجہ میں ہو، یعنی اگر نہ پاوے تو مطالبہ

کر سکے تو جائز نہیں، خواہ تنخواہ کے نام سے دینے جائیں یا بدیہ یا بخشش کے نام سے (۱) اور اگر محض وعدہ کے درجہ میں ہے اور محض تبرع ہے تو بدیہ اور بخشش کے نام سے دینا جائز ہے اور اگر بغیر شرط اور وعدہ کے دیا جاتا رہے تو اور اچھا ہے، سول کے اثر میں جو شرط ذکر کی گئی ہے وہ درست نہیں۔

اچھی صورت یہ ہے کہ محنت کرنے والے کا کچھ حصہ بڑھا دیا جائے اور ہر سال جدید معاملہ کیا جائے اور کام کرنے والے شریک کا کام دیکھ کر حصہ میں کمی و بیشی کر دی جائے (۲)۔

۳- ذمہ دار شریک جس کے پاس حساب رہتا ہے اور شرکاء کے درمیان نفع تقسیم کرتا ہے، اس کے لئے دکان کی مرمت کرنا اور کروانا اور سرکاری دفاتر سے متعلق کام کرنا اور کروانا درست ہے، ان چیزوں کے لئے صریح اجازت کی ضرورت نہیں، رہ گیا چندہ وغیرہ سو قیاس تو یہ ہے کہ اس مشترکہ ہوٹل میں سے دینا بغیر اذن صریح کے درست نہ ہو، مگر چونکہ تعارف ہے اور تعارف اذن صریح کے قائم مقام ہوا کرتا ہے، اس لئے اتحساناً درست ہے، ”ولکل من شریکی العنان والمفاوضة أن يستأجر ویضع“ الخ (۳)۔

”وکل ما کان لأحد أن یعمله إذا نہاہ شریکہ عنه لم یکن له عملہ“ (۴)۔

”ولا یجوز لهما فی عنان ومفاوضة تزویج العبد..... ولا الأمانة ای لثوب ونحوہ ولا القرض إلا باذن شریکہ إذا صریحاً (سراج) وفيہ إذا قال له: إعمل برأیک فله کل التجارة إلا القرض والهبة وكذا کل ما کان إتلافاً للمال أو تمليکاً للمال بغير عوض، لأن الشركة وُضعت للاسترباح وتوابعه وما لیس كذلك لا ینتظمه عقدها“ (۵)۔

”قال فی البحر: ولو قال کل منهما للآخر: إعمل برأیک فلكل منهما أن یعمل ما یقع فی التجارة كالرهن والإرتهان والسفر والخلط بما له والشركة بالغير لا الهبة والقرض وما کان إتلافاً

۱- ”وشروطها (الشركة) وعدم ما یقطعها كشرط دراہم مسماة من الربح لأحدهما لأنه لا بد لا یربح غیر المسمى، وحكمها الشركة فی الربح“ (الدر المختار مع رد المحتار ۶/۳۷۵)۔

۱- ”ومع النفاصل فی المال دون الربح وعكسه“ (الدر المختار)، ”لكن هذا مقيد بأن یشترط الأكثر للمعامل منهما أو لأكثرهما عملاً“ (رد المحتار علی الدر المختار ۶/۳۸۳ مکتبہ ذکریا دیوبند)۔

۳- تنویر الابصار مع الدر المختار ۳/۳۳۳۔

۴- فتاویٰ مالگیریہ ۳/۳۳۳، ونظام العبارة: فإن عملہ ضمن لصیب شریکہ۔

۵- الدر المختار علی ہاشم الخطاوی ۲/۵۲۰۔

للمال أو تملكها من غير عوض فإنه لا يجوز ما لم يصرح به نصاً“ (۱)۔

”قوله: وكذا كل ما كان إطلافاً للمال ولو في وجوه الخير كوقف وبناء مسجد“ (۲)۔

”ومنها لو باع التاجر في السوق شيئاً بشئ ولم يصرحاً بحلول ولا تأجيل وكان المتعارف فيما بينهم أن البائع يأخذ كل جمعة قدراً معلوماً إنصرف إليه بلا بيان، قالوا لأن المعروف كالمشروط“ (۳)۔

۴۔ شرکاء میں سے کسی شریک کے انتقال کر جانے سے اس کے حق میں شرکت فسخ ہو جاتی ہے اور دوسروں کے حق میں فسخ و باطل نہیں ہوتی ہے وہ اگر اس کو باقی رکھنا چاہیں تو بلا تکلف باقی رکھ سکتے ہیں، پس اس شریک کے وفات پا جانے کی وجہ سے شرکت فسخ ہو گئی، مرحوم کی وفات کے وقت جس قدر ان کا حصہ تھا صرف اسی مقدار کے ورثہ حقدار ہیں، جب ورثہ نے دوسرے شرکاء کیساتھ از سر نو مستقل عقد شرکت نہیں کیا ہے، تو مرحوم کے انتقال کے وقت سے اب تک جو ان کے چھوڑے ہوئے حصہ پر نفع ہوا ہے، اس کے حقدار ورثہ نہ ہوں گے، لیکن اس کو لیکر صدقہ کر دینا ضروری ہوگا ان کے لئے (یعنی شرکاء کے لئے) مرحوم کے حصہ کا نفع حائل نہیں رہے گا، ”وتبطل الشركة بموت أحدهما وبجنونه مطبقاً فالربح بعد ذلك للعامل لكنه يتصدق بربح مال المجنون“ (۴) (قوله لكنه يتصدق الخ) ”والظاهر أنه يقال مثل ذلك فيما إذا تصرف أحدهما بالمال في صور بطلان الشركة المارة فإن الربح يكون للعامل ويتصدق بما ربح من مال الآخر“ (۵)۔

”قوله وبجنونه“ قال في البحر: سئل أبو بكر عن شريكين جن أحدهما وعمل الآخر بالمال حتى ربح أو وضع قال: الشركة بينهما قائمة إلى أن يتم إطباق الجنون فإذا مضى ذلك الوقت عليه قال: تنفسخ الشركة بينهما فإذا عمل بالمال بعد ذلك فالربح كله للعامل والوضعية عليه وهو كالغصب لمال المجنون فيطيب له ربح ماله ولا يطيب ما ربح من مال المجنون فيتصدق (۶)۔

۱۔ جامعہ الفقہاء علی الدر مطبوعہ کوئٹہ ۲/ ۵۲۰، البحر الرائق ۵/ ۲۹۹۔

۲۔ جامعہ الفقہاء علی الدر مطبوعہ المکتبۃ العربیہ کوئٹہ ۲/ ۵۲۰، نیز الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۳۹۳، وقہ: وكذا كل ما كان إطلافاً للمال أو كان تملكها من غير عوض لأن الشركة وضعت للإسراج وتوابعه وما ليس كذلك لا ينظمه عقدها۔

۳۔ الأشباه والنظائر طبعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۲۸، وطبعہ دیوبند ۱۵۲۔

۴۔ الدر المختار ۳/ ۸۵-۸۳۔

۵۔ رد المحتار ۳/ ۸۵۔

۶۔ جامعہ الفقہاء علی الدر المختار ۲/ ۵۲۳۔

رہ گئی یہ بات کہ ورثہ شرکت کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور دوسرے شرکاء ورثہ کے ساتھ شرکت کو باقی رکھنا نہیں چاہتے، سو اس کا حکم یہ ہے کہ شرکت تو مرحوم کے وفات کے وقت فسخ و باطل اور معدوم ہو چکی ہے، اس باطل اور معدوم کو کس طرح باقی رکھیں گے، ہاں اگر ورثہ از سر نو دوسرے شرکاء کی رضا مندی سے شرکت کا معاملہ کریں اور صحت شرکت کی جملہ شرائط پائی جائیں تو وہ اور بات ہے ورثہ کو اس بات کا حق نہیں کہ شرکاء کے ساتھ بغیر انکی رضا مندی کے شریک ہو جائیں اور نہ ہی دوسرے شرکاء پر انکو شریک کرنا لازم ہے: ”لأن كل واحد مختار في المعاملات مع الآخرين“، البتہ مرحوم کا حصہ جو انکے انتقال کے وقت تھا، ورثہ ان کے حقدار ہیں وہ ان کو مل جائے گا، البتہ شرکاء کے لئے بہتر ہے کہ مرحوم کے ورثہ کو اگر کوئی مانع نہ ہو تو شریک کر لیں۔

۵۔ وہ شرکاء اس غیر شریک سے جو معاملہ کرنا چاہتے ہیں وہ مضارب بت ہے، پس اگر صحت مضارب بت کی ساری شرطیں پائی جائیں تو درست ہے ورنہ نہیں، مضارب بت کی ایک شرط یہ ہے کہ رأس المال اثمان میں سے ہو، اگر عرض میں سے ہے تو حیلہ کر لیا جائے، یعنی ارباب مال مضارب سے یوں کہیں کہ یہ سامان بیچ کر اس کے ثمن سے مضارب بت کرو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ نفع میں سے مضارب اور رب المال کے لئے جز و شائع ہی ہو، متعین مقدار نفع کی کسی کے لئے طے نہ کی جائے، پس اگر رأس المال اثمان میں سے ہے، یا عرض میں سے ہے، لیکن حیلہ کر لیا گیا ہے اور نفع میں سے ارباب مال کی طرح مضارب کا بھی جز و شائع ہی ہو، مثلاً ۱۵ پیسے یا ۳۰ پیسے وغیرہ تو درست ہے۔

اس مضارب بت کی بنیاد پر نفع میں ۱۵ روپے روزانہ مضارب کے لئے طے کرنا درست نہیں، اس سے مضارب بت فاسد ہو جائے گی، البتہ مضارب کو ۱۵ پیسے حصے کے بجائے تیس پیسے یا چالیس پیسے حصے وغیرہ متعین کر سکتے ہیں، اگر اس کو نفع کی تقسیم سے پہلے ہی بیسوں کی ضرورت ہو تو ارباب مال کی اجازت سے اپنے حصے میں سے کچھ لینا رہے، پھر نفع کی تقسیم کے وقت اس کے حصے میں سے اتنا کم کر دیا جائے گا اور اس صورت میں نقصان مضارب پر نہیں ہوگا بلکہ ارباب مال پر بعد وضع نفع ہوگا ”وشرطها أمور سبعة: كون رأس المال من الأثمان..... و كون الربح شائعاً فلو عين قادراً فسدت“ (۱)۔

”(قولہ اشترونی عبداً) هذا يفهم أنه لو دفع عرضاً وقال له: بعه واعمل بضمنه مضاربة أنه يجوز بالأولى، وقد أوضحه الشارح وهذه حيلة لجواز المضاربة في العروض“ (۲)، ”وهكذا في البدائع عن

۱۔ الدر المختار علی ہاشم رد المختار ۸۵۴-۸۴۳

۲۔ رد المختار ۸۴۳ نقلاً عن الطحاوی۔

کتاب المضاربة مفصلاً ومبسطاً (۱)۔

اس معاملہ کو اجارہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن اس صورت میں نفع میں سے پندرہ پیسے حصہ اجرت کے لئے طے کرنا درست نہ ہوگا، بلکہ اجرت کا متعین اور معلوم کرنا ضروری ہے، اسی طرح مدت عمل کا بیان کرنا بھی ضروری ہے، مثلاً یہ کہ پچیس روپے اور یا مثلاً ۵۰۰ سو روپے مہینے میں اس کو اجرت پر رکھا جائے اور اس سے بیچ و شراء کا کام لیا جائے، ”من دفع إلى حائك غزلاً لينسجه بالنصف فله أجر مثله وكذا إذا استاجر حماماً يحمل عليه طعاماً بقفيز منه فالإجارة فاسدة، لأنه جعل الاجر بعض ما يخرج من عمله فيصير في معنى قفيز الطحان، وقد نهى عليه السلام عنه والمعنى فيه أن المستاجر عاجز عن تسليم الأجر وهو بعض المنسوج أو المحمول وحصوله بفعل الأجير فلا يعد هو قادراً بقدره غيره“ (۲)۔

”ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة..... والمنافع تارة تكون معلومة

بالمدة“ الخ (۳)۔

”(فرع) استوجر على أن يبيع ويشتري لم يجز لعدم قدرته عليه، والحيلة أن يستأجره مدة

للخدمة ويستعمله في البيع زيلعى“ (۴)۔

مذکورہ صورت میں مضاربہ بھی ہے اور اجارہ بھی ہے جو تھل صفتیں ہیں، یہ وجہ بھی اس معاملہ کے درست ہونے کی ہے، پس یا تو اجارہ ہی رکھا جائے یا مضاربہ ہی۔

۶۔ سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شریک کو دوسرے شرکاء جو ہوکل چلانے کے لئے دے رہے ہیں، وہ اپنے حصوں کو کرایہ پر دے رہے ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو حکم یہ ہے کہ اگر وہ ہوکل مع اپنے الماریوں فرنیچر وغیرہ کے ان شرکاء کی ملکیت میں ہے تو دونوں صورتیں اپنی شرط (جس کا ذکر آگے آئے گا) کے ساتھ درست ہیں اور اگر وہ ہوکل کرایہ کا ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر انہوں نے ہوکل میں کچھ اصلاح کی ہے یا الماریاں وغیرہ خود لگوائی ہیں اور اب شریک کے ساتھ زیادتی اجرت کے ساتھ معاملہ کر رہے ہیں تو درست ہے اور اجرت زائدہ حلال و طیب ہے اجرت زائدہ کا الماریوں وغیرہ

۱۔ دیکھئے: بواکع الصنائع ۵/ ۱۱۳۔

۲۔ ہدایہ مع النسخ کتاب الإجارة ۸/ ۱۸۸۔

۳۔ ہدایہ ۳/ ۲۷۰۔

۴۔ الدر المختار ۳/ ۶۰۔

کے مقابلہ میں مقرر کرنا ضروری نہیں البتہ ایسا کر لینا بہتر ضرور ہے اور اگر نہ کچھ اصلاح کی ہے اور نہ ہی الماریاں وغیرہ خود لگوائی ہیں تو اجرت زائدہ دوسرے شرکاء کے لئے حلال نہیں ہوگی، اس کا صدقہ کر دینا واجب ہوگا، اس معاملہ کی جو صورتیں درست ہیں، ان میں بھی شرط یہ ہے کہ اجرت نفع میں سے متعین نہ کی جائے بلکہ مطلقاً روپے متعین کر لئے جائیں، اگر یہ شرط نہ پائی گئی تو اجارہ فاسد ہو جائے گا کما فی الہندیہ قولہ: ”وَأَجْمَعُوا أَنَّهُ لَوْ آجَرَ مِنْ شَرِيكَهٖ يَجُوزُ سِوَاءَ كَانَ مَشَاعاً يَحْتَمِلُ الْقِسْمَةَ أَوْ لَا يَحْتَمِلُ وَسِوَاءَ آجَرَ كُلَّ نَصِيبِهِ أَوْ بَعْضَهُ كَلَّمَا فِي الْخِلَاصَةِ“ (۱) ولما مرفی الجواب: عن السؤال الرابع من الدر المختار ورد المختار وأصول الكرخي، ولما في الدر المختار من قوله: ”ولو دفع غزلاً لآخر لينسجه له بنصفه أي بنصف الغزل أو استأجر بغلاً ليحمل طعامه ببعضه أو ثوراً ليطحن بُره ببعض دقيقه فسدت في الكل، لأنه استأجر بجزء من عمله والأصل في ذلك نهيه ﷺ عن قفيز الطحان وقدمناه في بيع الوفاء والحيلة أن يفرض الأجر أولاً أو يسمى قفيزاً بلا تعيين ثم يعطيه قفيزاً منه فيجوز“ (۲)۔

اور اگر سوال کا مقصد کچھ اور ہو تو واضح کیا جائے تاکہ حکم معلوم کیا جاسکے۔

۷۔ نفع میں شرکت کے لئے ضروری ہے کہ تین چیزوں میں سے ایک چیز پائی جائے: مال ہو یا عمل ہو، تقبل و ضمان ہو اور زید کا ان تینوں چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں ہے، لہذا یہ شرکت فی النفع درست نہ ہوگی اور زید کسی مقدار نفع کا مستحق نہ ہوگا اور نہ زید دکتی ان سے لے سکتا ہے، ”وفي الدر: لا يستحق الربح إلا بإحدى ثلاث: بمال أو عمل أو تقبل“ (۳)۔

”وقال في الدر: ولما لو قال لغيره: تصرف في مالک علی أن لی بعض ربحه لا يستحق شيئاً لعدم هذه المعاني“ (۴)۔

البتہ زید نے شرکاء پر شرائع یا اجارہ دکان کا انتظام کر کے تبرع اور احسان کیا ہے، اگر اس کے عوض میں بطیب خاطر اتنا حصہ یا جس قدر چاہیں اور جب تک چاہیں دیا کریں تو کوئی مضائقہ نہیں، یہ حکم مندرجہ ذیل عبارت سے مستفاد ہوتا ہے:

۱۔ الفتاوی الہندیہ ۳۸۸۔

۲۔ الدر المختار ۳۶۵ نمبر ۵۔

۳۔ الدر المختار ۳۳۹۔

۴۔ رد المختار ۳۳۹۔

”ولو عمل من غیر شرط و أعطاه شیئاً لا بأس به لأنه عمل معه حسنة فجازاه خيراً“ (۱)، دونوں صورتوں کا یہی حکم ہے۔

۸۔ کنویں کا مالک اس کے پانی کا مالک نہیں ہوتا کہ اس کی بیج صحیح ہو، ہاں اگر اس کو کسی آلے سے نکال لے تو مالک ہو جائے گا، پس اگر اپنی مشین یا رہٹ وغیرہ سے نکال دیتا ہے اور اجرت بھی مطلقاً متعین کرتا ہے نہ کہ پیداوار کا جزو شائع مثلاً دس روپیہ گھنٹہ یا پچاس روپیہ بیگھا متعین کرتا ہے تو درست ہے ورنہ درست نہیں، پس یہ معاملہ مذکورہ درست نہیں، ہے سوال میں جو مجبوری ذکر کی گئی ہے وہ کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے جس سے جواز کا حکم نکال لیا جائے، ”وقال الرملة: صاحب البئر لا يملك الماء“ (۲)۔

”ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة“ (۳) ”فیصیر بمعنی قفیز الطحان وقد نهی علیہ السلام عنه، والمعنی فیہ أن المستاجر عاجز عن تسلیم الأجر“ (۴)۔

جواب نمبر ۱۰ و ۱۱۔ الدر المختار و رد المختار کے کتاب المضاربة و الفتاویٰ الہندیہ ۲/۵۴۲ اور قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ ارباب مال اور مضاربین کے مشورہ سے یہ اضافے ہو سکتے ہیں (۵)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمار پورہ ۲۱/۵/۱۳۰۱ھ

شرکاء میں سے کسی شریک کا مال شرکت میں سے کچھ اپنے مصرف میں لانا:

۱۔ ایک کمپنی جو کہ بہت سے افراد کے حصص سے بنی ہے کی رقم میں سے جانے انجانے کچھ رقم ذمہ داران کے ذاتی مصرف میں بھی آجاتی ہے جس کا حساب میں آنا ممکن نہیں ہوتا (ذمہ داران کچھ رقم بنا حساب بھی خرچ کرتے ہیں) کیا یہ کوئی

۱۔ رد المختار ۳/۳۸۔

۲۔ رد المختار علی الدر المختار ۷/۲۵۸ نیز علامہ شامی آگے لکھتے ہیں: ”وهذا ما دام في البئر، أما إذا أخرجه منها بالإحبال كما في السواني فلا شك في ملكه له لحيازة له في الكيزان ثم صبه في البرك بعد حيازه“ (۷/۲۵۸ مکتبہ زکریا)۔

۳۔ ہدایہ ۳/۲۹۳ کتاب الاجارات یا سرمدیم لہذا کمپنی دیوبند۔

۴۔ ہدایہ ۳/۲۷۷۔

۵۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المختار ۸/۳۳۵..... ”ولا يملك المضاربة والشركة والخلط بمال نفسه إلا بإذن أو بعمل برأيه“۔

گناہ تو نہیں؟

۲- مزید جو حصص حصہ داران لیتے ہیں ان پر کچھ فائدہ ایسا بھی ہوتا ہے جو کہ حسابات سے پرے ہوتا ہے اور ان کے اندراجات نہیں ہوتے ان کے سلسلہ میں کیا حکم ہے؟ (یہ بات ظاہر ہے کہ جو بھی حصص حصہ داران خریدتے ہیں وہ ان کے بدلے صرف اندراجی حسابات کے فائدہ میں حصہ دار ہوتے ہیں اور حصص خریدتے وقت یہ ان کے علم میں ہوتا ہے کہ وہ صرف اندراجی فائدہ میں حصہ دار ہوں گے)۔

الجواب وبالله التوفیق:

۱- جو رقم انجانے میں اپنے ذاتی مصرف میں خرچ ہو جاتی ہو اس پر تو عند اللہ مواخذہ نہیں، البتہ اس کے بارے میں کوشش یہ رہنا چاہئے کہ اس طرح بھی کوئی رقم اپنے اوپر خرچ نہ ہو، نیز اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اے اللہ اس کے وبال سے ہمیں بچائیے اور اس طرح بھی کوئی رقم خرچ نہ ہو تو پھر معاملہ آخرت کا بالکل صاف رہے گا (۱) اور جو رقم جانتے بوجھتے اپنے ذاتی مصرف میں خرچ ہو جاتی ہو اس کا حکم یہ ہے کہ ایک انداز کر کے جتنی رقم جس کے حصے کی خرچ ہو جاتی ہو اور وہ اندراج میں نہ آسکتی ہو اندراج میں لانے میں کوئی قانونی گرفت یا اور کوئی پریشانی آسکتی ہو تو اندراج میں لائے بغیر اتنی رقم خواہ یہ تھفہ ہی کے نام پر ہو اصل مالک کی ملک میں پہنچا دینا آخرت کے حساب سے برأت کے لئے کافی ہوگی۔ اور ایسا کر لینے سے حقوق العباد کے تلف کا انشاء اللہ کوئی گزند نہ ہوگا (۲)۔

۲- جو فائدہ حسابات سے پرے ہو کسی مصلحت یا مجبوری سے اندراج میں نہ آتا ہو تو اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ اندازہ کر کے جس حصہ دار کی جتنی رقم اس فائدہ کی رقم میں آتی ہو اتنی رقم تھفہ بدیہ کے نام پر ان کی ملک میں پہنچا دے، پھر اگر ذمہ داران کو یہ معلوم ہو کہ ہم کو صرف اندراجی حساب کا فائدہ ملے گا زائد نہیں ملے گا اور اس علم کے باوجود حصہ خریدتے ہوں تو یہ سکوت اذن حالی کے درجہ کی چیز ہوگی اور اس صورت میں حسابات سے پرے والی رقم حسب طریق بالا ان تک پہنچانا

۱- حدثنا عبد الله بن السائب بن يزيد عن أبيه عن جده قال قال رسول الله ﷺ: "لا يأخذ أحدكم عصا أخيه لأعياً أو جاداً فمن أخذ عصا أخيه فليردّها إليه" (سنن الترمذی ۳۶۲۳ کتاب الفتن باب ما جاء لا يحل لمسلم أن يروى مسلماً عنه: ۲۱۶۰)۔

۲- ويجب رد عين المصوب ما لم يغير تغيراً فاحشاً، مجسبي، في مكان غصبه لنفاوت القيم باختلاف الأماكن، ويروى بردها ولو بغير علم المالك (الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۲۶۶)۔

تقویٰ ہوگا ورنہ از روئے فتویٰ کسی حیلہ سے اس کی ملک میں پہنچانا واجب رہے گا۔ ورنہ عند اللہ مواخذہ ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کمیشن کی شرط پر کمپنی میں شرکت:

ایک کمپنی جو کہ مثال کے طور پر ۵۰۰ افراد کے اشتراک سے بنتی ہے اور ہر فرد کچھ مخصوص رقم لگاتا ہے، اس مخصوص رقم پر یہ طے پایا جاتا ہے کہ اگر:

۱۔ تجارت ۱۰ لاکھ روپیہ تک ہوئی تو ۱۰% کمیشن ملے گا۔

۲۔ ۱۱ سے ۲۰ لاکھ روپیہ تک ہوئی تو ۱۱% // //

۳۔ ۲۰ سے ۳۰ لاکھ روپیہ تک ہوئی تو ۱۲% // //

۴۔ ۳۰ سے ۴۰ لاکھ روپیہ تک ہوئی تو ۱۳% // //

اور حد سے حد کمیشن ۱۵% تک ہوگا۔ کیا یہ کمیشن کی ادائیگی Interest تو نہیں مانی جائے گی (یہ بات مسلمہ ہے کہ کمپنی کی تجارت اس حد سے کم نہ ہوگی)

الجواب وبالله التوفیق:

یہ دس فیصد یا گیارہ فیصد یا جتنا فیصد بھی ہو اگر یہ فیصد محض نفع کا فیصد ہوتا ہے تو یہ نفع ہرگز سود میں نہیں آتا ہاں اگر بجائے نفع کے فیصد کے کل رقم کا فیصد مانا جائے تو روئے شرعی کا شبہ ہو جاتا ہے جس سے بھی بچنا ضروری ہے (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۰۲/۶/۳۰ھ

۱۔ حوالہ بالا، نیز "و کذا لو مسلمہ إلیہ بجهة أخرى کھبہ أو یداع أو شراء و کذا لو أطعمہ فأکله خلافاً للمشافعی" (الدر المختار مع رد المحتار ۹/۲۶۷)۔

۲۔ کیونکہ یہ مخصوص رقم پر شرط نفع ہو کر "کل قرض جو لفعاً حرام ای إذا کان مشروطاً" (رد المحتار علی الدر المختار ۷/۳۹۵) کے دائرہ میں آ جاتا ہے۔

شرکت کی ایک خاص اسکیم:

دوسو فراد نے بیس ماہ کی ایک اسکیم بنا رکھی ہے اس طریقہ پر دوسو فراد میں سے ہر ایک فرد نے بیس بیس روپیہ جمع کیا، یہ تمام رقم ایک شخص کے پاس ہی ان دوسو فراد میں سے رکھ دی گئی اور ہر ماہ وہ شخص سے بیس بیس روپیہ جمع کرائے یہ طے ہو گیا اور ہر مہینہ قریب اندازاً ہوگی جس میں دوسو فراد کے ناموں کی پرچی ہوگی جس کا نام اٹھے گا اس کو ایک ہیرو سائیکل دی جائے گی، اب یہ انعام پانے والا سائیکل حاصل کرنے کے بعد چاہے اس اسکیم میں شامل رہے اور چاہے شامل نہ رہے اگر شامل رہنا چاہتا ہے تو پھر سے اس کو ہر ماہ کے حساب سے بیس روپیہ جمع کرنے پڑیں گے، اس طرح اگر اس کا نام ابھی اسکیم شروع ہونے کے دو ماہ بعد نکلا تو اس نے سائیکل حاصل کر لی گویا کہ اس ۲۰ روپیہ میں چار سو کا مال حاصل کر لیا اب پھر وہ اسکیم میں رہنا چاہتا ہے تو اس کو ان دو ماہ کے پیسے جو کہ وہ جمع کر چکا تھا، از سر نو جمع کرنے ہوں گے اور اگر پھر انعام نہیں نکلا تو آخر میں بیس ماہ پورے ہونے کے بعد ایک سائیکل ملے گی، خلاصہ اسکیم دوسو فراد کی ہر ماہ بیس روپیہ جمع ہر ماہ قریب اندازاً انعام اور جس کا انعام میں نام نہ آئے تو بیس ماہ پورے ہونے کے بعد سب کو سائیکل مل جائے گی ہیرو، اب جس کے پاس پیسے رہیں گے وہی سائیکل کا ذمہ دار ہے اور انعام تو وہ بیس ماہ تک اس رقم سے کاروبار بھی کرتا ہے معلوم کرنا ہے کہ یہ طریقہ اسکیم کا کیا صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس کا اس رقم سے کاروبار کرنا کیسا ہے۔

سوالنا ظلیل الرحمن (مہتمم مدرسہ مرادیہ منظر مگر پولی)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر دوسو فراد نے بیس بیس روپیہ جمع کئے تو ایک ہی مرتبہ میں چار ہزار روپے ہو گئے اگر بیس ماہ تک یہ طریقہ رہا تو اسی ۸۰ ہزار روپے ہو گئے، پہلا سوال یہ ہے کہ یہ روپے خواہ چار ہزار ہوں یا اسی (۸۰۰۰۰) ہزار کس کے شمار ہوں گے، اگر سب کے شمار ہوں گے اور اس سے مشترکہ کاروبار ہوگا (۱) پھر اس قریب اندازاً میں جس کا قریب اندازاً اٹھے گا اس کو انعام میں سائیکل دینے کے کیا معنی؟ اگر کوئی فرد چند ماہ بعد قریب اندازاً میں نام آئے ہوئے اٹھے تو اس کے لئے کیا قاعدہ رکھا ہے پھر کوئی شخص درمیان میں آجائے تو اس کے لئے کیا قاعدہ ہے وغیرہ وغیرہ بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور ان سب کے لئے ضابطہ مقرر کئے بغیر

۱- ”و حکمها الشركة فی الربح“ (الدراختار مع رد المحتار ۵/۲۷۷)۔

یہ معاملہ خالص قمار اور ربوہ محرم کی ایک شکل ہوگی اور قطعاً حرام و ناجائز ہوگی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱۲/۱۴۰۰ھ

چوری کے مال سے قرض کی ادائیگی:

سلیمان زید کا مقروض تھا، اپنی قرض کی ادائیگی کے لئے سلیمان نے زید کو مال (متاع) تجارت دیا، زید نے اس مال میں سے بعض اپنی دوسری دکان میں بھیج دیا اب چند ماہ کے بعد زید کو ظلم ہوتا ہے کہ وہ مال جو سلیمان نے ان کو دیا تھا وہ مال سرقہ ہے، زید کو کیا کرنا چاہیے کہ اگر مذکورہ صورت میں زید نے پورے مال کو فروخت کر لیا تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

محمد امین فریقی (معلم دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند)

الجواب وبالله التوفیق:

(۱) سلیمان نے جو مال تجارت زید کو اپنے قرضہ کی ادائیگی میں دیا تھا، اس مال کے بارے میں اگر سلیمان نے منع کر دیا تھا کہ اس کو کسی دوسرے کے ذریعہ مت فروخت کرنا جب تو اس سرقہ شدہ مال کا ضمان زید پر واجب ہوگا۔ اور اگر سلیمان نے زید کو منع نہیں کیا تھا تو اس سرقہ شدہ مال کا ضمان زید پر شرعاً واجب الادا نہیں ہے۔ باقی اگر زید خود نقصان کی تلافی کر دے تو یہ اس کا تبرع و احسان ہوگا (۲)۔

(۲) اگر زید نے اس پورے مال کو فروخت کر لیا تو اپنے قرض کی مقدار خود رکھ کر بقیہ سلیمان کو واپس کر دے اور اگر کل مال فروخت کرنے پر بھی سب قرض وصول نہیں ہوا اور فروخت کیا مناسب قیمت پر تو باقی ماندہ کا مطالبہ سلیمان سے کر سکتا ہے بشرطیکہ کل قرض کے عوض میں یہ لیا ہوا مال محسوب کر کے نہ لیا ہو ورنہ اگر کل قرض میں محسوب کر کے وہ مال لیا تھا تو

۱- عن أبي هريرة قال: "لِهُي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْعُرْدِ وَبَيْعِ الْحَصَاةِ" (مسند الترمذی ۵۲۳/۳ کتاب البیوع باب ما جاء فی کراہیۃ بیع العورد حدیث ۱۲۳۰)، "یا أَيُّهَا الْمَلِیْنِ آمَنُوا إِذَا بَايَعْتُمُ الْخَمْرَ وَالْمَيْسِرَ وَالْأَلْسَابَ وَالْأَزْلَامَ وَجَسَ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ" (سورہ مائدہ ۹۰)۔

۲- "وَجِبَ عَلَى الْمُرْتَدِّ أَنْ يَحْفَظَهُ بِنَفْسِهِ وَعِيَالِهِ كَمَا فِي الْوَدِيعَةِ وَضَمَّنَ إِنْ حَفِظَ بَعِيْرَهُمْ كَمَا مَرَّ فِيْهَا وَضَمَّنَ بِإِيْدَاعِهِ وَإِعَارَتِهِ وَإِجَارَتِهِ وَاسْتِخْدَامِهِ وَنَعْمِيْهِ كُلِّ قِيَمَةٍ فَبَسَقَطَ الْمَلِيْنُ بِقَدْرِهِ (المر المختار) وفي الشامي: "و نعيمه" عطف عام على خاص أي كالقراءة والبيع... الخ" (رد المحتار علی الدر المختار ۹۱/۱۰)۔

اب زید باقی کا مطالبہ نہیں کر سکتا (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۱۲/۱۴۰۱ھ

غیر مسلم کمپنی سے شیئر زلیما:

ایک غیر مسلم کمپنی غیر مسلم ممالک میں سودی کاروبار کرتی ہے اور مسلمان اس کمپنی کو روپے دے کر شیئر زلیما ہے، تو شیئر زلیما مسلمان شخص کے لئے جائز ہو گا یا نہیں؟ نیز کمپنی کو نفع زیادہ ہونے کی صورت میں شیئر زدار کو نفع زیادہ ملتا ہے اور کمپنی کو نفع کم ہونے کی صورت میں شیئر زدار کو بھی نفع کم ملتا ہے اور کمپنی کو نقصان ہونے میں نفع نہیں ملتا، نیز ایک مسلمان دوسرے مسلمان کمپنی سے شیئر ز لے تو جائز ہے یا نہیں؟ مدلل و مکمل جواب عنایت فرمائیں، نیز اگر شیئر زلیما جائز ہے تو اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

رشید احمد سنی فریقی (معلم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

الجواب و بالله التوفیق:

غیر مسلم کمپنی سے شیئر زلیما جائز ہے اگرچہ یہ کمپنی دوسری کمپنی یا کسی بینک وغیرہ سے سودی معاملہ کرتے ہوں، لہذا ہمارا کاروبار اس کمپنی سے جائز ہے، کیونکہ ہمارے اور کمپنی کے مابین سودی معاملہ نہیں ہے، باقی رہا مسلمان سے مسلمان کا شیئر زلیما اگر دونوں کے مابین سودی کاروبار نہیں ہے اور کسی غیر شخص وغیرہ کا کاروبار بھی سودی نہیں جس سے اس کا تعلق کاروبار میں ہے تو جائز ہے ورنہ نہیں، لہذا اس شیئر ز کے مال تجارت میں زکوٰۃ ہے اور ادا کرنا ضروری ہے۔

”وفی المبسوط (۲۲/۱۲۵) یکرہ للمسلم أن يدفع إلى النصرانی مالا مضاربة وهو جائز فی

القضاء۔“

”وإن كان غالب مال المهدی من الحلال لا بأس بأن يقبل الهدیه، وبأكل ماله يتبین عندہ أنه

حرام لأن أموال الناس لا تخلوا عن قليل حرام فيعتبر الغالب“ (۲)۔

۱- ”فيسقط الدين بقدره أي يسقط الدين جميعه بقدر ما ضمن وإلا رجع كل منهما على صاحبه بما فضل“ (رد المحتار على الدر المختار ۱/۹۱)۔

۲- کتاب النظر والإباحة ما يكره أكله ولا يكره وكذا في مجمع الأنهر ۲/۵۲۹ کتاب الكراهية فصل في لا كل وكذا في الفتاوى العاتكيرية ۵/۳۳۳

”اذا خلط الوكيل دراهم الربوا بعضها ببعض الدراهم التي أخذها من حلال يجوز أخذ الربح منها لكون الخلط مستهلكا عند الإمام لاسيما إذا كان الوكيل كافراً، لا سيما والتقسيم مظهر عندنا، كما إذا بال البقر في الحنطة وقت الدياسة فاقسمها الملاك حل لكل واحدا كلها مع التيقن بكون الحنطة مختلطة بالظاهر والنجس، ولكن القسمة أوثرت احتمالا في حصة كل واحد من الشركاء فحكمنا بظاهرة نصيب كل واحد منهم فكذا ههنا إذا أربى الوكيل بالتجارة وخلط الدراهم بعضها ببعض ثم قسمها على الشركاء يحكم بحل نصيب كل واحد منهم“ (والله اعلم (۱)۔

مال تجارت پر زکوٰۃ ہے جب کہ بقدر نصاب ہو اور جو نقد پس انداز ہو اس میں بھی زکوٰۃ ہے جب کہ بقدر نصاب ہو اور حوالان حول ہو گیا ہو اور جو رقم منافع میں آئی ہے اس پر بھی زکوٰۃ ہے جب کہ مال تجارت اور منافع مجموعہ بقدر نصاب ہو یا خریدار کے پاس پہلے سونایا چاندی یا نقد بقدر نصاب موجود ہو اور اثاء حول میں یہ بھی اس کے ساتھ مل جائے تو مجموعہ ہر سال تمام پر زکوٰۃ واجب ہوگی ”و لعل هذا الظاهر“ (والله تعالى اعلم (۲) مال تجارت سے مراد مشتری و تجارت نہیں ہے بلکہ مال تجارت سے مراد میٹرل اور سامان تجارت ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مضاربت کی مختلف صورتیں اور ان کے احکام:

زید نے ایک کمپنی حکومت کی اجازت سے بنائی جو کہ عثمانی ہے، اس کمپنی کو چلانے کے لئے اس نے ایک آدمی ہندوستان سے ویزہ پر بلایا تا کہ وہ کمپنی اس کی نگرانی میں چلائی جاسکے، لیکن بعد کو زید اس کے نگران سے یہ کہتا ہے کہ تم مکمل ہماری کمپنی کو چلاؤ میں تم کو تنخواہ نہ دے کر پوری کمپنی سپرد کرنا ہوں صرف تم مجھ کو منافع کا دس فیصد یا جو بھی مقرر کر دے دیدیا کرو، ایسا کرنا زید کا درست ہے اور منافع کی وہ رقم جائز ہوگی یا ناجائز؟

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کام کا ٹھیکہ زید کو اس کی کمپنی کی معرفت ملتا ہے جس میں کچھ رقم زید اپنی دے کر نگران سے کہتا ہے کہ تم اس رقم کی مقدار سے مجھ کو نفع دے دو تو کیا یہ جائز ہے؟

کتاب الکراہیۃ الباب الثانی عشر۔

۱۔ امداد الفتاویٰ ۳/۳۹۲۔

۲۔ امداد الفتاویٰ ۳/۳۹۸۔

۴۔ تیسری شکل یہ ہے کہ زید اپنے نام پر ٹھیکہ لے کر اپنے نگران کو دے دیتا ہے اور اس میں اپنی کوئی رقم نہیں لگاتا اور کام کی تکمیل سے پہلے ہی اس سے اصل ٹھیکہ کی رقم کا بیس فیصد یا دس فیصد لے لیتا ہے اور نگران کے نقصان کا وہ شریک نہیں ہوتا تو کیا یہ رقم زید کے لئے جائز ہوگی؟

۴۔ زید نے حکومت سے تجارت کی اجازت حاصل کی جو عثمانی ہے، دوسرے کسی آدمی سے زید نے کہا کہ تجارت کے لائسنس پر جو بھی تجارت کرو گے بغیر کسی رقم کے ذمے میں اس میں بیس ۲۰ فیصد یا دس فیصد منافع لوں گا، تو کیا یہ رقم زید کے لئے جائز ہوگی جو صرف لائسنس کی وجہ سے لی جاتی ہے۔

۵۔ زید اپنے کام کے نام پر ایک آدمی کو ہندوستان سے بلاتا ہے، اس آدمی کے آجانے کے بعد زید اس سے کہتا ہے کہ تم کو اختیار ہے کہ تم جہاں چاہو ملازمت کرو تو کیا یہ کمیشن زید کے لئے جائز ہے یا ناجائز؟

۶۔ زید اپنی تجارت کے لائسنس پر ایک ٹھیکہ لیکر بکر کو دے دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میرے پاس چونکہ رقم نہیں ہے تم اپنی رقم اس پر خرچ کرو بعد کو جو اس ٹھیکہ سے نفع حاصل ہوگا اس نفع میں ہم دونوں برابر کے شریک ہیں یا دونوں فیصد مقرر کر لیتے ہیں اور اگر خدا نخواستہ اس میں نقصان ہو تو ہم دونوں اس کنٹیکٹ (معاہدہ) کے اعتبار سے نقصان میں بھی برابر کے شریک ہیں، تو کیا زید کا اس طرح سے نفع کمانا جائز ہے؟ جبکہ نفع اور نقصان میں دونوں برابر کے شریک ہوں۔

واضح ہو کہ یہاں حکومت عثمان میں قانوناً اس طرح کی کوئی مشارکت خارجیوں کے ساتھ کرنا حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کرنا ہے اور اگر کوئی قانون یا معاملہ شرعی طور پر جائز ہے اور حکومت اس کے خلاف اپنا الگ الگ ملکی قانون بناتی ہے تو کیا اس کی پابندی وہاں کے رہنے والوں پر شرعاً عائد ہوتی ہے یا نہیں؟

مولانا محمد عین شرف صاحب (جلالہ عثمان)

الجواب وبالله التوفیق:

۱۔ اس معاملہ کا حاصل یہ نکلے گا کہ ہر ماہ یہ ٹھیکہ دار کا ہوگا اور عمل نگران کا ہوگا اور نفع میں دونوں مثل عقد مضاربہ کے شریک ہوں گے، اس لئے یہ معاملہ اس تاویل سے جائز رہے گا اور منافع کی رقم کو حسب معاہدہ و شرائط لپیٹا دونوں کے لئے جائز رہے گا (۱)۔

۱۔ "ولو قال: خلد هذا المال واعمل به على ان ما رزق الله عز وجل من شيء فهو بيدي على كذا ولم يزد على هذا فهو جائز" (برائع المصالح ۵/۱۰۹، مکتبہ ذکریہ دیوبند)۔

۲۔ یہ معاملہ بھی بتاویل جائز ہو سکے گا اور تاویل یہ ہوئی کہ ٹھیکیدار کو تو حق اختیار ہونا ظاہر ہے کہ وہ اپنا سرمایہ لگائے اور اپنا ہی عمل کرے اور نفع خود لے، اسی طرح ہر انسان کو اختیار ہے کہ اپنا حق بالکل سوخت کر دے یا دوسرے شخص کو محض عمل کا اختیار بطریق مضاربہت دیدے جیسا کہ مسئلہ ۱ میں مذکور ہے یا اپنا حق بالکل سوخت کر کے اپنا حق اختیار اور عمل سب دوسرے کو تفویض کر دے پس جب ٹھیکیدار یہ کل حق اختیار نگراں کو تفویض کر دے، تو شرعاً یہ بھی جائز رہے گا اور یہ فعل ٹھیکیدار کا حق نگراں تبرع ہوگا اور وہ جائز رہے گا۔

پھر ٹھیکیدار نے جو چیز سرمایہ کی مقدار نگراں کو دیا ہے، اگر بطور قرض دے جب تو اس پر نفع لینا ”کحل قروض جو نفعاً فہو ربوا“ کے مطابق رہا ہوگا اور ناجائز ہوگا اور اگر بطریق مضاربہت دے تو یہ دینا درست رہے گا اور بحکم مضاربہت اس مقدار کے نفع میں دونوں حسب معاہدہ شریک ہوں گے، لیکن جب مضارب اپنا حصہ نفع بھی ٹھیکیدار کو دے دیگا تو یہ مضاربہت کا تبرع اور اپنا حق سوخت کر دینا ہوگا اور چونکہ بطیب خاطر ہوگا، اس لئے یہ تبرع اس کے تبرع کا بدل ہو کر دائرہ شرع میں داخل ہو کر جائز ہو سکے گا۔

اگر ٹھیکہ کی نوعیت معلوم ہو جائے کہ کس کام کا ٹھیکہ ہے اور کیا کرنا ہوگا اور کل سرمایہ کتنا لگے گا تو تھوڑے تغیر کے ساتھ عقد شرکت کا معاملہ بھی ہو سکے گا۔

سو۔ یہ صورت شرعاً ناجائز ہوگی۔

۴۔ یہ بھی اس مذکور طریقے سے ناجائز ہے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ دو یا تین یا چند آدمی ملکر عقد شرکت کے ضابطہ کے مطابق تجارت کرنا چاہیں اور قانونی مجبوری سے لائسنس صرف ایک آدمی کے نام لے لیا جائے، پھر عقد شرکت کے ضابطہ کے مطابق وہ سب مشترکہ تجارت کریں۔

۵۔ یہ صورت بھی ناجائز ہے۔

۶۔ یہ بھی شرعاً درست نہ ہوگا۔

نوٹ:- کوئی معاملہ شرعاً جائز ہو مگر خارجی ہونے و نہ ہونے کی قید خلاف شرع یا کوئی معاملہ شرعاً جائز ہو اور خارجی و غیر خارجی ہونے کی قید کے بغیر خلاف قانون حکومت ہو تو فی نفسہ اگرچہ مباح ہو لیکن قانون حکومت کے خلاف ہونے کی وجہ سے عزت آبرو یا مال خطرہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو تو چونکہ مال و عزت و آبرو کی حفاظت واجب ہے اور کسی خلاف قانون معاملہ کا کرنا واجب نہ ہو بلکہ صرف اباحت کی حد تک ہو تو اس مباح کے لئے واجب کو نہیں چھوڑا جاتا ہے اور اجازت نہیں دی

جاسکتی۔

اور اس کا حاصل یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص اپنی عزت و آبرو وغیرہ بچاتا ہے تو عند اللہ مواخذہ نہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم

بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۹/۱۴۰۳ھ

مقروض کا ادا نیکی قرض کے وقت اپنی خوشی سے کچھ رقم زائد دینا:

۱- بینک اور ڈاکخانہ میں جمع کردہ رقم پر ملنے والے سود کے بارے میں یہ مسئلہ معلوم ہوا تھا کہ وہاں سے لے لیا جائے اور بلائیت ثواب غریب مسلمانوں پر تقسیم کر دینا چاہئے، اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ زید کی رقم کسی کافر پر باقی تھی عرصہ کے بعد وہ ادا کرتا ہے اور اپنے دستور کے مطابق اپنی خوشی سے سود بھی دیتا ہے تو آیا اس سے بھی سود کی رقم لے کر غریب مسلمانوں پر صرف کر دینا چاہئے، اسی طرح مالدار مسلمان یا کافر پر زید کی رقم باقی تھی جس کو وہ نہیں دیتا تھا، چنانچہ زید نے بذریعہ عدالت اس پر ڈگری حاصل کی اور عدالت نے تجویز کیا کہ زید کو فلاں کافر کا فلاں مالدار مسلمان اتنی رقم اور اتنا سود ادا کرے تو زید سود کی رقم اس کافر یا اس مالدار مسلمان سے لے کر غریبوں پر تقسیم کر سکتا ہے یا کہ نہیں یا صرف اصل رقم لے اور سود چھوڑ دے؟

الجواب وبالله التوفیق:

بینک وغیرہ کے سود پر جو مسئلہ آپ نے لکھا ہے صحیح ہے اور اگر کوئی غیر مسلم بلا کسی دباؤ یا مقدمہ وغیرہ کے محض اپنی خوشی اور رضامندی سے کچھ زائد رقم دیتا ہے تو موجودہ بھارت میں اس پر سود کا حکم ہے عی نہیں وہ بالکل حلال و طیب ہے، البتہ کسی مسلمان سے اس طرح بھی لینا جائز نہیں۔ اگر کوئی مسلمان ما دھند ہو اور بلا عدالت و مقدمہ کے وصول نہ ہو اور عدالت میں سود سے مغر نہ ہو تو پہلے اس کو اطلاع دے کر متنبہ کر دے کہ ہماری اصل رقم اگر تم نے اتنی مدت میں ادا نہیں کی تو غیر مسلم کے حوالہ تمہارا معاملہ کروں گا پھر وہ تم سے مع سود در سود کے بھی وصول کر سکتا ہے اور تم خود اس سود دینے دلانے کے ذمہ دار ہو گے مجھ سے مطلب نہ ہوگا، اب اگر وہ اس تنبیہ کے بعد بھی مدت مقررہ کے اندر نہ دے تو اسکے ساتھ بھی وہی صورت اختیار

کر لے جائے جو اوپر گزرا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمار پورہ ۱۹/۵/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعیدنا، مفتی دارالعلوم دیوبند

مشترکہ کاروبار سے متعلق ایک اہم فتویٰ:

۱- عمر اور بکر نے پچیس پچیس ہزار روپے جمع کر کے کپڑے کی تھوک تجارت کرنا طے کیا، جس میں عمر کے صرف پچیس ہزار روپے لگیں گے، اور عمل و محنت، خرید و فروخت وغیرہ کچھ نہیں لگیں گے، اور بکر کے پچیس ہزار اور خرید و فروخت وغیرہ میں ہر قسم کی محنت اور عمل لگے گا، عمر کا چونکہ صرف روپیہ ہے اور بکر کا روپیہ اور عمل دونوں ہیں، نفع کی تقسیم اس طرح پائی کہ عمر کو نفع کا ۳۰ فیصد اور بکر کو ۷۰ فیصد ملے گا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح دونوں کو از روئے شرع معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں، اور بصورت نقصان کس نسبت اور حساب سے دونوں کے حصہ میں نقصان آئے گا؟

۲- یہ امر بھی دریافت طلب ہے کہ بکر اس مشترکہ مال کو دوسرے گا بکوں کو بیچے گا، تو کیا وہ خود اپنی خود فروش دکان کے لیے بھی اسی قیمت پر جس میں دوسرے گا بکوں کو بیچ رہا ہے، اس مال میں سے لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

۱- صورت مسئلہ میں ”الربح علی ما اشترطاً“ کے حکم سے ایک کا نفع ستر فیصد اور دوسرے کا یعنی جس کی محنت نہ ہوگی، صرف بضائع و پونجی میں شرکت ہوگی اس کا محض تیس فیصد نفع لینا صحیح رہے گا۔ باقی نقصان میں حکم یہ ہے کہ ہر ایک کا نقصان اس کے اس المال (پونجی) کے مطابق ہوگا، پس جب دونوں کے ۲۵/۲۵ ہزار (برابر، برابر) لگے ہوئے ہیں تو نقصان دونوں پر برابر رہے گا (۱)۔

۲- یہ معاملہ اپنے شریک کے اذن حال یا مقال کے ذریعہ طے ہو سکتا ہے اور بغیر اذن حالی یا مقالی کے نہیں

۱- ”ولا خلاف أن اشراط الوضیعة بخلاف الأمر رأس المال باطل، واشراط الربح متفاوتاً عدداً صحيحاً“ (فتاویٰ رضوی ۳۳/۳ بحث شرکت اشخاص) وکلمہ ”ایضاً فی محکمہ“، ۳۰۳ مطلب شرکت العنان، (مرتب)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۹/۱۳۰۹ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمن خیر آبادی، محمد ظفر الدین مفتاحی، کفیل الرحمن

تقسیم شئی مشترک کا ایک خاص فیصلہ:

دو بھائیوں کے درمیان ایک مکان ارث میں آیا۔ مکان کی پوزیشن اس طرح واقع ہوئی ہے کہ مکان کے دو حصے ہیں، ایک حصہ دوسرے حصہ سے عمدہ اور اچھا ہے اور اس کی قیمت بھی دوسرے سے زیادہ ہے، چنانچہ عمدہ حصہ لینے والے کو یہ کہا گیا کہ وہ دوسرے حصہ والے کو بارہ ہزار زائد دے گا اور اچھے حصے کے ایک کمرہ میں دونوں بھائیوں کا زمانہ سے آفس ہے، آفس بدستور رہے گا، بلکہ کرایہ اس کو دیا جائے گا جس نے اس اچھے حصہ کو خرید لیا ہے وہ اس کو کبھی اس کمرہ سے نکلنے کے لئے نہیں کہے گا، اس شرط پر دونوں بھائی راضی ہو گئے اور معاملہ طے ہو گیا۔ اس طرح مکان تقسیم ہو گیا۔ اب جس نے اچھا حصہ لیا تھا دوسرے بھائی کو آفس سے نکلنے کے لئے کہہ رہے ہیں، حالانکہ وہ کرایہ پر اہم دیتا ہے۔ لہذا صورت مسئلہ میں اس طرح نکالنا جائز ہو گا یا نہیں، اور جو معاملہ طے کیا گیا تھا وہ صحیح تھا یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

اس معاملہ کا تعلق دو چیزوں سے ہے، ایک جزو کا تعلق تقسیم سے ہے، خواہ تقسیم وراثت ہو یا تقسیم شئی مشترک ہو اور دوسرے جزو کا تعلق عقد اجارہ سے ہے اور عبارت استفتاء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ مسلم عند اکثر یقین ہے اور ناذ بھی ہو چکا ہے۔ خواہ ثالث کے فیصلہ کے ذریعہ سے ہو یا آپس کے مصالحتی معاہدہ کے ذریعہ سے ہو، اور یہ نزاع نفاذ فیصلہ کے بعد پیدا ہوا ہے۔

نیز فیصلہ کے اس جملہ (اچھے حصہ کے کمرہ میں دونوں بھائیوں کا زمانہ سے آفس ہے) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بوقت فیصلہ تقسیم دونوں بھائیوں کا کاروبار مشترک تھا۔ پس اگر اس وقت دونوں بھائیوں کا کاروبار مشترک تھا اور اب بھی مشترک ہے تو اس صورت میں اس کمرے سے نکالنا درست نہیں ہے، ہاں اگر حالات و وقت کی تبدیلی کی وجہ سے سابق کرایہ (تیس روپیہ) موجودہ عام کرایوں کے اعتبار سے بہت کم رہ گیا، تو اس میں مناسب اضافہ ہو سکتا ہے اور اگر اب دونوں

بھائیوں کا کاروبار جدا جدا ہو گیا ہو یا کمرہ ہی اس قدر خراب اور بوسیدہ ہو چکا ہو کہ قابل رہائش باقی نہ ہو تو نکال بھی سکتے ہیں۔ اور یہ الگ بات ہوگی۔

اور بوقت فیصلہ و تقسیم دونوں بھائیوں کے کاروبار الگ الگ اور جدا تھے تو پھر اس کمرہ (آفس) میں دونوں کے مشترک رہنے اور کرایہ داری کا فیصلہ دینے کا کیا منشاء و سبب تھا، جواب کے لئے اس کا واضح ہونا بھی ضروری ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بیٹے کی ملازمت کی رقم کا مالک بیٹا ہے یا باپ؟

باپ اور بیٹا، دونوں ایک مکان میں رہتے ہیں، کھانا پینا ساتھ ہے، بیٹے کو کسی اسکول یا اسپتال میں بیرون ملک یا ملک میں ملازمت دلوادی، سوال یہ ہے کہ بیٹے کو جو کچھ آمدنی اس ملازمت سے ہوگی اس کا مالک بیٹا ہے یا باپ ہے، اگر مالک باپ ہے تو کب، تنخواہ بیٹے کے ہاتھ میں آتے ہی یا باپ کو دینے کے بعد، اس پر یہ مسئلہ بھی متفرع ہوگا کہ بیٹے کے پاس دوسری جائیداد ہے وہ صاحب نصاب ہے بیٹے کی جو سابق ملکیت ہے بیٹا اس کی زکوٰۃ تو نکالے گا ہی تنخواہ کی رقم جو کئی ہزار ہے ابھی بیٹے کے ہی ہاتھ میں ہے، باپ کو دیا نہیں ہے، کیا اس کی بھی زکوٰۃ نکالے گا اس سلسلے میں فتاویٰ شامی کی باب اشترک القاسدۃ اور فتاویٰ دارالعلوم دیوبند قدیم ۵/۲۲۶، ۷/۶۱، ۷/۶۹ کو سامنے رکھ کر جواب عنایت فرمایا جائے۔

محمد ادریس چودھری جستان

الجواب وبالله التوفیق:

- ۱۔ اس صورت میں بیٹے کی جو آمدنی ہوگی یا بیٹے کو جو تنخواہ ملے گی اس کا مالک بیٹا ہی ہوگا باپ نہیں ہوگا (۱)، ہاں باپ کو جو رقم بیٹا بطور تمذیک دے دے گا، اس رقم کا باپ البتہ مالک ہو جائے گا، ملازمت و تنخواہ کی آمدنی کا یہی حکم ہے، باپ کی تجارت میں بیٹا مل کر کے جو بڑھاؤ و ترقی دیتا ہے اس کا حکم دوسرا ہے (۲)، اس مسئلہ سے اس میں مغالطہ و دھوکہ نہ ہونا۔
- ۱۔ یہ اجاہ کا معاملہ ہے جو بیٹے کے ساتھ ملے ہوا ہے باپ کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے اس لئے اجرت کا مالک بیٹا ہوگا (اجارہ کی بحث کے لئے دیکھئے رد المحتار ۳/۳، فتاویٰ مالگیریہ ۳/۴۰۹)۔
- ۲۔ ”أب وابن یکسبان فی صعة واحدة ولم یکن لهما مال فالکسب کلہ للأب إذا کان الابن فی عیال الأب لکولہ“

چاہئے، اور جب بیانی مالک رہے گا تو بیئے ہی پر اس کی زکوٰۃ بھی دینی واجب رہے گی اور یہ ظاہر ہے، ”وسببہ ائی سبب افتراضها ملک نصاب حولی..... قام“ (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۹/۱۴۰۰ھ

سودی کاروبار کرنے والی فیکٹری کا شیئر ہولڈر بننا:

مقام والی میں ایک فیکٹری قائم ہونے کا پلان کیا جا رہا ہے۔ اس میں ایک شیئر ہولڈر کا پانچ سو روپیہ ہے، اب ایسی صورت میں جب ایک بڑی رقم ہو جائے گی تو اس رقم کو بینک میں جمع کر کے لون لیا جائے گا تا کہ ایک بڑی رقم ہو جائے پھر اس کے بعد فیکٹری چالو ہوگی جو بھی شیئر ہولڈر ہوں گے اس کو نفع اور نقصان میں بھاگیدار کیا جائے گا، اس فیکٹری کے چالو کرنے میں لون کاروپیہ بیاج کے ساتھ شامل ہو رہا ہے اور جو شیئر ہولڈر والے ہیں ان کو کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔ اور اس کے بغیر بھی روزی چلتی ہے تو ایسی حالت میں جو نفع ہوگا وہ ہمارے لئے جائز ہوگا یا نہیں اس صورت میں اس طرح کا معاملہ کرنا کیسا ہے؟

فتحا رحمہ (کلی منزل صلح لسان کجرات)

الجواب وبالله التوفیق:

اس فیکٹری کے نفع کے جواز میں تو کوئی کراہت نہیں ہے اور اس کا نفع لینا تو جائز رہے گا (۲)، البتہ یہ بات توضیح طلب ہے کہ جب بڑی رقم ہو جائے گی تو اس کو بینک کو دیکھا کر بینک سے لون کون لے گا آیا یہی شیر خریدنے والے خود لیں گے یا یہ شیر ہولڈر شیر خرید کر اپنا روپیہ فیکٹری میں دیدیں گے اور پھر فیکٹری والے خود بینک سے لون لیں گے۔ اگر شیر ہولڈر خریدنے والوں کو خود اپنا روپیہ بینک کو دکھا کر اس پر سودی قرض لینا پڑتا ہے جب تو ان لوگوں کو ایسا کرنا جائز نہ ہوگا، جن

معبدا لہ“ (فتاویٰ مانگیر یہ ۳/۲۹، رد المحتار علی الدر المختار ۹/۵۰۲ عن ھبیر)۔

۱- الدر المختار ۲/۱۷۵، ۱۷۳۔

۲- ”لو دفع ألفاً إلى رجل وقال: أخرج مغلها واشرو ما كان من ربح فهو بسا وقبل الآخر وأخذها وفعل العقد الشراكة“ (المحرر الرائق ۵/۲۸۲)۔

کے پاس اپنا دوسرا جائز کاروبار ہے اور وہ مجبور نہیں ہیں (۱)، اور اگر شیر ہولڈر خریدار خود بینک کو دیکھا کر لون نہیں لیں گے بلکہ فیکٹری کا عملہ یہ سب کام خود انجام دیتا ہے اور وہ اکثر غیر مسلم ہے یا کل غیر مسلم ہے تو ایسی صورت میں یہ شیر خریدنا بھی جائز رہے گا منع نہ ہوگا (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ہمارے پور ۱۲/۱۱/۱۴۰۱ھ

فیکٹری ملازم کی بیوہ کے لئے فیکٹری سے ملنے والی رقم کا حکم:

بی۔ ایچ۔ ای، ایل کا ملازم ہے اور انتقال ہو جاتا ہے فیکٹری کی طرف سے اس کی بیوہ کو رقم دے دی جاتی ہے اور اس رقم کے لئے فیکٹری کی طرف سے جو اسکیم بنائی ہے بیوہ اس اسکیم میں حصہ لے سکتی ہے یا نہیں؟ رقم اس طرح اسکیم میں محفوظ رہتی ہے، اسکیم میں ۳۰ سال یا اس سے زائد ہوتی ہے اور اس کی ادائیگی کے بعد کچھ فی صد بڑھا کر سود کے ساتھ فیکٹری دیتی ہے، اس رقم کو حاصل کرنے کے بعد وہ کسی دھندہ تجارت میں لگاتی ہے یا کسی کو دیتی ہے اس رقم کی سودی نوعیت کے بارے میں تفصیل سے فرمائیں اور اس کو استعمال میں لانا بیوہ کیلئے جائز ہے یا نہیں؟

عبداللہ (صاحب سینٹرل ملنگ آدم بلڈنگ پلان بھوپال)

الجواب وبالله التوفیق:

اگر وہ رقم بیوہ کو دیکر اس کے قبضہ دخل میں فیکٹری دیتی ہے تو وہ رقم بالکل حلال و جائز ہے، البتہ پھر اس رقم کو جمع اسکیم میں داخل کرنے کے لئے یا اس اسکیم میں حصہ لینے کے لئے کسی قسم کی قانونی ہدایت یا پابندی نہیں ہے، بلکہ بیوہ اس معاملہ میں بالکل خود مختار اور آزاد رہتی ہے، پھر اس کے باوجود بیوہ اس جمع اسکیم میں حصہ لے اور یہ رقم اس میں داخل کر دے تو

۱- "الضرورات ببح المحظورات" (الاشباہ والافاضل طبع کراچی ۱۱۸)، "عن ابن مسعود قال: لعن رسول اللہ ﷺ اكل الربا وموكله وشاهديه وكاتبه" (سنن الترمذی ۳/۵۰۳ کتاب الربو باب ما جاء فی آكل الربا حدیث ۱۲۰۶)۔

۲- مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے لکی کمپنیاں جو اگرچہ سودی کاروبار میں ملوث ہیں مگر ان کا مجموعی کاروبار حلال ہے ان کے شیرز کی خرید کو دوسروں کے ساتھ جائز لکھا ہے بول یہ شیرز ہولڈر کمپنی کے اندر سودی کاروبار کے خلاف آواز اٹھائے، دوم یہ کہ آمدنی کا ہفتا فی صد حصہ سود ہے اپنے منافع سے اٹنا فی صد صدقہ کر دے (تفصیل کے لئے دیکھئے فقہی مقالات ۱/۵۰، ۱۳۹)۔

درست نہ ہوگا اور جو رقم اس جمع کردہ رقم سے زائد ملے گی وہ سود شرعی ہوگی، اس کا حکم وہی ہوگا جو کہ بینک کے دوسرے سود کا ہے، اسے لیکر غرباء و مساکین کو اس کے وبال سے بچنے کے لئے دے دینا ضرور رہے گا اور اگر صورت واقعہ اس طرح نہ ہو تو حکم بھی دوسرا ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

سدا پھولی اسکیم میں شرکت:

صوبہ مہاراشٹر میں ایک بینک ہے جس کا نام بینک آف مہاراشٹر ہے، اس بینک نے عوام کی سہولت کے لئے اسکیم نکالی، جس کی مرضی آئے جاری کرے کوئی سختی نہیں، اس میں ایک اسکیم ہے اور اس اسکیم کا نام سدا پھولی SADA FULI رکھا گیا ہے، اس میں اگر آپ پانچ سو روپیہ جمع کرنا چاہیں تو ہر مہینہ بینک میں جمع کرنا پڑے گا۔ اسی طرح اگر دس سال تک جاری رکھیں گے تو دس سال کا عرصہ ختم ہونے کے بعد ہر ماہ ایک ہزار روپیہ پنشن کے طور پر حیات تک میاں بیوی اور بچوں کو ہمیشہ کے لئے ملتا رہے گا، تحریری طور پر ایسی اسکیم ہے مثال اس اسکیم کی ایک پھل لگنے والے درخت سے دی ہے کہ کسی درخت کو لگانے کے وقت پانی دیتے رہو تو بعد میں وہ درخت ہمیشہ پھل دیتا رہے گا۔ اور سب کو اس کا فائدہ حاصل ہوگا، اس بناء پر انہوں نے یہ اسکیم بنائی ہے تو کیا ہم ایسی اسکیم میں شریک ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ بیان فرمائیں۔

کمپنی کا شیئر ہولڈر بن کر نفع حاصل کرنا:

اگر کسی کمپنی میں شیئر ہولڈر بن کر اس کا نفع حاصل کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ڈیونٹ DEVINT کی رقم لے سکتے ہیں یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ابھی یہ سوال نامکمل اور ادھورا ہے اس لئے ان باتوں کے بارے میں اگر قانون معلوم ہو جائے تو کوئی حتمی و قطعی جواب دیا جائے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص دس ۱۰ سال پورا ہونے سے پہلے اپنا جمع کیا ہوا روپیہ واپس لینا چاہے یا دس سال مسلسل جمع نہ کرے یا جمع نہ کر سکے یا مرجائے تو اس کے بارے میں کیا قانون ہے، اس کا جمع کیا ہوا روپیہ کیا ہوگا، واپس ملے گا ان دونوں باتوں کا جواب آنے پر اس نمبر کا جواب دیا جاسکے گا۔

تجارتی کمپنی میں شیر ہولڈر بننا اور اس کا نفع لینا جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۰۳/۲/۱۴۰۳ھ

موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت:

موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے کیا تھی اور اب کیا ہے، دارالحرب کی کتنی قسمیں ہیں؟

محمد ادریس (راجستھان)

الجواب وبالله التوفیق:

۱۹۴۷ء کے پہلے بھی دارالحرب تھا اور بعد میں بھی دارالحرب ہے، اور دارالحرب کی کئی قسمیں ہیں ان سب صورتوں

میں حکم علیحدہ علیحدہ ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

امداد باہمی کی ایک صورت کا شرعی حکم:

فرض کرو کہ میونسپل کمیٹی مالیر کوئٹہ کے ٹیس ملازمین اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ ایک صد روپیہ کٹوا کر مبلغ دو ہزار روپے جمع کرتے ہیں، اور روپیہ اکٹھا ہونے پر اس روپے کو انہیں ممبران میں کم قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں، یعنی جس ملازم ممبر کو ضرورت ہوتی ہے دوسرے ضرورت مند ملازم کے مقابلہ میں دو ہزار کی لاٹری ہزار یا بارہ صد میں لے لیتا ہے اور جو فالتو رقم ہوتی ہے باقی ممبران حصہ کے مطابق منافع سمجھ کر بانٹ لیتے ہیں، یہ سلسلہ اسی طرح ہر ماہ چلتا رہتا ہے جب تک کہ تمام ممبران پورے نہ ہو جائیں۔

کیا یہ فالتو فروخت کی گئی رقم جو کہ بانٹی جاتی ہے کسی غریب ملازم سے ضرورت کے پیش نظر فائدہ اٹھا کر بانٹنا کسی بیاج کی زد میں آتی ہے یا کہ نہیں، شرعی طور پر یہ سسٹم جائز ہے یا کہ نہیں؟

۱۔ اس مسئلہ کے لئے محدث فقیر مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے مقالہ ”دارالاسلام اور دارالحرب“ کا مطالعہ کیا جائے، انہوں نے ایک مقام پر تحریر فرمایا ہے جہاں تک ہماری نظروں کا تعلق ہے ہندوستان اسی آخری قسم میں شامل ہے ”الوطن القوی“ کے باوجود دارالاسلام کے حکم میں ہے (دارالاسلام اور دارالحرب مطبوعہ مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ سکس ۲۸)۔

الجواب وبالله التوفيق:

یہ سسٹم شرعی طور پر کئی وجوہ سے ناجائز و غلط ہے، مثلاً:

الف- تنخواہ کا یہ جز و نقدین ہوتا ہے، نقدین کا تبادلہ (بیع) زیادتی کمی کے ساتھ ناجائز ہے، حدیث شریف میں: ”مثلاً بمثل یدلما بیعاً“ ہونا ضروری ہے، اس کو شرعی اصطلاح میں بیع صرف کہیں گے، اس میں جو نفع ہو گا یا زیادتی ہو گی وہ سود ہو گی۔ ”والفضل ربوا“۔

ب- اس معاملہ میں (ربوا) سود کے ساتھ قمار (جوا) بھی ہے، مثلاً ربوا تو یہی کہ دو ہزار کو بارہ سو یا تیرہ سو میں فروخت کر کے آٹھ سو یا سات سو نفع کے نام پر وصول کیے۔ یہ سات سو یا آٹھ سو بھی ”الفضل ربوا“ کا مصداق ہے اور سود ہے اور بیع ہے، اور قمار مثلاً یہ ہے کہ جو لوگ ۲۰ قسطیں دینے سے پہلے نمبر آ جانے کی وجہ سے دو ہزار وصول کر کے ۲۰ قسطیں پوری کرنے سے پہلے ہی مرجائیں تو حسب حصہ بقیہ تمام ممبروں کا حصہ ضائع ہوا۔ اور مثلاً کوئی آدمی چند قسطیں دینے کے بعد وصولی کا نمبر آنے سے پہلے مرجائے تو اس کی داخل کی ہوئی رقم ضائع ہوئی اور بیس قسطوں کی ادائیگی میں ہر شخص کا زندہ رہنا ضروری نہیں، بلکہ ضیاع کے ایسے واقعات بعید از وقوع بھی نہیں۔ لہذا اس طرح سے مال کا دینا موضع خطر میں مال کا ڈال دینا ہوا، اور یہ بھی قمار کی ایک شکل ہے۔

ج- یہ معاملہ مفہمی الی النزاع بھی ہوگا، اس لئے کہ جو کن چند قسطیں دینے کے بعد اور دو ہزار وصول کر کے درمیان سے نکل جانا چاہے گا تو بقیہ ارکان ان کو نکلنے نہ دیں گے، جبر ہو گا یا دی ہوئی رقم کی واپسی کرنے کے لائق نہ ہوگا، اور وہ مطالبہ جاری رکھیں گے تو نزاع کا ظن غالب ہوگا۔

اسی طرح چند قسطیں دینے کے بعد دو ہزار کی رقم وصول کرنے سے قبل الگ ہوگا تو اپنے دیئے ہوئے روپیوں کی واپسی کا مطالبہ کرے گا اور یہ صورت بھی مفہمی الی النزاع ہوگی اور جو معاملہ اپنے نوعیت کے اعتبار سے مفہمی الی النزاع ہو، فاسد و ممنوع ہوگا۔

ہاں اگر ایثار و ہمدردی اور نفع رسانی کا جذبہ ہے تو صحیح ہے اور بطور امداد یا ہی جائز طریقہ سے کرنا چاہتے ہیں تو اس طرح کر سکتے ہیں، دو ہزار کی رقم جس کو دی جائے بذریعہ قرضہ اندازی کے جس کا نام نکلے اس کو پوری رقم بطور ہبہ کے دیدی جائے، ہر رکن بطور ہبہ اس کو دے دینے کی تصریح کر دے اور جس کا نام ایک مرتبہ قرضہ میں نکلے رقم اس کو مل جائے دوبارہ قرضہ اندازی میں اس کا نام نہ رکھا جائے۔

اور جو رکن قمر عد میں نام نکلنے اور روپیہ پانے کے بعد الگ ہو جائے اس سے واپسی کا مطالبہ بقیہ ارکان نہ کریں اور نہ اس پر کوئی گرفت کریں۔

اسی طرح جو رکن کچھ قسطیں دینے کے باوجود قمر عد میں آنے کے قبل نکل جاویں وہ اپنے دیئے ہوئے روپیہ کا مطالبہ نہ کریں اور نہ کوئی گرفت کریں۔ اور ان سب باتوں کا ضابطہ و قاعدہ پہلے تسلیم کر لے تو اس طرح یہ معاملہ درست رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور